اُردو زبان میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر جامع ترین کتاب

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

حصہ ششم

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ
علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب
غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

فہرست مضامین

اخلاق

اسلام اور اخلاق حسنہ

تزکیہ ۱۱
حکمت ۱۲
حقوق العباد کی اہمیت ۱۳
اسلام کے ارکان پنجگانہ اور اخلاق ۱۴
اخلاق حسنہ اور ایمان ۱۵
اخلاق حسنہ اور تقویٰ ۱۶
اخلاق حسنہ اور خدا کے نیک بندہ ہونے کا شرف ۱۶
اہل ایمان کے اخلاقی اوصاف ۱۷
اخلاق حسنہ کا درجہ اسلام میں ۱۸
ایمان کے اوصاف ولوازم ۲۱
اخلاق حسنۂ صفات الٰہی کا پرتو ہیں ۲۲

اخلاقی معلموں میں آنحضرت ﷺ کا امتیاز

بے پردہ زندگی ۲۵
قول کے ساتھ عمل ۲۶
کامل و مکمل ۲۸
اخلاقی تعلیم کا تنوع ۲۸

اسلام کا فلسفہ اخلاق

بے غرضی ۳۳
نیت ۳۳
فلسفۂ اخلاق کی تائید ۳۵
اخلاق کے لیے ایمان کی شرط ۳۵
غرض وغایت ۳۶
ضمیر کی آواز ۳۷
مسرت وانبساط ۴۰
رضائے الٰہی ۴۱
مذاہب میں اخلاق کا بنیادی اصول ۴۴
خوف ورجاء ۴۸
اخلاق اور رہبانیت ۵۰
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ۵۲
اس کی چند شرائط ۵۶
تجسس اور غیبت کی ممانعت ۵۶
توسط اور اعتدال ۵۸
عدل اور احسان ۵۹
قانون اور اخلاق ۶۰
عفو اور انتقام ۶۱
عفو ودرگذر کی تعلیم ۶۵
برائی کی جگہ نیکی ۶۷

اسلام کی اخلاقی تعلیم کا تکمیلی کارنامہ

تفصیل اور ہمہ گیری	۷۱
اخلاقی تعلیمات کا احاطہ	۷۳
انجیل کے اخلاقی احکام	۷۴
اسلام میں اخلاقی احکام کا استقصاء	۷۴
قرآنی اخلاق کی فہرست	۷۵
احادیث کے اخلاقیات کی فہرست	۷۶
اخلاقی جزئیات کا استقصاء	۷۷
مسکرات (نشہ آور چیزیں) کی حرمت میں جزئیات کا احاطہ	۸۱
رشوت کی حرمت میں استقصاء	۸۴
مسیحی اخلاق کی کمزوری	۸۴
نطشے کا اعتراض مسیحی اخلاق پر	۸۴
اسلامی اخلاق کا اعتدال	۸۴
نفوس کا اختلاف استعداد	۸۵
ہر شخص کی حسب ضرورت اصلاح	۸۵
مسیحی اور اسلامی اخلاقیات کا فرق	۸۶
مسیحی اخلاق کی کمزوریاں	۸۶
لیکی کا اعتراض مسیحی اخلاق پر	۸۷
اسلام اور بلند اخلاق	۸۷
تقدیر، توکل، صبر شکر	۸۸
اپنے دشمنوں سے پیار کرو	۹۰
کفار اور مشرکین سے عدم موالات	۹۳
سختی کا جائز موقع	۹۹
خدا کے لیے محبت اور خدا کے لیے ناراضی	۱۰۳
ترک ہوئی	۱۰۶
اخلاق اور محبت الٰہی	۱۰۷

تعلیم اخلاق کے طریقے اور اسلوب

اخلاقی تعلیمات کی قسمیں

حقوق و فرائض

حقوق کے معنی	۱۲۰
حقوق کی وسعت	۱۲۲
حقوق کی ترتیب	۱۲۳
والدین کا حق	۱۲۵
اولاد کا حق	۱۳۴
اصولی تعلیم	۱۳۴
اولاد کشی کا انسداد	۱۳۵
رضاعت وحضانت	۱۴۱
تعلیم وتربیت	۱۴۲
حقوق زوجین	۱۴۴
مرد کو کس عورت کے مارنے کا اختیار دیا گیا ہے	۱۵۲
اہل قرابت کے حقوق	۱۵۷
ہمسایہ کے حقوق	۱۶۱
یتیموں کے حقوق	۱۶۵
بیوہ کے ساتھ حسن سلوک	۱۷۰
حاجت مندوں کے حقوق	۱۷۳
بیمار کے حقوق	۱۷۵
غلاموں کے حقوق	۱۷۸
مہمان کے حقوق	۱۸۰

مسلمانوں کے باہمی حقوق ۱۸۳
انسانی برادری کا حق ۱۹۰
جانوروں کے حقوق ۱۹۳

فضائل اخلاق

فضائل کی مختصر فہرست ۱۹۹
صدق ۲۰۳
زبان کی سچائی ۲۰۷
دل کی سچائی ۲۰۸
عمل کی سچائی ۲۰۹
سخاوت ۲۱۳
عفت وپاک بازی ۲۲۵
دیانت داری اور امانت ۲۳۸
شرم وحیاء ۲۴۴
رحم ۲۴۹
عدل وانصاف ۲۵۳
عہد کی پابندی ۲۶۰
احسان (بھلائی کرنا) ۲۶۶
عفوودرگزر ۲۷۳
حلم اور بردباری ۲۸۰
رفق ولطف ۲۸۴
تواضع وخاک ساری ۲۸۹
خوش کلامی ۲۹۱
ایثار ۲۹۳
اعتدال اور میانہ روی ۲۹۵
خودداری یا عزت نفس ۲۹۸
شجاعت اور بہادری ۳۰۵
تعداد کی قلت وکثرت ۳۰۸
موت کا وقت مقرر ہے ۳۱۰
شہادت اور غزا کا رتبہ ۳۱۲
استقامت ۳۱۵
حق گوئی ۳۲۰
استغناء ۳۲۳

رذائل

رذائل کے معنی ۳۲۶
رذائل کے قرآنی نام ۳۲۶
فحشاء منکر اور بغی ۳۲۷
فحشاء کے معنی ۳۲۸
منکر کے معنی ۳۲۸
بغی کے معنی ۳۲۹
اخلاق ذمیمہ برے کیوں ہیں ۳۳۰
رذائل کی ترتیب ۳۳۰
جھوٹ ۳۳۱
جھوٹی قسمیں کھانا ۳۳۸
وعدہ خلافی ۳۴۳
خیانت اور بددیانتی ۳۴۴
غداری اور دغابازی ۳۴۷
بہتان ۳۴۸
چغل خوری ۳۵۱
غیبت اور بدگوئی ۳۵۴
دورخاپن ۳۵۹
بدگمانی ۳۶۰
مداحی اور خوشامد ۳۶۱

بخل ۳۶۳
حرص وطمع ۳۷۱
بے ایمانی ۳۷۳
چوری ۳۷۶
ناپ تول میں کمی بیشی ۳۷۸
چھپا کر لینا ۳۸۰
رشوت ۳۸۲
سودخوری ۳۸۴
شراب خوری ۳۸۷
غیظ وغضب ۳۹۱
بغض وکینہ ۳۹۳
ظلم ۳۹۵
فخر وغرور ۳۹۹
ریا ۴۰۷
خودبینی وخودنمائی ۴۱۰
فضول خرچی ۴۱۳
حسد ۴۱۵
فحش گوئی ۴۲۰
رذائل پر مختصر تبصرہ ۴۲۵

آداب

فطری آداب ۴۲۶
طہارت اور اس کے آداب ۴۲۸
کھانے پینے کے آداب ۴۳۳
آداب مجلس ۴۳۶
آداب ملاقات ۴۳۹
آداب گفتگو ۴۴۵
باہر نکلنے اور چلنے پھرنے کے آداب ۴۴۹
آداب سفر ۴۵۱
آداب خواب ۴۵۲
آداب لباس ۴۵۵
آداب مسرت ۴۵۸
آداب ماتم ۴۶۲
متفرق آداب ۴۶۶
آداب کا فلسفہ ۴۶۷
حکمت ربانی کا چشمۂ نور ۴۷۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلۡحَمۡدُلِلّٰہِ الَّذِیۡ اَنۡزَلَ الۡکِتَابَ وَالۡحِکۡمَۃَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوۡلِہٖ نبی الرحمۃ و علٰی اٰلِہٖ وَ اَصۡحَابِہٖ اولی العزم والھمۃ.

اے تو بہمیں صفت سزاوار　　نام تو گرہ کشائے ہر کار
اے کردہ زگنج خانۂ راز　　بر آدمیاں در سخن باز
علم ز توشد بحکمت آباد　　حکمت زتو یافت آدمی زاد

در قربتِ حضرت مقدس　　پیغمبرؐ پاک رہبرم بس
گنجینۂ کیمیائے عالم　　پیش از ہمہ پیشوائے عالم
نامش بسریرِ پادشاہی　　توقیعِ سپیدی و سیاہی

خسرو

سیرت نبویؐ کے سلسلہ کی چھٹی جلد آج ناظرین کے سامنے ہے یہ ان اخلاقی تعلیمات کی تفصیل اور تشریح میں ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے مسلمانوں کو بتائی اور سکھائی گئیں، یہ عجیب بات ہے کہ مذہب کے ضروری اور مفید ہونے کے ثبوت میں اخلاقی تعلیم کی نظری حیثیت سے جتنی اہمیت ہے، عملی حیثیت سے عام لوگ اس کو اتنا ہی کم درجہ دیتے ہیں اسی لیے عوام کے اس وہم کو دور، اور قوموں کی ترقی و تہذیب میں اخلاق کی صحیح اہمیت کو واضح کرنے کے لیے ان اوراق میں اس باب کے ہر گوشہ پر اچھی طرح روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ملت کی تعمیر کا اہم جز اخلاق کی صحیح تربیت ہے۔

کتاب میں اس نکتہ کی طرف کہ اخلاقِ حسنہ ''اسمائے حسنیٰ'' کا پرتو ہیں، بار بار اشارہ کیا گیا ہے لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ کوئی مخلوق، خالق کی کسی صفت میں برابر کا شریک نہیں ہوسکتا، ایسا سمجھنا سراسر شرک ہے بات اتنی ہے کہ بندہ کے جس وصف کو خدائے تعالیٰ کی جس صفت سے مناسبت ہوتی ہے اس پر اس صفت کا اطلاق مجازاً کر دیتے ہیں، جیسے خدا کے علم کے سامنے بندہ کے اس وصف کو بھی علم کہہ دیتے ہیں، حالانکہ حقیقی صفتِ علم خدا میں ہے، بندہ میں نہیں، لیکن چونکہ خدائے تعالیٰ اپنی صفتِ علم سے بندہ میں ایک انکشافی شان پیدا کر دیتا ہے، اس لیے بندہ کی اس ادنیٰ انکشافی شان کو بھی علم کہہ دیتے ہیں۔ [1] ورنہ درحقیقت دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں، یہی حال اللہ تعالیٰ اور بندہ کے دوسرے صفات اور اوصاف کے اشتراک کا ہے، اسی لیے بہت سے اہلِ حق اور اہلِ تحقیق کے

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے معارف لدنیہ حضرت مجدد الف ثانیؒ ص ۲۴ مطبوعہ مدینہ بجنور۔

نزدیک ان اوصاف کا اشتراک بادنیٰ مناسبت ہے اور بس ! ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَّ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ (شوریٰ :۱۱)

کتاب میں چند موقعوں پر مختلف مذہبوں سے اسلام کا موازنہ آ گیا ہے اور اس سلسلہ میں حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی تعلیمات کا ذکر بھی آیا ہے' اس سے مقصود وہ تعلیمات و ہدایات ہیں جو آج ان کی طرف منسوب صحیفوں میں پائی جاتی ہیں' یا ان کے موجودہ پیروان کی طرف منسوب کرتے ہیں' ورنہ ظاہر ہے کہ ہر پیغمبرِ صادق کی تعلیم ہر اعتراض سے بلند اور ہر خردہ گیری سے پاک ہے' اور نبوت کے جس دور میں جو ربانی تعلیم آئی وہ اس کے لیے بالکل مناسب تھی' یہاں تک کہ خاتم المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اس کی ہمیشہ کے لیے تکمیل فرمادی گئی۔

کتاب میں کہیں کہیں فقہی مسئلے آ گئے ہیں' چونکہ اس کتاب کا اصل موضوع احکام کا اخلاقی پہلو ہے' اس لیے فقہی جزئیات اور تفصیلات میں الجھا نہیں گیا ہے۔ ایسے موقع پر اگر شک و شبہ ہو تو ضروری ہے کہ ان جزئیات اور تفصیلات کو فقہ کی کتابوں میں دیکھ لیا جائے۔

کتاب کی ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ پہلے ایک مقدمہ ہے جس میں اخلاق کی مذہبی اہمیت ظاہر کی گئی ہے پھر کوشش کی گئی ہے کہ اسلامی اخلاق کا ایک فلسفہ مرتب کیا جائے اس کے بعد آنحضرت ﷺ کے طریقۂ تعلیم کی کچھ خصوصیتیں گنائی گئی ہیں' پھر حقوق' فضائل' رذائل اور آداب کے مختلف عنوانوں سے اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی تفصیل کی گئی ہے۔

فضائل' رذائل اور آداب کے بعض عنوان میرے رفیق کار مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے لکھے ہیں جن کو میں نے گھٹا بڑھا کر شامل کر لیا ہے' موصوف کی اس قلمی اعانت کا شکر گزار ہوں۔

آیات و احادیث سے احکام کے استنباط اور مصالح و احکام کی تشریح میں اپنے ذوق و فکر کی رہبری سے چارہ نہ تھا' سہو و خطا انسان کی فطرت ہے' پھر کیونکر دعویٰ کروں کہ اس میں میرا فکر و ذوق آزاد رہا ہے۔

سلسلۂ سیرت کے بانی حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی نعمانی کو مدت سے خواب میں نہیں دیکھا تھا' اس حصہ کے جب آخری ابواب زیرِ ترتیب تھے تو میں نے ان کو خواب میں دیکھا کہ ان کے سامنے اس کے بعض اجزا پڑے ہیں' اور وہ اس کا کوئی صفحہ پڑھ رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں (رحمۃ اللہ تعالیٰ)

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان اوراق کو قبول فرمائے اور ابنائے ملت میں اس آئینۂ محمدی کو دیکھ کر اپنی اخلاقی شکل و صورت کی تزئین و آرائش کا ذوق پیدا کرے اور وہ سمجھیں کہ ایمان و عبادت کی درستی کی بڑی عملی نشانی اسلام کی روشنی میں اخلاق و عادات کی درستی ہے۔

طالبِ رحمت

سید سلیمان ندوی　　(۴ ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ وَ عَلٰى اٰلِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ.

تعلیماتِ نبوی کا تیسرا باب

اخلاق

عقاید اور عبادات کے بعد تعلیماتِ نبوی کی کتاب کا تیسرا باب اخلاق ہے' اخلاق سے مقصود باہم بندوں کے حقوق و فرائض کی وہ تعلیمات ہیں جن کو ادا کرنا ہر انسان کے لیے مناسب بلکہ ضرورت ہے' انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس کی ہر شے سے تھوڑا بہت اس کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے' اسی تعلق کے فرض کو بحسن وخوبی انجام دینا اخلاق ہے۔ اس کے اپنے ماں باپ' اہل وعیال' عزیز ورشتہ دار' دوست واحباب' سب سے تعلقات ہیں' بلکہ ہر اس انسان کے ساتھ اس کا تعلق ہے جس سے وہ محلہ' وطن' قومیت' جنسیت یا اور کسی نوع کا علاقہ رکھتا ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر حیوانات تک سے اس کے تعلقات ہیں' اور ان تعلقات کے سبب سے اس پر کچھ فرائض عائد ہیں۔

دنیا کی ساری خوشی' خوش حالی اور امن وامان اسی اخلاق کی دولت سے ہے' اسی دولت کی کمی کو حکومت و جماعت اپنے طاقت وقوت کے قانون سے پورا کرتی ہے۔ اگر انسانی جماعتیں اپنے اخلاقی فرائض کو پوری طرح از خود انجام دیں تو حکومتوں کے جبری قوانین کی کوئی ضرورت ہی نہ ہو۔ اس لیے بہترین مذہب وہ ہے جس کا اخلاقی دباؤ اپنے ماننے والوں پر اتنا ہو کہ وہ ان کے قدم کو سیدھے راستہ سے بہکنے نہ دے' دنیا کے سارے مذہبوں نے کم وبیش اسی کی کوشش کی ہے اور دنیا کے آخری مذہب ''اسلام'' نے بھی یہی کیا ہے' آئندہ ابواب میں اسلام کی انہی کوششوں کا جائزہ لینا ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے اور کیا ہے' اس کو تفصیل سے بتایا ہے۔

❀❀❀

اسلام اور اخلاقِ حسنہ

اس میں شک نہیں کہ دنیا کے سارے مذہبوں کی بنیاد اخلاق ہی پر ہے۔ چنانچہ اس عرصۂ ہستی میں جس قدر پیغمبر اور مصلح آئے، سب کی یہی تعلیم رہی کہ سچ بولنا اچھا اور جھوٹ بولنا برا ہے، انصاف بھلائی اور ظلم برائی ہے، خیرات، نیکی اور چوری بدی ہے لیکن مذہب کے دوسرے ابواب کی طرح اس باب میں بھی محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت تکمیلی حیثیت رکھتی ہے خود آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ)) (مؤطا مالک حسن اخلاق)

''میں حسنِ اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔''

یہ امام مالک کی مؤطا کی روایت ہے، مسند احمد، بیہقی اور ابن سعد[1] وغیرہ میں اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح الفاظ ہیں، آپؐ نے فرمایا:

((اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ))

''میں تو اسی لیے بھیجا گیا کہ اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کروں۔''

چنانچہ آپؐ نے اپنی بعثت کے ساتھ ہی اس فرض کو انجام دینا شروع کر دیا ابھی آپؐ مکہ میں تھے کہ ابوذرؓ نے اپنے بھائی کو اس نئے پیغمبر کے حالات اور تعلیمات کی تحقیق کے لیے مکہ بھیجا، انہوں نے واپس آ کر اس کی نسبت اپنے بھائی کو جن الفاظ میں اطلاع دی وہ یہ تھے:

((رَاَیْتُہٗ یَاْمُرُ بِمَکَارِمِ الْاَخْلَاقِ))[2]

''میں نے اس کو دیکھا کہ وہ لوگوں کو اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دیتا ہے۔''

حبشہ کی ہجرت کے زمانہ میں نجاشی نے جب مسلمانوں کو بلوا کر اسلام کی نسبت تحقیقات کی، اس وقت حضرت جعفر طیارؓ نے جو تقریر کی اس کے چند فقرے یہ ہیں:

''اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بتوں کو پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے ہمسائیوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، زبردست، زیردستوں کو کھا جاتے تھے، اس اثنا میں ایک شخص ہم میں

(۱) کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۵ حیدر آباد و زرقانی شرح مؤطا جلد ۴ صفحہ ۹۲ مطبع کستلیہ مصر ۱۲۸۰ھ۔

(۲) صحیح مسلم مناقب ابی ذر جلد ۲ صفحہ ۳۴۹ مصر۔

پیدا ہوا، اس نے ہم کو سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خونریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو آرام دیں، عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں۔'' (۱)

اسی طرح قیصر روم کے دربار میں ابوسفیان نے جو ابھی تک کافر تھے آنحضرت ﷺ کی اصلاحی دعوت کا جو مختصر خاکہ کھینچا اس میں یہ تسلیم کیا کہ وہ خدا کی توحید اور عبادت کے ساتھ لوگوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ ''وہ پاک دامنی اختیار کریں سچ بولیں، اور قرابت کا حق ادا کریں۔'' (۲)

قرآن مجید نے جابجا آنحضرت ﷺ کی تعریف میں کہا ہے۔

﴿وَ یُزَکِّیۡہِمۡ وَ یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ﴾ (جمعه : ۲)

''یہ پیغمبر ان پڑھ جاہلوں کو پاک وصاف کرتا اور ان کو کتاب وحکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔''

اس آیت میں دو لفظ فیصلہ کے قابل ہیں، ایک پاک وصاف کرنا جس کو قرآن پاک نے تزکیہ کہا ہے اور دوسرا حکمت۔

(۱) تزکیہ کے لفظی معنی پاک وصاف کرنا، نکھارنا، میل کچیل دور کرنا ہیں، قرآن پاک نے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کیا ہے کہ نفسِ انسانی کو ہر قسم کی نجاستوں اور آلودگیوں سے نکھار کر صاف ستھرا کیا جائے، یعنی اس آئینہ کے زنگ کو دور کر کے اس میں صیقل اور جلا پیدا کر دی جائے سورۂ والشمس میں ہے۔

﴿وَ نَفۡسٍ وَّ مَا سَوّٰىہَا ○ فَاَلۡہَمَہَا فُجُوۡرَہَا وَ تَقۡوٰىہَا ○ قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰىہَا ○ وَ قَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰىہَا﴾ (شمس ۷. ۱۰)

''قسم ہے نفس کی اور جیسا اس کو ٹھیک کیا پھر اس میں اس کی بدی اور نیکی الہام کر دی بے شبہ جس نے اس کو صاف ستھرا بنایا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اس کو مٹی میں ملا دیا وہ ناکام رہا۔''

دوسری جگہ ہے۔

﴿قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَکّٰی ○ وَ ذَکَرَ اسۡمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی ○﴾ (الاعلیٰ : ۱۳. ۱۴)

''بے شبہ وہ جیتا جس نے اپنے کو پاک وصاف کیا اور اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی۔''

ایک جگہ اسلام کی دعوت کے نتیجہ کو تزکیہ اور تزکی کے لفظ سے ادا کیا ہے۔

﴿عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤی ○ اَنۡ جَآءَہُ الۡاَعۡمٰی ○ وَ مَا یُدۡرِیۡکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰۤی ○ اَوۡ یَذَّکَّرُ فَتَنۡفَعَہُ الذِّکۡرٰی ○﴾ (عبس : ۱. ۴)

''پیغمبر نے تیوری چڑھائی اور منہ موڑا کہ اس کے پاس وہ اندھا آیا اور تجھے کیا خبر ہے شاید کہ وہ سنور جاتا یا وہ سوچتا تو تیرا سمجھانا اس کے کام آتا۔''

---

(۱) ابن حنبل جلد ۱ صفحہ ۲۰۲ و مستدرک حاکم حیدر آباد جلد ۲ صفحہ ۳۱۰ و ابن ہشام ذکر واقعۂ ہجرت۔

(۲) صحیح بخاری کتاب الوحی و کتاب الجہاد: ۱۲۔

ان آیتوں سے اندازہ ہوگا کہ قرآن پاک میں ''تزکیہ'' کا مفہوم کیا ہے جس کو اس نے پیغمبرِ اسلام علیہ السلام کی خاص خصوصیت قرار دی ہے' اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ وہ نفوسِ انسانی کو جلا دیں' ان کو برائیوں اور نجاستوں کی آلودگیوں سے پاک کریں اور ان کے اخلاق و اعمال کو درست اور صاف ستھرا بنائیں۔ چنانچہ جو واقعات اوپر بیان کیے گئے ان سے ثابت ہوتا ہے کہ دوست اور دشمن دونوں آپ ؐ کی اس خصوصیت کے قائل تھے۔

(۲) حکمت: اس کے بعد دوسرا لفظ حکمت کا ہے' گو اس لفظ کی پوری تشریح اس سے پہلے چوتھے حصہ میں کی جا چکی ہے' مگر اس موقع کے لحاظ سے یہ کہنا ہے کہ حکمت کا لفظ قرآن پاک میں جہاں اس علم و عرفان کے معنی میں ہے' جو نورِ الٰہی کی صورت میں نبی کے سینہ میں ودیعت رکھا جاتا ہے اور جس کے آثار و مظاہر رسول کی زبان سے کبھی مصالح و اسرار اور کبھی سنن و احکام کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں' وہیں اس کا دوسرا اطلاق اس علم و عرفان کے ان عملی آثار و نتائج پر بھی ہوتا ہے جن میں بڑا حصہ اخلاقی تعلیمات کا ہے۔ قرآن میں دو موقعوں پر یہ بتایا گیا ہے کہ اس دوسرے معنی کی حکمت میں کون کون باتیں داخل ہیں' سورۂ بنی اسرائیل میں توحید' والدین کی اطاعت و تعظیم' قرابت داروں اور محتاجوں کی امداد کی نصیحت اور فضول خرچی' بخل' اولاد کشی' بدکاری' کسی بے گناہ کی جان لینے اور یتیموں کے ستانے کی ممانعت کے بعد ایفائے عہد کرنے' ٹھیک ناپنے اور تولنے اور زمین پر اکڑ کر نہ چلنے کی تاکید کی گئی ہے' اس کے بعد ارشاد ہے:

﴿ذٰلِکَ مِمَّآ اَوْحٰٓی اِلَیْکَ رَبُّکَ مِنَ الْحِکْمَةِ﴾ (بنی اسرائیل : ۳۹)

''یہ حکمت کی ان باتوں میں ہے جن کو تیرے رب نے تجھ پر وحی کیا۔''

سورۂ لقمان میں ہے کہ

﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِکْمَةَ اَنِ اشْکُرْ لِلّٰهِ﴾ (لقمان: ۱۲)

''اور ہم نے لقمان کو حکمت کی باتیں سکھائیں کہ خدا کا شکر ادا کر۔''

اس کے بعد حکمت کی ان باتوں کی مزید تشریح کی گئی ہے کہ ''کسی کو خدا کا شریک نہ بنا' والدین کے ساتھ مہربانی سے پیش آ' نماز پڑھا کر' لوگوں کو بھلی بات کرنے کو کہہ اور بری بات سے باز رکھ' مصیبتوں میں استواری اور مضبوطی دکھا۔ مغرور نہ بن' زمین پر اکڑ کر نہ چل' نیچی آواز میں باتیں کر' ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ قرآن کی اصطلاح میں ان فطری امورِ خیر کو بھی جن کا خیر ہونا فطرتہً تمام قوموں اور مذہبوں میں مسلم ہے اور جن کو دوسرے معنی میں اخلاق کہہ سکتے ہیں ''حکمت'' کہا گیا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں اخلاق کا مرتبہ اور پایہ یہ ہے کہ ان کو ''حکمت'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے' اور قرآن پاک کے اس اظہارِ حقیقت سے کہ وحیِ محمدی کتاب اور حکمت دونوں پر برابر مشتمل ہے۔ یہ راز ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں عبادات اور دوسرے احکام کو جو اہمیت حاصل ہے اس

سے کم اخلاق کی اہمیت اس کی نگاہ میں نہیں' خود قرآن پاک نے اس کی تصریح کی ہے' فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَ اسْجُدُوْا وَ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَ افْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (حج : ۷۷)

''اے ایمان والو! رکوع کرو' سجدہ کرو' اپنے رب کو پوجو' اور نیکی کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔''

گویا ایمان کی روح کے بعد دعوتِ محمدی کے جسم کے دو بازو ہیں' ایک عبادت اور دوسرا اخلاق' ایک خالق کا حق اور دوسرا مخلوق کا اور انہی کے مجموعہ کا نام ''اسلام'' ہے۔

حقوقِ عباد کی اہمیت

ایک اور نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تعلیمِ محمدی نے اخلاق کی اہمیت کو عبادات سے بھی زیادہ بڑھا دیا ہے' اخلاق حقوقِ عباد' یعنی باہم انسانوں کے معاملات اور تعلقات کا نام ہے اور عبادات' حقوق اللہ یعنی خدا کے فرائض ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو ارحم الراحمین ہیں اور جس کی رحمت کا دروازہ کسی نیک و بد پر بند نہیں ہے شرک اور کفر کے سوا ہر گناہ کو اپنے ارادہ اور مشیت کے مطابق معافی کے قابل قرار دیا ہے۔ مگر حقوقِ عباد یعنی باہم انسانوں کے خلاقی فرائض کی کوتاہی اور تقصیر کی معافی خدا نے اپنے ہاتھ میں نہیں بلکہ ان بندوں کے ہاتھوں میں رکھی ہے جن کے حق میں وہ ظلم اور تعدی ہوئی ہے اور ظاہر ہے کہ ان سے اس رحم و کرم کی توقع نہیں ہو سکتی جو اس ارحم الراحمین کی بے نیاز ذات سے ہے' اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جس بھائی نے دوسرے بھائی پر کوئی ظلم کیا ہو تو اس (ظالم بھائی) کو چاہیے کہ اسی دنیا میں وہ اس (مظلوم بھائی) سے اس کو معاف کرا لے' ورنہ وہاں تاوان ادا کرنے کے لیے کسی کے پاس کوئی درہم یا دینار نہ ہوگا' صرف اعمال ہوں گے' ظالم کی نیکیاں مظلوم کو مل جائیں گی اور نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں ظالم کے نامۂ اعمال میں لکھ دی جائیں گی۔''[1] ایک اور حدیث میں ہے کہ قیامت میں نامۂ اعمال کی تین فردیں ہوں گی' ایک وہ جس کی کوئی پروا خدا نہ کرے گا۔ دوسری وہ جس میں سے خدا ایک حرف کو بھی نہ چھوڑے گا اور تیسری وہ جس میں سے کچھ نہ معاف فرمائے گا۔ جس فرد کے گناہ معاف نہ ہوں گے وہ شرک ہے اور جس فرد کی کوئی پروا اس کو نہ ہوگی تو وہ ظلم ہے جو انسان نے خود اپنے اوپر کیا ہے اور جس کا معاملہ خود اس بندہ اور اس کے خدا کے درمیان ہے' جیسے اس نے روزہ نہ رکھا ہو یا نماز نہ پڑھی ہو تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا اس کے اس فرد کے گناہ کو معاف کر دے گا اور بخش دے گا۔ لیکن وہ فرد جس کا ایک حرف بھی چھوٹ نہیں سکتا وہ ظلم ہے جو ایک بندہ نے دوسرے بندہ پر کیا ہے۔'' (مسند احمد و حاکم عن عائشہ) اس سے معلوم ہوا کہ معاملاتِ انسانی میں جو تجاوز اور ظلم ہوگا۔ اس کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔[2] چنانچہ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حج کی فرضیت اس وقت

(۱) صحیح بخاری کتاب الرقاق باب القصاص یوم القیامۃ ص ۹۶۷۔

(۲) یہ اصولِ فقہ کا مسئلہ ہے دیکھو ہدایہ کتاب الحج ص ۲۱۳ مرتبہ مولانا عبدالحی مرحوم۔

تک بندہ پر عائد نہیں کی ہے جب تک وہ اپنے اہل وعیال کے نفقہ کا پورا سامان نہ کر لے اور زکوٰۃ بندہ کے اسی مال میں فرض کی ہے جو اس کے اور اس کے اہل وعیال کے مصارف سے زیادہ ہو یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنا حق اس وقت تک بندہ پر واجب نہیں کیا جب تک وہ بندوں کے حقوق سے عہدہ برآ نہ ہو لیا۔

اسلام کے ارکانِ پنجگانہ اور اخلاق

بعض ان حدیثوں کی بنا پر جن میں اسلام کی عمارت کو ایمان کے بعد نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے چار ستونوں پر قائم بتایا گیا ہے، بظاہر یہ غلط فہمی پیدا ہوئی ہے کہ اسلام کی عمارت میں اخلاقِ حسنہ کو کوئی جگہ ہی نہیں دی گئی ہے اور بے سمجھ واعظوں کی غلط بیانی سے اس غلط فہمی میں اور اضافہ ہو گیا ہے حالانکہ جیسا کہ عبادات کے شروع میں ہم یہ کہہ چکے ہیں کہ دوسرے اہم مقاصد کے علاوہ ان عبادات سے ایک مقصد انسان کے اخلاقِ حسنہ کی تربیت اور تکمیل ہے۔ قرآن پاک میں یہ لفظ ہر جگہ نمایاں طریقہ سے واضح کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ نماز کا ایک فائدہ اس نے یہ بتایا ہے کہ وہ بری باتوں سے باز رکھتی ہے، روزہ کی نسبت بتایا ہے کہ وہ تقویٰ کی تعلیم دیتا ہے، زکوٰۃ سر تا پا انسانی ہمدردی اور غم خواری کا سبق ہے اور حج بھی مختلف طریقوں سے ہماری اخلاقی اصلاح و ترقی کا ذریعہ اور اپنی اور دوسروں کی امداد کا وسیلہ ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے ان چاروں ارکان کے نام الگ الگ جو کچھ ہوں مگر ان کے بنیادی مقاصد میں اخلاقی تعلیم کا راز مضمر ہے اگر ان عبادات سے یہ روحانی اور اخلاقی ثمرہ ظاہر نہ ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ احکامِ الٰہی کی محض لفظی تعمیل اور عبادت کے جوہر و معنی سے یکسر خالی اور معرا ہیں، وہ درخت ہیں جن میں پھل نہیں، وہ پھول ہیں جن میں خوشبو نہیں، وہ قالب ہیں جن میں روح نہیں۔ قرآنِ پاک اور تعلیمِ نبوی کے جو اشارات اس باب میں ہیں، حضراتِ صوفیہ نے اپنی تالیفات میں ان کی پوری تشریح کر دی ہے۔

امام غزالی احیاء العلوم میں لکھتے ہیں:

”خدا فرماتا ہے کہ نماز کو میری یاد کے لیے کھڑی کرو اور فرمایا کہ بھولنے والوں میں نہ ہو اور فرمایا کہ نشہ کی حالت میں اس وقت تک نماز نہ پڑھو جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ تم کیا کہہ رہے ہو، کتنے نمازی ہیں جنہوں نے گو شراب نہیں پی مگر جب وہ نماز پڑھتے ہیں تو نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جو شخص دو رکعت بھی نماز ایسی ادا کرے جن میں کسی دنیاوی چیز کا دھیان نہ آوے تو خدا اس کے گناہ کو معاف کر دے گا، پھر فرمایا کہ نماز عاجزی، فروتنی، زاری، دردمندی اور شرمندگی کا نام ہے۔ اور یہ کہ ہاتھ باندھ کر کہو کہ ”اے میرے اللہ“! جس نے یہ بات نہیں پیدا کی، اس کی نماز ناقص ہے اور اگلی کتابوں میں ہے کہ ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ہر ایک نماز قبول نہیں کرتا۔ میں اس کی نماز قبول کرتا ہوں جو میری بڑائی کے سامنے سرنگوں ہے۔ میرے بندوں پر اپنی بڑائی نہیں جتاتا اور جو بھوکے محتاج کو میرے لیے کھانا کھلاتا ہے۔“ اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”نماز اسی لیے فرض کی گئی اور

اسی لیے حج کے ارکان بنائے گئے تا کہ خدا کی یاد کی جائے۔'' تو اگر دل میں یہ کیفیت پیدا نہ ہو جو مقصود ہے تو اس یادِ الٰہی کی قدر و قیمت کیا ہے حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ''جس کی نماز اس کو برائی اور بدی سے نہ روکے تو ایسی نماز اس کو خدا سے اور دور کر دیتی ہے۔''(۱)

اس اخیر حدیث کو ابن جریر، ابن ابی حاتم اور دوسرے اہل تفسیر محدثوں نے اپنی کتابوں میں بسند ذکر کیا ہے اور حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر (سورۂ عنکبوت) میں ان تمام روایتوں کو یکجا کر دیا ہے۔ اس حدیث کی دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ ''جس کو اس کی نماز برائی اور بدی سے باز نہ رکھے اس کی نماز ہی نہیں۔''(۲) اسی قسم کے الفاظ روزوں کے متعلق آپ ﷺ نے فرمائے ارشاد ہوا کہ ''روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کو نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔''(۳) ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ عبادات کا ایک اہم مقصد اخلاق کا تزکیہ بھی ہے۔

اخلاقِ حسنہ اور ایمان

اس سے بھی زیادہ مقدم یہ بات ہے کہ ایمان جو گو مذہب کا اصل الاصول ہے لیکن اس بنا پر کہ وہ دل کے اندر کی بات ہے جس کو کوئی دوسرا جانتا نہیں اور زبان سے ظاہری اقرار ہر شخص کر سکتا ہے۔ اس لیے اس ایمان کی پہچان اس کے نتائج و آثار یعنی اخلاقِ حسنہ کو قرار دیا گیا ہے، چنانچہ سورۂ مومنون میں عبادات کے ساتھ ساتھ اخلاق کو بھی اہلِ ایمان کی ان ضروری صفات میں گنایا گیا ہے جن پر ان کی کامیابی کا مدار ہے۔ فرمایا:

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ○ وَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ○ وَ الَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّکٰوةِ فَاعِلُوْنَ ○ وَ الَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ○ ...... وَ الَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ○ وَ الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ○﴾

(مؤمنون : ۱۔ ۵ ...... ۸۔ ۹)

''بے شبہ وہ ایمان والے کامیاب ہوئے جو اپنی نماز میں خضوع و خشوع کرتے ہیں اور جو نکمی بات پر دھیان نہیں کرتے اور جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ...... اور جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کا لحاظ رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔''

ان آیتوں میں اس ایمان کی کامیابی جن اوصاف کا نتیجہ بتائی گئی ہے، ان میں وقار و تمکنت (لغویات سے اعراض) فیاضی (زکوٰۃ) پاک دامنی اور ایفائے عہد کو خاص رتبہ دیا گیا ہے۔

---

(۱) جلد اول باب فضیلۃ الخشوع ۱۲۔

(۲) تفسیر ابن کثیر سورۂ عنکبوت، آیت مذکورہ ۱۲۔

(۳) صحیح بخاری و جامع ترمذی و ابوداؤد و ابن ماجہ، کتاب الصوم ۱۲۔

اخلاقِ حسنہ اور تقویٰ

اسلام کی اصطلاح میں انسان کی اس قلبی کیفیت کا نام جو ہر قسم کی نیکیوں کی محرک ہے، تقویٰ ہے، وحیِ محمدی نے تصریح کر دی ہے کہ تقویٰ والے لوگ وہی ہیں جن کے یہ اوصاف ہیں۔

﴿لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِیّٖنَ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنَ وَ ابْنَ السَّبِیْلِ وَ السَّآئِلِیْنَ وَ فِی الرِّقَابِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَ الصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِیْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ (بقرہ : ۱۷۷)

”نیکی یہی نہیں ہے کہ تم نماز میں اپنا منہ پورب یا پچھم کی طرف کرو بلکہ اصل نیکی اس کی ہے جو خدا پر، قیامت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا اور مال کی خواہش کے باوجود (یا خدا کی محبت کے سبب سے) اپنا مال رشتہ داروں کو، یتیموں کو، غریبوں کو، مسافر کو، مانگنے والوں کو اور غلاموں کے آزاد کرنے میں دیا اور نماز ادا کرتا رہا اور زکوٰۃ دیتا رہا اور جو وعدہ کر کے اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہیں اور جو مصیبت تکلیف اور لڑائی میں ثابت قدم رہتے ہیں، وہی ہیں جو راست باز ہیں اور یہی تقویٰ والے ہیں۔“

اس سے ظاہر ہوا کہ راست بازی اور تقویٰ کا پہلا نتیجہ جس طرح ایمان ہے، اسی طرح اس کا دوسرا لازمی نتیجہ اخلاق کے بہترین اوصاف فیاضی، ایفائے عہد اور صبر و ثبات وغیرہ بھی ہیں۔

اخلاقِ حسنہ اور خدا کے نیک بندہ ہونے کا شرف

محمد رسول اللہ ﷺ کی پاک تعلیم میں خدا کے نیک اور مقبول بندے وہی قرار دیے گئے جن کے اخلاق بھی اچھے ہوں اور وہی باتیں خدا کے نزدیک ان کے مقبول ہونے کی نشانی ہیں، چنانچہ سورۂ فرقان میں ارشاد ہوا:

﴿وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝ وَ الَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِیَامًا ۝ وَ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ۝ وَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَ لَمْ یَقْتُرُوْا وَ كَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝ وَ الَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَ لَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لَا یَزْنُوْنَ وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ یَلْقَ اَثَامًا ۝ ..... وَ الَّذِیْنَ لَا یَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝ وَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا صُمًّا وَّ عُمْیَانًا ۝ وَ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا

مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا○﴾ (فرقان : ۶۳. ۶۸ ...... ۷۲. ۷۴)

''اور رحم والے خدا کے بندے وہ ہیں جو زمین پر دبے پاؤں چلتے ہیں اور جب ناسمجھ لوگ ان سے بات کریں تو وہ سلام کہیں اور جو اپنے پروردگار کی عبادت کی خاطر قیام اور سجدہ میں رات گزارتے ہیں اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم سے جہنم کا عذاب دور کر' کہ اس کا عذاب بڑا تاوان ہے اور جہنم کا برا ٹھکانا اور مقام ہے اور جو خرچ جب کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کریں اور نہ تنگی کریں بلکہ ان دونوں کے بیچ سے وہ سیدھے گزریں۔ اور جو خدا کے ساتھ کسی اور خدا کو نہیں پکارتے اور جو کسی جان کا بے گناہ خون نہیں کرتے جس کو خدا نے منع کیا ہے اور نہ بدکاری کرتے ہیں کہ جو ایسا کرے گا وہ گناہ سے پیوستہ ہوگا۔۔۔۔۔اور جو جھوٹے کام میں شامل نہیں ہوتے اور جب کبھی لغوبات پر گزرتے ہیں تو سنجیدگی اور وقار سے گزر جاتے ہیں اور جب خدا کی نشانیاں ان کو سنائی جائیں تو وہ اندھے اور بہرے نہ ہو پڑیں اور یہ دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو ہمارے بیوی بچوں سے آنکھ کی ٹھنڈک بخش اور ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا بنا۔''

دیکھو کہ ایک ایمان کی حقیقت میں عفو ودرگزر و میانہ روی اور قتل وخون ریزی اور بدکاری نہ کرنا اور مکروزور میں شریک نہ ہونا وغیرہ اخلاق کے کتنے مظاہر پوشیدہ ہیں۔

اہلِ ایمان کے اخلاقی اوصاف

وہ لوگ جو خدا کے پیارے اور مقبول بندے ہیں' محمد رسول اللہ ﷺ کی زبانی ان کے اخلاقی اوصاف یہ بیان ہوئے ہیں۔

﴿وَ عَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ○ وَ الَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓىِٕرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ یَغْفِرُوْنَ○ وَ الَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَیْنَهُمْ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ○ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْیُ هُمْ یَنْتَصِرُوْنَ○ وَ جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ○ وَ لَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓىِٕكَ مَا عَلَیْهِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ○ اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَى الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ○ وَ لَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ○﴾ (شوری : ۳۶ تا ۴۳)

''اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور جو غصہ کی حالت میں معاف کرتے ہیں اور اپنے پروردگار کی پکار کا جواب دیتے

ہیں، نماز ادا کرتے ہیں اور ان کے کام باہم مشورہ سے ہوتے ہیں، اور ہم نے ان کو جو دیا ہے اس میں سے کچھ خدا کی راہ میں دیتے ہیں اور جب ان پر چڑھائی ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے تو جو کوئی معاف کر دے اور نیکی کرے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے، وہ ظلم کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا اور اگر کوئی مظلوم ہو کر بدلہ لے لے تو اس پر کوئی ملامت نہیں۔ ملامت تو ان پر ہے، جو لوگوں پر از خود ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق فساد مچاتے ہیں ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے اور بے شبہ جو (مظلوم ہونے پر بھی) ظالم کو معاف کر دے اور سہ لے تو یہ ہمت کے کام ہیں۔''

﴿اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ○ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَ الْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ○﴾ (آل عمران: ۱۳۳۔۱۳۴)

''جنت ان پرہیز گاروں کے لیے تیار کی گئی ہے جو خوشی اور تکلیف دونوں حالتوں میں خدا کی راہ میں کچھ خرچ کرتے ہیں، اور جو غصہ کو دباتے ہیں اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں اور خدا اچھے کام کرنے والے کو پیار کرتا ہے۔''

﴿اُولٰٓئِکَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَ یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَ قَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَ لَکُمْ اَعْمَالُکُمْ سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ لَا نَبْتَغِی الْجٰهِلِیْنَ﴾ (القصص: ۵۴۔۵۵)

''یہ وہ ہیں جن کو دہرا ثواب ملے گا اس لیے کہ انہوں نے صبر کیا اور وہ برائی کو بھلائی سے دور کرتے ہیں اور جو ہم نے دیا اس سے کچھ خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور جب کوئی بے ہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے کنارہ کر لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارا عمل اور تمہارے لیے تمہارا عمل ہے تم سلامت رہو، ہم ناسمجھوں کو نہیں چاہتے۔''

﴿وَ یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْکِیْنًا وَّ یَتِیْمًا وَّ اَسِیْرًا﴾ (دہر: ۸)

''اور کھانے کی خود ضرورت ہوتے ہوئے مسکین، یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں۔''

ان آیتوں کی اور اس قسم کی دوسری آیتوں کی جو تشریح آنحضرت ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے فرمائی وہ احادیث میں محفوظ ہے، ہم ان حدیثوں کو مختلف عنوانوں کے نیچے یہاں لکھتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ رسول اللہ ﷺ کے تعلیمی نصاب میں اخلاق کے سبق کی کیا اہمیت اور کیا رتبہ ہے:

اخلاقِ حسنہ کا درجہ اسلام میں

اسلام میں اخلاق کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ اس سے ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ نماز میں جو دعا مانگتے تھے اس کا ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا۔

((وَ اهْدِنِی لِاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ لَا یَهْدِیْ لِاَحْسَنِهَا اِلَّا اَنْتَ وَ اصْرِفْ عَنِّی سَیِّئَاتِهَا لَا یَصْرِفُ عَنِّی سَیِّئَاتِهَا اِلَّا اَنْتَ)) (مسلم باب الدعاء فی الصلوٰۃ)

''اور اے میرے خدا! تو مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کی راہنمائی کر کہ تیرے سوا کوئی بہتر سے بہتر اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا اور برے اخلاق کو مجھ سے پھیر دے اور ان کو کوئی نہیں پھیر سکتا' لیکن تو۔''

ان الفاظ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ایک پیغمبر اپنے تقرب اور استجابت کے بہترین موقع پر بارگاہِ الٰہی سے جو چیز مانگتا ہے' وہ حسنِ اخلاق ہے۔

ایمان سے بڑھ کر اسلام میں کوئی چیز نہیں لیکن اس کی تکمیل بھی اخلاق ہی سے ممکن ہے' فرمایا:

((اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا))

''مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے۔''

یہ حدیث ترمذی' ابن حنبل' ابوداؤد' حاکم اور ابن حبان میں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ایمان کے کمال کا معیار جس چیز کو ٹھہرایا گیا ہے وہ حسنِ اخلاق ہے کہ یہی وہ پھل ہے جس سے ایمان کے درخت کی پہچان ہوتی ہے۔

اسلام میں نماز اور روزہ کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے لیکن اخلاقِ حسنہ کو بھی ان کی قائم مقامی کا شرف کبھی کبھی حاصل ہو جاتا ہے' ارشاد ہوا:

((اِنَّ الرَّجُلَ لَیُدْرِکُ بِحُسْنِ خُلُقِهٖ دَرَجَةَ قَائِمِ اللَّیْلِ وَ صَوْمِ النَّهَارِ))

''انسان حسنِ اخلاق سے وہ درجہ پا سکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔''

یہ حدیث چند ہم معنی لفظوں کے الٹ پھیر سے ابوداؤد' ابن حنبل' حاکم' ابن حبان اور طبرانی میں ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نفل نمازوں میں رات بھر کی شب بیداری اور نفل روزوں میں دن بھر کی بھوک پیاس سے جو درجہ حاصل ہو سکتا ہے وہی درجہ حسنِ خلق سے بھی حاصل ہو سکتا ہے حسنِ اخلاق کی یہ حیثیت اس کو یک گونہ عبادات کی کثرت سے بڑھا دیتی ہے۔

((خِیَارُکُمْ اَحْسَنُکُمْ اَخْلَاقًا)) (بخاری کتاب الادب)

''تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔''

ایک اور حدیث میں ہے:

((مَامِنْ شَیْءٍ یُوْضَعُ فِی الْمِیْزَانِ اَثْقَلُ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ فَاِنَّ صَاحِبَ حُسْنِ الْخُلُقِ لَیَبْلُغُ بِهٖ دَرَجَه صَاحِبِ الصَّوْمِ وَ الصَّلٰوةِ))

(''قیامت کی) ترازو میں حسن خلق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہ ہوگی کہ حسنِ اخلاق والا اپنے حسنِ خلق

سے ہمیشہ کے روزہ دار اور نمازی کا درجہ حاصل کرسکتا ہے۔“

یہ حدیث ترمذی میں انہی الفاظ کے ساتھ ہے‘ لیکن حدیث کی دوسری کتابوں (حاکم‘ ابن حبان‘ ابن حنبل ابوداؤد) میں مختصراً صرف پہلا ٹکڑا ہے یعنی یہ کہ ”حسنِ اخلاق سے زیادہ بھاری چیز ترازو میں نہیں۔“ اس حدیثِ نبوی نے پوری طرح واضح کردیا کہ اسلام کی میزان میں حسنِ اخلاق سے زیادہ گراں کوئی چیز نہیں‘ ایک اور حدیث میں ہے کہ بندہ کو خدا کی طرف سے جو کچھ ملا ہے اس میں حسنِ اخلاق کا عطیہ سب سے بڑھ کر ہے۔

((خَيْرٌ مَا اَعْطَى النَّاسَ خُلُقَ حَسَنٍ))

”لوگوں کو قدرتِ الٰہی کی طرف سے جو چیزیں عطا ہوئیں ان میں سب سے بہتر اچھے اخلاق ہیں۔“

مختلف الفاظ کے ساتھ یہ حدیث حاکم‘ نسائی‘ ابن حنبل‘ طبرانی اور ابن ابی شیبہ میں ہے‘ اس بشارت نے اخلاقِ حسنہ کی نعمت کو تمام انسانی نعمتوں سے بالاتر بنادیا‘ ایک اور حدیث میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((اَحَبَّ عِبَادَ اللّٰهِ اِلَى اللّٰهِ اَحْسَنَهُمْ اَخْلَاقًا)) (طبرانی)

”اللہ کے بندوں میں اللہ کا سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔“

اس سے معلوم ہوا کہ حسنِ خلق خدا کی محبت کا ذریعہ ہے اور دراصل رسول کی محبت کا بھی یہی ذریعہ ہے فرمایا:

((اِنَّ اَحَبَّكُمْ اِلَيَّ وَ اَقْرَبُكُمْ مِنِّى فِى الْاٰخِرَةِ مَجَالِسُ مَحَاسَنُكُمْ اَخْلَاقًا وَ اَنَّ اَبْغَضَكُمْ اِلَيَّ وَ اَبْعُدُكُمْ مِنِّىْ فِى الْاٰخِرَةِ اَسَاوِيُكُمْ اَخْلَاقًا))

”تم میں میرا سب سے پیارا اور نشست میں مجھ سے سب سے نزدیک وہ ہیں جو تم میں خوش خلق ہیں اور مجھے ناپسند اور قیامت میں مجھ سے دور وہ ہوں گے جو تم میں بداخلاق ہیں۔“ (۱)

آنحضرت ﷺ کے عہدِ مبارک میں دو صحابی بیویاں تھیں‘ ایک رات بھر نماز پڑھتیں‘ دن کے روزہ رکھتیں اور صدقہ دیتیں‘ مگر اپنی زبان درازی سے پڑوسیوں کا دم ناک میں کیے رکھتی تھیں‘ دوسری بیوی صرف فرض نماز پڑھتیں اور غریبوں کو چند کپڑے بانٹ دیتیں مگر کسی کو تکلیف نہ دیتیں۔ آنحضرت ﷺ سے ان دونوں کی نسبت پوچھا گیا تو آپ ؐ نے پہلی کی نسبت فرمایا کہ ”اس میں کوئی نیکی نہیں وہ اپنی بدخلقی کی سزا بھگتے گی“ اور دوسری کی نسبت فرمایا کہ ”وہ جنتی ہوگی۔“ (۲) ان دونوں بیویوں کی سیرتوں کے جو مختلف نتیجے پیغمبر اسلام علیہ السلام کی زبانِ فیض ترجمان سے ظاہر ہوئے ہیں وہ اسلام میں اخلاق کی حیثیت کو پوری طرح نمایاں کردیتے ہیں۔

حضرت براء بن عازب ؓ کہتے ہیں کہ ایک بدوی نے آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کی کہ مجھے وہ کام سکھایئے جو مجھے جنت میں لیجائے۔ فرمایا ”انسان کو غلامی سے آزاد کر‘ انسان کی گردن کو قرض کے بندھن سے

(۱) یہ تمام حدیثیں کنز العمال جلد ثانی‘ کتاب الاخلاق باب اول سے ماخوذ ہیں۔

(۲) ادب المفرد امام بخاری باب من لایوذی جارہ۔

چھڑا اور ظالم رشتہ دار کا ہاتھ پکڑ اگر تو یہ نہ کر سکے تو بھوکے کو کھلا اور پیاسے کو پلا، اور نیکی بتا اور برائی سے روک، اگر یہ بھی نہ کر سکے تو بھلائی کے سوا اپنی زبان روک (۱) غور کیجیے کہ یہ حدیث اخلاقی عظمت کو کہاں تک بڑھا رہی ہے۔

ایمان کے اوصاف ولوازم

ان کے علاوہ کثرت سے ایسی حدیثیں ہیں جن میں آنحضرت ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ فلاں فلاں اوصاف واخلاق، ایمان کے لوازم اور خصوصیات ہیں، جس قدر ان لوازم اور خصوصیات میں زیادتی اور کمی ہوگی، گویا اسی قدر اس ایمان کے منشا میں زیادتی وکمی ہوگی یعنی ہمارے یہ ظاہری اخلاق ہماری اندرونی ایمانی کیفیت کا معیار اور پیمانہ ہیں۔ ہمارے دل کے اندر کا ایمان ہمارے گھر کا چراغ زیرِ دامن ہے جس کی چمک دمک اور روشنی کا اندازہ اس کی باہر نکلنے والی شعاعوں سے کیا جائے گا۔ آپ نے فرمایا:

(۱) ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں، جن میں سے ایک حیا ہے۔

(۲) ایمان کی بہت سی شاخیں ہیں جن میں سب سے بڑھ کر توحید کا اقرار ہے اور سب سے کم درجہ یہ ہے کہ تم راستہ سے کسی تکلیف کی چیز کو ہٹا دو (تا کہ تمہارے دوسرے بھائی کو تکلیف نہ ہو)

(۳) جس میں تین باتیں ہوں، اس نے ایمان کا مزہ پایا۔ جس کو خدا اور اس کا رسول سب سے پیارا ہو، جو دوسرے کو صرف خدا کے لیے پیار کرے، اور جس کو ایمان کے بعد پھر کفر میں مبتلا ہو جانے سے اتنا ہی دکھ ہو جتنا آگ میں پڑنے سے۔

(۴) جس میں یہ تین باتیں ہوں اس نے ایمان کا مزہ پایا۔ حق بات کے سامنے جھگڑے سے باز رہنا۔ مزاحمت کے باوجود جھوٹ نہ بولنا اور یقین کرنا کہ جو کچھ پیش آیا وہ ہٹ نہیں سکتا تھا۔

(۵) تین باتیں ایمان کا جز ہیں، مفلسی میں بھی خدا کی راہ میں دینا۔ دنیا میں امن اور سلامتی پھیلانا اور خود اپنے نفس کے مقابلہ میں بھی انصاف کرنا۔

(۶) تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوسکتا ہے جب تک اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔

(۷) مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامت رہیں اور مومن وہ ہے جس پر لوگ اتنا بھروسہ کریں کہ اپنی جان ومال اس کی ضمانت میں دے دیں۔

(۸) ایک شخص آ کر پوچھتا ہے کہ یا رسول اللہ (ﷺ) کون سا اسلام سب سے بہتر ہے؟ فرمایا (بھوکوں کو) کھانا کھلانا۔ اور جانے انجانے ہر ایک کو سلامتی کی دعا دینا (سلام کرنا)۔

(۹) ایک شخص پوچھتا ہے کہ اے خدا کے رسول! اسلام کیا ہے؟ فرمایا اچھی بات بولنا، اور کھانا کھلانا، پھر

(۱) مشکل الآثار امام طحاوی جلد ۲ صفحہ ۲ حیدر آباد دکن۔

پوچھا ایمان کیا ہے؟ فرمایا صبر کرنا اور اخلاقی جوانمردی دکھانا (سماحت)۔

(۱۰) مومن وہ ہے جو دوسروں سے الفت کرتا ہے اور جو نہ دوسرے سے الفت کرتا اور نہ کوئی اس سے الفت کرتا ہے اس میں کوئی بھلائی نہیں۔

(۱۱) مومن نہ تو کسی پر طعن کرتا ہے نہ کسی کو بددعا دیتا ہے اور نہ گالی دیتا ہے اور نہ بدزبان ہوتا ہے۔

(۱۲) ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے' نہ اس پر وہ ظلم کرے اور نہ اس کو گالی دے' جو اپنے کسی بھائی کی مدد میں ہوگا خدا اس کی مدد میں ہوگا' جو کسی مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کرے گا تو خدا اس کی مصیبت دور فرمائے گا۔

(۱۳) مؤمن وہ ہے جس کو لوگ امین سمجھیں' مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ سلامت رہیں' مہاجر وہ ہے جس نے بدی کو چھوڑ دیا ہے۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' کوئی اس وقت تک جنت میں نہیں جاسکتا جب تک اس کا پڑوسی اس کے غصہ سے محفوظ نہ رہا ہو۔

(۱۴) جو صاحبِ ایمان ہے اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔

(۱۵) بے ایمان (منافق) کی پہچان تین ہے' بولے تو جھوٹ بولے۔ وعدہ کرے تو خلاف کرے' اس کو امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے۔ [1]

ان مذکورہ بالا حدیثوں میں سے ایک ایک حدیث پر غور کرنا چاہیے کہ اسلام اور ایمان کا اخلاقی تخیل کتنا اونچا اور کتنا بلند ہے۔

اخلاقِ حسنہ' صفاتِ الٰہی کا سایہ ہیں

لیکن اسلام نے اخلاقِ حسنہ کا اس سے بھی ایک اور بلند تخیل پیش کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اخلاقِ حسنہ درحقیقت صفاتِ الٰہی کا سایہ اور ظل ہیں اور اسی کی صفاتِ کاملہ کے ادنیٰ ترین مظاہر ہیں حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا حسن الخلق خلق اللہ الا عظم۔ (طبرانی) یعنی ''خوش خلقی اللہ تعالیٰ کا خلقِ عظیم ہے''، ہم انہی اخلاق کو اچھا کہتے ہیں جو صفاتِ ربانی کا عکس ہیں اور انہی کو برا کہتے ہیں جو خدا کی صفات کے منافی ہیں۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ خدا کی بعض خاص صفتیں ایسی بھی ہیں جو اسی کے ساتھ مخصوص ہیں اور جن کا تصور بھی دوسرے میں نہیں کیا جاسکتا۔ جیسے اس کا واحد ہونا' خالق ہونا' نیز بعض ایسی پُر جلال صفتیں ہیں جو صرف خدا ہی کو زیبا ہیں جیسے اس کی کبریائی اور بڑائی وغیرہ۔ اس قسم کی صفات کا بندہ میں کمال یہ ہے کہ ان کی مقابل کی صفتیں اس میں پیدا ہوں' خدا

(۱) یہ تمام حدیثیں معتبر و مستند کتب حدیث کی کتاب الایمان میں موجود ہیں' ہم نے ان کو مجمع الفوائد اور کنز العمال جلد اول کتاب الایمان سے لیا ہے کنز العمال میں ہر قسم کی حدیثیں ہیں مگر ہم نے ان کے انتخاب میں مشہور و معتبر حدیثوں کو ترجیح دی ہے۔

کی کبریائی کے مقابلہ میں بندہ میں خاکساری اور تواضع ہو اور خدا کی بلندی کے مقابلہ میں بندہ میں پستی اور فروتنی ہو۔ الغرض اسلام نے انسان کی روحانی تکمیل کا ذریعہ اخلاق کو اسی لیے قرار دیا ہے کہ وہ صفاتِ الٰہی کے انوار کے کسب و فیض کا سبب ہے، ہم جس حد تک اس کسب و فیض میں ترقی کریں گے، ہماری روحانی ترقی کا سلسلہ جاری رہے گا اور یہی ہماری زندگی کی روحانی سیر کی آخری منزل ہے۔ اخلاق کا اس سے بلند تر تخیل ممکن نہیں۔ (۱)

❀❀❀

(۱) ہم نے اسمائے الٰہی کی بحث میں اس اجمال کی پوری تفصیل بیان کر دی ہے دیکھو سیرت جلد چہارم طبع اول صفحات ۳۸۴-۴۰۵۔

اخلاقی معلموں میں آنحضرت ﷺ کا امتیاز

دنیا میں اخلاق کے بڑے بڑے معلم پیدا ہوئے جن کے مکتب میں آ کر بڑی بڑی قوموں نے ادب کا زانوتہ کیا اور آداب و اخلاق کے وہ سبق ان سے حاصل کیے جو سینکڑوں اور ہزاروں برس گزر جانے کے بعد بھی اب تک ان کو یاد ہیں اور سچ یہ ہے کہ آج جہاں کہیں بھی حسن اخلاق کا کوئی نمونہ ہے وہ انہی کے صحیفۂ تعلیم کا ایک ورق ہے۔ مگر ایک تنقیدی نظر یہ بتادے گی کہ ان اخلاقی استادوں میں باہمی نسبت کیا ہے؟ ان کے تعلیمی نصاب کی ترتیب کن کن اصولوں پر مبنی ہے ان میں درس گاہِ عالم کے سب سے آخری معلم علیہ الصلوۃ والتسلیم کو کیا امتیاز حاصل ہے۔

آنحضرت ﷺ سے پہلے نوعِ انسانی کے اخلاقی معلمین کی دو جماعتیں ہیں، ایک وہ جس نے اپنی تعلیم کی بنیاد کسی اُخروی مذہب پر رکھی جیسے عام انبیاء علیہم السلام اور بعض مذہبوں کے بانی، دوسری وہ ہے جس نے اپنے فلسفہ وحکمت اور عقل و دانائی کی بنیاد پر اپنی عمارت کھڑی کی، ہم ان میں اول کو انبیا اور مصلحینِ دین اور دوسری کو حکما کے نام سے تعبیر کر سکتے ہیں، ان دونوں جماعتوں نے اپنے درس و تعلیم کے اصول اور طریقے الگ الگ اختیار کیے۔ پیغمبروں اور مذہب کے بانیوں نے اپنی تعلیمات کا ماخذ ''حکمِ خداوندی'' کو قرار دیا۔ اس حکم و فرمانِ الٰہی کے سوا ان کی تعلیم کی کوئی اور بنیاد نہیں، نہ ان کی تعلیمات میں علت و معلول کا سلسلہ ہے، نہ اخلاق کے دقیق نکتوں کی گرہ کشائی ہے اور نہ ان احکام و تعلیمات کی اخلاقی مصلحتوں اور عقلی حکمتوں کی تصریح ہے۔ دوسرے فریق کی تعلیمات میں علت و معلول کی تحقیق، نفسیاتی خواص کی بحث، اخلاق کی غرض و غایت کی تعیین، قوائے عملی کی تحدید، یہ سب کچھ ہے مگر بحث و نظر سے آگے عمل کا درجہ صفرِ محض ہے، اگر ہے تو بے کیف اور بے لذت مگر۔

یارِ ما ایں دارد و آں نیز ہم

دنیا کے آخری معلم کی تعلیم میں حکمِ خداوندی اور عقلی دقیقہ رسی، فرمانِ الٰہی اور اخلاقی نکتہ وری، امرِ ربانی اور حکمِ فطرت، کتاب اور حکمت دونوں کی آمیزش ہے۔

انبیا اور حکما میں جو اصلی فرق اور امتیاز ہے وہ یہ ہے کہ انبیا کی اخلاقی تعلیمات کے ساتھ ساتھ ان کی معصوم زندگی، ان کے مقدس کارنامے اور ان کے پاک اثرات ہوتے ہیں، جن کا فیض ان کے ہر بنِ مو سے خیر و برکت کی سلسبیل بن کر نکلتا ہے اور پیاسوں کو سیراب کرتا ہے لیکن بلند سے بلند حکیم اور اخلاق کا دانائے رموز جس کی اخلاقی

سخن طرازی' اور نکتہ پروری سے دنیا محوِ حیرت ہے اور جس نے انسان کے ایک ایک اندرونی جذبہ' باطنی قوت اور اخلاقی فطرت کا سراغ لگایا ہے' عمل کے لحاظ سے دیکھو تو اس کی زندگی ایک معمولی بازاری سے ایک انچ بلند نہ ہوگی' وہ گو دوسروں کو روشنی دکھا سکتا ہے' مگر خود تاریکی سے باہر نہیں آتا' وہ دوسروں کی رہنمائی کا مدعی بنتا ہے مگر خود عمل کی راہ میں بھٹکتا پھرتا ہے' وہ رحم و محبت کے طلسمات کے ایک ایک راز سے واقف ہے' مگر غریبوں پر رحم کھانا اور دشمنوں سے محبت کرنا وہ نہیں جانتا' وہ سچائی اور راست بازی پر بہترین خطبہ دے سکتا ہے مگر وہ خود سچا اور راست باز نہیں ہوتا۔

اس واقعہ کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ چونکہ وہ محض زبان یا دماغ ہوتا ہے' دل اور ہاتھ نہیں' اس لیے اس کے منہ کی آواز کسی دل کی لوح پر کوئی نقش نہیں بناتی بلکہ ہوا کے تموج میں مل کر بے نشان ہو جاتی ہے' اور انبیاء علیہم السلام چونکہ جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے بھی ہیں' جو ان کی تعلیم ہے وہی ان کا عمل ہے جو ان کے منہ پر ہے وہی دل میں ہے۔ اس لیے ان کی تعلیم اور صحبت کا فیضان خوش بو بن کر اڑتا اور ہم نشینوں کو معطر بنا دیتا ہے۔ یہی وہ فرق ہے جو انبیا اور حکما یعنی موسیٰ' عیسیٰ' محمد رسول اللہ ﷺ اور سقراط' افلاطون' اور ارسطو میں نمایاں ہے' سقراط اور افلاطون کے مکالمات اور ارسطو کے اخلاقیات پڑھ کر ایک شخص بھی صاحبِ اخلاق نہ بن سکا مگر یہاں قوموں کی قومیں ہیں جو موسیٰ علیہ السلام عیسیٰ علیہ السلام اور محمد رسول اللہ علیہم السلام کی تعلیم و تلقین سے اخلاق کے بڑے بڑے مدارج اور مراتب پر پہنچیں' اور آج زمین کے کرہ پر جہاں کہیں بھی حسنِ اخلاق کی کوئی کرن ہے وہ نبوت ہی کے کسی مطلعِ انوار سے چھن کر نکل رہی ہے۔

مگر اس وصف میں سارے انبیاء علیہم السلام یکساں نہیں ہیں' بلکہ ان کے مختلف مدارج ہیں' ان کی عملی حیثیت کے کامل ہونے کے ساتھ ضرورت یہ ہے کہ ان کے اس درجۂ کمال کی ایک ایک ادا عمل کی صورت میں نمایاں ہو تا کہ ہر ذوق اور رنگ کے رفیق اور اہلِ صحبت اپنی اپنی استعداد کے مطابق ان کی عملی مثالوں سے متاثر ہوں اور پھر وہ روایتوں کے اوراق میں محفوظ رہیں تا کہ بعد کے آنے والے بھی اس نشانِ قدم پر چل کر مقصود کی منزل تک پہنچ سکیں' الغرض ایک کامل و مکمل اور آخری معلم کے لیے حسب ذیل معیاروں پر اترنا ضروری ہے۔

(۱) اس کی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہ ہو۔

(۲) اس کی ہر زبانی تعلیم کے مطابق اس کی عملی مثال بھی سامنے موجود ہو۔

(۳) اس کی اخلاقی زندگی میں یہ جامعیت ہو کہ وہ انسانوں کے ہر کارآمد گروہ کے لیے اپنے اندر اتباع اور پیروی کا سامان رکھتی ہو۔

بے پردہ زندگی

تنقید کے ان معیاروں پر اگر ہم سارے انبیا اور مذہبوں کے بانیوں کی زندگیوں کی جانچیں تو معلوم ہوگا کہ

ان میں سے کسی کی زندگی بھی پیغمبر اسلام علیہ السلام کی حیاتِ پاک کے برابر جامع کمالات نہیں' دنیا کا کوئی پیغمبر یا بانیِ مذہب ایسا نہیں ہے جس کی اخلاقی زندگی کا ہر پہلو ہمارے سامنے اس طرح بے نقاب ہو کہ گویا وہ خود ہمارے سامنے موجود ہے۔ توراۃ کے پیغمبروں میں سے کون سا پیغمبر ہے جس کے اخلاقی کمالات ہمارے علم میں ہیں' ان غیر اخلاقی قصوں کا ذکر فضول ہے جن کو توراۃ کے راویوں نے ان معصوم بزرگوں کے حالات میں شامل کر دیا ہے اور قرآن نے ہر جگہ ان کو ان بے ہودہ الزامات سے پاک اور بری قرار دیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک توراۃ کے ایک ایک پیغمبر پر نگاہ ڈال جاؤ ان کی معصوم زندگی کے حالات کی کتنی سطریں تمہارے سامنے ہیں اور کیا ان کی اخلاقی شکل وصورت کی پوری شبیہ دنیا کے سامنے کبھی موجود رہی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تینتیس برس کی زندگی میں سے صرف تین برس کا حال ہم کو معلوم ہے اور ان تین برسوں کے حالات میں سے بھی معجزات وخوارق کے سوا کوئی اور حال بہت کم معلوم ہے ایسی صورت میں کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی اخلاقی زندگی کا کوئی پہلو پردہ مین نہیں۔

ان انبیاء علیہم السلام کے علاوہ ہندوستان' ایران اور چین کے بانیانِ مذاہب کی اخلاقی زندگیوں کا جائزہ لینا چاہو تو معلوم ہوگا کہ اس کے لیے دنیا میں کوئی سامان ہی موجود نہیں۔ کیونکہ ان کی اخلاقی زندگی کے ہر پہلو پر ناواقفیت کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ صرف اسلام ہی کے ایک معلم کی زندگی ایسی ہے جس کا حرف حرف دنیا میں محفوظ اور سب کو معلوم ہے اور بقول باسورتھ اسمتھ کے کہ ''یہاں (سیرتِ محمدی) پورے دن کی روشنی ہے جن میں محمد کی زندگی کا ہر پہلو روزِ روشن کی طرح نمایاں ہے۔''(۱) آنحضرت ﷺ کا خود یہ حکم تھا کہ میرے ہر قول اور عمل کو ایک سے دوسرے تک پہنچاؤ' محرمانِ راز کو اجازت تھی کہ جو مجھے خلوت میں کرتے دیکھو اس کو جلوت میں برملا بیان کرو جو حجرہ میں کہتے سنو اس کو چھتوں پر چڑھ کر پکار دو الا **فلیبلغ الشاھد الغائب**۔

قول کے ساتھ عمل

اب دوسری حیثیت سے غور کیجیے' ان مقدس ہستیوں کی تعلیم کی اچھائی' اخلاقی احکام کی خوبی اور مواعظ و نصائح کی عمدگی میں کوئی شبہ نہیں لیکن کیا دنیا کو خود ان بزرگوں کے عملی اخلاق کا بھی تجربہ اور علم ہے؟ کوہِ زیتون کے پرتاثیر واعظ (حضرت عیسیٰ) کی معصومانہ باتیں' سچائی اور راست بازی کی نصیحتیں اور لفظی صنائع وبدائع اور دل کش تمثیلوں سے بھری ہوئی تقریریں' دنیا نے سنیں اور ان کی فصاحت اور شیرینی کا مزہ اب تک اس کے کام ودہن میں ہے مگر کیا اس کی آنکھوں نے اس معصوم واعظ کی عملی مثالیں بھی دیکھیں؟ کیا اس سلبی پہلو کے سوا اس کے اخلاق کا کوئی ایجابی پہلو بھی ہمارے سامنے ہے؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ''سب کچھ جو تمہارے پاس ہے جب تک اس کو خدا کی راہ میں لٹا نہ دو' آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہو گے۔''(۲) کیا اس نے اپنا بھی سب کچھ خدا کی راہ میں

---

(۱) باسورتھ سمتھ کی کتاب سیرتِ محمدی ص ۱۰۸۔

(۲) انجیل۔

لٹایا۔ وہ جس نے یہ کہا کہ ''شریروں کا مقابلہ نہ کرو۔'' کیا اس نے خود بھی شریروں کا مقابلہ نہیں کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ''دشمنوں کو بھی پیار کرو'' کیا اس نے بھی کبھی اپنے دشمن کو پیار کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ''تو اپنے پڑوسی کو اپنے سارے جان و مال سے پیار کر'' کیا خود بھی اس کا ایسا ہی عمل تھا؟ وہ جس نے کہا کہ ''اگر تمہارے داہنے گال پر کوئی تھپڑ مارے تو بایاں گال بھی اس کے سامنے کردو'' کیا اس نے خود بھی ایسا کیا۔ وہ جس نے یہ کہا کہ ''تم سے اگر کوئی تمہارا کرتہ مانگے تو اپنی قبا بھی اس کے حوالہ کردو۔'' کیا ایسی فیاضی اس سے خود بھی ظہور میں آئی؟ ہم یہ نہیں کہتے کہ حضرت مسیح میں یہ صفتیں موجود نہ تھیں بلکہ کہنا یہ ہے کہ انجیل نے ان کی اس حیثیت کو محفوظ نہیں رکھا ہے۔

مگر اسلام کے اخلاقی معلم کی شان اس حیثیت سے بھی بلند ہے' اس نے جو کچھ کہا سب سے پہلے اس کو کرکے دکھایا اس کا جو قول تھا وہی اس کا عمل تھا اس نے یہودیوں کو طعنہ دیا کہ

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ (بقرہ : ۴۴)

''کیا اوروں کو نیکی کی بات بتاتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو۔''

اور مسلمانوں کو متنبہ کیا :

﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ﴾ (الصف : ۲. ۳)

''تم کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں بڑی بیزاری ہے اللہ کے یہاں کہ کہو وہ جو نہ کرو۔''

ایک شخص نے آ کرام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے دریافت کیا کہ آنحضرت ﷺ کے اخلاق کیا تھے؟ فرمایا کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا ﴿كان خلقه القران﴾ جو قرآن پاک میں الفاظ کی صورت میں ہے وہی حاملِ قرآن کی سیرت میں بصورتِ عمل تھا۔ اگر غریبوں اور مسکینوں کی امداد و اعانت کا حکم دیا تو پہلے خود اس فرض کو ادا کیا' خود بھوکے رہے اور دوسروں کو کھلایا' اگر آپؐ نے اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کرنے کی نصیحت کی تو پہلے خود اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کیا' کھانے میں زہر دینے والوں سے درگزر کیا' اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیا۔ جنہوں نے آپؐ پر تیر برسائے اور تلواریں چلائیں' مسلح ہو کر بھی کبھی ان پر ہاتھ نہیں اٹھایا' کپڑوں کی شدید ضرورت کے وقت بھی جس نے آپؐ سے کپڑا مانگا خود اپنی چادر اتار کر اس کے حوالہ کردی۔ سیرت کی دوسری جلد میں یہ واقعات پوری شرح و تفصیل کے ساتھ ہم بیان کر چکے ہیں۔ الغرض یہی وجہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ انسانوں کو اپنے ہادیوں اور راہنماؤں کے صرف تعلیمات اور اقوال سناتے ہیں اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں اور مسلمان اپنے پیغمبر کے نہ صرف اقوال و نصائح کو بلکہ اس کے عملی نمونوں اور کارناموں کو بھی پیش کرتے اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں۔ دنیا کے کسی پیغمبر اور بانیِ دین کے صحیفہ نے خود اپنے پیغمبر یا بانی کی اخلاقیات کو تحدی اور اعلان کے ساتھ اس کے ہم عصروں کے سامنے پیش نہیں کیا۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کے صحیفہ نے سب سے آگے بڑھ کر بلا خوف و خطر اپنے داعی اور مبلغ کی زندگی کی اخلاقیت کو خود اس کے معاصرین کے سامنے نقد و تبصرہ کے لیے پیش کیا' فرمایا:

﴿فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِيۡكُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِهٖ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ﴾ (یونس : ۱۶)

(''اے منکرو!) میں تو تمہارے درمیان اس سے پہلے ایک زمانہ بسر کر چکا ہوں' کیا تم نہیں سمجھتے۔''

پھر آپؐ کو خطاب کر کے خود آپؐ سے فرمایا:

﴿اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيۡمٍ﴾ (قلم : ۴)

(''اے محمد!) بے شک تو اخلاق کے بڑے درجہ پر ہے۔''

کامل و مکمل

اخلاقی معلم کے کمال کی ایک اور شرط یہ ہے کہ اس کی تعلیم میں یہ تاثیر ہو کہ وہ دوسروں کو بھی اپنے فیض سے بہرہ مند کر سکے' یعنی وہ خود کامل ہو اور دوسرے ناقصوں کو بھی کامل بناتا ہو' وہ خود پاک ہو اور دوسرے ناپاکوں کو بھی دھو کر پاک وصاف کر دیتا ہو۔ اخلاق کے سارے معلموں کی فہرست پر ایک نظر ڈال جاؤ کہ یہ تکمیل کی شان سب سے زیادہ کس میں تھی؟ کیا اس میں جس کو قدم قدم پر بنی اسرائیل کی سنگ دلی اور کجروی کا گلہ کرنا پڑا ہے' کیا اس میں جس کے پورے گیارہ شاگرد بھی امتحان کے وقت پورے نہ اتر سکے' یا اس میں تھی جس کی نسبت اس کے صحیفۂ وحی نے بار بار اعلان کیا۔

﴿يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيۡهِمۡ وَ يُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَ الۡحِكۡمَةَ﴾ (الجمعة : ۲)

''وہ ان کو خدا کی باتیں سناتا اور ان کو پاک وصاف بناتا اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔''

اس تحدی اور اعلان میں یہ بات خاص لحاظ کے قابل ہے کہ اس میں اسلام کے معلم کی نسبت صرف یہی دعویٰ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو کتاب وحکمت کی باتیں سکھاتا اور خدا کے احکام سناتا ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ ان کو اپنے فیض واثر سے پاک وصاف ومصفی بنا بھی دیتا ہے' وہ ناقصوں کو کامل' گنہگاروں کو نیک' اندھوں کو بینا اور تاریک دلوں کو روشن دل بنا دیتا ہے' چنانچہ جس وقت اس نے اپنی حیات کا کارنامہ ختم کیا' کم از کم ایک لاکھ انسان اس کی تعلیم سے عملاً بہرہ مند ہو چکے تھے' اور وہ عرب جو اخلاق کے پست ترین نقطہ پر تھا' تیئیس برس کے بعد وہ اخلاق کے اس اوجِ کمال پر پہنچا جس کی بلندی تک کوئی ستارہ آج تک نہ پہنچ سکا۔

تعلیم اخلاق کا تنوع

اگر کسی معلم میں تکمیل کی یہ تاثیر بھی ہو' پھر بھی یہ دیکھنا ہے کہ اس عالم کی تکمیل' اور نظم ونسق کے لیے ایک ہی قوت کے انسانوں کی نہیں بلکہ سینکڑوں مختلف قوتوں کے انسانوں کی ضرورت ہے۔ اخلاق کے دوسرے معلمین کی درس گاہوں پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ وہاں صرف ایک فن کے طالب العلم تعلیم پاتے ہیں' حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تربیت گاہ میں فوجی تعلیم کے سوا کوئی فن نمایاں نہیں' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مکتب میں عفو ودرگزر کے سوا

(۱) ابوداؤد باب صلوٰۃ اللیل۔

کوئی اور سبق نہیں، بودھ کے وہار اور خانقاہ میں در بدر بھیک مانگنے والے مرتاض فقیروں کے سوا کوئی اور موجود نہیں۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی درس گاہِ اعظم میں آ کر دیکھو تو معلوم ہو گا کہ یہ ایک عمومی جامعہ ہے جس میں انسانی ترقی ہر وقت نشو ونما پا رہی ہے خود معلم کی ذات ایک پوری یونیورسٹی ہے، جس کے اندر علم وفن کا ہر شعبہ اپنی جگہ پر قائم ہے اور ہر جنس اور ہر مذاق کے طالب العلم آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسبِ کمال کر رہے ہیں۔

آپ کی حیثیت ایک انسان، ایک باپ، ایک شوہر، ایک دوست، ایک خانہ دار، ایک کاروباری تاجر، ایک افسر، ایک حاکم، ایک قاضی، ایک سپہ سالار، ایک بادشاہ، ایک استاد، ایک واعظ، ایک مرشد، ایک زاہد و عابد اور آخر ایک پیغمبر کی نظر آتی ہے۔ یہ تمام انسانی طبقے آپ کے سامنے آ کر زانوئے ادب تہ کرتے ہیں۔ اور اپنے اپنے پیشہ وفن کے مطابق آپ کی تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ مدینۃ النبی کی اس درس گاہِ اعظم کو غور سے دیکھو، جس کی چھت کھجوروں کے پتوں سے اور ستون کھجور کے تنوں سے بنائے گئے تھے، اور جس کا نام مسجدِ نبوی تھا، اس کے الگ الگ گوشوں میں ان انسانی جماعتوں کے الگ الگ درجے کھلے ہوئے ہیں، کہیں ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ جیسے حکمراں روازیر تعلیم ہیں، کہیں طلحہؓ و زبیر و معاویہؓ و سعدؓ بن معاذ و عبداللہ بن زبیرؓ جیسے اربابِ رائے و تدبیر ہیں، کہیں خالدؓ، ابوعبیدہؓ، سعدؓ بن ابی وقاصؓ اور عمرو بن العاصؓ جیسے سپہ سالار ہیں۔ کہیں وہ ہیں جو بعد کو صوبوں کے حکمران، عدالتوں کے قاضی اور قانون کے مقنن بنے، کہیں ان زہاد و عباد کا مجمع ہے جن کے دن روزوں میں اور راتیں نمازوں میں کٹتی تھیں۔ کہیں ابوذرؓ و سلیمان و ابوالدرداءؓ جیسے وہ خرقہ پوش ہیں، جو "مسیح اسلام" کہلاتے تھے، کہیں وہ صفہ والے طالب العلم تھے جو جنگل سے لکڑی لا کر بیچتے اور گزارہ کرتے اور دن رات علم کی طلب میں مصروف رہتے تھے۔ کہیں حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ جیسے فقیہ و محدث تھے جن کا کام علم کی خدمت اور اشاعت تھا۔ ایک جگہ غلاموں کی بھیڑ ہے تو دوسری جگہ آقاؤں کی محفل ہے، کہیں غریبوں کی نشست ہے، اور کہیں دولت مندوں کی مجلس ہے، مگر ان میں ظاہری عزت اور دنیاوی اعزاز کی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی، سب مساوات کی ایک ہی سطح پر، اور صداقت کی ایک ہی شمع کے گرد پروانہ وار جمع ہیں، سب پر توحید کا یکساں نشہ چھایا اور سینوں میں حق پرستی کا ایک ہی ولولہ موجیں لے رہا ہے اور سب اخلاق و اعمال کے ایک ہی آئینہ قدس کا عکس بننے کی کوشش میں لگے ہیں۔ (۱)

❀❀❀

۱) اس موقع پر مدراس والے میرے چھ خطبوں پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔

اسلام کا فلسفۂ اخلاق

ان اصولوں کی تفصیل و تشریح کے لیے ہم کو تھوڑی دیر کے لیے فلسفۂ اخلاق کے کانٹوں میں الجھنا ہوگا۔
"اخلاق کا وجود تو یقیناً اس وقت سے ہے جب سے انسان کی زندگی اور اس کے ذہنی و جسمانی اعمال کا وجود ہے' مگر ان اعمال کی حقیقت پر بحث' ان کے اسباب و علل کی تلاش' ان کے اصول و قوانین کی تحقیق اور ان کی غرض و غایت کی تعیین یونانیوں کے عہد میں شروع ہوئی اور موجودہ عہد میں علمِ نفسیات کے زیرِ سایہ پرانے نظریوں پر نظر ثانی کی گئی۔ ان اسباب و علل' اصول و قوانین اور غرض و غایت کی تحقیق میں شروع سے آج تک فلسفیوں میں قدم قدم پر اختلافات رونما ہوئے' ہر سوال کے جواب میں متعدد نظریے بنتے اور بگڑتے رہے' اور نئے نئے فرقے اور اسکول پیدا ہوتے رہے اور ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ نام پڑ چکا ہے' تاہم اگر ان سب کو سمیٹنا چاہیں تو اساسی اور کلی طور پر یہ تمام مذاہب انہی دو قدیم مسلکوں کی تشریح ہیں جنہیں یونانی اصطلاح میں ''رواقیہ'' اور ''لذتیہ'' کہا گیا ہے۔ موجودہ اصطلاح میں پہلے کو ''ضمیریہ'' اور دوسرے کو ''افادیہ'' کہہ لیجئے' یا ایک اور تعبیر کے لحاظ سے یوں کہیے' پہلا فریق اخلاق کی بنا ''جذبات'' پر قرار دیتا ہے اور دوسرا ''عقل'' پر' پھر اس منشائے اختلاف کے تحت میں تعبیر کے اختلاف سے اور بہت سے فرقے پیدا ہو گئے' ارسطو اور اس کے متبعین نے اخلاق کا مبنیٰ نفس کی تکمیل کو قرار دیا ہے۔

اخلاقی قوانین کی حقیقت اور اصل ماخذ کی نسبت بھی بے انتہا اختلافات ہیں' علمائے اخلاق کے مختلف فرقوں نے بادشاہ کا قانون' خدا کا قانون' فطرت کا قانون' حاسۂ اخلاق کی آواز' ضمیر کا قانون' وجدانیت' اور پھر بالآخر عقل کا قانون کہہ کر الگ الگ اپنے نظریوں کی بنیاد ڈالی ہے' لیکن درحقیقت ان کی بھی دو ہی اصلی تقسیمیں ہیں' یعنی یہ کہ یہ قوانینِ اخلاق کسی وحی و الہام سے ماخوذ ہیں یا کسی بیرونی ماخذ سے' جو لوگ وحی و الہام پر ایمان نہ لا سکے' انہوں نے ان قوانین کا کوئی بیرونی ماخذ قرار دینا چاہا۔ پھر کسی نے بیرونی ماخذ کو انسان کے اندر تلاش کیا اور کسی نے اس سے باہر۔ جنہوں نے خود انسان کے اندر تلاش کیا۔ انہوں نے باختلاف مذاق انسان کی اصل فطرت کو' انسان میں ایک خاص حاسۂ اخلاقی کو' انسان کے وجدان کو' انسان کے ضمیر کو' اور آخری طور پر خود انسان کی عقل کو ان کا ماخذ قرار دیا' جنہوں نے انسان سے باہر ڈھونڈا' انہوں نے قبیلہ کے سردار اور بادشاہ کے حکم یا سوسائٹی کے رسم و رواج کو ان کا ماخذ قرار دیا۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ قبیلہ کے سردار کا حکم' یا بادشاہ کا حکم یا سوسائٹی کے رسم و رواج کی بنیاد

خود کس اصول پر پڑی؟ اس لیے لامحالہ اس بیرونی ماخذ کو چھوڑ کر پھر کسی اندرونی ہی ماخذ کو اصل مبنیٰ قرار دینا ہوگا‘ ورنہ اخلاقی اصول کو فطری ہونے کے بجائے مصنوعی اور ساختہ پرداختہ بتانا پڑے گا۔ جو اخلاق کے امہات مسائل میں کبھی قبول نہیں کیا جاسکتا۔

بہر حال دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جو اخلاق کا ماخذ خدا کے حکم کے سوا کسی اور شے کو تسلیم کرتا ہو‘ لیکن اسلام اس کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ خدا نے اپنے ان احکام کو وحی کے الفاظ میں بیان بھی کیا ہے اور اپنے بندوں کی فطرت میں ودیعت بھی رکھا ہے تاکہ فطرت اگر کسی سبب سے خاموش رہے تو احکامِ الٰہی کی آواز اس کو پکار کر ہشیار کر دے۔ فلسفیانہ کاوشوں اور موشگافیوں کو چھوڑ کر عملی حیثیت سے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ نظریے باہم کسی قدر متخالف ہونے کے باوجود بھی باہم اس قدر متضاد نہیں کہ وہ ایک جگہ جمع نہ ہوسکیں‘ ہوسکتا ہے کہ ہمارے اخلاق کا ماخذ خدا کا حکم ہونے کے ساتھ اس کے تائیدی مآخذ اور محرکات‘ ضمیر‘ فطرت‘ وجدان اور عقل سب ہوں اسی طرح معیارِ اخلاق کے اختلافات میں بھی توافق ممکن ہے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انسان بغیر کسی ذاتی غرض و غایت کو خیال میں لائے ہوئے محض اپنی فطرت کے اصرار یا ضمیر کی پکار سے مجبور ہو کر ایک کام کو انجام دے یا اپنا فرض سمجھ کر اس کو پورا کرے یا اس کے ساتھ کسی مصلحتِ عامہ کی افادی حیثیت بھی اس میں ملحوظ ہو اور وہ روحانی تکمیل کا بھی ذریعہ ہو۔ اسلام کے اخلاقی فلسفہ میں یہ سب جہتیں ایک کام میں مجتمع ہوسکتی ہیں۔

فرض کیجیے کہ ایک مظلوم کی امداد خدا کا حکم بھی ہے اور ہماری فطرت کے اندر بھی یہ ودیعت ہے ہمارے ضمیر کا بھی یہی تقاضا ہے اور وجدان بھی اسی طرح اس کام کو اچھا کہتا ہے‘ جس طرح وہ ایک خوب صورت چیز کو خوب صورت یقین کرنے پر مجبور ہے‘ ساتھ ہی اس کے اندر عام فائدے اور مصلحتیں بھی ہیں اور ہم کو اس سے مسرت بھی ہوتی ہے اور عقل بھی یہی کہتی ہے‘ لیکن اس میں شک نہیں کہ بہت سے ایسے مواقع بھی ہوسکتے ہیں‘ جہاں خدا‘ ضمیر‘ فطرت‘ جذبات اور وجدان کا ایک حکم ہو اور ہماری خود پسند اور مصلحت شناس عقل دوسری طرف جا رہی ہو۔ اسی لیے اخلاق کے باب میں وہ عقل جو ہمارے قویٰ کے مجموعی احکام کے خلاف جانا چاہتی ہے‘ اصلاح کے لائق ہے۔

الغرض خدا کے حکم ہونے کے ساتھ اسلام ان کو انسان کے اندر کی آواز بھی کہتا ہے‘ اس اندر کی آواز کو خواہ فطرت کہیے‘ وجدان کہیے‘ حاسۂ اخلاقی کہیے‘ ضمیر کہیے‘ اس فلسفیانہ تشقیق سے اس کو بحث نہیں اور باوجود اس کے وہ ان کو عقل اور مصلحت اور فوائد پر مبنی سمجھتا ہے‘ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک بات بدیہی طور سے ثابت ہے کہ انسان میں زیادہ تر اخلاقی اصول ایسے ہیں جن کی اچھائی یا برائی پر آب و ہوا‘ خصوصیاتِ اقلیم‘ زبان‘ مذہب‘ رسم و رواج‘ طرزِ حکومت وغیرہ صدہا اختلافات کے باوجود دنیا کی ساری قومیں بلادلیل متفق اور متحد ہیں‘ اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ یہ اخلاقی حس ہمارے اندر اسی طرح فطرۃً ودیعت ہے جس طرح دوسرے قویٰ اور حواس ودیعت ہیں۔ اب یہ کاوش کہ جس طرح مرئیات‘ مسموعات اور ملموسات وغیرہ کے لیے ہمارے اندر باصرہ‘ سامعہ اور لامسہ کے نام سے الگ الگ حاسے ہیں اسی طرح اخلاقی تمیز کے لیے ہمارے اندر کوئی خاص اخلاقی حاسہ ہے جس سے ہم

اخلاق کی اچھائی یا برائی کا احساس اور تمیز کرتے ہیں' یا کوئی اخلاقی وجدان ہمارے اندر ہے' جس کے ذریعہ سے ہم اس طرح اس کا احساس کرتے ہیں جس طرح ہم دوسرے وجدانیات جیسے حسن و قبح' خوب صورتی اور بدصورتی کا' یا یہ کہ ہمارے اندر کوئی روحانی آواز ہے جو ہم کو بر وقت ہمارے فرائض یاد دلاتی ہے' اور بتاتی ہے کہ یہ اچھا ہے یا برا' عملی حیثیت سے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی۔

تعلیم محمدی نے گو اخلاق کے ان اصول و مبانی کی طرف کہیں تفصیلی اور کہیں اجمالی اشارات کیے ہیں مگر اس نے اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے کہ اخلاق کی خوبی ان کے علم و فلسفہ میں نہیں بلکہ ان کے عمل میں ہے اس لیے ''علم بلا عمل'' کی کوئی قدر و قیمت اس کی نگاہ میں نہیں لیکن اسی کے ساتھ ''عمل بلا علم'' کو بھی اس نے پسندیدہ نہیں سمجھا ہے' اسی بنا پر اس نے ان اصولوں کی طرف اشارے تو کیے ہیں مگر اخلاق کے باب میں اس کی عالمانہ تحقیق و تلاش کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے۔

اسلام نے اخلاق کا کمال یہ قرار دیا ہے کہ وہ یہ سمجھ کر ادا کیے جائیں کہ یہ خدا کے احکام ہیں' وہ خدا کے دوسرے فطری احکام کی طرح ہمارے اندر ودیعت ہیں۔ انہی احکامِ الٰہی کے مطابق ہمارا ضمیر' وجدان' اخلاقی حاسہ اور عقل میں سے جس ایک کو یا سب کو اصل کہیے ہونا چاہیے' ان میں باہم جس حد تک باہمی مطابقت و موافقت زیادہ ہوگی' اسی قدر انسان کا روحانی کمال بلند ہوگا اور جس حد تک ان میں کمی ہوگی اسی حد تک اس کے کمال میں نقص ہوگا۔

ایک مسافر کی امداد یا ایک بیمار کی تیمارداری یہ سمجھ کر کی جائے کہ یہ خدا کا حکم ہے' پھر کرنے والے کے ضمیر کی آواز بھی یہی ہونی چاہیے' اس کا وجدان بھی یہی ہو۔ اس کو وہ اپنا فرض بھی جانے اس کے کرنے میں وہ اپنے اندر روحانی مسرت بھی محسوس کرے اور اسی کی پیروی میں نوعِ انسان کی کثیر جماعت کا فائدہ بھی سمجھے۔ الغرض جس حد تک اس کے ان تمام قویٰ میں اس بارہ میں باہم موافقت اور یکسانی ہوگی اتنا ہی اس کا روحانی کمال بلند ہوگا اور جس قدر اس توافق میں کمی ہوگی کہ خدا کا حکم سمجھ کر بھی اس کے اندر کے ضمیر اور وجدان کی یہ آواز نہ ہو' یا وہ اس کو اپنا انسانی فرض نہ سمجھے یا اس سے اس کو روحانی مسرت اور انبساط پیدا نہ ہو' اسی قدر اس کے روحانی اور ایمانی کمال میں نقص پیدا ہے' کتنا ہی نیک کام ہم خدا کا حکم سمجھ کر انجام دیں' لیکن اگر ہمارا اندرونی احساس اور ضمیر اس کو نیک نہیں سمجھتا اور ہماری عقل اس کے خلاف ہم کو راہ سمجھاتی ہے' تو اس کے یہ صاف معنی ہیں کہ ابھی تک اس کے خدا کے حکم ہونے پر ہمارا یقین پختہ نہیں ہوا ہے' جس کے دوسرے معنی ایمان اور روحانی تکمیل کا نقص ہے اسی طرح اگر کسی نیک سے نیک کام کو کوئی انسان صرف اپنے ضمیر کی آواز یا صرف فرض یا وجدان یا حصولِ مسرت یا فائدہ عام کی غرض سے انجام دے' مگر خدا کے حکم کی حیثیت اس میں ملحوظ نہ رکھے تو وہ کام بھی اسلام کی نظر میں ثواب اور تزکیہ روح کا ذریعہ نہیں۔

بے غرضی

چونکہ اسلام میں اخلاق بھی دوسری مذہبی چیزوں کی طرح عبادت ہے اس لیے اس کی غرض وغایت بھی ہر قسم کی دنیاوی' نفسانی اور ذاتی اغراض سے پاک ہونی چاہیے' اگر ایسا نہیں ہے تو ان کاموں میں کوئی نیکی اور ثواب نہیں' اور نہ ان کی حیثیت عبادت کی باقی رہے گی' مذہبی کاموں کو چھوڑ کر دنیاوی کاموں پر بھی نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے کام میں جس قدر اخلاص کا حصہ شامل ہوتا ہے اسی قدر وہ قابلِ قدر ہوتا ہے ہم کسی مہمان کی کتنی ہی خاطر کریں اور اس کے سامنے کتنے ہی الوانِ نعمت چن دیں لیکن اگر اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس خاطر داری کی تہہ میں ذاتی نفع' یا ریاکاری یا نمائش یا خوشامد یا کرنے والے کی کوئی ذاتی غرض ہے تو ہماری یہ تمام خاطر تواضع اور تعظیم و تکریم اس کی نگاہ میں بے قیمت ہو جاتی ہے' لیکن اگر ہم کسی کے سامنے اخلاص اور بے غرضی کے ساتھ نان و نمک ہی رکھ دیں تو اس کی وقعت اور قدر و قیمت کی کوئی انتہا نہ رہے گی' تو جب دنیاوی کاموں میں اخلاص اور عدمِ اخلاص کے یہ اثرات ہیں تو روحانی عالم میں ان کے نتائج کہاں تک ہوں گے۔

نیت

اسی لیے آنحضرت ﷺ نے اپنی تعلیمات میں نیت یعنی قلبی ارادہ اور انسان کی اندرونی غرض وغایت کو ہر اچھے اور برے کام کی بنیاد قرار دیا ہے بلکہ حقیقت میں روحانی حیثیت سے کہ کوئی کام اپنے نتیجہ کے لحاظ سے اتنا اچھا یا برا نہیں ہوتا' جتنا قلب کی کیفیت اور اس کی اندرونی نیت کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ ایک دو مثالوں سے یہ حقیقت زیادہ واضح ہو جائے گی۔ ایک شخص نے نہایت اصرار سے کسی کو رات کی تاریکی میں اپنے گھر اس لیے بلایا کہ اس کو یقین تھا کہ راہ کے ڈاکو اس کو مار ڈالیں گے' یا سخت تکلیف پہنچائیں گے' اتفاق یہ کہ وہ اندھیرے میں بہک کر دوسرے راستہ پر جا پڑا اور وہاں اس کو اشرفیوں کی تھیلی راستہ میں پڑی ملی' تو گو اس سفر کا نتیجہ کتنا ہی اچھا ہو' مگر اس بلانے والے کی نیت کی برائی میں اب بھی کوئی شک نہیں' اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے رات کو اندھیرے میں بلوا کر اس پر احسان کیا۔ لیکن ایک اور شخص نے اس کو رات کے اندھیرے میں درحقیقت اس کے ساتھ احسان کرنے ہی کی نیت سے اس کو بلوایا لیکن اتفاق سے وہ راستہ میں کسی گڑھے یا کنوئیں میں گر کر مر گیا تو وہ بلانے والا بدی کے گناہ کا مرتکب نہ ہوگا کہ گو جانے والے کے سفر کا نتیجہ خراب نکلا مگر پہلے شخص کی طرح اس دوسرے شخص کی نیت بری نہ تھی۔

ایک دوسری مثال فرض کیجیے' میری جیب میں روپیوں کا ایک بٹوہ تھا' اتفاق سے وہ راستہ میں گر گیا' جب میں راستہ سے واپس پلٹا تو ایک بٹوہ پڑا دیکھا اور دل میں یہ خیال کر کے کہ یہ کسی دوسرے کا ہے چپکے سے اٹھا لیا' تو اگرچہ واقعہ کے لحاظ سے میں کسی برائی کا مرتکب نہیں ہوا مگر اپنے ارادہ اور نیت کے لحاظ سے برائی کر چکا۔ لیکن فرض کیجیے کہ کسی دوسرے موقع پر اسی قسم کا بٹوہ مجھ کو سڑک پر پڑا ملا' اور میں نے اس کو اپنا سمجھ کر اٹھا لیا تو گو واقعہ کتنا ہی

مختلف ہو پھر بھی میرا دامن گناہ کی برائی سے پاک ہے۔ راستہ میں کوئی چل رہا ہو اور ایک عورت سامنے سے نظ آئے اس نے اس کو بیگانہ اور غیر سمجھ کر کسی بری نیت سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر در حقیقت وہ اس کی بیوی تھی اس نے کسی غیر عورت کی طرف یہ سمجھ کر ہاتھ بڑھایا کہ وہ اس کی بیوی ہے حالانکہ یہ واقعہ نہ تھا تو پہلی صورت میں اس کا دل گنہگار ہو چکا اور دوسری صورت میں اس کی بے گناہی بالکل ظاہر ہے۔ نماز سے بڑھ کر کوئی نیک کام کیا: سکتا ہے لیکن اگر وہ بھی فخر نمائش ریا اور دکھاوے کی خاطر سے کیا جائے تو وہ ثواب کے بجائے الٹا عذاب کا باعث ہوگا اسی طرح آپ اگر کسی معذور کی امداد اس لیے کریں کہ لوگ آپ کی تعریف کریں گے تو اسلام کی نگاہ میں نیکی کا کام شمار نہ ہوگا۔ سورۂ آل عمران میں ہے:

﴿وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا﴾ (آل عمران : ۱۴۵)

''اور جو دنیا کا بدلہ چاہے گا اس کو وہ دیں گے اور جو آخرت کا بدلہ چاہے گا اس کو وہ دیں گے۔''

ایک اور آیت میں اس کی تصریح کردی گئی ہے کہ جس کام کا مقصد صرف نمائش اور دکھاوا ہو اس کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں۔ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ (بقرہ : ۲۶۴)

''اے ایمان والو! تم اپنی خیراتوں کو احسان دھر کر اور ستا کر برباد نہ کرو جس طرح وہ اپنے مال کو برباد کرتا ہے جو لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور خدا اور قیامت پر یقین نہیں رکھتا۔''

اسی قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ نے یہ مختصر لیکن جامع و مانع الفاظ فرمائے ہیں:

((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ)) (صحیح بخاری باب اول)

''انسان کے اعمال اس کی نیت پر موقوف ہیں۔''

اور اس کی مزید تصریح کے لیے یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔

((وَ لِكُلِّ امْرِئٍ مَانَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ مَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلٰى دُنْيَا يُصِيْبُهَا اَوِ امْرَاَةً يَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَاهَاجَرَ اِلَيْهِ))

''ہر شخص کے لیے وہی ہے جس کی وہ نیت کرے تو جس کی ہجرت خدا اور رسول کی طرف ہے تو اس کی ہجرت خدا اور رسول کی طرف ہے اور جس کی ہجرت کی غرض دنیا کمانا ہو یا کسی عورت کو پانا ہو کہ اس سے نکاح کرے تو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہے جس کی غرض سے اس نے ہجرت کی۔''

الغرض عمل کا نیک و بد ہونا تمام تر نیت اور ارادہ پر موقوف ہے اور اسی لیے اخلاق کی بحث میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے حسنِ نیت نہ ہو تو اخلاق کا بڑے سے بڑا کام بھی حسنِ خلق کے دائرہ سے خارج، دنیاوی تعریف و ستائش کے حدود سے باہر اور روحانی خیر و برکت اور ثواب سے محروم رہ جاتا ہے۔

فلسفۂ اخلاق کی تائید

آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیم کا یہ اصول ہے جس کی حرف بحرف تائید جدید فلسفۂ اخلاق سے بھی ہوتی ہے چنانچہ جان ایس میکنزی اپنی تصنیف ''مینول آف ایتھکس'' کی پہلی کتاب کے چھٹے باب میں لکھتا ہے:

''جس چیز پر حکم لگایا جاتا ہے وہ صاف ہے یعنی فعلِ ارادی' جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے' یہی وہ چیز ہے جس سے اخلاقیات کو شروع سے آخر تک بحث ہوتی ہے' اس کا کام تمام تر ارادہ کی صحیح جہت ہی کا بتلانا ہے۔ جو اخلاقی احکام ہم لگاتے ہیں ان کا تعلق بھی ارادہ سے ہی ہوتا ہے۔ جس فعل میں ارادہ شامل نہیں اس کی اخلاقی حیثیت نہیں۔''

اس مسئلہ کی ایک دو مثالیں دے کر کینٹ کی رائے نقل کی ہے۔

''اسی لیے کینٹ نے اپنی اخلاقیات کی کتاب کو جس مشہور و معروف دعویٰ کے ساتھ شروع کیا ہے اس کی ہم کو تصدیق کرنی پڑتی ہے' وہ کہتا ہے کہ ''بجز اچھے ارادہ کے دنیا بھر میں بلکہ دنیا کے باہر بھی کوئی ایسی شے نہیں ہے جس کو علی الاطلاق بلا کسی قید و شرط کے اچھا کہا جا سکے۔'' (۱)

اخلاق کے لیے ایمان کی شرط

جب یہ ظاہر ہو چکا کہ اخلاق کی تمام تر بنا ارادہ و نیت' یعنی قلب کے عمل پر ہے تو قلب کی اندرونی کیفیت اور حالت کی درستی کے لیے یہ اعتقاد ضروری ہے کہ کوئی ہستی ہے جو ہمارے دل کے ہر گوشہ کو ہر طرف سے جھانک رہی ہے' ہم مجمع میں ہوں یا تنہائی میں' اندھیرے میں ہوں یا روشنی میں' تاہم کوئی ہے جس کی آنکھیں اس کے دل کی تہ کو پردوں میں بھی دیکھ رہی ہیں' دنیا کی تمام قوتیں صرف جسم پر حکمران ہیں مگر ایک قدرت والا ہے جو دل پر حکمران ہے۔ پھر یہ اعتقاد بھی ضروری ہے کہ ہم کو اس ہستی کے آگے اپنے تمام کاموں کا جواب دہ ہونا ہے اور ایک دن آئے گا جب ہم کو اپنے اعمال کی جزا یا سزا ملے گی۔ جب تک یہ دو خیال دل و دماغ میں جاگزیں نہ ہوں گے اچھے اعمال کا اچھے ارادہ سے وجود قطعی محال ہے' اسی لیے وحیِ محمدی نے خدا اور قیامت پر ایمان لانا' ہر نیک عمل کی بنیاد قرار دی ہے کہ بے اس کے ہر کام محض ریا اور نمائش بن جاتا ہے' فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰی كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ (بقرہ:۲۶۴)

---

(۱) علم اخلاق کتاب اول باب ششم' مترجمہ پروفیسر عبدالباری ندوی شائع کردہ جامعہ عثمانیہ ۱۳۴۱ھ۔

''اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو جتا کر یا ستا کر برباد نہ کرو جس طرح وہ برباد کرتا ہے جو اپنے مال کو لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور خدا اور آخری دن پر یقین نہیں رکھتا۔''

یہی ایمانِ صحیح جس سے حسنِ نیت پیدا ہوتا ہے' آبِ حیات کا وہ سرچشمہ ہے' جو نہ ہو تو ہمارے اعمال سراب سے زیادہ بے حقیقت ہیں۔

﴿وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِیْعَةٍ یَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰٓی اِذَا جَآءَهٗ لَمْ یَجِدْهُ شَیْـًٔا﴾ (نور:۳۹)

''اور جو خدا اور قیامت کو نہیں مانتے ان کے کام ایسے ہیں جیسے میدان میں ریت' کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے جب وہاں جائے تو اس کو کچھ نہ پائے۔''

یہی وہ مشعل ہے جو ہماری تیرہ و تار زندگی کی روشنی ہے۔ یہ نہ ہو تو ہم کو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آئے اور اپنے کسی کام کی کوئی غایت معلوم نہ ہو۔

﴿اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ اِذَآ اَخْرَجَ یَدَهٗ لَمْ یَكَدْ یَرٰهَا وَ مَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ﴾ (نور:۴۰)

''یا (خدا اور قیامت کے) نہ ماننے والوں کے کاموں کی مثال ایسی ہے کہ اندھیرے میں گہرے دریا میں اس کو لہر ڈھانکے ہے' اس لہر پر دوسری لہر ہے اس پر گھٹا چھائی ہے تاریکیاں ہیں ایک پر ایک جب اپنا ہاتھ نکالے تو سوجھتا نہیں اور جس کو اللہ نے روشنی نہیں دی اس کو کہیں روشنی نہیں۔''

جب تک کسی واقفِ اسرار' عالم الغیب' دانائے راز اور دل کی ہر جنبش اور ہر حرکت سے باخبر ہستی کا اور اس کے سامنے عمل کے مؤاخذہ' باز پرس' اور جواب دہی کا یقین نہ ہوگا۔ دل میں اخلاص اور نفس میں دنیاوی اغراض سے پاکی پیدا نہیں ہو سکتی اور نہ بے غرضانہ بلند پایہ اخلاق کا وجود ہو سکتا ہے۔

غرض و غایت

اسی لیے آنحضرت ﷺ کی شریعتِ کاملہ میں نفسِ عمل مطلوب نہیں بلکہ وہ عمل مطلوب ہے جس کی غرض و غایت صحیح ہو۔ عمل قالب ہے تو صحیح غرض و غایت اس کی روح ہے' روح نہیں تو بے جان قالب کس کام آ سکتا ہے' حکمائے اخلاق کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ انسان کا کوئی فعل' غرض و غایت سے خالی نہیں ہوتا لیکن یہ غرض و غایت ہے کیا؟ اس پر آج تک وہ متفق نہیں ہو سکے' سقراط' افلاطون اور ارسطو کے زمانہ سے لے کر آج تک بیسیوں نظریے قائم ہو چکے ہیں' لیکن حقیقت کا راز اب تک آشکارا نہیں۔

اسلام کو اس سے بحث نہیں کہ اخلاق کی غرض و غایت کیا ہوتی ہے' بلکہ اس سے بحث ہے کہ اخلاق کی غرض و

غایت کیا ہونی چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے کام کی ادنیٰ اور اعلیٰ، پست اور بلند، متعدد غرضیں اور غایتیں ہو سکتی ہیں، ہم راہ میں ایک بوڑھے کی گردن سے بوجھ اتار کر خود اٹھا لیتے ہیں اور اس کو اس کے گھر تک با آرام پہنچا دیتے ہیں، ہمارے اس کام کی غرض یہ ہو سکتی ہے کہ گھر پہنچ کر بڈھا خوش ہو کر ہم کو مزدوری اور انعام دے گا، یہ بھی مقصد ہو سکتا ہے کہ لوگ ہم کو دیکھ کر ہماری تعریف کریں گے اور کسی پبلک منصب یا عہدہ کے انتخاب میں وہ ہم کو اپنی رائے دیں گے، یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ راستہ چلتے لوگ ہم کو اس حالت میں دیکھ کر ہمیں بڑا نیک اور دین دار سمجھیں گے، یہ بھی غرض ہو سکتی ہے کہ آج اگر جوانی میں اس بوڑھے کی مدد کریں گے تو کل ہمارے بڑھاپے میں کل کے نوجوان ہماری مدد کریں گے۔ بعض نیک لوگوں کو ایسے کاموں کے کرنے سے طبعاً خوشی ہوتی ہے، وہ اپنی اس خوشی کے لیے اس قسم کے کاموں کو کرتے ہیں بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک بوڑھے کو اس حال میں دیکھ کر ترس کھاتے ہیں اور اس سے متاثر ہو کر یہ کام کرتے ہیں، غرض ایک ہی قسم کے کام کے یہ تمام مختلف اغراض، مختلف اشخاص کے کاموں کی غایت اور محرک ہو سکتے ہیں، لیکن اس فہرست پر دوبارہ غور کی نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام اغراض بتدریج پستی سے بلندی کی طرف جا رہے ہیں اور جس حد تک جو غرض فاعل کی ذاتی ونفسانی غرض و غایت سے پاک ہے، اسی قدر وہ بلند اور قابلِ قدر ہے، کسی مالی یا جسمانی معاوضہ کی خاطر کوئی نیک کام کرنا سب سے پست مقصد ہے، اس کے بعد عزت وشہرت کی طلب اور نیک نامی کے حصول کے لیے کرنا بھی گو پست مقصد ہے مگر پہلے سے بلند ہے، پھر روحانی خوشی کی فطری خواہش کی تسلی کرنا پہلے سے اعلیٰ مقصد ہے مگر پھر بھی ذاتی منفعت اور اس دنیا کا لگاؤ باقی ہے۔ یہ بالکل فطری بات ہے کوئی انسان کسی کے ساتھ کتنا ہی عمدہ برتاؤ کرے مگر جب اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی تہ میں اس کی فلاں ذاتی غرض تھی تو اس کام کی قدر و قیمت اس کی نگاہوں سے گر جاتی ہے اور یہ سارا جادو بے اثر ہو جاتا ہے۔

اس سے آگے بڑھ کر مذہبی لوگ اپنے کاموں کی غرض و غایت جنت کی طلب قرار دے سکتے ہیں لیکن در حقیقت اس میں بھی گو دنیا کی نہیں، لیکن اس دنیا کی ذاتی غرض و غایت شامل ہے اس لیے یہ اعلیٰ ترین مقصد ہونے کے باوجود بھی ہنوز پست ہے، اس لیے یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تعلیمِ محمدی میں بہشت کو ایک مومن کے نیک کام کا لازمی نتیجہ بتایا ضرور گیا ہے، مگر اس کو نیک کام کی غرض و غایت قرار نہیں دیا گیا ہے، یہاں تک کہ ایک بادہ خوار مسلمان شاعر بھی اس نکتہ سے بے خبر نہیں۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کے بہشت کو

ضمیر کی آواز

یعنی انسان کی نفسیاتی کیفیت کا وہ زندہ احساس جس کے ذریعہ سے وہ برائی اور بھلائی میں تمیز کر لیتا ہے اور

جس کے سبب سے اس کے دل کے اندر سے خود نیکی کی دعوت کی آواز اٹھتی ہے‘ غریب ولاچار آدمی کو دیکھ کر ہر شخص پر فطرۃً رحم کا جذبہ طاری ہوتا ہے‘ قاتل اور ظالم سے طبعاً ہر شخص کو نفرت ہوتی ہے۔ یہ قلب کی فطری صلاحیت ہر انسان کے ضمیر میں ہے ہر اچھے یا برے کام کے کرتے وقت اس کے دل کے پردہ سے تحسین یا نفرین کی آواز آتی ہے‘ لیکن بری تربیت یا کسی خاص شدید جذبہ کے اثر سے یہ آواز اور اس کا اثر دب بھی جاتا ہے‘ یہی سبب ہے کہ ہر گناہ کے پہلے پہل کرنے میں انسان خوف کھاتا ہے‘ اس کے ہاتھ پاؤں لرزتے ہیں‘ وہ اپنی گنہگاری کے تخیل سے شدید ذہنی اذیت محسوس کرتا ہے‘ وہ کبھی کبھی ندامت کے دریائے احساس میں غرق ہو جاتا ہے‘ اس کے ذکر سے اس کی خجالت کی پیشانی عرق عرق ہو جاتی ہے لیکن جب وہ بار بار اپنے ضمیر کی اس آواز کو دباتا رہتا ہے تو وہ دب کر رہ جاتی ہے اور اس کی پشیمانی اور ندامت کے احساس کا شیشہ اس ٹھوکر سے چور چور ہو جاتا ہے۔

یہ اثرات کس چیز کا نتیجہ ہیں؟ اسلام کے اصولِ اخلاق کی بنا پر اس کا جواب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں نیکی وبدی کے جو فطری الہامات ودیعت کر رکھے ہیں‘ یہ اس کے نتائج ہیں‘ قرآن کہتا ہے:

﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَ تَقْوٰهَا﴾ (الشمس:۸)

(”نفس میں) اس کی بدی اور نیکی الہام کر دی ہے۔“

وہ جذبہ جس کا نام ضمیر ہے اور جو ہم کو ہمارے ہر برے کام کے وقت ہشیار کرتا ہے‘ وحیِ محمدی کی اصطلاح میں اس کا نام ”نفس لوامہ“ (ملامت کرنے والا نفس) ہے اور یہ خود ہمارے دل کے اندر ہے‘ سورۂ قیامت میں ہے:

﴿وَ لَآ أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ﴾ (قیامۃ:۲)

”اور قسم کھاتا ہوں اس نفس کی جو انسان کو اس کی برائیوں پر ملامت کرتا ہے۔“

آگے چل کر فرمایا:

﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ○ وَّ لَوْ اَلْقٰی مَعَاذِيْرَهٗ ○﴾ (قیامۃ:۱۴-۱۵)

”بلکہ انسان اپنے نفس پر آپ سمجھ بوجھ ہے اگرچہ وہ اپنے اوپر طرح طرح کے بہانوں کے پردے ڈال دیتا ہے۔“

نواس بن سمعانؓ انصاری ایک سال تک اس انتظار میں مدینہ میں ٹھہرے رہے کہ آنحضرت ﷺ سے نیکی اور گناہ کی حقیقت سمجھیں‘ آخر ایک دن ان کو موقع مل گیا اور انہوں نے دریافت کیا۔ فرمایا ”نیکی حسنِ اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ جو تیرے دل میں کھٹک جائے اور تجھ کو پسند نہ ہو کہ تیرے اس کام کو لوگ جانیں۔“ اسی طرح وابصہؓ بن معبد نامی ایک صاحب خدمتِ نبوی میں نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے کی غرض سے آئے‘ چاروں طرف جاں نثاروں کا ہجوم تھا اور وہ شوق وذوق میں سب کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے‘ لوگ ان کو روک رہے تھے مگر وہ آگے بڑھتے گئے۔ آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو فرمایا ”وابصہ قریب آجاؤ۔“ جب وہ قریب

جا کر بیٹھے تو فرمایا ''اے وابصہ! میں بتاؤں کہ تم کیوں آئے ہو یا تم بتاؤ گے۔'' عرض کی ''حضور ہی ارشاد فرمائیں'' فرمایا'' وابصہ! تم مجھ سے نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے آئے ہو'' ''عرض کی سچ ہے یارسول اللہ!'' فرمایا:

((یَا وَابِصَۃَ اسْتَفْتِ قَلْبَکَ وَ اسْتَفْتِ نَفْسَکَ اَلْبِرُّ مَا اطْمَأَنَّ اِلَیْہِ الْقَلْبُ وَ اطْمَأَنَّتْ اِلَیْہِ النَّفْسُ وَ الْاِثْمُ مَا حَاکَ فِی الْقَلْبِ وَ تَرَدَّدَ فِی النَّفْسِ وَ اِنْ اَفْتَاکَ النَّاسُ)) (۱)

''اے وابصہ! اپنے دل سے پوچھ کر اپنے نفس سے فتویٰ لیا کر نیکی وہ ہے جس سے دل اور نفس میں طمانیت پیدا ہو اور گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکے اور نفس کو ادھیڑ بن میں ڈالے' اگرچہ لوگ تجھے اس کا کرنا جائز ہی کیوں نہ بتائیں۔''

یہی وہ حاسۂ اخلاقی ہے جس کا نام لوگوں نے ضمیر کی آواز رکھا ہے۔

پہلے پہل جب انسان اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف کوئی بات کرتا ہے تو اس کے دل کی صاف وسادہ لوح پر داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے' اگرچہ ہوش میں آ کر جب وہ توبہ واستغفار کرتا ہے اور پشیمان و نادم ہوتا ہے تو وہ داغ مٹ جاتا ہے لیکن پھر اگر وہی گناہ بار بار اسی طرح کرتا رہے تو وہ داغ بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ پورے دل کو سیاہ کر کے ضمیر کے ہر قسم کے احساس سے اس کو محروم کر دیتا ہے' اسی مفہوم کو آنحضرت ﷺ نے ان الفاظ میں ادا فرمایا:

((اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا اَخْطَأَ خَطِیْئَۃً نُکِتَتْ فِیْ قَلْبِہٖ نُکْتَۃً سَوْدَاءَ فَاِذَا ھُوَ نَزَعَ وَ اسْتَغْفَرَ وَ تَابَ صَقِلَ قَلْبُہٗ وَ اِنْ عَادَ زِیْدَ فِیْھَا حَتّٰی یَعْلُوَ قَلْبَہٗ)) (۲)

''بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے تو اگر اس نے پھر اپنے کو علیحدہ کر لیا اور خدا سے مغفرت مانگی اور توبہ کی تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے' اور اگر اس نے پھر وہی گناہ کیا تو وہ داغ بڑھایا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ پورے دل پر چھا جاتا ہے۔''

اس کے بعد فرمایا یہی وہ دل کا زنگ ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے:

﴿کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ﴾ (مطففین:۱۴)

''کبھی نہیں بلکہ ان کے (برے) کاموں کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ چھا گیا تھا۔''

آنحضرت ﷺ نے ایک تمثیل میں فرمایا کہ منزلِ مقصود کی جانب ایک سیدھا راستہ جاتا ہے' راستہ کے ادھر ادھر دونوں طرف دو دیواریں کھینچی ہوئی ہیں اور ان دونوں میں دو دروازے کھلے ہیں لیکن ان پر پردے پڑے ہیں' راستہ کے سرے پر ایک آواز دینے والا آواز دے رہا ہے کہ راستہ پر سیدھے چلے چلو اور ادھر ادھر مڑو نہیں' جب کوئی راہ گیر خدا کا بندہ چاہتا ہے کہ ان دائیں بائیں کے دروازوں میں سے کسی ایک دروازے کا پردہ اٹھائے تو

(۱) مسند ابن حنبل ج ۴ ص ۲۲۸ مصر۔

(۲) جامع ترمذی تفسیر آیت مذکور۔

اوپر سے ایک منادی پکار کر کہتا ہے ’’خبردار پردہ نہ اٹھانا‘ اٹھاؤ گے تو اندر چلے جاؤ گے‘‘ پھر فرمایا یہ راستہ اسلام ہے‘ اور یہ دروازے اللہ تعالیٰ کے ممنوعات ہیں اور یہ پردے اس کے حدود ہیں اور راستہ کے سرے پر پکارنے والا قرآن ہے اور اوپر کا منادی جو پکارتا ہے۔

((هُوَ وَاعِظُ اللّٰهِ فِي قَلْبِ كُلِّ مُؤْمِنٍ)) (۱)

’’وہ خدا کا وہ واعظ ہے جو ہر مومن کے قلب میں ہے۔‘‘

کیا کسی بڑے سے بڑے ضمیری نے بھی اخلاقی ضمیر کی اس سے بہتر تشریح کی ہے۔

مسرت وانبساط

یہ بات کہ نیکی کے کاموں سے‘ کرنے والے کو جو خوشی اور برائی کی باتوں سے اس کو جو رنج ہوتا ہے‘ وہی اس کو نیکی کے حصول کی ترغیب دیتا اور برائیوں سے بچنے پر آمادہ کرتا ہے‘ گو تمام تر صحیح نہیں ہے تاہم اتنا درست ہے کہ نیکی کے کاموں سے حقیقتاً کرنے والے کے دل کو انشراح اور خوشی ہوتی ہے اور برائی سے اس کو انقباض اور غم ہوتا ہے لیکن یہ نیکی اور بدی کے محرک نہیں اور نہ ان کو ہمارے کاموں کی غرض وغایت ہونی چاہیے کہ یہ بھی مادی خود غرضی ہے بلکہ درحقیقت یہ نیکی اور بدی کے فطری اور طبعی نتائج ہیں‘ ایک غریب ولاچار کی امداد سے بے شبہ ہم کو خوشی ہوتی ہے لیکن یہ خوشی ہماری مخلصانہ کوشش کا طبعی اور لازمی نتیجہ ہے لیکن وہ اس کی محرک‘ علت اور غرض وغایت نہیں اسلام کے نزدیک ایک مسلمان کے کاموں کی غرض وغایت تو صرف ایک ہی ہوتی ہے اور وہ خدا اور اس کی رضامندی کا حصول ہے۔

اس تشریح کے بعد معلوم ہوگا کہ سرورِ کائنات علیہ الصلوٰت والسلام کی تعلیم نے حکمائے اخلاق کی اس جماعت کے نظریہ میں جو اخلاق کی بنیاد اسی خوشی اور رنج یا روحانی لذت والم کے اصول پر قائم کرتی ہے‘ تھوڑی سی ترمیم کردی ہے اور وہ یہ کہ خوشی حاصل کرنا اور قلبی غم سے بچنا‘ نیکی کی غرض وغایت نہیں بلکہ اس کا لازمی اور طبعی نتیجہ ہے۔ علمائے اخلاق میں بڑی جماعت کا آج کل یہی مسلک ہے کہ مسرت نیکی کی غرض نہیں‘ اسی نکتہ کو اسلام کے صحیفۂ الٰہی نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

﴿وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَ زَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ كَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَ الْفُسُوْقَ وَ الْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ﴾ (حجرات:۷)

’’لیکن اللہ نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا اور اس کو تمہارے دلوں میں اچھا کر کے دکھایا اور کفر اور گناہ اور نافرمانی سے گھن لگادی۔ یہی لوگ نیک چلن ہیں۔‘‘

اسی آیت پاک کی تفصیل محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے الفاظ میں اس طرح فرمائی۔

---

(۱) مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ۔ بحوالہ احمد وبیہقی فی شعب الایمان ورزین وترمذی مختصراً۔

((اِذَا سَرَّتْکَ حَسَنَتُکَ وَ سَاءَ تْکَ سَیِّئَتُکَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ)) (۱)

"جب تمہاری نیکی تمہیں خوشی بخشے اور تمہاری بدی تم کو غمگین کر دے تو تم مومن ہو۔"

((مَنْ سُرَّتْهُ حَسَنَةٌ وَ سَاءَ تْهُ سَیِّئَةٌ فَهُوَ مُؤْمِنٌ)) (۲)

"جس کو نیکی خوشی بخشے اور جس کو بدی بری لگے وہ مومن ہے۔"

((مَنْ عَمِلَ سَیِّئَةً فَکَرِهَهَا حِیْنَ یَعْمَلُ وَ عَمِلَ حَسَنَةً فَسُرَّ فَهُوَ مُؤْمِنٌ. (۳)

"جس نے جب کوئی برائی کی تو اس کو اس سے سخت نفرت آئی اور جب کوئی اچھا کام کیا تو اس کو مسرت ہوئی وہ مومن ہے۔"

غرض نیکی پر مسرت وانبساط اور انشراحِ خاطر کی لذت کو اسلام نے ایمان کی پہچان مقرر کیا ہے اور اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلام کے اصولِ اخلاق میں سابق الذکر ترمیم کے ساتھ فرقۂ لذتیہ کے لیے بھی قدم رکھنے کی گنجائش باقی رکھی ہے اور پیغمبر اسلام ﷺ کی پیغمبرانہ نظر سے یہ نکتہ بھی پوشیدہ نہیں رہا ہے بلکہ اس نظریہ میں جس حد تک غلطی تھی اس کی تصحیح فرما دی ہے۔

رضائے الٰہی

اسلام میں ہر قسم کے نیک کاموں کی غرض وغایت صرف ایک ہی قرار دے گئی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی ہے' ایک سچے مسلمان کو صرف اسی کی خاطر کام کرنا چاہیے اور اس کے سوا کسی دوسری غرض کو اپنے کام کی بنیاد نہیں بنانا چاہیے' یہیں آ کر فلسفۂ اخلاق اور اسلامی اخلاق کے اصول کا فرق نمایاں ہوتا ہے۔ حکمائے اخلاق یہ ڈھونڈتے ہیں کہ انسانی اخلاق کی غرض وغایت کیا ہوتی ہے اور معلمِ حکمت علیہ السلام یہ تعلیم دیتے ہیں کہ انسان کو اپنے اخلاق کی غرض وغایت کیا قرار دینی چاہیے۔ انسان کے پاس دو ہی دولتیں ہیں اور انہی دونوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرنا ایثار اور حسنِ عمل ہے' پہلے ایک مومن کی جان کے متعلق فرمایا:

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ﴾ (بقرہ: ۲۰۷)

"بعض ایسے ہیں جو اپنی جان کو خدا کی خوشنودی چاہنے کے لئے بیچتے ہیں اور اللہ بندوں پر مہربان ہے۔"

---

(۱) مسند احمد حنبل عن ابی امامۃ الباہلی جلد ۵ صفحہ ۲۵۱' ۲۵۲ ومستدرک حاکم کتاب الایمان جلد اول ص ۱۴ حیدر آباد ومختصر شعب الایمان بیہقی ص ۵۲ مطبع سعادت مصر وابن حبان وابوداؤد عن عمرؓ بن الخطاب۔

(۲) طبرانی فی الکبیر عن ابی موسیٰ کنز العمال ج ۱ ص ۳۷۔

(۳) مستدرک حاکم کتاب الایمان ج ۱ ص ۱۳ حیدر آباد۔

پھر مال کے متعلق فرمایا:

﴿وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ﴾ (بقرہ:۲۶۵)

''اور ان کی مثال جو اپنی دولت خدا کی خوشنودی کے لیے خرچ کرتے ہیں۔''

﴿وَ مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ﴾ (بقرہ:۲۷۲)

''اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر۔''

﴿وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ (نساء:۱۱۴)

''اور جو یہ تمام کام خدا کی خوشنودی کے لیے کرے گا تو ہم اس کو بڑا اجر دیں گے۔''

﴿وَ الَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً وَّ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ﴾ (رعد:۲۲)

''اور جنہوں نے خدا کے لیے صبر کیا اور نماز کھڑی کی اور ہم نے جو ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ چھپے اور کھلے طریقہ سے خرچ کیا اور برائی کو نیکی سے دور کرتے ہیں، انہی کے لیے ہے پچھلا گھر۔''

سب سے صاف اور واضح طور سے یہ حقیقت سورۂ لیل میں کھول گئی ہے۔

﴿الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ وَ مَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝﴾ (اللیل:۱۸-۲۰)

''جو اپنا مال صفائی اور پاکی حاصل کرتے ہوئے دیتا ہے کسی کا اس پر احسان نہیں ہے جس کو ادا کرنے کے لیے دیتا ہو بلکہ وہ خدا کی ذات کی طلب کے لیے دیتا ہے۔''

ان آیات کی تفسیر و توضیح آنحضرت ﷺ نے متعدد احادیث میں فرمائی ہے، ایک صحابیؓ پوچھتے ہیں یا رسول اللہ! کوئی اس لیے لڑتا ہے کہ غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے کوئی اس لیے کہ وہ بہادر کہلائے، کوئی اس لیے کہ اسے شہرت حاصل ہو تو ان میں سے راہِ خدا میں لڑنا کس کو کہیں گے؟ فرمایا۔ ''اس کو جو اس لیے لڑتا ہو کہ خدا کی بات بلند ہو۔''(۱) ایک دفعہ ارشاد فرمایا۔ ''گھوڑا باندھنا کسی کے لیے اجر کا موجب، کسی کے لیے پردہ پوش، اور کسی کے لیے گناہ ہے، اجر کا موجب اس کے لیے ہے جو خدا کی راہ میں اس کو باندھتا ہے تو اس کے چرنے اور پانی پینے کا بھی اس کا ثواب ملتا ہے، پردہ پوش اس کے لیے ہے، جو ضرورۃً اس لیے باندھتا ہے کہ خدا نے اس کو دولت دی ہے تو اس کو اپنی ضرورت کی چیز دوسروں سے مانگنی نہ پڑے تو وہ رحم و شفقت کے ساتھ اس سے کام لیتا ہے اور اس کا حق ادا کرتا ہے اور گناہ اس کے لیے ہے جو فخر اور نمائش کے لیے باندھتا ہے۔''(۲)

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الجہاد ج ا ص ۳۹۴۔

(۲) صحیح بخاری کتاب الجہاد و کتاب المناقب آخر باب علامات النبوۃ فی الاسلام و کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ باب الاحکام التی تعرف بالدلائل و باب تفسیر اذا زلزلت و صحیح مسلم کتاب الزکوۃ۔

اس تعلیم کا سب سے موثر بیان وہ ہے جس کو ترمذی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے اور جس کو دہراتے ہوئے حضرت ابو ہریرہؓ تین دفعہ غش کھا کر گرے اور جس کو سن کر حضرت معاویہؓ زارزار روئے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے قسم کھا کر بیان کیا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ عدالت کے لیے اترے گا اور ہر امت اپنی جگہ گھٹنے ٹیکے گی۔ اس وقت سب سے پہلے ان کی پیشی کا حکم ہوگا جو قرآن کے عالم تھے اور جو جہاد میں مارے گئے تھے اور جو دولت والے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ عالم سے پوچھے گا' کیا میں نے تجھ کو وہ سب نہیں سکھایا جو اپنے پیغمبر پر اتارا تھا۔ تو تم نے اس پر کیا عمل کیا؟ عرض کرے گا' بارِالٰہا! میں شب و روز نماز میں قرآن پڑھتا تھا۔ خدا فرمائے گا تو جھوٹا ہے۔ فرشتے بھی کہیں گے یہ جھوٹا ہے۔ پھر خدا فرمائے گا' تو تو اس لیے یہ کرتا تھا تاکہ لوگ کہیں کہ تو بڑا عالم اور قرآن خواں ہے' تو دنیا میں تجھ کو یہ کہا جا چکا (یعنی تو اپنا بدلہ پا چکا) پھر دولت مند سے خدا فرمائے گا' کیا میں نے تجھ پر دنیا کو کشادہ نہیں کیا' یہاں تک کہ تو کسی کا محتاج نہ رہا؟ عرض کرے گا کیوں نہیں' اے میرے رب' دریافت کرے گا تو میں نے جو کچھ تجھ کو دیا اس میں تو نے کیا کیا؟ جواب دے گا میں اہلِ استحقاق کا حق ادا کرتا تھا اور خیرات دیتا تھا۔ ارشاد ہوگا تو جھوٹا ہے' فرشتے بھی کہیں گے یہ جھوٹا ہے۔ پھر خدا فرمائے گا تو تو اس لیے یہ کرتا تھا تاکہ لوگ کہیں کہ تو بڑا سخی ہے' تو یہ تجھ کو دنیا میں کہا جا چکا (تو اپنا بدلہ پا چکا) اس کے بعد وہ لایا جائے گا جو جہاد میں مارا گیا تو خدا اس سے دریافت کرے گا تو کس بات کے لیے مارا گیا؟ کہے گا خدایا تو نے اپنی راہ میں جہاد کا حکم دیا تھا تو میں لڑا یہاں تک کہ مارا گیا' خدا فرمائے گا تو جھوٹا ہے' فرشتے بھی کہیں گے یہ جھوٹا ہے' خدا کہے گا تو تو اس لیے لڑا تھا کہ لوگ تجھ کو بہادر کہیں' تو دنیا میں تجھ کو یہ کہا جا چکا' پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو سب سے پہلے جہنم میں ڈالے جائیں گے۔''(۱)

حضرت معاویہؓ اس حدیث کو سن کر بہت روئے۔ پھر بولے خدا اور اس کا رسول سچا ہے اور اس حدیث کی تائید میں قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَ هُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَ حَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ○﴾ (ہود:۱۵۔۱۶)

''جو کوئی دنیا کی زندگی اور اس کی رونق چاہتا ہو تو ہم اس کا عمل اسی دنیا میں پورا کر دیں گے' بے کم و کاست' ان لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ مگر دوزخ اس دنیا میں انہوں نے جو بنایا وہ مٹ گیا اور جو کیا وہ برباد گیا۔''

غرض ہمارے اخلاق و اعمال کی غایت' خود غرضی اور کسی نہ کسی طرح کی ذاتی منفعت ہے تو وہ ثواب کی روح سے خالی ہے اور اسلام کی اخلاقی تعلیم اس پستی سے بہت بلند ہے بلکہ ایک مقام اس کا وہ بھی ہے جہاں اس کی

(۱) جامع ترمذی باب الزہد باب ماجاء فی الریاء والسمعۃ۔

منزل رضائے الٰہی کی طلب نہیں بلکہ خود ذاتِ الٰہی ہو جاتی ہے۔

﴿وَ مَا تُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ اللّٰهِ﴾ (بقرہ:۲۷۲)

''اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر۔''

﴿وَ الَّذِيۡنَ صَبَرُوا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ رَبِّهِمۡ﴾ (رعد:۲۲)

''اور جنہوں نے اپنے پروردگار کی طلب کے لیے صبر کیا۔''

﴿وَ مَا لِاَحَدٍ عِنۡدَهٗ مِنۡ نِّعۡمَةٍ تُجۡزٰۤى ۞ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ رَبِّهِ الۡاَعۡلٰى﴾ (الیل:۱۹-۲۰)

''اور جو کسی کے احسان کا بدلہ اتارنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے برتر پروردگار کی طلب کے لیے کرتا ہے۔''

اخلاقی احکام کی تعمیل اور ادائے حقوق کی تاکید کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا:

﴿فَاٰتِ ذَا الۡقُرۡبٰى حَقَّهٗ وَ الۡمِسۡكِيۡنَ وَ ابۡنَ السَّبِيۡلِ ذٰلِكَ خَيۡرٌ لِّلَّذِيۡنَ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَ اللّٰهِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ﴾ (الروم:۳۸)

''تو رشتہ دار کا حق ادا کر اور غریب کا اور مسافر کا ایسا کرنا ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو خدا کی ذات کو چاہتے ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔''

مذاہب میں اخلاق کا بنیادی اصول

آنحضرت ﷺ کے ذریعہ سے اصولِ اخلاق کی جو تکمیل ہوئی اس کا پتہ اخلاق کے بنیادی اصول سے چلتا ہے' توراۃ نے اپنی اخلاقی تعلیمات میں شاہی احکام کی شان رکھی ہے جس میں کسی اصول اور غرض وغایت اور علت ومصلحت کی کوئی تشریح نہیں کی جاتی' انجیل میں لفظی صناعیوں کے سوا ان اخلاقی احکام کی کوئی دوسری بنیاد ہی قائم نہیں کی گئی ہے تاہم عیسائی مذہب میں کچھ اصول ضرور موجود ہیں مگر ان کی بنیاد حد درجہ کمزور ہے ان میں سے پہلا مسئلہ خود اصل خلقتِ انسانی کا ہے۔

سوال یہ ہے کہ انسان کی ہستی کا صحیفہ اپنی اصل خلقت میں سادہ ہے یا گناہوں سے داغ دار ہے۔ عیسائیت کی تعلیم یہ ہے کہ انسان اصل میں گناہ گار پیدا ہوتا ہے' گناہ اس کا مایۂ خمیر ہے کیونکہ اس کے باپ اور ماں حضرت آدمؑ اور حوا گناہ گار تھے' اور یہ موروثی گناہ ہر انسان کی فطرت میں منتقل ہوتا چلا آتا ہے جس سے بچنا انسان کے لیے ممکن نہیں' اس مسئلہ میں مسیحی تعلیم کا غلو اس درجہ بڑھا ہوا ہے کہ اس کے نزدیک ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ جب تک بپتسمہ نہ پالے پاک نہیں ہوتا۔ اگر کسی عیسائی کا بچہ بھی اس سے پہلے مر جائے تو وہ گناہ گار مرا۔ اور آسمانی بادشاہی کے حدود میں وہ داخل نہ ہوگا بلکہ وہ جہنم میں جھونکا جائے گا کیونکہ مسیح کے نام سے اس نے نجات نہیں پائی تھی۔

لیکن اسلام کا اصول اس سے بالکل جداگانہ ہے اس کے نزدیک توحید اصل فطرت ہے ﴿فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا﴾ (خدا کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا) پھر ﴿اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ﴾ کے

ازلی سوال کے جواب میں بلیٰ یعنی خدا کا اعتراف ہر انسان روزِ ازل کر چکا ہے۔ اس لیے اس دنیا میں آ کر جس نے اپنے فطری اور ازلی اعتراف کے بعد اس کا انکار نہیں کیا اس کا وہ اقرار و اعتراف اس کی بے گناہی کے لیے کافی ہے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی لوحِ فطرت پر جو زریں حرف لکھے ہیں، وہ اپنے ہوش و تمیز کے بعد یا ان کو ابھار کر چمکا دیتا ہے یا مٹا ڈالتا ہے، فرمایا:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ﴾ (التین: ۴)

''ہم نے انسان کو اچھی راستی پر پیدا کیا۔''

یعنی ہم نے اس کی خلقت بہترین تقویم اور راستی پر بنائی ہے، دوسری جگہ ارشاد ہوا:

﴿الَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ ○ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ ○﴾ (الانفطار: ۷۔۸)

''جس خدا نے تجھے بنایا پھر تجھ کو برابر کیا، پھر تجھ کو ٹھیک کیا پھر جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ دیا۔''

یہ آیت سورہ انفطار کی ہے، اس میں قیامت اور حشر و نشر یعنی انسان کی جزا و سزا کے مقررہ دن کا بیان ہے اس کے بعد یہ آیت ہے جس لفظ کا ترجمہ ہم نے ''ٹھیک کیا'' کیا ہے، اس کے لفظی معنی ''معتدل کیا'' کے ہیں یعنی اس کو قویٰ کا ہر قسم کا اعتدال بخشا، نیشاپوری وغیرہ مفسرین نے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ اس میں کمالات کے حصول کی پوری استعداد عنایت کی، اس سے ثابت ہوا کہ اعتدال کے عموم میں اس کے جسمانی اور روحانی دونوں قویٰ کا اعتدال داخل ہے، دوسری آیتوں میں یہ مفہوم اور زیادہ واضح بیان کیا گیا ہے سورۂ اعلیٰ میں ہے۔

﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلَی ○ الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ○ وَ الَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ○﴾ (اعلیٰ: ۱۔۳)

''اپنے بلند و برتر رب کی پاکی بیان کر جس نے پیدا کیا پھر برابر کیا اور جس نے ہر قسم کا اندازہ درست کیا پھر راہ دکھائی۔''

راہ دکھانا، یعنی ہدایت انسان کی فطرت میں اس نے اسی طرح ودیعت رکھا ہے جس طرح اس میں دوسرے بیسیوں قویٰ اس نے ودیعت رکھے ہیں، سورۂ دہر میں اس سے بھی زیادہ صاف ہے:

﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِیْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًا، بَصِیْرًا ○ اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُوْرًا﴾ (دہر: ۲۔۳)

''ہم نے انسان کو ایک بوند کے لچھے سے پیدا کیا، پلٹتے رہے اس کو پھر کر دیا اس کو سنتا دیکھتا ہم نے اس کو راہ سوجھا دی تو وہ یا شکر گزار (نیکوکار) ہوتا ہے یا ناشکر (بدکردار)۔

غرض اس کو یہ رہنمائی اور ہدایت پہلے ہی دن دے دی گئی۔ اب عقل و تمیز آنے کے بعد خدا کا شکر گزار، یا ناشکر نیکوکار یا بدکردار، اچھا یا برا ہو جانا خود اس کا کام ہے، سورۂ شمس میں اس سے بھی زیادہ واضح ہے:

﴿وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰهَاO فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَاO قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَاO وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَاO﴾ (الشمس:۷۔۱۰)

''قسم ہے ہر نفس کی اور اس کو ٹھیک بنانے کی، پھر ہم نے اس کو الہام کر دیا (یا سوجھا دیا) اس کی نیکی اور بدی تو کامیاب ہوا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک وصاف رکھا اور ناکام ہوا وہ جس نے اس کو مٹی میں ملا دیا (گندہ کر دیا۔)

الغرض محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کی رو سے انسانی فطرت کو پیدائش کے ساتھ ہی گناہ گار اور عصیان کار نہیں ٹھہرایا گیا ہے بلکہ اس کی اصل فطرت میں ہدایت اور صحیح الہام ودیعت ہے اسی لیے یہ کہا گیا:

﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (روم:۳۰)

''سو تو باطل سے ہٹ کر اپنے آپ کو دین پر سیدھا قائم رکھ وہی اللہ کی فطرت، جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا، خدا کے بنائے میں بدلنا نہیں، یہی سیدھا دین ہے لیکن بہت لوگ نہیں جانتے۔''

یہ دینِ فطرت، اسلام اور اس کی تعلیمات ہیں جن کی بنیادی چیز توحید ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ ''ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ جس طرح ہر جانور کا بچہ اصل میں صحیح وسالم پیدا ہوتا ہے وہ کن کٹا نہیں پیدا ہوتا۔''[1] اسی طرح انسان کا بچہ بھی اپنی صحیح فطرت اور صالح خلقت پر پیدا ہوتا ہے، وحی محمدی نے اسی مسئلہ کو اپنے ایک ازلی مکالمہ کی صورت میں بیان کیا ہے۔ انسان کی موجودہ جسمانی پیدائش کے سلسلہ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے انسانی ارواح سے دریافت فرمایا ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں؟ انہوں نے اپنی زبان حال یا قال سے بالاتفاق جواب دیا ﴿بلیٰ﴾ ہاں بے شک تو ہمارا پروردگار ہے، یہی ازلی اور فطری اعتراف انسان کا وہ عہد ہے جس کو قرآن نے بار بار یاد دلایا ہے اور کہا ہے کہ ''دیکھو شیطان نے تمہارے باپ آدمؑ کو بہکایا تھا تو تم اس کے بہکانے میں نہ آؤ۔

ان تعلیمات کا لازمی نتیجہ یہ عقیدہ ہے کہ انسان اپنی اصل فطرت سے معصوم اور بے داغ پیدا ہوتا ہے، وہ پیدا ہونے کے ساتھ اپنے باپ کے موروثی گناہ کا پشتارہ اپنی پیٹھ پر لاد کر نہیں آتا، قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ

﴿وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ (فاطر:۱۸)

''اور ایک کے گناہ کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا۔''

﴿كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ﴾ (طور:۲۱)

''ہر نفس اپنے ہی عمل میں گروی ہے۔''

(۱) صحیح بخاری ومسلم کتاب الایمان۔

اور اسی کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((اَلَا لَا یَجْنِی جَانٍ عَلٰی وَ لَدِہٖ وَ لَا مَوْلُوْدٌ عَلٰی وَ الِدِہٖ)) (۱)

''ہاں باپ کے جرم کا بیٹا ذمہ دار نہیں اور نہ بیٹے کے جرم کا باپ۔''

اسی طرح ان مذہبوں نے بھی جنہوں نے انسان کو آواگون اور تناسخ کے چکر میں پھنسا رکھا ہے انسانیت کی پیدائش کو ایک طرح سے گنہگار اور داغ دار ہی ٹھہرایا گیا۔ انہوں نے انسانیت کی پیٹھ پر ایک بڑا بھاری بوجھ رکھ دیا ہے اس کی ہر پیدائش کو دوسری پیدائش کا' ہر زندگی کو دوسری زندگی کا اور ہر جنم کو دوسرے جنم کا نتیجہ بتا کر اس کو اپنے پچھلے کرموں کے ہاتھوں میں مقید کر رکھا ہے یعنی اس سے پہلے کہ وہ پیدا ہو اس کے اعمال کا دفتر سیاہ ہو چکا ہے۔

اب غور کیجیے کہ آنحضرت ﷺ کی یہ تعلیم کہ انسان اصل فطرت میں بے گناہ اور بے داغ ہے' غمگین دنیا کے لیے کتنی بڑی عظیم الشان خوش خبری ہے' اسی کا نتیجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی تعلیم اس سراسر ظلم اور بے انصافی کے عقیدہ سے پاک ہے کہ معصوم اور نا کردہ گناہ بچہ بھی گنہگار اور جہنم کا ایندھن ہے' آپؐ کی تعلیم یہ ہے کہ ہر بچہ اپنے ہوش وحواس اور عقل وتمیز سے پہلے تک معصوم اور بے گناہ ہے' فرمایا کہ ''خدا کا قلم بچہ سے اس وقت تک کے لیے اٹھا دیا گیا جب تک وہ عقل وتمیز کو نہ پہنچے۔''(۲)

باغِ ہستی کی یہ انسانی کلیاں جو بن کھلے مرجھا گئیں' اسلام کی نگاہ میں جنت کے پھول ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ ''جس مسلمان کے تین بچے بچپن میں مر گئے' وہ خدا کے دربار میں اپنے ماں باپ کے شفیع ہوں گے اور ان کو جنت میں لے جائیں گے۔''(۳) آنحضرت ﷺ کے شیر خوار صاحبزادہ نے جب وفات پائی تو فرمایا ''یہ جنت میں جا کر جنتی دایوں کا دودھ پئے گا۔''(۴) اس سے زیادہ یہ کہ مشرکین کے کم سن بچوں کی نسبت آپؐ سے دریافت کیا گیا کہ یہ بے گناہ کہاں رہیں گے' فرمایا ''خدا کو علم ہے کہ یہ کیا ہوتے۔''(۵) لیکن دوسرے موقع پر اس کی تصریح فرما دی' ایک دفعہ رؤیا میں حضرت ابراہیمؑ کو دیکھا کہ وہ جنت میں بیٹھے ہیں اور ان کے چاروں طرف کمسن بچوں کا ہجوم تھا فرمایا یہ وہ کمسن بچے تھے جو دینِ فطرت پر مر گئے۔ صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ! اور مشرکوں کے بچے؟ فرمایا ''اور مشرکوں کے بچے بھی۔''(۶) ان تصریحات کا نتیجہ یہ تھا کہ بعض صحابہؓ کمسنی میں مر جانے والے بچہ کو بہ

---

(۱) سنن ابن ماجہ کتاب الحج باب الخطبہ یوم النحر۔

(۲) صحیح بخاری کتاب الطلاق وترمذی فی من لایجب علیہ الحد۔

(۳) ابن ماجہ کتاب الجنائز۔

(۴) صحیح مسلم' کتاب القدر۔

(۵) صحیح بخاری کتاب التعبیر باب تعبیر الرؤیا بعد صلوۃ الصبح۔

(۶) یہ حدیثیں صحیح مسلم کتاب القدر میں ہیں۔ نیز امام نووی کی شرح مسلم میں بھی یہ باب دیکھو اور باب فضل من یموت لہ ولد جلد۲ صفحہ ۳۳۰' ۳۳۷۔

تخصیص جنتی کہہ اٹھتے تھے لیکن چونکہ غیب پر حکم لگانا صرف خدا کا کام ہے اس لیے تصریحاً کسی خاص بچہ کی نسبت ایسا کہہ دینا' آپؐ نے مناسب نہیں سمجھا' ایک دفعہ ایک صحابی کا بچہ مر گیا تھا۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے اس سانحہ کو سن کر آنحضرت ﷺ سے عرض کیا ''یا رسول اللہ! اس کو مبارک ہو۔ یہ جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا تھی' نہ گناہ کیا نہ گناہ کرنے کا زمانہ پایا۔'' فرمایا ''اے عائشہ! اللہ تعالیٰ نے جنت کے لیے کچھ لوگ پیدا کیے ہیں اور جہنم کے لیے کچھ لوگ۔''(۱) ایک طرف عیسائیت ہے جو بپتسمہ پانے سے پہلے مر جانے والے بچوں کو جہنم میں جھونکتی ہے' دوسری طرف اسلام ہے جو ان کے لیے جنت کا دروازہ کھولتا ہے' اور ان کے جنازہ کی نماز میں یہ دعا مانگنے کی تعلیم دیتا ہے۔ ''خداوندا! اس کو میرے لیے پیشگی کا ذخیرہ بنانا اس کو میرا ایسا شافع بنانا جس کی شفاعت تیری بارگاہ میں مقبول ہو۔'' احادیث میں ایسے موقعوں پر جب کسی ایک نیک عمل سے سارے گناہوں کے معاف ہو جانے کا ذکر آتا ہے۔ اکثر آنحضرت ﷺ نے یہ فقرہ استعمال کیا ہے کہ ''وہ پھر ایسا معصوم ہو جاتا ہے کہ گویا اس کی ماں نے اس کو آج ہی جنا ہے۔''(۲)

خوف ورجا

اسی مسئلہ کے قریب قریب ایک اور مسئلہ ہے' یونان کے فلسفیوں میں دو گروہ گزرے ہیں ایک کو رونے والے فلسفی' دوسرے کو ہنسنے والے فلسفی کہتے ہیں۔ پہلا گروہ وہ ہے جو ہر واقعہ سے نا امیدی اور مایوسی کا نتیجہ پیدا کرتا ہے' اس کو دنیا تمام تر تاریک اور خارزار نظر آتی ہے' دوسرا گروہ وہ ہے جس کو دنیا میں چہل پہل' عیش و آرام اور بہار و رونق کے سوا کچھ سوجھائی نہیں دیتا' پہلے گروہ کی تعلیم یہ ہے کہ خاموش رہو اور زندگی میں موت کی صورت بنالو کہ دنیا کی آخری منزل یہی ہے' دوسرے کا نظریہ یہ ہے کہ کھاؤ پیو اور خوش رہو اور کل کے غم کی فکر نہ کرو' اخلاقی لحاظ سے یہ دونوں رائیں ترمیم کے قابل ہیں۔ پہلے نظریہ پر اگر یقین ہو تو انسان کے تمام قویٰ سرد ہو کر رہ جاتے ہیں اور وہ دنیا میں کسی کام کے سرانجام دینے کا اہل نہیں باقی رہتا اور جو دوسرے عقیدہ پر ایمان رکھتا ہے' وہ بادۂ غفلت میں مست و سرشار ہوتا ہے اور اس کو نیک و بد کی تمیز نہیں رہتی۔ اسلام کی تعلیم کی شاہراہ ان دونوں گلیوں کے بیچ سے نکلی ہے۔ وہ ایک طرف دنیا کی فنا اور زوال کا قصہ بار بار سناتا ہے کہ دل بادۂ غفلت میں سرشار نہ ہو اور دوسری طرف وہ اس کو خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونے دیتا۔ وہ اخیر وقت تک خدا کے سہارے جینے کی تعلیم کرتا ہے' اس کی شریعت میں خدا سے نا امیدی اور کفر ایک ہے' وہ ایک مسلمان کے دل کو مشکل سے مشکل اوقات میں بھی نا امید بنا کر بے سہارا نہیں ہونے دیتا۔ قرآن پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرشتہ کی زبانی کہا گیا۔

﴿فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ﴾ (حجر:۵۵)

---

(۱) صحیح مسلم باب الاوقات التی نہی عن الصلوۃ فیہا و صحیح بخاری و مسلم و ترمذی کتاب الحج۔

(۲) صحیح مسلم باب فضل من یموت لہ ولد۔

(''ابراہیم)! ناامیدوں میں سے نہ بن۔''

پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبانی تعلیم ملی۔

﴿وَ لَا تَایْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا یَایْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (یوسف ۸۷)

''اور اللہ کے فیض سے ناامید مت ہو اللہ کے فیض سے ناامید وہی ہیں جو خدا کے منکر ہیں۔''

اس امت کے گناہ گاروں کو کس پیار سے خطاب ہوتا ہے۔

﴿یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ﴾ (زمر:۵۳)

''اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر آپ ظلم کیا تم خدا کی رحمت سے ناامید مت بنو۔''

اسی لیے آنحضرت ﷺ نے احادیث میں انسان کو ہمیشہ پر امید رہنے کی تاکید کی ہے آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ ''میں اپنے بندہ کے گمان کے پاس رہتا ہوں۔''(۱) یعنی جیسا وہ میری نسبت گمان کرتا ہے وہی اس کے لیے ہو جاتا ہے۔ اس بارہ میں اسلام کے عقیدہ کی صحیح آئینہ دار یہ آیت کریمہ ہے:

﴿اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیْلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا یَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَ یَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ﴾ (زمر:۹)

''بھلا ایک وہ جو بندگی میں لگا ہے رات کی گھڑیوں میں سجدہ کرتا ہے اور کھڑا ہوتا ہے۔ آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار ہے۔''

یعنی اس کے دل میں یہ دونوں کیفیتیں یکجا ہیں' گناہوں اور تقصیروں کے مؤاخذہ اور باز پرس کا ڈر بھی ہے اور خدا کی رحمت کی امید کا سہارا بھی' خدا کے غضب سے ڈرنا اور اس کی رحمت کا امیدوار رہنا یہی اسلام کی تعلیم ہے' یہ ڈر اس کو غافل' بیباک اور گستاخ نہیں ہونے دے گا۔ اور یہ امید اس کو مایوس' غم زدہ اور شکستہ خاطر نہیں ہونے دیتی۔ اسی لیے ایک مسلمان کا دل ہمیشہ سوئے انجام سے خائف لیکن توقعات سے لبریز رہتا ہے' اسی کی طرف اشارہ کر کے قرآن اہل ایمان سے کہتا ہے:

﴿وَ تَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا یَرْجُوْنَ﴾ (نساء:۱۰۴)

''اور تم کو خدا سے وہ امید ہے جو کافروں کو نہیں۔''

یہی وہ ذہنی فرق ہے جو مشکلات کے عالم میں ایک مومن اور ایک کافر کے دل میں پیدا ہوتا ہے کافر اپنے ہر کام اور ہر عمل کی دنیاوی جزا کا خواہاں ہے اور جب وہ اس کو نہیں پاتا تو دل شکستہ ہو جاتا ہے وہ کامیابی صرف مادی ہی کامیابی کو سمجھتا ہے اور جب وہ نہیں ملتی تو افسردہ ہو جاتا ہے لیکن مومن اگر ظاہری اور دنیا کی مادی کامیابی سے ہم آغوش نہیں بھی ہوتا تب بھی اس کا دل شاداں اور فرحاں رہتا ہے کہ اس نے نیکی کا کام کیا اور بہر حال اس نیکی کا یہاں نہیں تو وہاں معاوضہ ضرور ملے گا۔ اگر دنیا کی کامیابی نصیب نہ ہوئی تو نہ ہو خدا کی خوشنودی اور ثواب تو

(۱) جامع ترمذی کتاب الزہد باب فی حسن ظن باللہ تعالیٰ۔

بہر حال ملے گا۔ اسی یقین کا نتیجہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کو ہر نیک کام میں جری اور بہادر بنا دیا ہے اور ان کو بغیر کسی مادی غرض کے اخلاق کے ساتھ کام کرنا سکھا دیا ہے اسی کا اثر ہے کہ دنیا کی تمام غیر اسلامی قوموں میں ناکامی اور ناامیدی کی خودکشیوں کا عام طور سے رواج ہے ہندوستان میں ہندو عورتوں کے جان دینے کے واقعات ہر روز اخبارات میں پڑھے جاتے ہیں یورپ اور امریکہ کے متمدن ملکوں میں ذرا ذرا سی ناامیدی پر خودکشی کر لینا ایک معمولی واقعہ بن گیا ہے جس وقت یہ سطریں لکھ رہا ہوں وارسا (پولینڈ) میں ناکام نوجوان لڑکیوں کو خودکشی پر آمادہ کرنے کی ایک مجلس کے قیام کی خبریں اخباروں میں چھپ رہی ہیں مگر کسی مسلمان میں اخیر سے اخیر لمحہ میں بھی ناامیدی کا یہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا اور خدا کے فضل و کرم سے اس کی آس نہیں ٹوٹتی امیر ہو کہ غریب تندرست ہو کہ بیمار اولاد والا ہو کہ بے اولاد کامیاب ہو یا ناکام دولت مند ہو یا دیوالیہ ہر حالت میں وہ پر امید رہتا ہے۔ مشکلات میں بیماریوں میں محتاجیوں میں ناکامیوں میں ہر وقت وہ ہمت کے ساتھ خدا کی رحمت کا امیدوار ہے اور یقین رکھتا ہے کہ ناامیدی اور کفر دونوں اس کے مذہب میں ایک ہیں اور اس کے عمل کا معاوضہ اگر یہاں نہیں تو وہاں ضرور ہے۔ اس کے خدا کا یہ وعدہ ہے کہ

﴿اِنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ﴾ (آل عمران: ۱۹۵)

''میں تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہیں کرتا۔''

اخلاق اور رہبانیت

اخلاق درحقیقت انسانوں کے باہمی تعلقات میں خوش نیتی اور اچھائی برتنے کا نام ہے یا یوں کہیے کہ ایک دوسرے پر جو انسانی فرائض عائد ہیں ان کو ادا کرنے کو کہتے ہیں اخلاق کی اس حقیقت ہی سے یہ واضح ہے کہ اخلاق کے وجود کے لیے باہم انسانوں میں تعلقات اور وابستگی کا وجود ضروری ہے جو رہبانیت تجرد اور جوگی پن میں نہیں پائی جاتی ہے اسی لیے گوشہ نشینی عزلت گزینی خلق سے کم آمیزی جماعت سے علیحدگی اہل و عیال عزیز و اقارب اور دوست واحباب کے تعلقات سے آزادی اخلاق کے استعمال کے موقع ہی کو کھو دیتی ہے یا کم کر دیتی ہے۔

اس مسئلہ پر بحث کی ضرورت اس لیے ہے کہ خلق سے قطع تعلق اور گوشہ نشینی نے مذہب میں اکثر نیکی اور دین داری کی بہترین شکل کی حیثیت حاصل کر لی ہے اسلام سے پہلے راہب اور جوگی اسی اصول پر اپنی زندگی بسر کرتے تھے اور وہ خود اور ان کے عقیدت مند بھی اس کو ان کی انتہائی نیکوکاری اور دین داری قرار دیتے تھے لیکن حقیقتاً ان مذہبی افراد اور جماعتوں نے زیادہ تر اس پردہ اور حجاب کو اس لیے اختیار کیا کہ اس سے ایک طرف اپنے کو عام نظروں سے چھپا کر بادشاہوں کی طرح اپنے رعب واثر کو نمایاں کرنے اور اپنے کو بالاتر ہستی تصور کرانے میں مدد ملے اور دوسری طرف اپنی زندگی کو زیر پردہ رکھ کر جھوٹا تقدس اور جھوٹی دین داری کا ڈھونگ کھڑا کر سکیں اور

تیسری طرف اپنی عزلت نشینی کے جھوٹے عذر کی بنا پر کسی ملامت کا نشانہ بنے بغیر اہل وعیال، اعزہ واقارب، دوست واحباب اور قوم وملت کے فرائض وحقوق کو بجا لانے کی تکلیف سے بچ جائیں، اسی لئے اسلام نے اپنے اصولِ اخلاق میں راہبانہ، جوگیانہ اور مجردانہ زندگی کی ہمت افزائی نہیں کی ہے، نبوت کے بعد آنحضرت ﷺ نے اپنی پوری ۲۳ برس کی زندگی اسی مجمعِ انسانی میں رہ کر اور تمام تر انسانی جدوجہد میں شریک ہو کر گزاری ہے، یہی طرز عمل خلفائے راشدینؓ اور چند کے سوا تمام اکابر صحابہؓ کا تھا اور پورا قرآن پاک اسی انسانی جدوجہد اور انسانی مجمع کے ساتھ عملِ صالح کی تعلیم سے بھرا ہوا ہے تجرد، علیحدگی، خلوت نشینی، ترکِ عمل اور ترکِ جماعت کے لیے ایک اشارہ بھی پورے قرآن میں موجود نہیں ہے۔

یہ بالکل ظاہر ہے کہ جماعتی حقوق اور فرائض جماعتوں کے اندر ہی رہ کر ادا ہو سکتے ہیں، ان سے ہٹ کر نہیں، وہ لوگ جو آبادی سے دور کسی جنگل یا ویرانہ میں گوشہ گیر اور عزلت نشین ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں کیا وہ جماعتی مشکلات کو حل کرتے ہیں؟ کیا وہ قوم کی اخلاقی نگرانی کا فرض انجام دیتے ہیں؟ کیا وہ غریبوں کا سہارا بنتے ہیں؟ کیا وہ یتیموں کے سرپرست ہیں؟ کیا وہ خلقِ الٰہی کی کوئی خدمت کرتے ہیں؟ کیا وہ تبلیغ ودعوت، تعلیم وموعظت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اور جہاد جیسے فریضوں سے عہدہ برآ ہیں؟ حالانکہ اخلاقی عبادتوں کے یہی بہترین مواقع ہیں، اسی لیے اسلام کی نظر میں نجات طلبی کا عموماً یہ مستحسن طریقہ نہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿قُوْآ اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ (تحریم:۶)

''تم اپنے کو اور اپنے اہل وعیال کو بھی دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔''

یعنی انسان کا فرض اپنے ہی کو آگ سے بچانا نہیں بلکہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بچانا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے صریح طور سے تمام مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا **کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته۔** تم میں سے ہر ایک دوسرے کا ذمہ دار ہے اور نگران ہے اور اس سے اس کی ذمہ داری اور نگرانی میں آئے ہوئے لوگوں کی نسبت پوچھا جائے گا۔ امیر اپنی رعیت کا چرواہا، مرد اپنے اہل وعیال کا رکھوالا اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان ہے۔ (۱)

جماعتی مصیبتیں جب آتی ہیں تو کنارہ گیر اشخاص کو بھی نہیں چھوڑتیں۔ یہ آگ اندر اور باہر سب کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے اسی لیے وحیِ محمدی نے اس نکتہ کو علی الاعلان ظاہر کر دیا اور کہا:

﴿وَ اتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً﴾ (الانفال:۲۵)

''اور اس فساد سے بچو جو چن کر صرف گناہ گاروں ہی پر نہیں پڑے گا۔''

بلکہ اس کی لپٹ گنہگار و بے گناہ سب تک پہنچے گی کہ اگر جماعت اپنے تمرد کی مجرم ہوئی ہے تو کنارہ گیر اپنے تبلیغ کے فرض سے غافل رہے، چنانچہ قرآنِ پاک میں اصحابِ سبت کے قصہ میں ان کنارہ گیر اور فرضِ تبلیغ سے بے

(۱) صحیح بخاری جلد دوم کتاب النکاح باب المراۃ راعیۃ فی بیت زوجھا، ص ۷۸۳۔

پروار ہنے والے اشخاص کو بھی گنہگاروں ہی میں شامل کیا ہے۔

دنیا درحقیقت جدوجہد اور داروگیر کا ایک میدان ہے‘ جس میں تمام انسان باہمی معاونت سے اپنا اپنا راستہ طے کر رہے ہیں‘ راستہ میں سب لوگوں کے ساتھ چلنے میں یقیناً بہت کچھ تکلیفیں ہیں‘ ہر ایک کو دوسرے کی تکلیف و آرام کا لحاظ وخیال کرنا پڑتا ہے‘ اسی لیے وہ شخص جوان جماعتی مشکلات سے گھبرا کر الگ ہو جاتا ہے اور صرف اپنا بوجھ اپنے کندھے پر رکھ کر چل کھڑا ہوتا ہے‘ دنیا کے معرکہ کا ایک نامرد سپاہی ہے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں اور ترمذی نے جامع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے۔

((اِنَّ الْمُسْلِمُ الَّذِیُ یُخَالِطُ النَّاسَ وَ یَصْبِرُ عَلٰی اَذَاھُمْ اَفْضَلُ مِنَ الَّذِیُ لَایُخَالِطُ النَّاسَ وَ لَا یَصْبِرُ عَلٰی اَذَا ھُمْ)) (۱)

”وہ مسلمان جو لوگوں میں مل جل کر رہتا ہے اور ان کی تکلیف دہی پر صبر کرتا ہے‘ اس سے بہتر ہے جو لوگوں سے نہیں ملتا‘ اور ان کی تکلیف دہی پر صبر نہیں کرتا۔“

گوشہ گیری اور جماعت سے علیحدگی کی اجازت اسلام نے صرف ایک ہی موقع پر دی ہے کہ جماعت کا قوام اتنا بگڑ جائے کہ ان کا کوئی مرکزی نظام باقی نہ رہے۔ اور فتنہ وفساد کے شعلے اتنے بھڑک چکے ہوں کہ ان کا بجھانا قابو سے باہر ہو جائے تو ایسے وقت میں وہ اشخاص جو اس فساد کے روکنے اور اس آگ کے بجھانے کی طاقت اپنے میں نہ پائیں وہ مجمع سے الگ ہو جائیں۔ فتنہ میں عزلت نشینی کی حدیثیں اسی موقع سے تعلق رکھتی ہیں‘ ورنہ ہر قوی ہمت مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس حالت میں تبلیغ اور امر معروف کے فرض کو ادا کر کے جماعت کے بچانے میں پوری کوشش صرف کر دے۔ یہی وہ نمونہ ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں پیش کیا اور تمام بڑے بڑے صحابہؓ نے اپنے اپنے دائرہ میں اسی کی پیروی کی۔

آپؐ نے فرمایا کہ ”بدی کو اپنے ہاتھ سے روکنا اور مٹانا ہر مسلمان کا فرض ہے اگر ہاتھ سے نہ مٹا سکے تو زبان سے مٹائے‘ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو اس کو دل سے برا سمجھے اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے۔“ (۲)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

اسلام کے اس اصولِ اخلاق کو پیشِ نظر رکھنے سے اسلام کا ایک دوسرا اخلاقی اصول بھی خود بخود سامنے آ جاتا ہے کہ تعلیم محمدی میں جماعت کے افراد پر ان کی قوت کے بقدر جماعت کے دوسرے افراد کی نگرانی فرض ہے‘ اسی اخلاقی فرض کا دوسرا نام شرعی ”امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔“ (یعنی اچھی باتوں کے لیے کہنا اور بری باتوں سے روکنا) ہے۔ قرآن پاک نے مسلمانوں کا یہ ممتاز وصف قرار دیا ہے۔

(۱) شعب الایمان‘ بیہقی و جامع ترمذی‘ کتاب الزہد‘ ص ۴۱۲۔

(۲) صحیح مسلم کتاب الایمان۔

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران:۱۱۴)

''تم سب سے بہتر امت ہو جو لوگوں کے لیے باہر لائی گئی ہو اچھی بات کا حکم دیتے ہو اور بری بات سے روکتے ہو۔''

﴿يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (توبہ:۷۱)

''وہ اچھی بات کا حکم دیتے ہیں اور بری بات سے باز رکھتے ہیں۔''

پھر خاص طور سے حکم ہوا:

﴿وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (لقمان:۱۷)

''اچھی بات کا حکم دے اور بری بات سے روک۔''

مسلمانوں کی تصویر یہ ہے کہ:

﴿وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ (العصر:۳)

''اور وہ آپس میں سچائی اور ثابت قدمی کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں۔''

﴿وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ﴾ (بلد:۱۷)

''اور آپس میں ثابت قدم رہنے اور مہربانی کرنے کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں۔''

یہ وہ تعلیم ہے جو تمام دنیا کے مذاہب میں اسلام کی اخلاقی نگرانی کے اصول کو نمایاں کرتی ہے اور قوی دل اور قوی ہمت افراد کا یہ فرض قرار دیتی ہے کہ وہ جماعت اور سوسائٹی کے مزاج اور قوم کی نگہبانی اور اس کے بگاڑ کی دیکھ بھال کرتے رہیں۔

توراۃ میں قابیل کا یہ فقرہ کہ ''کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں؟''[1] عیسائی مذہب کے اخلاق کا ایک اہم اصول بن گیا ہے۔ اسی اخلاقی اصول نے یورپ کے اس قانونی مسئلہ کی صورت اختیار کر لی ہے جس کا نام ''شخصی آزادی کی بحالی'' ہے لیکن اسلام کے قانون میں اس کے برخلاف واقعی ہر شخص اپنے بھائی کا رکھوالا بنایا گیا ہے آنحضرت ﷺ نے صاف طور پر فرمایا جیسا کہ ابھی گزرا کہ کلکم راع و کلکم مسئول عن رَّعِیَّتِہ۔ ''تم میں ہر شخص نگہبان ہے اور تم میں ہر شخص سے اس کے زیر ذمہ داری لوگوں کی نسبت باز پرس ہوگی'' قرآن پاک میں صراحت کے ساتھ لوگوں کو نیکی کی ہدایت کرنے اور بدی سے بچنے اور باز رکھنے کا فرض مسلمانوں پر واجب ٹھہرایا گیا ہے تا کہ سوسائٹی کی شرم اور جماعت کا خوف، لوگوں کی نیک چلنی کا ضامن ہو سکے اور ساتھ ہی جماعت کا ہر فرد اپنے دوسرے بھائی کو ضلالت کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لانے کا ذمہ دار ٹھہرے۔

(۱) سفر تکوین۔۴۔۹

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا ایک قصہ بیان فرمایا ہے۔ بنی اسرائیل کے لیے سبت کے دن کسی قسم کا دنیاوی کام کرنا حرام تھا۔ بنی اسرائیل کی ایک آبادی سمندر کے کنارے آباد تھی۔ وہ حیلہ کر کے سبت کے دن مچھلی پکڑ لیتی تھی۔ اس موقع پر اس آبادی میں تین گروہ ہو گئے۔ ایک وہ جو اس گناہ کا علانیہ مرتکب ہوتا تھا' دوسرا وہ جو اس فعل سے ان کو باز رکھنے کی کوشش کرتا تھا اور ان کو سمجھاتا تھا' تیسرا وہ جو گو اس فعل میں شریک نہ تھا لیکن ان کو سمجھانے اور باز رکھنے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا بلکہ خود سمجھانے والوں سے کہتا تھا کہ ایسے ناشنوا لوگوں کو سمجھانے سے کیا فائدہ؟ جن کو اللہ تعالیٰ ان کے اس جرم کی پاداش میں ہلاک کرنے والا ہے لیکن ان پر جب عذاب الٰہی آیا تو صرف دوسرا گروہ بچ گیا۔ جو اپنے تبلیغ کے فرض کو ادا کر رہا تھا۔ بقیہ پہلا اور تیسرا گروہ برباد ہو گیا' پہلا تو اپنے گناہ کی بدولت اور دوسرا اپنے فرضِ تبلیغ کو ترک کرنے کے سبب سے' سورۂ اعراف کے بیسویں رکوع میں یہ پورا قصہ مذکور ہے۔ آخر میں ہے:

﴿وَ اِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا نِ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ○ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْءِ وَ اَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ بَئِيْسٍ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ○﴾ (اعراف: ۱۶۴۔ ۱۶۵)

''اور جب ان میں سے ایک فرقہ بولا کہ تم کیوں ایسے لوگوں کو نصیحت کرتے ہو جن کو خدا برباد کرنے والا یا سزا دینے والا ہے' انہوں نے جواب دیا کہ ہم تمہارے رب کے آگے اپنے سے الزام اتارنے کے لیے ان کو نصیحت کرتے ہیں' اور شاید کہ یہ نیک بن جائیں تو جب وہ بھول گئے جو ان کو سمجھایا گیا تھا تو ہم نے ان کو جو منع کرتے تھے' بچا لیا اور گناہ گاروں کو ان کی بے حکمی کے سبب بڑے عذاب میں پکڑا۔''

یہ قصہ بتاتا ہے کہ اسلام کی نظر میں اپنے دوسرے بھائیوں کو گرنے سے بچانا اور گرتوں کو سنبھالنا اور سہارا دینا کتنا اہم ہے اور اس کے اخلاقی فرائض کا یہ کیسا ضروری حصہ ہے کہ اگر اس کو ادا نہ کیا جائے تو وہ بھی ایسا ہی گناہ گار ہے جیسا وہ جو اس فعل کا مرتکب ہوا' البتہ بھائی کا فرض اس کو سمجھا دینے اور بتا دینے کے بعد ختم ہو جاتا ہے' زبردستی منوا دینا اس کا فرض نہیں اور اس کا کیا بلکہ رسول کا بھی یہ فرض نہیں۔ فرمایا:

﴿مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ﴾ (مائدہ: ۹۹ والنور: ۵۴)

''رسول کا کام فقط پیام پہنچا دینا ہے۔''

اگر یہ فرض ادا ہو گیا تو اس کے سر سے ذمہ داری اتر گئی' اسی لیے سورۂ مائدہ میں فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾ (مائدہ: ۱۰۵)

''اے ایمان والو! تم پر اپنی جان کی فکر لازم ہے۔ تم اگر سیدھے راستے پر ہو تو جو کوئی بھٹکا وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا۔''

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس آیت کو پڑھ کر لوگوں سے کہا کہ ''لوگو! تم کو اس آیت کے ظاہری معنی دھوکے میں نہ ڈالیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے اگر ظالم کو ظلم کرتے لوگ دیکھیں اور پھر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ نہ لیں تو ہوسکتا ہے کہ وہ سب کے سب عذاب میں گرفتار ہو جائیں۔'' ایک دوسرے صحابی ابوثعلبہؓ سے اس آیت کے معنی پوچھے گئے تو جواب دیا کہ میں نے خود آنحضرت ﷺ سے اس کے معنی دریافت کیے' تو فرمایا کہ ''نہیں بلکہ نیکی کا باہم حکم کرو اور بدی سے ایک دوسرے کو روکو لیکن جب دیکھو کہ حرص اور بخل کی اطاعت ہے اور خواہشِ نفسانی کی پیروی ہے اور دنیا کو دین پر ترجیح دی جارہی ہے اور ہر ایک اپنی رائے پر آپ مغرور ہے تو اس وقت عوام کو چھوڑ کر اپنی خبر لو کہ تمہارے بعد وہ زمانہ آنے والا ہے جس میں ثابت قدم رہنا شعلہ کو ہاتھ سے پکڑنا ہے۔'' (۱)

ان تعلیمات نے اخلاق کے اس غلط اصول کو کہ ''کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں؟'' منسوخ کر دیا' واقعہ یہ ہے کہ جب تک اخلاقی تعلیمات کو جماعت اپنے ہاتھ میں نہیں رکھے گی' ان کی حفاظت نہیں ہوسکتی' قوموں کے رسوم و آداب اور ایٹیکیٹس اسی اصول پر قائم ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ بظاہر اخلاقی امور سے ہر شخص کے پرائیویٹ اور نجی قسم کی باتیں معلوم ہوتی ہیں' جن کا نفع ونقصان کرنے والے کی ذات تک محدود ہے مگر ذرا گہری نظر سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اثرات اور نتائج پوری سوسائٹی کو متاثر کرتے ہیں' ان کا اثر ایک سے دوسرے تک اور دوسرے سے تیسرے تک پہنچتا ہے اور اسی طرح رفتہ رفتہ پوری سوسائٹی میں پھیل جاتا ہے' دوسرے یہ کہ اگر ان کی روک تھام نہ کی جائے تو ان برائیوں کی برائی نہایت ہلکی ہو کر رہ جاتی ہے اور لوگ اس کو ایک معمولی بات سمجھنے لگتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہ زہر اتنا پھیلتا ہے کہ ان برائیوں کا برا ہونا بھی مشکوک معلوم ہونے لگتا ہے' اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند روز میں پوری قوم کا اخلاقی مزاج فاسد ہو جاتا ہے' اور وہ اپنی بلندی کے معیار سے نیچے گر جاتی ہے' ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کی مجلس میں فرمایا کہ ''بنی اسرائیل میں اخلاقی تنزل اسی طرح شروع ہوا کہ جب ان میں برائی پھیلنے لگی تو پہلے تو ان کے علما نے منع کیا لیکن جب وہ نہ رکے تو وہ ان کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے اور کھانے پینے لگے' صحبت کے اثر سے وہ بھی ایسے ہی ہو گئے' اللہ تعالیٰ نے داؤدؑ اور عیسیٰ علیہ السلام کی معرفت ان پر لعنت کی۔'' اس کے بعد آپ ﷺ سنبھل کر بیٹھ گئے اور فرمایا ''نہیں! جب تک تم ظالم کا ہاتھ نہ پکڑو اور اس کو حق پر نہ جھکا دو۔'' (۲)

یہ ہے اس باب میں محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم۔

(۱) یہ دونوں حدیثیں ترمذی کتاب التفسیر' (مائدہ) میں ہیں۔ص ۴۹۸' ۴۹۹۔

(۲) جامع ترمذی تفسیر مائدہ۔

اس کے چند شرائط

لیکن یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر جاہل و عامی کا فرض نہیں ہے کیونکہ اگر ایسا ہو تو وہ اس کے بہانہ سے فتنہ وفساد پیدا کر دے گا۔ یہ حق سب سے اول اسی شخص کو حاصل ہے جو خود ان برائیوں سے بچا ہے' قرآن نے کہا:

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ (بقرہ:۴۵)

''کیا تم دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو۔''

اسی طرح یہ ضروری ہے کہ نصیحت اور فہمایش' خوش اسلوبی' نرمی اور مصلحت کے ساتھ کی جائے' خود آنحضرت ﷺ سے فرمایا گیا۔

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ (نحل:۱۲۵)

''تو اپنے رب کے راستہ کی طرف دانائی سے اور اچھی نصیحت سے بلا۔''

حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس بھیجا گیا تو کہہ دیا گیا۔

﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا﴾ (طٰہٰ:۴۴)

''تم دونوں اس سے نرمی سے باتیں کرنا۔''

ایک اور جگہ تعلیم دی گئی۔

﴿وَ عِظْهُمْ وَ قُلْ لَّهُمْ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِیْغًا﴾ (نساء:۶۳)

''اور تو ان کو نصیحت کر اور ان سے کہہ ان کے دل تک پہنچ جانے والی بات۔''

یہ تمام احتیاطیں اور تاکیدیں اس لیے ہیں کہ لوگوں میں ضد اور کد نہ ہونے پائے اور نیکی کی بجائے برائی کا اندیشہ نہ پیدا ہو جائے۔

امن و امان کا قائم رکھنا امام کے ہاتھ میں ہے' اس لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ایسے فوج دارانہ اور زبردستی کے تحکمانہ انتظامات جن کے لیے تنفیذی قوت درکار ہے' صرف حکومت کا فرض ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ ایک برائی کے روکنے کے لیے دوسری قسم کی اور بیسیوں برائیوں کا ارتکاب ہو جائے۔

تجسس اور غیبت کی ممانعت

یہ بات کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اصل مقصد سوسائٹی کی اصلاح اور جماعت کی اخلاقی حفاظت ہے' اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ذاتی معائب کی تحقیق و تفتیش کی جس کا نام تجسس اور ٹوہ لگانا ہے۔ ممانعت کی ہے' کسی مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے مسلمان کے گھر گھس کر اس کی حالت و کیفیت کی جستجو کرے' یہاں تک کہ اسلام کے لٹریچر کا یہ عام محاورہ بن گیا ہے کہ:

محتسب را درونِ خانہ چہ کار؟

اس کا سبب یہی ہے کہ اس طریقۂ اصلاح سے فتنہ وفساد کا دروازہ کھل جاتا اور کوئی شخص اپنے گھر میں بھی محفوظ نہ رہتا۔ لیکن اس کی ممانعت کا اصلی راز یہ ہے کہ جو شخص گھر میں چھپ کر کوئی برا کام کرتا ہے اس کا اثر صرف اس کی ذات تک محدود رہتا ہے، جماعت تک اس کا اثر نہیں پہنچتا۔ اس لیے جماعت کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں، اور اسی کے ساتھ ایک اور نکتہ یہ ہے کہ جو شخص کوئی مخفی گناہ کرتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں شرم و حیا کا جوہر ابھی موجود ہے، جو ممکن ہے کہ آگے چل کر اس کی ہدایت کا سبب بن جائے۔ لیکن اگر لوگ اس کو چھپ چھپ کر دیکھتے پھریں تو ڈر ہے کہ ضد اور ہٹ کی بادِ تند سے اس کے دل کی یہ دھندلی روشنی بھی گل نہ ہو جائے۔ اسلام میں کسی گھر یا کمرہ میں بے اجازت داخلہ کی جو ممانعت ہے اس کی علت بھی یہی ہے جیسا کہ خود آنحضرت ﷺ نے اس کو ظاہر فرمادیا ہے کہ ((انما الاذن لا جل لارؤیه)) یعنی کسی کے گھر میں داخلہ کی اجازت مانگنا اسی لیے ہے کہ وہ اس کو نہ دیکھے۔

اس سلسلہ میں ایک اور اصول یہ ہے کہ اس کی غیبت نہ کی جائے یعنی اس کی برائی اس کے پیچھے دوسروں سے نہ کی جائے کہ یہ اصلاح کی تدبیر نہیں بلکہ ممکن ہے کہ اس کو جب یہ معلوم ہو تو واعظ و ناصح کی طرف سے اس کو ملال ہو اور اس میں مخالفت کی ضد پیدا ہو جائے اور پھر اس کی اصلاح کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے، چنانچہ وحیِ محمدی نے اسی لیے تجسس اور غیبت ان دونوں چیزوں کی قطعی طور سے ممانعت کی، فرمایا:

﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَیُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ یَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ﴾ (حجرات:۱۲)

''اے ایمان والو! بہت سارے گمانوں سے بچتے رہو کہ بے شک بعض گمان گناہ ہیں اور نہ کسی کا اندر کا بھید ٹٹولا کرو اور نہ پیٹھ پیچھے کسی کو برا کہو، بھلا تم میں سے کوئی یہ پسند کرسکتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے، سو تم کو گھن آئے، اللہ سے ڈرو، بے شبہ اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے۔''

پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی مردہ لاش کا گوشت اپنے دانتوں سے نوچنا کہ جس طرح مردہ اپنے اس جسم کی حفاظت نہیں کرسکتا، وہ بھی جس کو تم اس کی غیر حاضری میں برا کہہ رہے ہو، اپنے الزام کی مدافعت نہیں کرسکتا۔ اس غیبت کی ایسے قابلِ نفرت کام سے تشبیہ جس سے ہر انسان کو فطرۃً گھن آجائے، اس سے زیادہ بلیغ نہیں ہوسکتی، اس کی کراہت کی یہ شدت اسی لیے اختیار کی گئی ہے کہ اس طریقہ سے امر بالمعروف کا فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا اور نہ اس شخص کی، جس کی غیبت کی جائے، اصلاح ہوسکتی ہے اور نیز اس سے غیبت کرنے والے شخص کی اخلاقی کمزوری برملا ظاہر ہو جاتی ہے جو ایک مسلمان کی شانِ ایمان کے شایان نہیں، اس لیے آنحضرت ﷺ نے

ارشاد فرمایا کہ "اگر تم لوگوں کی کمزوریوں کی ٹوہ لگاتے پھرو گے تو ان کو برباد کر دو گے۔" (۱)

غور کیجیے کہ آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات میں اخلاق کے کتنے لطیف نکتے پنہاں ہیں۔

توسط اور اعتدال

آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے یہودیت' اور نصرانیت کا دور گزر چکا تھا اور دنیا ایک ایسے مذہب کا انتظار کر رہی تھی جو ان دونوں کا جامع ہو' اسلام دنیا کی اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے آیا۔ اور سلسلۂ نبوت کی ان دونوں بکھری ہوئی کڑیوں کو باہم ملا دیا۔

عدل و انصاف ایک ایسی چیز ہے جس نے دنیا کے نظام کو قائم رکھا ہے اور احسان و رفق و ملاطفت کی آمیزش نے اس کو اور بھی خوش نما بنا دیا ہے' لیکن اسلام سے پہلے مذہبی سیاست کے یہ دونوں جز بالکل الگ الگ تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اب تک دنیا کا نظام غیر مکمل تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت مجسم عدل ہے۔ اس میں احسان و درگزر کی اخلاقی کشش بہت کم رکھی گئی ہے' (۲) اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام مجسم رحمت کا پیام بن کر آئے' ان کی شریعت میں عدل و انصاف کے قائم کرنے کی روح بہت کم پائی جاتی ہے۔ (۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت نے دنیا کے لیے عدل و انصاف کے جو اصول قائم کر دیے تھے' اس کے مقابل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی اخلاقی تعلیم کا اعلان ان لفظوں میں فرمایا:

"تم نے یہ سنا ہوگا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت' (۴) لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ برائی کا برائی کے ساتھ مقابلہ نہ کرو' بلکہ جو شخص تمہارے داہنے گال پر طمانچہ مارے اس کے سامنے دوسرا گال بھی حاضر کر دو' جو شخص لڑنے جھگڑنے میں تمہارے کپڑے پکڑے اس کو چادر بھی دے دو' جو شخص تم کو ایک میل تک بے گاری پکڑ لے جائے اس کے ساتھ دو میل تک چلے جاؤ' جو تم سے مانگے اس کو دو' جو تم سے قرض لینا چاہے اس کو واپس نہ کرو۔

تم نے یہ کہتے ہوئے سنا ہوگا کہ اپنے عزیزوں سے محبت اور دشمنوں سے بغض رکھو' لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو۔" (متی: باب ۵)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے دنیا سے جو کچھ کہا گیا تھا' وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قانون تھا جو بالکل عدل و انصاف پر مبنی تھا لیکن اب جو کچھ دنیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان مبارک سے سن رہی تھی وہ سراسر اخلاق' رحمت اور

---

(۱) سنن ابی داؤد' کتاب الادب' باب النہی عن التجسس۔

(۲) یہود کی سنگ دلی کے سبب سے۔

(۳) یہود کی قانونی لفظ پرستی کی اصلاح کے لیے۔

(۴) یہ موسوی شریعت کی طرف اشارہ ہے۔

احسان تھا لیکن اسلام نے عدل واحسان دونوں میں امتزاج پیدا کر کے دنیا کے نظامِ حکومت کو کامل تر کر دیا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ﴾ (نحل: ۹۰)

''بے شبہ خدا عدل اور احسان (دونوں کا) حکم دیتا ہے۔''

یہ ایک اصولی تعلیم تھی جس نے شریعتِ موسوی وعیسوی کی دو الگ الگ خصوصیتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔

عدل واحسان

''عدل اور احسان'' کے صحیح مفہوم کے سمجھنے کے لیے تھوڑی تفصیل کی ضرورت ہے' قانون کی بنیاد درحقیقت ''عدل'' پر ہے ''عدل'' کے معنی برابر کے ہیں۔ جو شخص کسی کے ساتھ برائی کرے' اس کے ساتھ اتنی ہی برائی کی جائے۔ یہ ''عدل'' ہے اور اس کو چھوڑ دینا اور معاف کر دینا اور درگزر کرنا یہ ''احسان'' ہے' اسلام میں ان دونوں کے الگ الگ مراتب ہیں۔ قانونِ عدل کو جماعت اور سلطنت کے ہاتھ میں اس نے دیا ہے' یہ کسی ایک شخص کا کام نہیں اور احسان ہر شخص کے ہاتھ میں ہے اور یہ محض شخصی معاملہ ہے۔ قانونِ عدل ہی پر جماعت اور حکومت کا نظام قائم ہے' اگر اس کو مٹا دیا جائے تو جماعت اور حکومت کا شیرازہ بکھر جائے اور کسی کی جان ومال وآبرو سلامت نہ رہے' اس لیے حکومت کو سرے سے مٹانا جیسا کہ پال نے عیسائیت کو اس رنگ میں پیش کر کے ہمیشہ کے لیے توراۃ کے قانونِ عدل کا خاتمہ کر دیا' کبھی دنیا کے لیے قابلِ عمل نہیں رہا' خود عیسائی سلطنتوں کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ کسی قانونِ عدل کے بغیر صرف اخلاق کے بھروسہ پر زمین کے ایک چپہ پر بھی امن وامان قائم نہیں رہ سکا اور نہ برائیوں کی روک تھام ہو سکی۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ ایک شخص جب جماعت کے کسی فرد کا کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ گناہ درحقیقت اس شخص کا نہیں ہوتا بلکہ پوری جماعت کے نظام کا ہوتا ہے' اب اگر پہلی ہی دفعہ اس کی باز پرس نہ کی جائے تو بہت ممکن ہے کہ وہ جرأت پا کر اسی گناہ کا ارتکاب جماعت کے کسی دوسرے فرد کے ساتھ کرے' اس لیے کسی مظلوم کو اپنے ظالم کے معاف کر دینے کا پورا پورا حق نہیں ہے' کیونکہ وہ اس طرح ایک فرد کے ساتھ نیکی کر کے جماعت کے ہزاروں لاکھوں افراد کے ساتھ گویا برائی کا ارتکاب کر رہا ہے۔ اس لیے اخلاق کو قانونِ عدل کی جگہ دینے میں بہت کچھ غور وفکر اور احتیاط کی ضرورت ہے جو شریعتِ محمدی میں پوری طرح برتی گئی کیونکہ وہ دنیا کی دائمی شریعت بننے والی تھی۔

پھر سب لوگ دنیا میں ایک طبیعت اور فطرت کے پیدا نہیں ہوئے۔ بعض نیک' نرم مزاج' صابر اور متحمل پیدا ہوئے ہیں جن کے لیے معاف کر دینا' درگزر کرنا اور بدلہ نہ لینا آسان ہے' اور بعض غصہ ور' سخت مزاج اور تند خو پیدا ہوئے ہیں جو بدلہ اور بدلہ سے زیادہ لیے بغیر چین نہیں لے سکتے۔ ان کے لیے اتنی ہی اصلاح بہت ہے کہ بدلہ سے زیادہ کرنے سے ان کو روک دیا جائے۔ اور ''برائی' برائی کے بقدر'' کے اصول پر عمل کرنے کے لیے ان کو رضا

مند کر لیا جائے۔ اس لیے ایک عالم گیر شریعت کے لیے جو تمام دنیا کی اصلاح کے لیے آئی ہو عدل اور احسان دونوں اصولوں کی جامعیت کی ضرورت تھی۔

قانون اور اخلاق

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ دنیا میں امن و امان اور عدل و انصاف کے قیام اور فتنہ و فساد اور برائیوں کے انسداد کے لیے دو چیزیں ہیں، قانون اور اخلاق۔ اور گو ان دونوں کا منشا ایک ہی ہے مگر ان کے منزل مقصود تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں، اور تنہا ان میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ کمی ہے، جس کی تلافی دوسرے سے ہوتی ہے۔ قانون برائیوں کو تو روک دیتا ہے، مگر دل میں اس برائی کی طرف سے کراہت کا کوئی روحانی کیف پیدا نہیں کرتا جو انسانیت کی جان ہے اور اخلاق پر عمل کرنے کے لیے ہر شخص کو بزور مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اس کے ذریعہ عدل و انصاف کا قیام اور برائیوں کا استیصال کلیتہً نہیں ہوسکتا، توراۃ محض قانون ہے اور انجیل محض اخلاق، اسی لیے یہ دونوں الگ الگ امن و امان اور عدل و انصاف کے قیام اور فتنہ و فساد اور بدیوں اور برائیوں کے لیے پوری طرح کافی نہیں۔ آنحضرت ﷺ ایک ایسی کامل شریعت لے کر آئے جو عدل و احسان اور قانون و اخلاق دونوں کی جامع ہے۔

اس جامعیت کا اصول، شریعتِ محمدی میں دو حیثیتوں سے پایا جاتا ہے، ایک تو یہ کہ اس نے نہ تو یہودیت کی طرح اخلاق کو بھی قانون کی شکل دے دی اور نہ عیسائیت کی طرح قانون کو مذہب کے ہر حصہ سے خارج کر کے قانون کو بھی اخلاق بنا دیا۔ بلکہ اس نے قانون اور اخلاق دونوں کے درمیان حدِ فاصل قائم کر کے ہر ایک کی حد مقرر کر دی اور اپنی شریعت کی کتاب میں قانون کو قانون کی جگہ اور اخلاق کو اخلاق کی جگہ رکھ کر انسانیت کو تکمیل تک پہنچا دیا۔

اسلام نے ان برائیوں کے انسداد کو جن کا اثر براہِ راست دوسروں تک پہنچتا ہے، قانون کے تحت میں رکھا۔ مثلاً قتل، سرقہ، رہزنی، تہمت لگانا، چنانچہ ان جرائم کے لیے قرآن نے سزا مقرر کی ہے، جو حکومتِ اسلام کی طرف سے دی جاسکتی ہے، اور جو باتیں ایک انسان کی ذاتی تکمیلِ نفس کے متعلق تھیں، ان کو اخلاق کے دائرہ میں رکھا۔ مثلاً جھوٹ نہ بولنا، رحم کھانا، غریبوں کی امداد وغیرہ۔ اس طرح شریعتِ محمدی اس حیثیت سے قانون اور اخلاق دونوں کا مجموعہ ہے۔

اسلام ایک اور حیثیت سے بھی قانون اور اخلاق کا مجموعہ ہے، قانوناً اس نے ہر مظلوم اور صاحبِ حق کو یہ اختیار بخشا ہے کہ وہ چاہے تو توراۃ کے حکم کے مطابق اس کا بدلہ لے، لیکن اس سے بلند تر بات یہ رکھی ہے کہ وہ انجیل کے مطابق اس ظالم کو معاف کر دے بلکہ برائی کے بجائے اس کے ساتھ بھلائی اور نیکی کرے۔ اس مجموعی تعلیم نے حکومت کے قانون انتظام و عدل اور شخص کی اخلاقی روحانیت کی تکمیل دونوں کو اپنی اپنی جگہ قائم رکھا ہے

اور اس لیے وہ نسل انسانی کی حفاظت‘ ترقی اور نشو ونما کی پوری طرح متکفل ہے‘ وہ عدل و انصاف کے بزور قائم کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے اور ذاتی اخلاق کے ذریعہ سے لوگوں کی روحانی تکمیل میں بھی کسی طرح حارج نہیں‘ وہ نہ یہودیوں کی شریعت کی طرح صرف مردہ جسم ہے اور نہ عیسائیوں کی تعلیم کی طرح غیر محسوس روح ہے بلکہ وہ جسم و جان کا مجموعہ اور زندہ و محسوس پیکر ہے۔

عفو اور انتقام

موسوی‘ عیسوی اور محمدی اخلاقی تعلیمات میں باہم جو باریک فرق ہے وہ اسی قانون اور اخلاق کی علیحدگی اور ترکیب کا نتیجہ ہے۔ اسلامی قوانین کو پیشِ نظر رکھ کر مخالفین نے اکثر کہا ہے کہ پیغمبرِ اسلام کی تعلیم میں اخلاقی روح نہیں۔ لیکن اگر وہ قانونِ محمدی کے ساتھ ساتھ اخلاقِ محمدی کو بھی سامنے رکھتے تو ان کو یہ شبہ پیش نہ آتا۔ معلوم ہو چکا کہ توراۃ کا اصول عادلانہ انتقام پر مبنی ہے۔ اس کا حکم ہے:

’’اور جو انسان کو مار ڈالے گا سو مار ڈالا جائے گا۔۔۔۔۔۔۔۔ اور اگر کوئی اپنے ہمسایہ کو چوٹ لگائے‘ سو جیسا کرے گا ویسا پائے گا‘ توڑنے کے بدلے توڑنا‘ آنکھ کے بدلے آنکھ‘ دانت کے بدلے دانت۔‘‘ (احبار ۲۴‘ ۱۷‘ خروج ۲۱‘ ۱۲‘ گنتی ۳۵‘ ۳۱‘ استثناء ۱۹۔ ۱۱۔ ۱۲)

انجیل کی تعلیم سراسر عفو ہے‘ اس کا حکیمانہ وعظ یہ ہے۔

’’تم سن چکے کہ کہا گیا‘ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت‘ پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ ظالم کا مقابلہ نہ کرنا‘ بلکہ جو تیرے داہنے گال پر تھپڑ مارے‘ دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دے۔‘‘ (متی: ۵‘ ۳۸)

لیکن اس سرتاپا روحانی اخلاقیت پر ایک دن بھی دنیا کا نظام قائم رہ سکتا ہے؟ اور کبھی کوئی عیسائی قوم اور عیسائی ملک اس رحیمانہ وعظ پر عمل کر سکا؟ محمد رسول اللہ ﷺ نے جو تعلیم پیش کی وہ عفو اور عادلانہ انتقام یعنی اخلاق اور قانون دونوں کا مجموعہ ہے۔ عدل قانون ہے اور احسان اخلاق ہے‘ اسلام کے تمام احکام میں یہ دونوں اصول جاری ہیں‘ اوپر جس مسئلہ کے متعلق توراۃ اور انجیل کے احکام نقل کیے گئے ہیں اس کی نسبت محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ یہ تعلیم ہم کو ملی ہے:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِى الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى﴾ (بقرہ: ۱۷۸)

’’اے ایمان والو! تم پر مقتولوں میں برابری کے بدلے کا حکم ہوا! آقا کے بدلے آقا‘ غلام کے بدلے غلام‘ عورت کے بدلے عورت۔‘‘

یہ تو معاوضہ کا عادلانہ قانون تھا‘ اس کے بعد ہی اخلاق کا حکم ہے:

﴿فَمَنْ عُفِىَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَىْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ

مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ رَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِکَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ﴾ (بقرہ:۱۷۹)

''تو اگر اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا گیا' تو دستور کے مطابق اس کی پیروی کرنا اور نیکی کے ساتھ اس کو ادا کرنا ہے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہوئی تو جو کوئی (مقتول کے رشتہ داروں میں سے) اس (معافی یا خون بہا لینے) کے بعد پھر زیادتی کرے تو اس کے لیے دکھ کی سزا ہے۔''

ان آیتوں کی بلاغت پر غور کیجیے کہ قاتل اور مقتول کے رشتہ داروں کے درمیان کھلی دشمنی کے بعد ان کے جذبۂ رحم کی تحریک کی غرض سے قاتل کو مقتول کے رشتہ داروں کا بھائی کہہ کر بتایا گیا' ساتھ ہی چونکہ توراۃ کے حکم میں خون بہا لے کر معافی کی دفعہ نہ تھی اس لیے اس عفو کو آسانی اور رحمت سے تعبیر کیا گیا اور قاتل کی نیکی اور احسان کی یاد دلائی گئی اور مقتول کے رشتہ داروں کو معاف کر دینے یا خون بہا لے لینے کے بعد انتقام لینے پر عذابِ الٰہی کا ڈر سنایا گیا۔ دیکھو کہ اسلام کا حکم توراۃ اور انجیل' قانون اور اخلاق' انتقام اور عفو دونوں کو کس خوبی سے یکجا کرتا ہے۔

قرآن نے اسی جامعیت کو دوسری جگہ ظاہر کیا ہے:

﴿وَ کَتَبْنَا عَلَیْهِمْ فِیْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَ الْعَیْنَ بِالْعَیْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ وَ الْجُرُوْحَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ کَفَّارَةٌ لَّهٗ وَ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ○ وَ قَفَّیْنَا عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ بِعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ اٰتَیْنٰهُ الْاِنْجِیْلَ فِیْهِ هُدًی وَّ نُوْرٌ وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ هُدًی وَّ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ○﴾ (مائدہ:۴۵-۴۶)

''اور ہم نے بنی اسرائیل پر توراۃ میں یہ حکم لکھا کہ جان کے بدلے جان' آنکھ کے بدلے آنکھ' ناک کے بدلے ناک' دانت کے بدلے دانت اور زخموں میں برابر کا بدلہ تو جس نے بخش دیا تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے' اور جس نے خدا کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہیں کیا تو وہی ظالم ہیں۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کے ان پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا جو اپنے آگے کی کتاب توراۃ کی تصدیق کرتا تھا اور اس کو انجیل دی جس میں رہنمائی اور روشنی ہے اور جو اپنے آگے کی کتاب توراۃ کی تصدیق کرتی ہے اور جو پرہیزگاروں کے لیے ہدایت اور وعظ و نصیحت ہے۔''

(۲) یہ فوج داری کے سب سے سخت گناہ کے متعلق قانونی و اخلاقی احکام تھے' مالی معاملات کے متعلق بھی اسلام اسی جامعیت کے نکتہ کو پیش نظر رکھتا ہے۔ فرمایا:

﴿وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَکُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِکُمْ﴾ (بقرہ:۲۷۹)

''اور اگر تم سود سے باز آ گئے تو تمہارا وہی حق ہے جو اصل سرمایہ تم نے دیا تھا۔''

یہ تو قانون تھا' اب اخلاق دیکھیے:

﴿وَ اِنۡ کَانَ ذُوۡ عُسۡرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیۡسَرَۃٍ وَ اَنۡ تَصَدَّقُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ﴾ (بقرہ:۲۸۰)

''اور اگر قرض دار تنگ دست ہو تو اس کو اس وقت تک مہلت ہے جب تک اس کو کشائش ہو اور بالکل معاف کر دینا تمہارے لیے زیادہ اچھا ہے اگر تم کو سمجھ ہو۔''

جزئیات کو چھوڑ کر اصولی طور سے بھی اس جامعیت کو قائم رکھا ہے۔ فرمایا:

﴿وَ اِنۡ عَاقَبۡتُمۡ فَعَاقِبُوۡا بِمِثۡلِ مَا عُوۡقِبۡتُمۡ بِہٖ وَ لَئِنۡ صَبَرۡتُمۡ لَہُوَ خَیۡرٌ لِّلصّٰبِرِیۡنَ﴾ (نحل :۱۲۶)

''اور اگر سزا دو تو اتنی ہی جتنی تکلیف تم کو دی گئی ہے اور اگر صبر کر لو تو یہ صبر کرنے والوں کے لیے بہت بہتر ہے۔''

اسی مفہوم کو ایک اور آیت میں اس طرح ادا کیا گیا:

﴿وَ الَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَصَابَہُمُ الۡبَغۡیُ ہُمۡ یَنۡتَصِرُوۡنَ وَ جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثۡلُہَا فَمَنۡ عَفَا وَ اَصۡلَحَ فَاَجۡرُہٗ عَلَی اللّٰہِ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیۡنَ ۝﴾ (شوریٰ:۳۹۔۴۰)

''اور وہ لوگ کہ جب ان پر چڑھائی ہو تب وہ بدلہ لیتے ہیں اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے تو اگر معاف کر دیا اور نیکی کی تو اس کا ثواب دینا خدا پر ہے، وہ ظالموں کو پیار نہیں کرتا۔''

آیت کے پہلے ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان ازخود کسی پر ظلم کرنے میں پہل اور سبقت نہ کریں لیکن اگر کوئی ان پر ظلم کرے تو وہ اس ظلم کا قانوناً اتنا ہی بدلہ لے سکتے ہیں جتنا ان پر کیا گیا۔ کیونکہ قانون یہی ہے کہ برائی کا بدلہ اتنی ہی برائی ہے جیسا کہ توراۃ میں بیان ہوا ہے، لیکن اگر کوئی مسلمان اخلاقاً اس ظلم کو معاف کر دے اور نہ صرف معاف ہی بلکہ اس برائی کی جگہ کچھ نیکی اور بھلائی بھی کرے ﴿وَ اَصۡلَحَ﴾ تو اس کو خدا کی طرف سے ثواب ملے گا اور بلاغت یہ ہے کہ اس صابر مظلوم کی خاطر فرمایا کہ اس کو ثواب اور اجر دینا خدا پر ہے۔

الغرض عفو اور انتقام میں سے کسی ایک ہی کو اختیار کرنا، دنیا کے جسمانی یا روحانی نظام کا نقص ہے، اگر انتقام اور سزا کا اصول نہ ہو تو جماعت کا نظام قائم نہیں رہ سکتا اور نہ ملک میں امن و امان رہ سکتا ہے اور نہ افراد کے بڑے حصہ کو برائیوں سے باز رہنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے، اور اگر عفو کا اصول نہ ہو تو روح کی بلندی اور اخلاق کی پاکیزگی کوئی چیز نہ رہے۔ حالانکہ وہی ایک سچے مذہب کا مطلوب ہے، اس لیے ان میں سے کسی ایک کو لینا اور دوسرے کو چھوڑ دینا نظامِ ہستی کو آدھا رکھنا اور آدھا مٹا دینا ہے۔

اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی تعلیم کو لے کر آئے، جس کی نظر انسانی ہستی کے پورے نظام پر ہے اس نے یہ کیا کہ سزا اور انتقام کو تو جماعت اور حکومت کے ہاتھ دے دیا اور اس حکم کے ساتھ دیا کہ اس کے اجرا میں کوئی رحم نہ کیا جائے اور نہ اس میں بڑے چھوٹے، امیر و غریب اور اپنے اور غیر میں کوئی فرق کیا جائے تاکہ جماعت اور

ملک کا نظام قائم رہے، دوسری طرف عفو کو شخصیت کے مدارجِ کمال کا ذریعہ بتایا تا کہ اشخاص کی روحانی پاکی اور اخلاقی بلندی برابر ترقی کرتی جائے۔

جماعتی انتظامات کے قیام کے لیے سختی کا یہ عالم ہے کہ ایک خاص سزا کے اجرا کے وقت حکم ہوتا ہے:

﴿وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ (نور:۲)

''اور تم کو اللہ کے حکم چلانے میں ان دونوں گناہ گاروں پر ترس نہ آئے، اگر تم کو خدا پر اور قیامت پر ایمان ہے۔''

یعنی اس گناہ کی جو سزا خدا کے ہاں ہے اور جو قیامت میں ہوگی، وہ اس سے کہیں زیادہ سخت ہوگی، اس لیے اس گناہ کی سزا دنیا ہی میں دے دینا درحقیقت اپنے گناہ گار بھائی پر احسان کرنا ہے اس لیے اس سزا کے دینے میں نرمی نہ کی جائے۔

کسی سزا کے جاری کرنے میں اونچے نیچے اور امیر و غریب کے درمیان فرق نہ کرنے کا یہ حال ہے کہ ایک دفعہ جب ایک شریف مسلمان عورت سرقہ کے جرم میں گرفتار ہوئی اور قریش نے چاہا کہ اس کو سزا نہ دی جائے اور اس کے لیے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں سفارشیں پہنچائی گئیں تو فرمایا ''اے لوگو! تم سے پہلی قومیں اسی لیے ہلاک ہوئیں کہ جب کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور اگر کوئی معمولی آدمی اسی کام کو کرتا تو اس کو سزا دیتے، خدا کی قسم! اگر محمد کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹتا۔'' (۱)

دوسری طرف عفو کا یہ حال ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ''آنحضرت ﷺ نے کبھی کسی سے اپنا ذاتی انتقام نہیں لیا۔ الا یہ کہ اس نے خدا کے کسی حکم کو توڑا ہے۔ (۲) تو اس کو (قانونًا) سزا ملی ہے۔'' یہ عمل تھا۔ تعلیم کی کیفیت یہ ہے کہ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ''میں نے آپؐ کی خدمت میں قصاص کا کوئی مقدمہ پیش ہوتے نہیں دیکھا۔ لیکن یہ کہ اس میں آپؐ نے معاف اور درگذر کرنے کا مشورہ دیا۔'' (۳) یعنی قصاص کے بجائے بالکل معافی یا دیت (زرِ تاوان یا خون بہا) لے کر معاف کر دینے کو فرمایا۔ معمولی چھوٹے جرائم کی نسبت صحابہؓ سے فرمایا۔ ''آپس میں گناہوں کو معاف کر دیا کرو لیکن مجھ تک جب وہ واقعہ پہنچے گا تو سزا ضروری ہو جائے گی۔'' (۴) یعنی جب مرافعہ اور استغاثہ حکومت کے سامنے پیش ہو جائے گا، تو پھر سزا ہونا واجب ہے تا کہ حکومت کا رعب دلوں پر قائم رہے، چنانچہ ایک دفعہ کا واقعہ کہ ایک صاحب ایک چادر اوڑھے سو رہے تھے، ایک شخص نے چپکے سے چادر اتار لی، وہ پکڑا گیا اور عدالتِ نبوی میں پیش کیا گیا۔ آپؐ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ جن صاحب کی چادر تھی انہوں نے آ

(۱) صحیح بخاری جلد دوم کتاب الحدود، ص ۱۰۰۲۔

(۲) ایضاً کتاب الحدود۔

(۳) ابوداؤد، نسائی کتاب الدیات۔

(۴) ابوداؤد کتاب الحدود۔

کر عرض کی کہ ''یا رسول اللہ ﷺ! کیا تیس درہم کی ایک چادر کے لیے ایک انسان کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ میں یہ چادر س کے ہاتھ ادھار فروخت کر دیتا ہوں'' فرمایا کہ ''میرے پاس لانے سے پہلے یہ کیوں نہیں کر لیا۔''(۱) یہ تو اس عفو کا حال ہے جس کو ایک حد تک قانونی جرائم کی صورت حاصل ہے اور اس لحاظ سے قانون محمدی موجودہ سلطنتوں کے نوانین سے زیادہ نرم ہے' زیادہ منصفانہ اور عقل کے زیادہ مطابق ہے لیکن عفو کی عام اخلاقی تعلیم کا دائرہ اسلام میں س سے بھی زیادہ وسیع ہے۔

عفو و درگذر کی تعلیم

اخلاق کی سب سے بھاری اور دشوار ترین تعلیم جو اکثر نفوس پر نہایت شاق گذرتی ہے وہ عفو' درگذر' ضبط نفس' تحمل اور برداشت کی ہے لیکن اسلام نے اس سنگلاخ زمین کو بھی نہایت آسانی سے طے کیا ہے' سب کو معلوم ہے کہ سلام میں شرک اور بت پرستی سے کتنی شدید نفرت ظاہر کی گئی ہے' اور خدائے تعالیٰ کی توحید اور عظمت وجلالت کا کتنا علیٰ اور ناقابل تبدیل تصور اس نے پیش کیا ہے' جو خاص اسلام کا امتیازی حصہ ہے تاہم مسلمانوں کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ ''تم مشرکوں کے بتوں کو برا بھلا نہ کہو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ چڑ میں تمہارے خدا کو برا کہہ بیٹھیں۔''

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا ۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (انعام:۱۰۹)

''اور جن کو یہ مشرک اللہ کے سوا پکارتے ہیں ان کو برا نہ کہو کہ وہ اللہ کو بے ادبی سے نادانستہ برا کہہ بیٹھیں۔''

یہ برداشت کی کتنی انتہائی تعلیم ہے۔ پیغمبر کو خطاب ہوا کہ کفار اور مشرکین کے ظلم وستم اور گالی گلوچ پر صبر کرو' ور ان کو معاف کرو اور اسی کی پیروی کا حکم عام مسلمانوں کو ہو رہا ہے۔

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ ۝ وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ (اعراف:۱۹۹۔۲۰۰)

''معاف کرنے کی خو پکڑ اور نیک کام کو کہہ اور جاہلوں سے کنارہ کر' اور اگر تجھ کو شیطان کی کوئی چھیڑ ابھار دے (یعنی غصہ آجائے) تو خدا کی پناہ پکڑ وہ ہے سنتا جانتا۔''

سکون کی حالت میں عفو و درگذر آسان ہے' مگر ضرورت ہے کہ انسان غصہ میں بھی بے قابو نہ ہونے پائے' صحابہؓ کی تعریف میں فرمایا۔

﴿وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ﴾ (شوریٰ:۳۷)

''اور جب غصہ آئے جب بھی وہ معاف کر دیتے ہیں۔''

نیکو کاروں کی تعریف میں ایک اور جگہ یہ فرمایا گیا کہ اپنے غصہ کو دبانا اور معاف کرنا خدا کا پیارا بننے کا ذریعہ

(۱) ایضاً کتاب الحدود۔

ہے:

﴿وَ الۡکٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ وَ الۡعَافِیۡنَ عَنِ النَّاسِ وَ اللّٰہُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ﴾ (آل عمران:۱۳۴)

”اور جو غصہ کو دبانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں اور اللہ اچھے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔“

انتقام کی قدرت ہونے اور استطاعت رکھنے کے باوجود دشمن کو معاف کر دینا بہت بڑی بلند ہمتی کا کام ہے۔ فرمایا:

﴿وَ لَمَنۡ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ﴾ (شوریٰ:۴۳)

”اور البتہ جس نے برداشت کیا اور معاف کیا تو وہ بےشک ہمت کے کام ہیں۔“

اس برداشت اور عفو کو وحیِ محمدی نے اپنے الفاظ میں ”عزم“ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جو خاص انبیاءؑ اور پیغمبروں کی توصیف میں آیا ہے، فرمایا:

﴿فَاصۡبِرۡ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الۡعَزۡمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ (احقاف:۳۵)

”اور برداشت کر، جس طرح ہمت اور عزم والے پیغمبروں نے برداشت کیا۔“

نیکی کے پھیلانے اور بدی کے روکنے میں ایک مسلمان کو ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنی چاہیے کہ یہ بڑی ہمت کا کام ہے، فرمایا:

﴿وَ اۡمُرۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ انۡہَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَ اصۡبِرۡ عَلٰی مَاۤ اَصَابَکَ اِنَّ ذٰلِکَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ﴾ (لقمان:۱۷)

”اچھی بات بتا اور بری بات سے روک اور جو تجھ پر پڑے اس کو سہار لے کہ یہ ہمت کے کام ہیں۔“

کفار اور مشرکین کی بدگوئیوں کو اور ان کی لائی ہوئی مصیبتوں کو برداشت کر لینا بھی بہادری ہے، فرمایا:

﴿وَ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَ تَتَّقُوۡا فَاِنَّ ذٰلِکَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ﴾ (آل عمران:۱۸۶)

”اور اگر صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ بڑے ہمت کے کام ہیں۔

اوپر کی تمام آیتوں میں صبر، برداشت، تحمل اور عفو و درگزر کو بڑی ہمت اور اخلاقی بہادری کا کام بلکہ خدا کی محبوبی کا سبب بتایا گیا اور مسلمان کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دی گئی ہے، اس سے آگے بڑھ کر دیکھئے کہ حسب ذیل آیت میں ایمان والوں کو دشمنوں کو بھی معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

﴿قُلۡ لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یَغۡفِرُوۡا لِلَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ اَیَّامَ اللّٰہِ﴾ (جاثیہ:۱۴)

”(اے پیغمبر!) ایمان والوں سے کہہ دو کہ ان کو جو ایام اللہ کی امید نہیں رکھتے، معاف کریں۔“

ایام اللہ (خدا کی گرفت اور شہنشاہی کے دن) کی جو امید نہیں رکھتے، ظاہر ہے کہ یہ وہی ہیں جو کافر و مشرک ہیں اب دیکھیے کہ کافر و مشرک کے خلاف اسلام کو جو شدید بیزاری ہے اس کے باوجود مسلمانوں کو یہ تاکید کی جاتی

ہے کہ وہ ان کو معاف کریں اور ان کی خطاؤں سے درگزر کریں' کیا اس سے زیادہ اسلام سے کسی نرمی کا مطالبہ ہے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی ترغیب کی خاطر اس عفوودرگزر اور معافی کو اپنا خاص وصف بتا کر ان کو اپنی پیروی کی تلقین فرماتا ہے:

﴿اِنْ تُبْدُوْا خَیْرًا اَوْ تُخْفُوْہُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا قَدِیْرًا﴾ (نساء:۱۴۹)

''اگر کسی نیکی کے کام کو کھلے طور سے کرو یا چھپا کر کرو یا کسی برائی کو معاف کرو' تو یہ مسلمان کی شان ہے کیونکہ خدا معاف کرنے والا قدرت والا ہے۔''

یعنی جب گناہ گاروں اور بدکاروں کو معاف کرنا خدا کی صفت ہے تو بندوں میں بھی خدا کی اس صفت کا جلوہ پیدا ہونا چاہیے اور اس تعلیم میں قرآنِ پاک یہ بلاغت اختیار کرتا ہے کہ فرماتا ہے کہ تمہارا خداوند تعالیٰ تو ہر قسم کی قدرت علی الاطلاق رکھنے کے باوجود اپنے بندوں کو معاف کرتا ہے تو انسان جس کی قدرت محدود ہے اور جس کا اختیار مشروط ہے اور جس کی عاجزی و درماندگی ظاہر ہے اس کو تو بہر حال معاف ہی کرنا چاہیے' اسی کے قریب قریب یہ آیت پاک بھی ہے:

﴿وَلْیَعْفُوْا وَ لْیَصْفَحُوْا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰہُ لَکُمْ وَ اللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ (نور:۲۲)

''اور چاہیے کہ معاف کریں اور درگزر کریں' کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کرے' اللہ بخشنے والا' مہربان ہے۔''

یعنی تم دوسروں کو معاف کرو تو اللہ تم کو معاف کر دے گا اس میں عفوودرگزر کی کتنی عظیم الشان ترغیب ہے۔

برائی کی جگہ نیکی

عفوودرگزر کے بعد اس سے زیادہ اہم تعلیم یہ ہے کہ جو برائی کرے نہ صرف یہ کہ اس کو معاف کرو' بلکہ اس کے ساتھ بھلائی کرو اور جو عداوت رکھے اس کے ساتھ حسنِ سلوک کرو' اس تعلیم ربانی پر عمل کرنے والوں کا نام خدا نے صابر اور ذُوْحَظٍّ عَظِیْمٍ یعنی ''بڑا خوش قسمت'' رکھا ہے اور بتایا ہے کہ دشمن کو دوست بنا لینے کی یہ بہترین تدبیر ہے' فرمایا:

﴿لَا تَسْتَوِی الْحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَ بَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ○ وَ مَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَ مَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ﴾

(حم السجدۃ:۳۴۔۳۵)

''نیکی اور بدی برابر نہیں' تو برائی کا جواب بہتری سے دے پھر دیکھ کہ وہ جس کے اور تیرے درمیان دشمنی ہے وہ ایسا ہو جائے گا جیسا ناتے دار دوست' اور یہ بات انہی کو حاصل ہوتی ہے جو برداشت (صبر) رکھتے ہیں اور جس کی بڑی قسمت ہے۔''

اس عظیم الشان تعلیم کو اللہ تعالیٰ نے ''بڑی خوش قسمتی'' سے تعبیر کیا ہے' اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے' پھر دوسری جگہ فرمایا مشرکوں اور کافروں کے طعنوں کا برا نہ مانو کیونکہ دینی معاملہ میں بھی غصہ سے کوئی بے جا حرکت کر بیٹھنا شیطان کا کام ہے' اگر ایسا موقع پیش آئے تو خدا سے دعا مانگنی چاہیے کہ وہ شیطان کے پھندے سے بچالے اور غصہ سے محفوظ رکھے۔

﴿اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَصِفُوْنَ○ وَ قُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ وَ اَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ○﴾ (مؤمنون:۹۷۔۹۸)

''مشرکوں کی برائی کا جواب بھلائی سے دے' ہم جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں اور کہہ کہ اے میرے پروردگار! میں شیطانوں کی چھیڑ سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور اے رب اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔''

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے نماز' خیرات' صبر اور عفو کا ذکر فرمایا ہے اور ان کاموں کے بدلہ میں جنت کا وعدہ کیا ہے' مگر تمام مذکورہ بالا نیکیوں میں سے دوبارہ صرف صبر ہی کو خصوصیت کے ساتھ اس جنت کے ملنے کا سبب قرار دیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَ یَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ○ وَالَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً وَّ یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَی الدَّارِ○ جَنّٰتُ عَدْنٍ﴾ (رعد:۲۱۔۲۳)

''اور جو لوگ اس کو جوڑتے ہیں جس کے جوڑنے کا حکم ان کو اللہ نے دیا ہے (یعنی ایک دوسرے کا حق) اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور حساب کے برے انجام سے خوف کھاتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کی خوشی کے لیے صبر کرتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں اور ہم نے ان کو جو روزی دی اس میں سے چھپے اور کھلے خیرات کرتے ہیں اور برائی کے بدلہ بھلائی کرتے ہیں انہی کے لیے ہے پچھلا گھر' ہمیشہ رہنے کے باغ۔''

ان سے کہا جائے گا۔

﴿سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَی الدَّارِ﴾ (رعد:۲۴)

''تم پر سلامتی ہو اس کے بدلے میں کہ تم نے صبر کیا سو خوب ملا پچھلا گھر۔''

آپ نے دیکھا کہ جنت کی اس بشارتِ غیبی میں نہ تو نماز کا ذکر ہے نہ خیرات کا اور نہ خوفِ خدا کا صرف ایک صبر کی جزا کی خوش خبری ہے۔ علاوہ ازیں اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ برائی کے بدلہ نیکی کرنا ایسی اہم چیز ہے کہ نماز اور زکوٰۃ جیسے فرائض کے پہلو بہ پہلو اس کا بھی ذکر کیا جائے۔ ایک اور آیت میں نومسلم یہودیوں کو

اپنے برخلاف اپنی ہم قوموں سے جو دلآ زار فقرے اور اعتراضات سننے پڑتے ہیں اور وہ اس پر صبر کرتے ہیں اس کی تعریف کی گئی ہے کہ اسلام کے اثر سے اب ان کا یہ حال ہو گیا ہے کہ وہ برائی کی جگہ بھلائی کرتے ہیں:

﴿أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ○ وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ﴾ (قصص: ۵۴-۵۵)

''وہ لوگ صبر کے سبب سے اپنا حق دہرا پائیں گے اور وہ برائی کا جواب بھلائی سے دیتے ہیں' اور ہمارا دیا کچھ خیرات کرتے ہیں اور جب کوئی نکمی بات سنتے ہیں' تو اس سے درگزر کر لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارے کام ہیں' اور تمہارے لیے تمہارے کام۔ سلامت رہو' ہم کو بے سمجھوں سے مطلب نہیں۔''

ان آیتوں کے ایک ایک ٹکڑے پر غور کیجیے۔ نہ صرف یہ کہ برائی کا بدلہ نیکی کے ساتھ دیتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں بلکہ ان کے حق میں سلامتی کی دعائے خیر بھی کرتے ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''قرابت کا حق ادا کرنے والا وہ نہیں ہے جو احسان کے بدلہ میں احسان کرتا ہو' بلکہ وہ ہے جو بدسلوکی پر سلوک کرتا ہو۔'' (۱) ایک دفعہ ایک صحابی نے آکر عرض کی کہ ''اے خدا کے پیغمبر! میرے کچھ رشتہ دار ہیں جن کے ساتھ میں تو سلوک کرتا ہوں مگر وہ بدسلوکی کرتے ہیں' میں نیکی کرتا ہوں اور وہ بدی کرتے ہیں۔ میں حلم اور بردباری سے پیش آتا ہوں اور وہ جہالت کرتے ہیں۔'' آپ نے فرمایا ''اگر ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو تو تم ان کے منہ میں مٹی بھر رہے ہو۔'' یعنی نیکی کے لقمہ سے ان کا منہ بند کر رہے ہو اور جب تک تم اس روش پر قائم رہو گے' خدا کی مدد شامل رہے گی۔ (۲) حذیفہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ ''تم ہر ایک کے پیچھے نہ چلو' تم کہتے ہو کہ اگر لوگ تیرے ساتھ بھلائی کریں گے تو ہم بھی کریں گے' اور اگر وہ ظلم کریں گے تو ہم بھی کریں گے یہ نہیں بلکہ اپنے کو پرسکون رکھو' لوگ تمہارے ساتھ بھلائی کریں تو بھلائی کرو اور اگر برائی کریں تو بھی ظلم نہ کرو۔'' (۳) وہ لوگ جو اسلام اور مسلمانوں کو اپنی فریب کاریوں' جھوٹے وعدوں' خیانت کارانہ معاہدوں اور پرفریب صلحوں سے دھوکا دیا کرتے تھے ان کے متعلق بھی آنحضرت ﷺ کو یہی ہدایت ہوئی:

﴿وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَىٰ خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ (مائدہ: ۱۳)

(۱) صحیح بخاری بحوالہ مشکوۃ باب البر والصلۃ۔
(۲) صحیح مسلم بحوالہ مشکوۃ باب البر والصلۃ۔
(۳) جامع ترمذی کتاب البر والصلۃ ص ۳۳۴ (غریب)

''اوران میں سے چند کے سوا اوروں کی کسی نہ کسی خیانت سے تو ہمیشہ مطلع ہوتا رہتا ہے تو تو ان کو معاف کرا اوران کے قصور سے درگزر کر کہ اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

غور کا مقام ہے کہ ایسی خیانت کار قوم کو بھی معاف کرنا اوران کے قصوروں سے درگزر کرنا' اسلام میں وہ نیکی ہے جس کے سبب سے خدا ان نیکی کرنے والوں کو اپنے پیار اور محبت کو خوش خبری دیتا ہے۔

ان تمام تفصیلات سے واضح ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم اس باب میں کس قدر اہم اور کامل ہے۔

❀❀❀

اسلام کی اخلاقی تعلیم کا تکمیلی کارنامہ

تمدن کے زمانہ میں نظامِ حکومت میں جو ترقیاں ہو جاتی ہیں' ان کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ تمدن اصولِ قانون میں کوئی جدید اضافہ کر دیتا ہے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ تمدنی نظامِ حکومت میں قانون کے نفاذ میں ان وسیع اور ہمہ گیر دفعات کا لحاظ رکھا جاتا ہے جو اس کے اثر کو اس قدر عام کر دیتا ہے کہ دنیا کا ایک ذرہ بھی ان کے حدود سے باہر نہیں جا سکتا۔ لیکن وحشت کے زمانہ میں صرف سادہ قانون نافذ کر دیا جاتا ہے اور گرد و پیش اور اطراف و جوانب کے حالات پر نظر نہیں کی جاتی' ہر سلطنت نے چوری کو ایک جرم قرار دیا ہے اور اس لحاظ سے ایک غیر متمدن سلطنت بھی ایک اعلیٰ سے اعلیٰ مہذب حکومت کی ہم پلہ ہے۔ لیکن اس جرم کے کلی استیصال کے لیے اسی قدر کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا استیصال صرف اس وقت ہو سکتا ہے' جب وہ تمام لوگ مجرم قرار دیے جائیں جو اس جرم میں اعانت کرتے ہیں' موقعِ واردات کا سراغ دیتے ہیں۔ مال مسروقہ کو بیچتے یا خریدتے ہیں وغیرہ وغیرہ' بہر حال تمدنی نظامِ حکومت کو ایک غیر متمدن سلطنت پر جو ترجیح و امتیاز ہے' وہ صرف اس بنا پر ہے کہ تمدن نے اس کے اصول و آئین کو نہایت وسیع و عام کر دیا ہے اور وحشیانہ نظامِ حکومت میں یہ وسعت اور ہمہ گیری نہیں پائی جاتی۔ تمدن کے زمانہ میں انسانی ضرورت میں جو غیر محدود اضافہ ہو جاتا ہے اس کا راز بھی تمدن کی اسی خصوصیت کے اندر مضمر ہے۔

تفصیل اور ہمہ گیری

مذہب بھی ایک عظیم الشان روحانی سلطنت ہے اور جس اصول کی بنا پر ایک دینی حکومت کو دوسری حکومت پر ترجیح دی جا سکتی ہے اسی کو مختلف مذاہب کے موازنہ و مقابلہ کا بھی معیار قرار دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اصولِ شریعت میں دنیا کے اکثر مذاہب میں اشتراک و اتحاد پایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے عقائد میں' اعمال میں' عبادات میں' معاملات میں' اخلاق میں' جو چیزیں ناجائز اور مصلحتِ عامہ کے مخالف تھیں' ان کی سرسری طور سے سب نے ممانعت کی' اور جو چیزیں جائز اور مصالحِ عامہ کے موافق تھیں' ان کی ترغیب دی۔ لیکن امر و نہی کے طریقے اور ان کی جزئیات کے احاطہ میں کمی و بیشی ہے اور اسی نے ان مذاہب کے احکام و شرائع میں باہم امتیاز پیدا کر دیا ہے۔ اس بنا پر جس طرح اس حکومت کے قانون کو سب سے بہتر کہا جاتا ہے جس سے برائیوں کا تمام تر سدباب ہوتا ہے اور جس کے اندر تمام جزئیات کا احاطہ کر لیا گیا ہو' اسی طرح بہترین اخلاقی تعلیم وہ ہے جس نے محاسن اور مفاسد کا سب سے زیادہ

استقصا کیا ہو اور عام انسانوں کے لیے کھول کر ان کو اچھی طرح بیان کر دیا ہو اور اس کے ہر ہر گوشہ کو اس قدر روشن کر دیا ہو کہ غلط فہمی کی گنجائش نہ رہے۔ اسلام کو دوسرے مذاہب پر جو ترجیح و امتیاز ہے' اس کا ایک سبب اس کے احکام کی تفصیل' ہمہ گیری اور انضباط ہے۔ یعنی اسلام نے اپنے اصول و احکام کی تفصیل اس وسعت اور جامعیت کے ساتھ کی ہے کہ برائیوں کا کلی استیصال ہو گیا ہے اور نیکیوں کے مظاہر عام ہو گئے ہیں۔ اس کے برخلاف دوسرے مذاہب نے ان کلیات کی نہایت نامکمل اور اجمالی تشریح کی ہے۔

مثلاً توحید تمام مذاہب کا ام الاصول ہے لیکن کامل طور پر کسی مذہب نے اس کی حقیقت اور اس کے مظاہر کی تعیین نہیں کی۔ اس بنا پر ہر مذہب میں شرک کسی نہ کسی صورت میں شامل ہو گیا' صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے۔ جس نے شرک کے تمام علل و اسباب اور عواقب و نتائج کی تحدید کی' اور ان کا کلی استیصال کیا' شرک کا ایک متداول طریقہ بت پرستی تھا۔ اس کے انسداد کا سادہ طریقہ یہ تھا کہ تمام قوم کو توحید کی دعوت دی جاتی اور عرب کے تمام بت توڑ دیے جاتے لیکن اسلام نے صرف اس سادہ طریقہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان تمام چیزوں کو ناجائز قرار دیا جو ان بتوں کی یاد کو تازہ کر سکتی تھیں' تصویر بجائے خود کوئی بری چیز نہ تھی تاہم وہ بت پرستی کا ایک عام مظہر تھی' اس لیے اسلام نے اس کو ناجائز قرار دیا۔ کسی کی مدح میں غلو و اغراق اگرچہ ایک قسم کی بداخلاقی ہے تاہم اس سے اشخاص کے اثر اور ان کے نفوذ و طاقت میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے' اگر اس سے کوئی نیک کام لیا جائے تو وہ نہایت مفید چیز ہو سکتا ہے۔ اسلام اپنے عالم گیر اثر کی وسعت کے لیے اس سے کام لے سکتا تھا' تاہم چونکہ اس سے شخص پرستی کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ جس نے امم قدیمہ میں شرک کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے برسرِ منبر سختی کے ساتھ اس کی ممانعت فرمائی:

((لَا تُطْرُوْنِی کَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰی ابْنَ مَرْیَمَ فَاِنَّمَا اَنَا عَبْدُهٗ فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللّٰهِ وَ رَسُوْلُهٗ)) (بخاری' کتاب الانبیاء)

''میری شان میں مبالغہ نہ کرو جس طرح نصاریٰ نے ابنِ مریم کی شان میں کیا۔ میں تو خدا کا بندہ ہوں تو کہو کہ خدا کا بندہ اور رسول۔''

یہ ایک کلی حکم تھا اور آنحضرت ﷺ نے ہر موقع پر اس کی پابندی کرائی' اسی طرح شرک کے ایک ایک ریشہ کو بتا بتا کر اس کی بیخ کنی کی' یہی حال عبادات کا بھی ہے اس کے ایک ایک رکن اور طریقہ کو اسلام نے پوری تفصیل سے واضح کر دیا اور یہی روش اس کے اخلاقی تعلیمات کی بھی ہے۔ اخلاق کے تمام جزئیات کا پوری طرح احاطہ کر کے اپنے پیرووں کو ان سے ہر طرح آگاہ فرما دیا اور کوئی بات سوال و جواب کے لیے باقی نہیں رکھی یہی معنی اس تکمیل کے ہیں جس کے لیے آپ ؐ کی بعثت ہوئی۔

آنحضرت ﷺ نے اخلاق کی تکمیل تین حیثیتوں سے فرمائی ہے۔

(۱) تمام اخلاقی تعلیمات کا احاطہ۔

(۲) ہر برائی اور بھلائی کے سارے جزئیات کا احاطہ۔

(۳) نرمی و گرمی، عاجزی و بلند ہمتی، دونوں قسم کے اخلاق کی تفصیل اور ان کے مواقع کی تحدید۔

اخلاقی تعلیمات کا احاطہ

یہودی و عیسائی اور دوسرے اخلاقی معلمین کی تعلیمات کی فہرست پر ایک استقصائی نظر ڈال لینا اس راز کو فاش کر دے گا کہ انسان کے تمام اخلاقی احوال اور کیفیات کا احاطہ ان میں سے کسی نے نہیں کیا ہے، بلکہ صرف اپنے زمانہ اور اپنی قوم کے حالات کو سامنے رکھ کر اپنی اخلاقی اصلاحات کی فہرست بنالی گئی ہے اور ان میں سے بھی صرف چند اصول کو سب سے زیادہ اہمیت دے کر ان کو ہر جگہ اپنی تعلیم میں نمایاں کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحیفہ میں سب سے زیادہ اہمیت احکامِ عشرہ کی ہے یعنی وہ دس احکام جو بنی اسرائیل کو کوہ سینا کے دامن میں سنائے گئے تھے۔ ان دس احکام میں سے پہلا حکم توحید، دوسرا تصویر اور مجسمہ بنانے کی ممانعت، تیسرا خدا کے نام کی جھوٹی قسم کھانے کی کراہت اور چوتھا سبت کے دن آرام کرنے کی ہدایت پر مشتمل ہے باقی اخلاقی احکام صرف چھ ہیں جو حسب ذیل ہیں:[1] (دیکھو خروج، باب ۲۰)

(۱) تو اپنے ماں اور باپ کو عزت دے۔

(۲) تو خون مت کر۔

(۳) تو زنا مت کر۔

(۴) تو چوری مت کر۔

(۵) تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے۔

(۶) تو اپنے پڑوسی کی جورو، اس کے غلام اور اس کی لونڈی اور اس کے بیل اور اس کے گدھے اور اس کی کسی چیز پر جو تیرے پڑوسی کی ہے، لالچ مت کر۔

یہ گویا انسان کے اخلاقی سبق کی ابجد ہے اس کے بعد خروج باب ۲۲ اور ۲۳ میں قانونی احکام کے ساتھ ساتھ دو تین باتیں اور آ گئی ہیں یعنی مسافر، بیوہ اور یتیم کے ساتھ سلوک کا حکم اور جھوٹی گواہی کی ممانعت پھر احبار باب ۱۹ میں انہی احکام کی حسب ذیل مزید تفصیل ہے۔

(۱) تم میں سے ہر شخص اپنی ماں اور باپ سے ڈرتا رہے۔

(۲) تم چوری نہ کرو، نہ جھوٹا معاملہ کرو، ایک دوسرے سے جھوٹ نہ بولو۔

(۳) تم میرا نام لے کر جھوٹی قسم نہ کھاؤ۔

(۴) تو اپنے پڑوسی سے دغابازی نہ کر، نہ اس سے کچھ چھین لے، تو مزدور کی مزدوری چاہیے کہ ساری رات

(۱) توراۃ کے اخلاقی احکام۔

صبح تک تیرے پاس نہ رہ جائے۔

(۵) تو بہرے کو مت کوس‘ تو وہ چیز جس سے اندھے کو ٹھوکر لگے اندھے کے آگے مت رکھ۔

(۶) تو حکومت میں بے انصافی نہ کر‘ غریب وامیر کو نہ دیکھ بلکہ انصاف سے اپنے بھائی کی عدالت کر۔

(۷) تو عیب جوؤں کے مانند اپنی قوم میں آیا جایا نہ کر اور اپنے بھائی کے خون پر کمر نہ باندھ۔

(۸) تو اپنے بھائی سے بغض اپنے دل میں نہ رکھ۔

(۹) تو اپنی قوم کے فرزندوں سے بدلہ مت لے اور نہ ان کی طرف کینہ رکھ۔

(۱۰) تو اس کے آگے جس کا سر سفید ہے‘ اٹھ کھڑا ہو اور بوڑھے مرد کو عزت دے۔

(۱۱) اگر کوئی مسافر تمہاری زمین پر تمہارے ساتھ سکونت کرلے‘ تم اس کو مت ستاؤ بلکہ مسافر کو جو تمہارے ساتھ رہتا ہے ایسا جانو جیسے وہ تم میں پیدا ہوا ہے بلکہ تم اس کو ایسا پیار کرو جیسا آپ کو کرتے ہو۔

(۱۲) تم حکومت کرنے میں پیمائش کرنے میں‘ تولنے میں‘ ناپنے میں بے انصافی نہ کرو۔

انجیل کے اخلاقی احکام

انجیل نے اخلاقی تعلیمات کا نہ صرف یہ کہ احاطہ نہیں کیا ہے بلکہ ان کی تفصیل بھی نہیں کی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا مقصد درحقیقت بنی اسرائیل کو رسم پرستی اور شریعت کی ظاہری پابندی کے خلاف معنیٰ اور روح کی طرف دعوت تھی۔ یہ حقیقت جس طرح احکام میں نظر آتی ہے‘ اخلاق میں بھی جھلکتی ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اخلاقی تجدید واصلاح یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تورات‘ حضرت داؤدؑ کی زبور‘ حضرت سلیمانؑ کے امثال‘ اور دوسرے اسرائیلی صحیفوں میں جو خالص بلند اخلاقی تعلیمات منتشر تھیں اور جن کو بنی اسرائیل اپنے قانونی احکام کے سامنے بھلا بیٹھے تھے‘ ان کو یکجا اپنے مشہور وعظ میں ان کے سامنے پیش کیا۔ اس مشہور اخلاقی وعظ میں بترتیب حسب ذیل باتیں بیان کی گئی ہیں۔

دل کی غریبی‘ غمگینی‘ حلم و بردباری‘ راست بازی‘ رحم دلی‘ پاک دلی‘ صلح جوئی‘ صبر‘ عفو و درگذر‘ پاک دامنی‘ قسم کھانے کی ممانعت‘ ظالم کا مقابلہ نہ کرنا‘ قرض معاف کرنا‘ دشمنوں کو پیار کرنا‘ ریا کی ممانعت‘ توکل‘ عیب نہ لگانا‘ جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں ایسا تم بھی ان کے ساتھ کرو۔

یہ اخلاقی تعلیمات بیشتر انہی لفظوں کے ساتھ جو انجیل میں ہیں۔ بنی اسرائیل کے مختلف صحیفوں میں مذکور ہیں۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خاص طور سے ان اخلاقیات کو بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرنے سے مقصود ان میں اخلاقی توازن کا قائم کرنا اور رسمی اخلاق اور لفظی شریعت کے اصل روح ومعنی کو جلوہ گر کرنا تھا۔

اسلام میں اخلاقی احکام کا استقصا

محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کسی خاص قوم یا زمانہ تک محدود نہیں‘ اس لیے آپ ﷺ کو اخلاقی تعلیمات کا جو

صحیفہ عنایت ہوا' اس کو صرف ایک قوم یا زمانہ کی اخلاقی اصلاح تک محدود نہیں رکھا گیا۔ بلکہ تمام قوموں اور زمانوں تک وسیع کیا گیا۔ اس لیے تمام قوموں اور زمانوں میں جو برائیاں پائی جاتیں یا پائی جانے والی تھیں ان سب کا استقصا کر کے منع کیا گیا اور اسی طرح تمام انسانی اخلاقی محاسن کو بھی کھول کر بیان کیا گیا۔ اور ان کے حصول کی تاکید کی گئی' گذشتہ صحیفوں میں جن برائیوں سے روکا گیا ہے یا جن نیکیوں کی تعلیم دی گئی تھی۔ آنحضرت ﷺ کی وحی مبارک نے ان کی تمام جزئیات کا استقصا کیا اور ان کے گوشہ گوشہ کو کھول کر روشن کر دیا۔ ذیل میں ہم ان اخلاقی تعلیمات کی ایک مجمل فہرست درج کرتے ہیں جن کی تعلیم یا ممانعت قرآن پاک نے کی ہے۔

قرآنی اخلاق کی فہرست

سچ بولنا' جھوٹ کی برائی' علم بے عمل کی مذمت' عام عفو و درگذر' توکل' صبر' شکر' حق پر استقامت' خدا کی راہ میں جان دینا۔ سخاوت اور خیرات کا حکم' بخل کی برائی' اسراف اور فضول خرچی کی ممانعت' میانہ روی کی تاکید' عزیزوں' قرابت داروں' یتیموں' مسکینوں اور پڑوسیوں کے ساتھ نیکی' مسافروں' سائلوں اور غریبوں کی امداد' غلاموں اور قیدیوں کے ساتھ احسان' فخر و غرور کی برائی' امانت داری' وعدہ کا ایفا کرنا۔ عہد کا پورا کرنا' معاہدوں کا لحاظ کرنا' صدقہ اور خیرات' نیکی اور بھلائی کی بات کرنا' آپس میں لوگوں کے درمیان محبت پیدا کرنا' کسی کو برا بھلا نہ کہنا' کسی کو نہ چڑانا' نہ برے ناموں سے یاد کرنا' والدین کی خدمت اور اطاعت' ملاقاتوں میں باہم بھلائی اور سلامتی کی دعا دینا' حق گوئی' انصاف پسندی' سچی گواہی دینا' گواہی کو نہ چھپانا' جھوٹی گواہی کا دل کی گناہ گاری پر اثر' نرمی سے بات کرنا۔ زمین پر اکڑ کر نہ چلنا' صلح جوئی' اتحاد و اتفاق' ایمانی برادری' انسانی برادری' اکلِ حلال' روزی خود حاصل کرنا' تجارت کرنا' گداگری کی ممانعت' لوگوں کو اچھی بات کی تعلیم دینا اور بری بات سے روکنا' اولاد کشی' خودکشی اور کسی دوسرے کی ناحق جان لینے کی ممانعت' یتیم کی کفالت' اس کے مال و جائداد کی نیک نیتی کے ساتھ حفاظت' ناپ اور تول میں بے ایمانی نہ کرنا' ملک میں فساد برپا نہ کرنا' بے شرمی کی بات سے روکنا' زنا کی حرمت' آنکھیں نیچی رکھنا۔ کسی کے گھر میں بے اجازت داخل نہ ہونا' ستر اور حجاب' خیانت کی برائی' آنکھ' کان اور دل کی باز پرس' نیکی کے کام کرنا' لغو سے اعراض' امانت و عہد کی رعایت' ایثار' تحمل' دوسروں کو معاف کرنا' دشمنوں سے درگذر' بدی کے بدلہ نیکی کرنا' غصہ کی برائی' مناظروں اور مخالفوں سے گفتگو میں آداب کا لحاظ' مشرکوں کے بتوں تک کو برا نہ کہنا' فیصلہ میں عدل و انصاف' دشمنوں تک سے عدل و انصاف' صدقہ و خیرات کے بعد لوگوں پر احسان دھرنے کی برائی۔ الاہنے کی مذمت' فسق و فجور سے نفرت' چوری' ڈاکا' رہزنی اور دوسرے کے مال کو بے ایمانی سے لے لینے کی ممانعت' دل کا تقویٰ اور پاکیزگی' پاک بازی جتانے کی برائی' رفتار میں وقار و متانت' مجالس میں حسنِ اخلاق' ضعیفوں' کمزوروں اور عورتوں کے ساتھ نیکی' شوہر کی اطاعت' بیوی کا حق ادا کرنا' ناحق قسم کھانے کی برائی' چغل خوری' طعنہ زنی اور تہمت دھرنے کی ممانعت' جسم و جان اور کپڑوں کی پاکیزگی اور طہارت' شرم گاہوں کی ستر پوشی'

سائل کو نہ جھڑکنا‘ یتیم کو نہ دبانا‘ خدا کی نعمت کو ظاہر کرنا‘ غیبت نہ کرنا۔ بدگمانی نہ کرنا‘ سب پر رحم کرنا‘ ریا اور نمائش کی ناپسندیدگی۔ قرض دینا‘ قرض معاف کرنا‘ سود اور رشوت کی ممانعت‘ ثباتِ قدم‘ استقلال اور شجاعت و بہادری کی خوبی‘ لڑائی کے گھمسان سے نامردی سے بھاگ کھڑے ہونے کی برائی‘ شراب پینے اور جوا کھیلنے کی ممانعت‘ بھوکوں کو کھانا کھلانا‘ ظاہری اور باطنی ہر قسم کی بے شرمی کی باتوں سے پرہیز‘ بے غرض نیکی کرنا۔ مال و دولت سے محبت نہ ہونا‘ ظلم سے منع کرنا‘ لوگوں سے بے رخی نہ کرنا‘ گناہ سے بچنا‘ ایک دوسرے کو حق پر قائم رکھنے کی فہمائش‘ معاملات میں سچائی اور دیانت داری۔

احادیث کے اخلاقیات کی فہرست

یہ وہ تعلیمات ہیں جن کا ماخذ قرآن پاک ہے۔ ان کے علاوہ اسلام کی اخلاقیات کا بڑا ذخیرہ آنحضرت ﷺ کے ان اقوال میں ہے جو ان کی تفسیر اور تشریح میں احادیث میں مذکور ہیں۔ ان کی کثرت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ کنز العمال میں جو ہر قسم کی حدیثوں کا سب سے بڑا مجموعہ ہے۔ آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات باریک ٹائپ کی بڑی تقطیع کے ۱۸۷ صفحوں میں ہے۔ جن میں سے ہر ایک صفحہ میں ۳۷ سطریں ہیں اور تعداد کے اعتبار سے یہ تین ہزار نو سو چھ حدیثیں ہیں ڈھائی سو کے قریب مختلف اخلاقی ابواب و عنوانات میں منقسم ہیں‘ ان میں سے بعض مکرر باتیں بھی ہیں۔ تاہم ان سے اندازہ ہوگا کہ انسان کی اخلاقی و نفسانی کیفیات و حالات کا کوئی ایسا جز نہ ہوگا جو داعیِ اسلام علیہ السلام کی تلقینات کی فہرست سے رہ گیا ہو۔ اور جس پر دنیا کے اس سب سے بڑے اور سب سے آخری اخلاقی معلم کی نگاہ نہ پڑی ہو۔ ہم ذیل میں آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات کے صرف وہ عنوانات لکھتے ہیں جو صحیح بخاری‘ جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد میں مذکور ہیں۔

صلۂ رحمی‘ ماں باپ کے ساتھ سلوک‘ بچوں سے محبت‘ چھوٹوں کی محبت اور بڑوں کی عزت‘ اپنے بھائی کو اپنے ہی مانند چاہنا‘ ہمسایوں کے ساتھ سلوک‘ غلاموں کے ساتھ سلوک‘ غلاموں کا قصور معاف کرنا‘ اہل و عیال کی پرورش‘ یتیموں کی پرورش‘ بیوہ کی خبر گیری‘ حاجت مندوں کی امداد‘ اندھوں کی دست گیری‘ عام انسانوں کے ساتھ ہمدردی‘ قرض داروں پر احسان‘ فریادیوں کی فریاد رسی‘ خلق کو نفع رسانی‘ مسلمانوں کی خیر خواہی‘ جانوروں پر شفقت اور رحم‘ محسنوں کی شکر گزاری‘ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق‘ بیماروں کی خدمت و عیادت‘ رشک و حسد کی ممانعت‘ دوسروں کی مصیبت پر خوش ہونے کی ممانعت‘ شجاعت و بہادری‘ لڑائی کے میدان سے بھاگنے کی برائی‘ امیر و امام کی اطاعت‘ مداومتِ عمل‘ اپنے ہاتھ سے کام کرنا‘ شیریں کلامی‘ خوش خلقی‘ فیاضی‘ بدزبانی سے اجتناب‘ مہمان نوازی‘ شرم و حیا‘ حلم و وقار‘ غصہ کو ضبط کرنا‘ عفو و درگزر‘ صبر و تحمل‘ حسب و نسب پر فخاری کی مذمت‘ بدگمانی کی برائی‘ کسی کے گھر بلا اجازت داخل نہ ہونا۔ دوسروں کے گھر جا کر ادھر ادھر نہ دیکھنا‘ دوسرے بھائی کے لیے پیٹھ پیچھے دعا کرنا‘ رفق و نرمی‘ قناعت و استغنا‘ گداگری کی ممانعت‘ اپنے گناہوں کی پردہ پوشی‘ اپنے بھائیوں کے عیوب پر پردہ ڈالنا‘

چغل خوری کی ممانعت' تہمت لگانے کی برائی' غیبت کی ممانعت' بغض و کینہ کی ممانعت' دوسروں کی ٹوہ لگانے کی ممانعت' رازداری' تواضع وخاکساری' امانت داری' گالی کی ممانعت' منہ پر مدح وستائش کی ممانعت' لعنت کرنے کی ممانعت' بخل کی ممانعت' فضول گوئی کی ممانعت' فضول خرچی کی ممانعت' کبر وغرور کی مذمت' ہنسی مذاق کی برائی' نفس انسانی کا احترام' ظلم کی ممانعت' عدل وانصاف کا حکم' تعصب کی ممانعت' سخت گیری کی ممانعت' غم خواری وغم گساری' توکل' لالچ کی برائی' رضا بالقضا' ماتم کی ممانعت' قمار بازی کی ممانعت' سچائی کی ہدایت اور جھوٹ کی ممانعت' جھوٹی گواہی کی ممانعت' جھگڑا فساد کرنے کی ممانعت' باہم مصالحت کرانا' ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے تین دن سے زیادہ ناراض نہ رہے' منافقت اور دورخی چال کی مذمت' وعدہ خلافی کی ممانعت' خیانت اور فریب کی ممانعت' شراب خوری' زناکاری اور چوری کی ممانعت' طہارت وصفائی' دوست واحباب کی ملاقات' سلام وتحیت' مصافحہ ومعانقہ' دیگر آدابِ ملاقات' آدابِ مجلس' آدابِ طعام' آدابِ لباس' آدابِ نشست وبرخاست' خانہ داری کے آداب' سونے جاگنے کے آداب' عورتوں کے متعلق خاص آداب واخلاق وسلوک کے احکام۔

ان تفصیلات سے قیاس ہو سکے گا کہ آنحضرت ﷺ کے ذریعہ اخلاقیات کا کتنا عظیم الشان ذخیرہ انسانوں کو عطا کیا گیا ہے۔

اخلاقی جزئیات کا استقصا

انسان بڑا بہانہ جو اور حیلہ طلب واقع ہوا ہے اس کے لیے اخلاقیات کے صرف کلی اصول کافی نہیں کہ وہ لفظوں کے ہیر پھیر کے سایہ میں پناہ لے اور صرف چند رسوم کی لفظی تقلید پر قناعت کرلے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ ہر خوش اخلاقی یا بداخلاقی کے ایک ایک جزئیہ کا استقصا کیا جائے اور اس کے ایک ایک ریشہ کو کھول دیا جائے اور اس کی تہ کی اصلی گہرائیوں تک پہنچا جائے اس کے وسائل اور ذرائع کا بھی پتہ لگایا جائے اور ان کے متعلق صریح احکام دیے جائیں۔ آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات نے اس نکتہ کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ اس کی توضیح کے لیے امر ونہی دونوں کی ایک ایک دو دو مثالیں کافی ہوں گی۔

صدقہ وخیرات تمام مذہبوں میں ثواب کا سب سے بڑا کام سمجھا گیا ہے لیکن توراۃ نے اس کو صرف عشر اور زکوٰۃ تک محدود رکھا ہے۔ ان کے علاوہ کسی اور قسم کی خیرات کا ذکر اس میں نہیں ملتا۔ انجیل نے سب کچھ غریبوں کو دے کر خود غریب بن جانے کو اچھا سمجھا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے دونوں کو یکجا کر دیا ہے اور ہر ایک کے ایک ایک جز کی تفصیل کر دی۔ توراۃ میں یہ مبہم تھا کہ کتنے غلے یا سونے چاندی کے مالک پر عشر یا زکوٰۃ فرض اور کن کن چیزوں میں فرض ہے۔ شریعتِ محمدی نے اس کے متعلق مقدار اور تعداد اور زمانہ کی پوری پوری تعیین کر دی۔ وہ اجناس مقرر کر دیے جن میں عشر یا زکوٰۃ واجب ہے ان کی تحصیل کا طریقہ بتا دیا' ان کے اخراجات اور مصارف کی نوعیتوں کی تشریح کر دی' اس نے یہ حکم نہیں دیا کہ تم سب کچھ راہِ خدا میں لٹا کر خود مفلس اور کنگال بن جاؤ بلکہ یہ کہا:

﴿يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ﴾ (بقرہ:۲۱۹)

''لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں وہ کیا خرچ کریں۔ کہہ دے کہ جو تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو۔''

مگر اخلاقی حیثیت سے اس نے یہ تلقین ضرور کی کہ تم خود اپنی ضرورت روک کر اور اپنے اوپر تھوڑی تکلیف اٹھا کر دوسروں کی حاجت پوری کرو تو یہ تمہارے کمالِ خلق کی دلیل ہے۔ انصار جنہوں نے خود تکلیفیں اٹھا کر مہاجرین کی مصیبتیں دور کیں' ان کی تعریف میں خدا نے فرمایا:

﴿يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ (حشر:۹)

''وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود ان کو حاجت ہو۔''

صحابہؓ کی مدح میں فرمایا:

﴿يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا﴾ (دہر:۸)

''خود کھانے کی خواہش کے باوجود مسکین' یتیم اور قیدی کو کھانا کھلا دیتے ہیں۔''

قرآن پاک سراپا انفاق فی سبیل اللہ یعنی خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی ہدایت سے بھرا ہوا ہے۔

اکثر لوگ وہ چیز خدا کی راہ میں دوسروں کو دیتے ہیں جو سڑی گلی' خراب اور نکمی ہو۔ قرآن پاک نے اس سے روکا کہ یہ نفس کے تزکیہ اور صفائی کے بجائے جو اس خیرات کا مقصد ہے' نفس کی اور دناءت اور آلودگی ظاہر کرتا ہے۔ فرمایا:

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ﴾ (آل عمران:۹۲)

''تم ہرگز پوری نیکی کو نہ پاؤ گے جب تک اس میں سے تم خرچ نہ کرو جو تم کو محبوب ہے اور جو بھی تم خرچ کرو خدا کو اس کا علم ہے۔''

پھر فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ﴾ (بقرہ:۲۶۷)

''اے ایمان والو! جو تم کماتے ہو اس میں کی اچھی چیزیں اور جو ہم تمہارے لیے زمین سے نکالتے ہیں اس میں سے کچھ خدا کی راہ میں دو اور اس میں سے خراب چیز دینے کا قصد بھی نہ کرو کہ تم کو کوئی ایسی چیز دے تو نہ لو۔ مگر یہ کہ چشم پوشی کرو اور یقین کرو کہ اللہ بے پروا اور خوبیوں والا ہے۔''

اس آیت پاک کے خاتمہ کی بلاغت پر غور کرو کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت فرمایا کہ ''وہ بے پروا اور خوبیوں والا ہے۔'' یعنی اس نے اپنے بندوں کو مال کے بہترین حصہ کے خیرات کرنے کی جو ہدایت فرمائی اس کا یہ

سبب نہیں کہ نعوذ باللہ خود خدا کو اپنے بندوں کی اچھی چیزوں کو ضرورت ہے کہ وہ تو تمہاری ہر اچھی سے اچھی چیز سے بے نیاز اور بے پروا ہے بلکہ یہ سبب ہے کہ وہ خوبیوں والا ہے اس لیے خوبی ہی والی چیز کو قبول کرتا ہے۔

سب سے پہلے تمہاری امداد کے محتاج خود وہ ہیں جن کی کفالت کا بار تم پر ہے اہل وعیال' دست نگر عزیز و قریب' پھر دوسرے محتاج و مسکین اور یتیم اور مسافر۔

﴿یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ﴾ (بقرہ:۲۱۵)

''لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خیرات کریں' کہہ دے کہ جو کچھ تم نیکی کا مال خرچ کرو' وہ ماں باپ' رشتہ داروں' یتیموں' مسکینوں' اور مسافر کے لیے اور جو بھی تم نیکی کا کام کرو اللہ اس سے واقف ہے۔''

اگر کسی کے پاس کچھ نہ ہو تو خیرات کیا دے؟ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ فرمایا کہ ''ہر مسلمان پر صدقہ دینا واجب ہے' لوگوں نے عرض کی کہ اگر اس کی قدرت نہ ہو' تو فرمایا مزدوری کرے اور جو ملے اس میں سے کچھ خود کھائے کچھ محتاجوں کو کھلائے' صحابہؓ نے عرض کی اگر مزدوری کرنے کی بھی قوت نہ ہو' فرمایا تو غم رسیدہ' حاجت مند کی کوئی جسمانی خدمت کرے اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو نیکی کی تعلیم دے اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو برائی کرنے سے بچے' یہ بھی صدقہ ہے۔ [1] دوسرے موقع پر فرمایا ''اچھی بات کہنا اور بری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے' کسی بھولے بھٹکے مسافر کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے' کسی اندھے کی دست گیری بھی صدقہ ہے' راستہ سے پتھر' کانٹا اور ہڈی کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے اور اپنے ڈول کا پانی اپنے بھائی کے ڈول میں ڈال دینا بھی صدقہ۔'' [2] غور کیجیے کہ یہ صدقہ اور خیرات کا کتنا وسیع مفہوم ہے۔

کسی کے ساتھ کوئی نیکی کر کے اس کو یاد مت دلاؤ' نہ احسان اس پر جتاؤ' نہ اس سے اس کے شکریہ کے طالب ہو۔ نہ نمائش مقصود ہو کہ اس سے خود نیکی برباد ہو جاتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کو دوسری ہی وحی میں یہ نکتہ بتایا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ﴾ (مدثر:۶)

''اور اپنا احسان نہ جتا کہ تو اور زیادہ چاہے۔''

عام مسلمانوں کو تاکید کی گئی۔

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ (بقرہ:۲۶۴)

''اے ایمان والو! اپنی خیرات کو احسان رکھ کر اور جتا کر برباد مت کرو جس طرح وہ برباد کرتا ہے جو

---

(۱) ادب المفرد امام بخاری باب ان کل معروف صدقۃ ص ۴۶ مصر۔

(۲) جامع ترمذی ابواب البر والصلۃ باب صنائع المعروف۔

لوگوں کے کھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور خدا اور پچھلے دن پر یقین نہیں رکھتا۔"

پھر فرمایا کہ ایسی خیرات سے تو معمولی سی نیکی بہتر ہے۔

﴿قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ﴾ (بقرہ:۲۶۳)

"اچھی بات کہنی اور معاف کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے احسان جتا کر دینے والے کے دل کو صدمہ پہنچایا جائے اور خدا بے نیاز اور بردبار ہے۔"

ریاء اور نمائش سے بچنا ہو تو چھپا کر دو اور اگر لوگوں کی تشویق و ترغیب مقصود ہو تو دکھا کر بھی دے سکتے ہو۔

﴿اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَ اِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ يُكَفِّرُ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ (بقرہ:۲۷۱)

"اگر تم خیرات کھول کر دو تو بھی اچھا ہے اور اگر چھپا کر غریبوں کو دو تو وہ تمہارے لیے سب سے بہتر ہے اور اللہ تمہاری برائیوں کا کفارہ کر دے گا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔"

﴿اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (بقرہ:۲۷۴)

"جو لوگ اپنا مال رات اور دن، چھپے اور کھلے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے، نہ ان کو خوف ہوگا نہ غم۔"

صدقہ اور خیرات کھلے دل سے ہنسی اور خوشی ہونی چاہیے، جبر و کراہت سے نہ ہو کہ یہ منافقت کی نشانی ہے۔

﴿وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ﴾ (توبہ:۵۴)

"اور وہ خدا کی راہ میں نہیں خرچ کرتے لیکن کڑھ کر۔"

صدقہ وخیرات پکے دل سے اور صرف خدا کے لیے ہونی چاہیے۔

﴿وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَ تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ﴾ (بقرہ:۲۶۵)

"اور ان کی مثال جو اپنا مال اللہ کی خوشنودی چاہ کر اور اپنا دل پکا کر کے خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس باغ کی مانند ہے جو کسی ٹیلہ پر ہو۔"

بلکہ اس سے زیادہ یہ کہ اس سے مقصود خود خدا ہو۔

﴿وَ مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ﴾ (بقرہ:۲۷۲)

"اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر اور جو خیرات کرو گے وہ تم کو پوری ملے گی، تمہارا حق کچھ دبا نہ رہے گا۔"

صدقہ وخیرات کی ان تمام تفصیلات سے اندازہ ہوگا کہ اسلام نے اس ایک تعلیم کے کتنے گوشوں کا احاطہ کیا ہے۔

منکرات کی حرمت میں جزئیات کا احاطہ

احکام میں یہ وسعت اور ہمہ گیری اور بھی زیادہ نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ مثلاً مسکرات کو تمام مذاہب نے صاف صاف حرام نہیں کیا ہے مگر اچھا کسی نے نہیں سمجھا ہے۔ اسلام پہلا مذہب ہے جس نے تذبذب اور شک اور ہاں اور نہیں کے تمام پہلوؤں کو دور کر کے اس بارہ میں ایک قطعی اور آخری فیصلہ نافذ کر دیا۔ اسلام سے پہلے گو بعض لوگوں نے شراب کا پینا چھوڑ دیا تھا لیکن یہ حرمت صرف اشخاص تک محدود تھی اس کے ذریعہ سے تمام دنیا کو ان کے نقصانات سے محفوظ نہیں رکھا جا سکتا۔ اور خود اشخاص بھی اس کے اثر سے کلیۃً محفوظ نہیں رہ سکتے۔ مثلاً ایک شخص شراب نہیں پیتا لیکن اس کی تجارت کرتا ہے' ایک شخص ان دونوں چیزوں سے احتراز کرتا ہے' لیکن ان برتنوں کو استعمال میں لاتا ہے جن میں شراب رکھی یا بنائی جاتی ہے۔ لیکن اسلام نے شراب کی حرمت کا اعلان اس جامعیت کے ساتھ کیا ہے کہ ان احکام کی مراعات کے ساتھ کوئی شخص شراب کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

((قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَعَنَ اللّٰهُ الْخَمْرُ وَ شَارِبُهَا وَ سَاقِيَهَا وَ بَائِعَهَا وَ مُبْتَاعِهَا وَ عَاصِرَهَا وَ مُعْتَصِرَهَا وَ حَامِلُهَا وَ الْمَحْمُوْلَةُ اِلَيْهِ)) (ابوداؤد۔ کتاب الاشربۃ)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' خدا شراب پر' اس کے پینے والے پر' اس کے پلانے والے پر' اس کے بیچنے والے پر' اس کے خریدنے والے پر' اس کے نچوڑنے والے پر' اس کے اپنے لیے نچڑوانے والے پر' اس کے لے جانے والے پر اور اس شخص پر جس کے پاس وہ لے جائی جائے' لعنت کرتا ہے۔''

مہذب قانون کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ جس چیز سے لوگوں کو روکتا ہے سب سے پہلے اس کی منطقی حقیقت (ڈیفینیشن) بتائے' عرب میں شراب مختلف چیزوں سے بنتی تھی' اس کے مختلف نام تھے اور ان کا اثر بھی مختلف تھا۔ قرآن مجید میں حرمتِ شراب کے متعلق جو آیت نازل ہوئی ہے' اس میں خمر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس بنا پر خمر کی حقیقت کی تعیین نہایت ضروری تھی۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس کی تعیین فرما دی۔

((قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنَ الْعِنَبِ خَمْرًا وَ اِنَّ مِنَ التَّمْرِ خَمْرًا وَ اِنَّ مِنَ الْعَسَلِ خَمْرًا وَ اِنَّ مِنَ الْبُرِّ خَمْرًا وَ اِنَّ مِنَ الشَّعِيْرِ خَمْرًا)) (ابوداؤد۔ کتاب الاشربۃ)

''آپؐ نے فرمایا: انگور سے بھی شراب بنتی ہے' کھجور سے بھی' شہد سے بھی' گیہوں سے بھی' اور جو سے بھی۔''

((قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ الْخَمْرُ مِنَ الْعَصِيْرِ وَ الزَّبِيْبِ

وَ التَّمر وَ الْحِنْطَةِ وَ الشَّعِيرِ وَ الذُّرَةِ وَ اِنِّیْ اَنْهَاكُمْ عَنْ كُلِّ مُسْكِرٍ)) (ابوداود۔ کتاب الاشربۃ)

"راوی کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ شراب انگور، منقی، کھجور، گیہوں، جو، جوار اور ہر چیز کے نچوڑنے سے بنتی ہے اور میں تم کو ہر نشہ آور چیز سے منع کرتا ہوں۔"

عرب کے مختلف حصوں میں انہی چیزوں کی شراب بنتی تھی اس لیے یہ تعریف عرب کے تمام اصنافِ شراب کو حاوی تھی، لیکن اسلام ایک عالم گیر مذہب تھا۔ اور یہ ممکن تھا کہ دنیا کے اور حصوں میں شراب کی دوسری قسمیں استعمال کی جائیں اور تحدید ان کو شامل نہ ہو، اس لیے آپ نے شراب کی ایک کلی تعریف کی، جو تمام اقسامِ شراب پر حاوی تھی۔

كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ وَ كُلَّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ (ابوداود۔ کتاب الاشربۃ و صحیح مسلم و احمد و ترمذی و نسائی)

"ہر نشہ آور چیز شراب ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔"

كُلُّ شَرَابٌ اُسْكَرٌ فَهُوَ حَرَامٌ (ابوداؤد، احمد و بخاری و مسلم)

"ہر پینے کی چیز جو نشہ لائے وہ حرام ہے۔"

لیکن حیلہ جو لوگوں کے لیے اب بھی حیلہ جوئی کا موقع باقی تھا۔ حرمتِ شراب کی اصل وجہ جو اس تعریف سے مستنبط ہوتی ہے، نشہ ہے لیکن یہ ممکن تھا کہ شراب کی اس قدر کم مقدار استعمال کی جائے کہ نشہ نہ آئے اس لیے فرمایا:

مَا اَسْكَرَ كَثِيرُهٗ فَقَلِيلُهٗ حَرَامٌ. (ابوداود۔ کتاب الاشربۃ)

"جو چیز زیادہ مقدار میں نشہ لائے اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔"

بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو نشہ نہیں لاتیں۔ تاہم اعصاب میں ایک خدر کی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں جو نشہ کا ابتدائی مقدمہ ہوتی ہے، بھنگ وغیرہ اسی قسم کی چیزیں ہیں اور تمدن کے زمانہ میں مہذب اور حیلہ جو لوگ اکثر اس قسم کے مفرحات کا استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے ان کی ممانعت فرمائی۔

((نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ كُلِّ مُسْكِرٍ وَ مُفْتِرٍ)) (ابوداود۔ کتاب الاشربۃ)

"آنحضرت ﷺ نے ہر منشی و مخدر چیز سے منع فرمایا۔"

لیکن اس تفصیل و جامعیت کے بعد بھی یہ ممکن تھا کہ لوگ اس کی منشی چیزیں استعمال کریں جن پر عرفاً خمر کا اطلاق نہ کیا جاتا ہو۔ عرب میں اس قسم کی ایک مصنوعی چیز تھی، جس کو داوی کہتے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو بھی خمریات میں داخل فرمایا۔

((يَقُوْلُ يَشْرِ بَنَّ نَاسٌ مِنْ اُمَّتِی الْخَمْرَ يُسَمُّوْنَهَا بِغَيْرِ اسْمِهَا)) (ابوداود۔ کتاب الاشربۃ)

''آپ نے فرمایا کہ میری امت میں کچھ لوگ نام بدل کر شراب کا استعمال کریں گے۔''

اس کے علاوہ عرب میں جن برتنوں میں شراب رکھی جاتی تھی' شروع میں ان کے استعمال کی بھی ممانعت فرمائی۔

﴿نَهَى عَنِ الدَّبَاءِ وَ الْحَنتَمِ وَ الْمَزَفَّتِ وَ النَّقِيرِ﴾

''آپ نے کدو' سبز و سیاہ رنگ کے مرتبان اور کھجور کی جڑ سے جس میں سوراخ کر کے شراب رکھی جاتی' منع فرمایا۔''

لیکن چونکہ یہ ایک قسم کی سخت گیری تھی۔ اس لئے آپ نے آخر میں اس حکم کو منسوخ فرما دیا' اب صرف شراب کے استعمال کی دو صورتیں باقی رہ گئی تھیں' ایک یہ کہ اس کی حقیقت بدل دی جائے' دوسرے یہ کہ سخت مجبوری کی حالت میں استعمال کی جائے' لیکن آنحضرت ﷺ نے ان دونوں صورتوں میں بھی شراب کی ممانعت فرمائی چنانچہ چند یتیم بچوں نے وراثت میں شراب پائی تھی' حرمت خمر کے بعد وہ بے کار چیز ہوگئی۔ حضرت ابوطلحہؓ نے آپ سے سوال کیا کہ اس کا سرکہ کیوں نہ بنا لیا جائے آپ نے اجازت نہ دی۔ (۱)

ایک بار دیلم حمیری نے آپ کی خدمت میں عرض کی کہ ہم سرد ملک میں رہتے ہیں اور سخت کام کرتے ہیں' اس لیے گیہوں کی شراب پیتے ہیں کہ محنت اور سردی برداشت کرنے کی طاقت قائم رہے' آپ نے فرمایا کیا اس سے نشہ بھی ہوتا ہے؟ انہوں نے کہا ہاں' آپ نے فرمایا تو اس کو چھوڑ دو' انہوں نے کہا لیکن اور لوگ نہیں چھوڑیں گے' ارشاد ہوا کہ ''اگر نہ چھوڑیں تو ان سے جہاد کرو۔ (۲)

سود کی حرمت میں جزئیات کا احاطہ

اسلام سے پہلے توراۃ نے بھی بنی اسرائیل کو اپنے بھائیوں سے سود لینے کی ممانعت کی تھی' انجیل نے بھی ''ناروا نفع'' سے لوگوں کو روکا ہے۔ تاہم یہ ممانعت بہت مجمل ہے۔ لیکن اسلام نے جب اس کو حرام کیا تو ربا کی حقیقت' ربا کے اقسام' کن کن چیزوں میں کس کس قسم کا ربا ناجائز ہے۔ اس کی پوری تفصیل کی' اس کے مشابہ اور مبہم معاملات سے بھی باز رکھا۔ اس ظلم میں لوگ کسی طرح بھی شریک ہوں' ان سب کو شریک جرم ٹھہرایا۔

((لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اٰكِلَ الرِّبٰوا وَ مُوْكِلَهٗ وَ شَاهِدَهٗ وَ كَاتِبَهٗ))

(ابوداؤد۔ کتاب البیوع)

''آنحضرت ﷺ نے سود کھانے والے' سود کھلانے والے' اس پر گواہی دینے والے اور اس کے لکھنے والے پر لعنت بھیجی۔''

---

(۱) ابوداؤد جلد ۲ ص ۸۰ کتاب الاشربۃ اس سرکہ کے جواز و عدم جواز میں فقہا کا اختلاف ہے۔

(۲) ابوداؤد جلد ۲ ص ۸۰ کتاب الاشربہ۔

رشوت کی حرمت میں استقصاء

لعَنَ رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشي و المرتشي.

آنحضرت ﷺ نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر لعنت بھیجی ہے۔

اسلام کی دوسری اخلاقی تعلیمات میں بھی اس قسم کی تفصیل، استقصا اور تمام جزئیات کا احاطہ پایا جاتا ہے کیونکہ جس چیز کا عام رواج پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی نہایت کثرت سے مختلف صورتوں کو مٹا نہ دیا جائے اس چیز کا کلیتاً قلع قمع نہیں ہوسکتا۔

مسیحی اخلاق کی کمزوری

مسیحی فلسفۂ اخلاق نے دنیا میں ایک بڑی غلط فہمی یہ پیدا کر دی تھی کہ اس نے حسنِ اخلاق کا انحصار اخلاق کی صرف منفعل اور سرد قسم میں کر دیا تھا، یعنی تواضع، خاکساری، فروتنی، عاجزی، خواری، بردباری، مسکینی، غمگینی وغیرہ۔ منفعل قوتوں کو اخلاق کا درجہ دیا تھا اور اس کے مقابل کی قوتوں کی سخت توہین کی تھی، حالانکہ دنیا کے امن و سلامتی اور ترقی و خوشحالی کے لیے دونوں قسم کی مناسب قوتوں کے امتزاج کی ضرورت ہے۔ جس قدر ایک مقام پر تواضع و خاکساری کی ضرورت ہے، اسی قدر دوسرے مقام پر خودداری اور عزتِ نفس کی حاجت ہے، جس طرح عفو و درگزر بلند ہمتی کا کام ہے اسی طرح عدل اور مناسب قانونی انتقام بھی بسا ضروری ہے، محکومانہ اخلاق کی خوگیری کا وعظ قناعت پسندوں کے لیے ضروری سہی۔ مگر حاکمانہ روح بھی قوم کے اندر موجود رہنی چاہیے کہ دنیا کے عدل کی میزان قائم رہے۔

نٹشے کا اعتراض مسیحی اخلاق پر

جرمن فلاسفر نٹشے نے مسیحی اخلاق پر جا و بیجا اعتراضات کے جو تیر برسائے اور ان مسیحی اخلاقی تعلیمات کو جس طرح انسانی چہرہ کا داغ ٹھہرایا ہے۔ وہ اسی لیے ہے کہ وہ صرف کمزوری، عاجزی، خواری، اور مسکینی کی تعلیم دیتے ہیں، جن سے لوگوں میں عزم، بلند ہمتی، استقلال، ثباتِ قدم، عزتِ نفس اور خودداری کے جوہر پیدا نہیں ہو سکتے۔ وہ کہتا ہے:

''مسیحیت نے ہمیشہ کمزور، پست اور بوسیدہ اشیا کا ساتھ دیا ہے۔ مسیحیت نے طبائعِ انسانی کی تمام خود دارانہ قوتوں کا استیصال کر دینا، اپنا مسلک قرار دیا ہے۔ مسیحیت نے زبردست دماغوں کا ستیاناس کر دیا ہے۔''(۱)

اسلامی اخلاق کا اعتدال

لیکن اس کو معلوم نہ تھا کہ مسیح علیہ السلام کے ۵۷۵ برس بعد اس نبی آخر الزماں ﷺ کا ظہور ہوا ہے جس نے

(۱) نٹشے از ایم اے مگّے مترجمہ مولوی سید مظفر الدین ندوی ایم اے باب سوم۔

مسیحی نظامِ اخلاق کی غلطیوں کی تصحیح کر دی اور انسانی اخلاق کا ایسا معتدل نظام پیدا کر دیا جو ہر شخص، ہر قوم اور ہر زمانہ کے مناسب ہے۔ اسی کا اثر یہ ہوا کہ ابھی اس کی تعلیم پر دس سال کی مدت بھی نہیں گزری تھی کہ محکوموں نے حاکموں کی، پست نے بلند کی، ادنیٰ نے اعلیٰ کی، اور تنزل نے ترقی کی جگہ حاصل کر لی۔ مسیحی یورپ کو ان میں سے ایک چیز بھی اس وقت تک نہ مل سکی جب تک اصلاح و تجدید کے نام سے اسلامی اصول کو اس نے عاریتاً قبول نہیں کیا۔

نفوس کا اختلافِ استعداد

اخلاقی تعلیم کوئی ایسی طب نہیں ہے جس کا ایک ہی نسخہ ہر بیمار کی اندرونی بیماریوں کا علاج ہو۔ تمام انسانوں کی اندرونی کیفیتیں، اخلاقی استعدادیں اور نفسانی قوتیں یکساں نہیں ہیں۔ انسانوں میں کمزور و پست ہمت بھی ہیں اور قوی و بلند حوصلہ بھی، خاکسار و متواضع بھی ہیں اور مغرور و خوددار بھی، بزدل بھی ہیں اور بہادر بھی، بردبار بھی ہیں اور غضب ناک بھی، بخیل بھی ہیں اور فضول خرچ بھی، گداگر بھی ہیں اور فیاض بھی، ناامید بھی ہیں اور پرامید بھی، ضعیف الارادہ بھی ہیں اور قوی دل بھی۔ ظالم و زبردست بھی اور ذلیل و خوار بھی، الغرض امراض کے اس قدر متفاوت اور مختلف درجات اور مراتب ہیں کہ سب کے لیے ایک دوا کبھی کارآمد نہیں ہو سکتی۔ بہترین اخلاقی معالج وہ ہے جس نے ہر شخص، ہر قوم اور ہر زمانہ کے مطابق اپنے نسخے ترتیب دیے ہوں اور ہر قسم کے مریضوں کو صحیح و تندرست بنانے کی قدرت رکھتا ہو۔

ہر شخص کی حسبِ ضرورت اصلاح

صحیح اخلاقی تعلیم و تربیت کا اصول یہ ہے کہ ہر شخص یا ہر قوم اور کیفیت کو دیکھ کر جو عنصر کم ہو اس کو زیادہ اور جو زیادہ ہو اس کو کم کر کے قوتوں میں مناسب اعتدال پیدا کرے۔ وہ کمزور کو بہادر اور بہادر کو عادل، پست ہمت کو بلند ارادہ اور بلند ارادہ کو دوسروں کے حقوق کو نہ غصب کرنے والا بنائے، وہ ناامید کو پرامید کرے اور امید سے بھرے ہوئے کو یہ سمجھائے کہ جو کچھ تم کو مل رہا ہے وہ خدا سے مل رہا ہے۔ وہ قانع کو بلند ارادہ اور حریص کو دوسروں سے بے نیاز کر کے خدا سے مانگنے والا کر دے۔ وہ ذلیل و خوار کو خوددار اور خوددار کو غیر مغرور بنا دے، وہ اچھی قوتوں کو نشو و نما دے اور بری قوتوں کا رخ اچھے مقصدوں کی طرف پھیر کر ان کی برائی کو کم سے کم کر دے۔

قدیم فلسفۂ اخلاق کے واقف کار جانتے ہیں کہ انسان کے تمام اخلاق کی بنیاد اس کی دو قوتوں پر ہے، قوتِ غضب اور قوتِ شہوت۔ غضب نام ہے اپنے نفس کے نامناسب امور کے پیش آنے پر ان کی مدافعت کی قوت کا اور شہوت نام ہے نفس کے مناسب امور کے حصول اور طلب کی قوت کا۔ ان دونوں قوتوں کی افراط و تفریط اور اعتدال اور ان کے مختلف مراتب سے سینکڑوں اچھے برے اخلاقی جزئیات پیدا ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ نام ہے۔ غضب کی قوت اگر افراط و تفریط سے پاک ہو اور عقل کے قابو میں ہو تو اس کا نام شجاعت ہے اور وہ حالات و کیفیات کے لحاظ سے مختلف پیکروں میں جلوہ گر ہوتی ہے مثلاً خودداری، دلیری، آزادی، حق

گوئی‘ بلند ہمتی‘ بردباری‘ استقلال‘ ثباتِ قدم‘ وقار‘ صبر و سکون‘ مطالبۂ حق‘ جدوجہد‘ سعی و محنت‘ جہاد‘ پھر جب یہی قوت اعتدال سے ہٹ کر افراط کی طرف مائل ہوتی ہے تو تہور بن جاتی ہے اور اس سے سلسلہ بہ سلسلہ غرور‘ نخوت‘ خود پرستی‘ تکبر‘ ترفع‘ دوسروں کی تحقیر‘ ظلم‘ قتلِ نفس وغیرہ کی برائیاں پیدا ہوجاتی ہیں اور جب یہ قوت تفریط کی طرف جھکتی ہے تو ذلت پسندی‘ کم حوصلگی‘ بے طاقتی‘ خوف اور دناءت کے قالب میں ظہور کرتی ہے‘ اسی طرح شہوت کی قوت میں جب کامل اعتدال ہوتا ہے تو اس کو عفت کہتے ہیں یہی صفت مختلف سانچوں میں ڈھل کر مختلف ناموں سے پکاری جاتی ہے۔ یعنی پاک دامنی‘ پرہیزگاری‘ جود و سخا‘ شرم و حیا‘ صبر و شکر‘ قناعت‘ بے طمعی‘ خوش طبعی‘ ترقی کی خواہش‘ نسل و اولاد کی آرزو‘ خانگی مسرت کی مناسب طلب وغیرہ‘ پھر یہ صفت جب افراط و تفریط کی طرف مائل ہو جاتی ہے تو اس سے حرص و طمع‘ بے شرمی‘ فضول خرچی‘ بخل‘ ریا‘ اوباشی‘ تملق‘ حسد‘ رشک وغیرہ اوصافِ ذمیمہ پیدا ہو جاتے ہیں۔

مسیحی اور اسلامی اخلاقیات کا فرق

مسیحیت کی تعلیم کا منشا انسان کی دونوں غضبی اور شہوی قوتوں کا استیصال ہے اور اسلامی تعلیم کی غرض ان دونوں کو افراط و تفریط سے ہٹا کر ان میں توسط اور اعتدال پیدا کرنا ہے۔ مسیحیت کے نزدیک نفس کی یہ دونوں قوتیں بذاتہٖ بری ہیں اور اسلام کے نزدیک یہ دونوں قوتیں بجائے خود بری نہیں ہیں بلکہ کبھی کبھی ان کے استعمال کا موقع و محل برا ہوتا ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ اپنی قوتِ غضب کو فنا کر کے ”دشمن کو پیار کرو“ اور نہ یہ کہ اپنی قوتِ خواہش کو فنا کر کے مجرد رہو‘ اور مفلس و غمگین بن کر زندگی گزار دو۔ بلکہ یہ ہے کہ اپنے ذاتی دشمنوں کو بہتر یہ ہے کہ معاف کرو! اور خدائی دشمنوں کے حق میں دعائے خیر کرو کہ انہیں ہدایت ملے اور خدا کے حلال کیے ہوئے طیبات اور لذائذ سے لطف اٹھاؤ‘ لیکن شریعت کے مقرر کردہ حدود سے کبھی آگے نہ بڑھو۔ امام غزالی کے بقول اسلام نے غصہ کے دبانے والے کی تعریف کی ہے۔ غصہ کے مٹانے والے کی نہیں‘ اس نے ﴿وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ﴾ کہا ہے ﴿وَالْفَاقِدِيْنَ الْغَيْظَ﴾ نہیں کہا۔

مسیحی اخلاق کی کمزوریاں

دنیا میں علم و ہنر‘ خوشی و مسرت‘ ولولہ و انبساط‘ رونق و ترقی‘ جدوجہد‘ جو کچھ ہے‘ وہ انہی دونوں قوتوں کی جلوہ آرائیاں ہیں‘ اگر یہ دونوں قوتیں ایک قلم مٹ جائیں یا ان میں افراط و تفریط پیدا ہوجائے تو نیکی‘ سعادت اور خوش بختی کی آدھی دنیا مرجائے‘ نہ عفت کا کوئی مفہوم ہو‘ نہ عصمت کے کوئی معنی ہوں‘ نہ عدل کا وجود ہو‘ نہ امن و امان کا نشان ملے‘ نہ کسی کی ملک محفوظ اور نہ کسی کی جان سلامت رہے‘ نہ انسان کی بلند ہمتی‘ استقلال‘ ثباتِ قدم اور سعی و محنت کے جوہر نمایاں ہوں‘ قوموں کی ترقی اور ملکوں کا نظام درہم برہم ہوجائے اور خدا کی یہ دنیا ایک ایسا ویرانہ بن جائے جس میں حرکت و جنبش کا نام نہ رہے۔

مسیحی اخلاقی تعلیم میں یہ نکتہ ملحوظ نہیں رہا ہے کہ نفسِ غصہ اور خواہش بری چیز نہیں ہے بلکہ بے جا غصہ اور ناجائز خواہش بری چیز ہے۔ نیز یہ کہ جس طرح غصہ اور خواہش بری چیزیں ہیں اسی طرح وہ معائب بھی جو ان دونوں قوتوں کی تفریط اور کمی سے پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً بے آبروئی، بے غیرتی، ذلت پسندی، دناءت، بے طاقتی، تملق، کم حوصلگی، بے عملی، سستی، فاقہ زدگی بھی برے ہیں۔ اسلام نے اپنے پیروؤں میں ان دونوں قوتوں کو اعتدال کے ساتھ جمع کیا ہے۔ اس نے جہاں ان کو ﴿رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ﴾ (آپس میں رحمدل) اور ﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (مومنون کے فرمان بردار) کی تعلیم دی وہیں ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ (کافروں پر بھاری) اور ﴿اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ﴾ (کافروں پر گراں) بننے کی بھی تعلیم دی۔ اور ان کو بتایا کہ عزت صرف خدا اور رسول اور ان کے فرمان برداروں کے حصہ میں ہے ﴿وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ﴾ مسیحی قوموں کو اس وقت تک ترقی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا جب تک اسلامی فلسفۂ اخلاق کی ان تعلیمات سے پروٹسٹنٹ بن کر انہوں نے فائدہ نہیں اٹھایا۔

لیکی کا اعتراض مسیحی اخلاق پر

لیکی تاریخ اخلاقِ یورپ کی دوسری جلد میں کہتا ہے:

''لیکن انکسار اور فروتنی کا وصف تمامتر مسیحیت کا پیدا کردہ ہے اور گویہ وصف بھی ایک زمانہ تک نہایت موزوں اور مناسب رہا۔ تاہم تمدن کی روزافزوں ترقی کی رفتار کا آخر تک ساتھ نہ دے سکا۔ ترقیِ تمدن کے لیے لازمی ہے کہ قوم میں خودداری ہو اور حریت کے جذبات موجود ہوں اور انکسار و تواضع اس کے دشمن ہیں۔ خانقاہانہ طرزِ زندگی کے مثل، فوجی طرزِ زندگی کا اقتضاء یہ ہے کہ استبدادی حکومت ہو۔ تاہم سپاہیوں میں تو پھر بھی فی الجملہ خودی و خودداری موجود ہوتی ہے لیکن اسے بالکل مٹا دینا جو خانقاہانہ طرزِ زندگی کا مطمحِ نظر تھا، کسی طرح ترقیِ تمدن کے حق میں مفید نہیں پڑ سکتا تھا۔ اور پھر بڑے بڑے زاہدوں میں تو اس جذبہ سے اور فضائل پیدا ہوتے بھی رہتے ہیں لیکن عوام میں تجربہ سے معلوم ہوا کہ انکسار بالکل غلامانہ زندگی کے مترادف ہو جاتا ہے۔ اسی کو دیکھ کر متاخرینِ حکمائے اخلاق نے بجائے انکسار کے خودی پر زیادہ زور دیا اور اس کے دو مظاہر ہیں، ایک مردانگی اور دوسرے خودداری۔ انہی پر زور دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ پروٹسٹنٹ ممالک میں جو صاف گوئی، آزاد خیالی، خوش معاملگی، بلند حوصلگی، غیرت و حمیت اور عالی ظرفی نظر آتی ہے، وہ کیتھولک علاقوں میں نہیں پائی جاتی بلکہ ان کے بجائے دناءت، پست ہمتی، کم ظرفی، بزدلی اور گداگری کے مناظر سامنے آتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اول الذکر میں سیاسی حریت کی جو جلوہ آرائیاں ہیں، ان سے آخر الذکر یکسر خالی ہیں۔'' (فصل ۱۱)

اسلام اور بلند اخلاق

لیکن اس کے بالمقابل معلمِ اسلام علیہ السلام کی تعلیم جو کچھ ہے اس کا اندازہ آپ ﷺ کے صرف ایک سبق سے ہو

سکتا ہے۔ فرمایا ((اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ معالي الامور و يبغض سفافها)) (بے شک اللہ معالی امور کو پسند اور محقرات امور کو ناپسند کرتا ہے)

''معالی امور'' سے مقصود عالی حوصلگی کے بڑے کام' اور ''محقرات'' سے مراد چھوٹی اور ادنیٰ باتیں ہیں۔ اس حدیث میں گویا ارشاد ہوا کہ ایک مسلمان کو خدا کا دوست بننے کے لیے ضرورت ہے کہ اس کی نظر ہمیشہ اونچی اور مقصد ہمیشہ بلند رہے اور دناءت کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے الگ رہے۔

اسی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور تعلیم کا حوالہ دینا بھی اس باب میں اسلام کے نقطۂ نظر کو واضح کر دینے کے لیے کافی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

((اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ وَاَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيْفِ وَ فِي كُلٍّ خَيْرًا اِحْرِصْ عَلٰى مَايَنْفَعُكَ وَ اسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَ لَا تَعْجِزْ وَاِنْ اَصَابَكَ شَيْءٌ فَلَا تَقُلْ لَوْاِنِّي فَعَلْتُ كَانَ كَذَا وَ كَذَا وَ لٰكِنْ قُلْ قَدَّرَ اللّٰهُ وَ مَا شَاءَ فَعَلَ فَاِنْ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلُ الشَّيْطَانِ)) (صحیح مسلم کتاب القدر باب فی الامر بالقوۃ)

''کمزور مسلمان سے قوت ور مسلمان زیادہ بہتر اور خدا کے نزدیک پیارا ہے اور ہر ایک میں بھلائی ہے۔ ہر وہ چیز جو تجھے نفع دے اس کی پوری خواہش کر اور خدا سے مدد چاہ' اس راہ میں کمزوری نہ دکھا اور اگر تجھے اس میں کچھ تکلیف پہنچ جائے تو یہ نہ کہہ ''اگر میں یوں کرتا تو یوں ہوتا'' بلکہ یہ کہہ کہ اللہ نے مقدر کر دیا ہے اور جو چاہا اس نے کیا کیونکہ یہ اگر (اور مگر) شیطان کا کاروبار کھولتا ہے۔''

تقدیر' توکل' صبر اور شکر

یہ حدیث ان تمام مسائل کی شرح کرتی ہے جن کو اسلام کی اصطلاح میں تقدیر' توکل' صبر اور شکر سے ادا کیا جاتا ہے۔ اور جن کی پوری تفصیل مسئلۂ قضا و قدر کے ضمن میں جلد چہارم میں اور عباداتِ قلبی کے تحت عنوان جلد پنجم میں کی جا چکی ہے اور بتایا گیا ہے کہ چاروں تعلیمات اسی لیے ہیں کہ مسلمانوں میں حوصلہ مندی' پُر امیدی' استقلال اور ثباتِ قدم پیدا ہو۔ مسلمان میں سب سے پہلے بڑے کام کا عزم پیدا ہونا چاہیے پھر اس عزم کے پیدا ہونے کے ساتھ خدا پر بھروسہ اور توکل کر کے کام شروع کر دینا چاہیے۔ اگر کام میں کامیابی ہوئی تو فخر و غرور کے بجائے دل سے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ اسی کے فضل و کرم سے ہوا۔ اور اگر ناکامی ہو تو دل میں یاس اور ناامیدی کے بجائے صبر و ثبات پیدا ہونا چاہیے اور سمجھنا چاہیے کہ خدا کا منشا یہی تھا (یہی تقدیر ہے۔)

حدیث بالا میں جو کچھ فرمایا گیا وہ درحقیقت قرآن پاک کی ان آیتوں کی تشریح ہے:

﴿فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ○ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَ اِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

الْمُؤْمِنُوْنَ○﴾ (آل عمران:۱۵۹۔۱۶۰)

’’جب تو پکا ارادہ کر لے پھر خدا پر بھروسہ کر‘ بے شک اللہ متوکلوں کو پیار کرتا ہے‘ اگر خدا تمہاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غلبہ پانے والا نہیں اور اگر وہ چھوڑ دے تو پھر اس کے بعد کون تمہاری مدد کر سکتا ہے۔ خدا ہی پر ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے۔‘‘

﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرٌ○ لِّكَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ○﴾ (حدید:۲۲۔۲۳)

’’کوئی مصیبت نہیں آتی زمین پر اور نہ تم پر لیکن یہ کہ وہ اس کے پیدا کرنے سے پہلے کتابِ (الٰہی) میں درج ہوتی ہے یہ اللہ پر آسان ہے یہ اس لیے تاکہ اس پر جو تم سے جاتا رہے‘ غم نہ کرو‘ اور جو تم کو اللہ دے اس پر اترایا نہ کرو اللہ کسی اترانے والے‘ بڑائی مارنے والے کو پسند نہیں کرتا۔‘‘

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ تقدیر‘ توکل اور صبر و شکر کی تعلیم اسلام میں پستی اور دناءت کے لیے نہیں بلکہ مسلمانوں میں ہمت‘ جرأت‘ بہادری اور ثابت قدمی پیدا کرنے کے لیے ہے۔ اسی تعلیم کا اثر تھا کہ صحابہؓ نے تمام خطرات سے نڈر ہو کر بڑی بڑی سلطنتوں اور فوجوں کا مقابلہ کیا۔ اور کامیاب رہے ان کو مشکلات میں خدا کے دوسرے برگزیدوں کی یہ دعا سنائی گئی:

﴿رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ﴾ (بقرہ:۲۵۰)

’’اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر و ثبات کا پانی بہا اور ہمارے پاؤں کو مضبوط گاڑ اور ہم کو کافر لوگوں پر فتح یاب کر۔‘‘

اور بتایا کہ مشکلات میں دوسرے پیغمبروں کے ساتھیوں نے کیا کیا:

﴿وَ كَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّیُّوْنَ كَثِیْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ مَا ضَعُفُوْا وَ مَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰهُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ○ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِیْٓ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْكَافِرِیْنَ○﴾ (آل عمران: ۱۴۶۔۱۴۷)

’’اور کتنے نبی تھے کہ ان کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے لڑائی لڑی‘ تو خدا کی راہ میں جو مشکل یا مصیبت پیش آئی اس سے وہ سست نہ ہوئے اور نہ کمزور ہوئے اور خدا ثابت رہنے والوں کو پیار فرماتا ہے اور ان کا کہنا نہ تھا لیکن یہی کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہ اور ہمارا حد سے بڑھ جانا معاف فرما اور ہمارے پاؤں مضبوط رکھ اور ہم کو کافروں پر فتح دے۔‘‘

پھر خاص طور سے حکم ہوتا ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (آل عمران:۲۰۰)

''اے وہ جو ایمان لائے ثابت قدم رہو اور دشمن کے مقابلہ میں ثابت قدم اور بہادر ثابت ہو اور اللہ سے تقویٰ کرو تا کہ کامیاب ہو۔''

ان آیتوں سے معلوم ہوگا کہ اسلام نے اخلاق کی بلندی، عالی حوصلگی، بلند ہمتی اور مشکلات میں صبر و ثباتِ قدم کی کیسی اچھی تعلیم دی ہے یعنی جس طرح اس کے نزدیک تواضع، فروتنی اور عاجزی اپنے موقع پر پسندیدہ ہے، اسی طرح سطوت اور بہادری و حکومت کا رعب بھی اپنی جگہ پر محبوب ہے۔

اپنے دشمنوں سے پیار کرو

مسیحی اخلاقی تعلیم کا سب سے زریں اصول یہ ہے کہ اپنے دشمنوں کو پیار کر۔ اس میں شک نہیں کہ اس اصول کی ظاہری چمک دمک ایسی ہے کہ ظاہر بینوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں لیکن اہل معنی نے اس کے منطقی تضاد کو اچھی طرح سمجھا ہے۔ یہی سبب ہے کہ خود انجیل کے مفسروں نے اس حکم کو ناممکن العمل بتایا ہے۔[1] تم دشمن کو معاف کر سکتے ہو، دشمن کے ساتھ نیک سلوک کر سکتے ہو، دشمن کے حق میں دعائے خیر کر سکتے ہو مگر تم دشمن سے پیار اور محبت نہیں کر سکتے کہ یہ دل کا فعل ہے جس پر تم کو قدرت نہیں۔

اخلاقِ محمدی نے اس کے بجائے وہ تعلیم دی جن پر ہر خوش نصیب سے عمل ممکن ہے اور اللہ کے بندوں نے ہمیشہ اس پر عمل کیا ہے یعنی دشمنوں کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ برا چاہنے والوں کے ساتھ بھلائی کرو۔ جو تم کو بد دعائیں دیں ان کو دعا دو، جو تمہارا قصور کریں، ان کو معاف کرو۔ اور جو تم پر ظلم کریں ان کے ساتھ انصاف کرو فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ (مائدہ:۲)

''اے ایمان والو! خدا کے لیے کھڑے ہو جایا کرو۔ انصاف کے ساتھ گواہ بن کر۔ اور کسی قوم کی دشمنی تم کو عدل و انصاف کرنے سے باز نہ رکھے۔ انصاف کرو کہ انصاف کرنا پرہیزگاری سے بہت نزدیک ہے اور خدا سے ڈرو کہ اس کو تمہارے کاموں سے خبر ہے۔''

﴿وَ لَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَ بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ○ وَ مَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ○ وَ اِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ﴾ (حم السجدۃ: ۳۴-۳۶)

---

(۱) اسکاٹ صاحب کی تفسیر متی۔

''اور بھلائی اور برائی برابر نہیں' برائی کو بھلائی سے دفع کرو تو دفعتاً وہ جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے' رشتہ دار دوست کے مانند ہو جائے گا۔ اور اس پر عمل کی توفیق انہی کو ہوتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور انہی کو یہ سعادت ملتی ہے جو بڑی قسمت والے ہیں اور اگر شیطان تم کو اکسائے تو خدا کی پناہ مانگو کہ وہ سننے والا' جاننے والا ہے۔''

(۱) اس آیت پاک میں شروع ہی میں ایک اصول بتا دیا گیا ہے کہ بھلائی اور برائی برابر نہیں ان دونوں کا فرق بالکل نمایاں ہے۔

(۲) اس آیت پاک میں جس نیکی اور حسنِ سلوک کی تاکید کی گئی ہے وہ ان لوگوں کے ساتھ کرنے کی ہے جو تمہارے دشمن ہیں۔ کیونکہ اس کے بعد ہی ہے کہ تمہارے اس نیک طرزِ عمل سے تمہارا دشمن تمہارا دوست بن جائے گا۔

(۳) دشمن کے ساتھ اس نیکی کرنے کو صبر کا انتہائی درجہ کہا گیا اور اس کو عظیم الشان خوش قسمتی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ اخلاقِ محمدی کے صحیفہ میں اس کا کیا درجہ ہے۔

(۴) دشمن کے ساتھ برائی کرنے کو اس میں شیطانی تحریک بتایا گیا ہے اور اس سے خوش قسمت مسلمانوں کو خدا کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے حضرت ابن عباسؓ جو صحابہؓ میں بڑے مفسر ہیں اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں۔ [1]

''اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غیظ و غضب کی حالت میں صبر کا اور کسی کے برائی کرنے پر حلم اور عفو و درگزر کرنے کا حکم دیا ہے۔ وہ ایسا کریں گے تو خدا ان کو شیطان کے پنجہ سے چھڑائے گا اور ان کا دشمن بھی دوست کی طرح ان کے آگے سر جھکا دے گا۔''

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو جو آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھے تھے گالی دی' وہ سن کر چپ رہے' اس نے دوبارہ وہی حرکت کی' وہ پھر بھی چپ رہے' اس نے پھر تیسری دفعہ بدزبانی کی' تو وہ چپ نہ رہ سکے' اور کچھ بول اٹھے' یہ دیکھ کر آنحضرت ﷺ فوراً اٹھ گئے حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی' یا رسول اللہ! کیا آپ مجھ سے خفا ہوئے؟ فرمایا ''اے ابوبکرؓ جب تک تم چپ تھے' خدا کا فرشتہ تمہاری طرف سے کھڑا تھا' جب تم نے جواب دیا تو وہ ہٹ گیا۔'' [2]

آپ ﷺ نے فرمایا ''صلۂ رحم یہ نہیں ہے کہ صلۂ رحم کرنے والوں کے ساتھ صلۂ رحم کرو بلکہ یہ ہے کہ جو قطعِ رحم کرلے اس کے ساتھ صلۂ رحم کرو۔'' [3] یعنی دوستوں کے ساتھ دوستی کوئی بات نہیں بلکہ دشمنوں کے ساتھ دوستی

---

(۱) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۷۱۳ وابن جریر جلد ۲۴ ص ۶۸ مصر۔

(۲) سنن ابی داؤد' کتاب الادب۔ باب فی الاختصار۔

(۳) صحیح بخاری' کتاب الادب ج ۲ ص ۸۸۶۔

اصلی خوبی ہے۔

ایک دفعہ ایک اعرابی نے خدمتِ نبوی میں آ کر عرض کی یا رسول اللہ! مجھے وہ بات بتائیے جس کے کرنے سے جنت مل جائے۔ آپؐ نے اس کو چند باتیں بتائیں۔ منجملہ ان کے فرمایا ''ظالم رشتہ دار پر اپنی عنایتوں کی بارش کرو۔''(۱)

اسلام کی نظر میں کافر ومشرک سے بڑھ کر تو کوئی دشمن نہیں ہوسکتا لیکن دیکھو کہ قرآن پاک مسلمانوں کو اپنے ایسے دشمنوں کے ساتھ بھی عفوودرگزر کی کیسی صریح تعلیم دیتا ہے:

﴿قُلْ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَغْفِرُوْا لِلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ اَیَّامَ اللّٰهِ لِیَجْزِیَ قَوْمًا بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ﴾ (جاثیہ:۱۴)

(''اے پیغمبر!) مسلمانوں سے کہہ دے کہ ان کو جو خدا کے دنوں پر یقین نہیں رکھتے' معاف کردیا کریں' تاکہ خدا ایسے لوگوں کو ان کے کرتوتوں کا بدلہ دے۔''

اگر عملی مثالیں چاہتے ہو تو وہ ''ریاکار فریسیوں'' اور ''سانپوں اور سانپوں کے بچوں''(۲) والے مسیحیت کے واعظ میں نہیں بلکہ اسلام کے اس اولین داعی وواعظ میں ہے جس نے فاتح بن کر' مفتوح ہو کر نہیں' حاکم ہو کر' محکوم بن کر نہیں' بیک دفعہ مکہ کے ان ہزاروں دشمنوں کو معاف کردیا جن میں سے ہر ایک اس کے خون کا پیاسا سارہ چکا تھا(۳) جس نے اس کو معاف کردیا۔ جس نے اس کے قتل یا گرفتاری کے لیے اہلِ مکہ کا اشتہار وانعام سن کر اس کا تعاقب کیا تھا۔(۴) جس نے خیبر میں اپنی زہر دینے والی یہودیہ کو معاف کیا تھا۔(۵) جس نے اپنے چچا کے قاتل کو معاف کیا تھا۔(۶) جس نے حمزہؓ کی لاش کو بے حرمت کرنے والی اور ان کے جگر کو چبانے والی کو معاف کیا۔(۷) جس نے اپنی قرۃ العین کے ایک طرح کے قاتل کو معاف کیا۔(۸) جس نے تنعیم کی وادی میں قریش کے اس گرفتار دستہ کو معاف کیا(۹) جو اس کے قتل کے ارادہ سے آیا تھا۔ جس نے نجد کے ایک نخلستان میں جب وہ

(۱) مستدرک حاکم کتاب المکاتب ج۲ص ۲۱۷ حیدرآباد دکن۔
(۲) انجیل متی' ۲۳' ۲۵' ۳۳۔
(۳) صحیح بخاری باب فتح مکہ۔
(۴) صحیح بخاری کتاب الہجرۃ۔
(۵) صحیح بخاری باب فتح خیبر وذکرِ وفاتِ نبوی۔
(۶) صحیح بخاری باب فتح مکہ۔
(۷) صحیح بخاری باب فتح مکہ۔
(۸) کتب سیر وطبقاتِ صحابہ ذکر اشتمار یان فتح مکہ وہبار بن اسود۔
(۹) جامع ترمذی کتاب التفسیر سورۂ فتح ص ۵۴۰۔

محوِ خواب تھا۔ اپنے ایک تیغ بکف حملہ آور کو قابو میں پا کر معاف کیا۔ (۱) جس نے ان طائف والوں کے حق میں دعائے خیر کی جنہوں نے اس پر کبھی پتھروں کی وہ بارش کی تھی جس سے اس کے پاؤں خون آلودہ ہو گئے تھے۔ (۲) جس نے احد کے میدان میں اپنے چہرہ کے زخمی کرنے والوں کو نیک دعا دی (۳) جس نے دشمنوں کے حق میں بددعا کرنے والوں کو کہا کہ میں دنیا میں لعنت کے لیے نہیں۔ بلکہ رحمت کے لیے آیا ہوں۔ (۴) ﷺ انتہا یہ ہے کہ کفار اور مشرکین کے ساتھ معاہدہ کو پورا کرنا تقویٰ اور پرہیزگاری کی شان بتائی گئی۔

((اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ)) (توبہ:۴)

''لیکن جن مشرکوں سے تم نے عہد باندھا پھر انہوں نے تم سے کچھ کم نہ کیا اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ان کا عہد ان کی مدت مقرر تک پورا کرو۔ اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔''

کفار و مشرکین سے عدم موالات

اس موقع پر اکثر معترض اسلام کے ان احکام کو پیش کرتے ہیں، جن میں مسلمانوں کو کافروں اور مشرکوں کی رفاقت اور موالات سے منع کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل علیحدہ چیز ہے۔ یقیناً ہر نیک تحریک کے بانی کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تحریک کے قیام و بقا اور حفاظت کی خاطر اس تحریک کے پیروؤں کو اس کے ان مخالفوں کے میل جول، راز داری اور رفاقت سے روک دے جو زور یا سازش سے اس کے مٹانے اور برباد کر دینے کے درپے ہوں۔ خصوصاً ایسے وقت میں جب اس تحریک کو تیغ و خنجر اور فوج و لشکر سے مٹا دینے کی کوششیں ہو رہی ہوں اور طرفین میں لڑائی کی سی حالت قائم ہو۔ یا غلط شبہے اور افواہیں پھیلا کر اس کے پیروؤں کو برگشتہ کرنا چاہتے ہوں چنانچہ اس قسم کی آیتیں۔

﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّاۤ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً﴾ (آل عمران:۲۸)

''ایمان والے مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں تو جو ایسا کرے گا تو اس کو اللہ سے کوئی علاقہ نہیں مگر یہ کہ تم ان سے بچاؤ چاہو۔''

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى

(۱) صحیح بخاری کتاب الجہاد ص ۴۰۸۔
(۲) ابن سعد غزوہ طائف۔
(۳) فتح الباری ج ۷ ص ۲۸۶ مع باب احد۔
(۴) صحیح بخاری مبعث النبی ﷺ و مشکوٰۃ اخلاق النبی ﷺ بحوالہ مسلم۔

﴿الْاِيْمَانِ ط وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ (توبہ:۲۳)

''اے ایمان والو! اپنے باپ اور بھائیوں کو اگر وہ ایمان کے برخلاف کفر سے محبت رکھیں' اپنا دوست نہ بناؤ اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا تو وہی حد سے گذرنے والے ہوں گے۔''

اسی موقع کی ہیں ایک اور بات یہ بھی ہے کہ جب حق و باطل معرکہ آرا ہوں تو اہلِ حق کے درمیان اسی حق کی خاطر جس قدر محبت ہوگی' فطرۃً ان اہلِ باطل سے اسی قدر بیزاری اور علیحدگی ہوگی جو اس حق کے مٹانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہوں۔ اس لیے حق کی حفاظت کی خاطر اہلِ باطل سے اس قسم کی محبت اور موالات سے اسلام نے روکا ہے' اسلام کے اس قسم کے احکام کے معنی وہی ہیں جو ''شہزادۂ امن'' کے اس اعلان کے ہیں:

''یہ مت سمجھو کہ میں زمین پر صلح کروانے آیا' صلح کروانے نہیں بلکہ تلوار چلانے کو آیا ہوں' کیونکہ میں آیا ہوں کہ مرد کو اس کے باپ' اور بیٹے کو اس کی ماں' اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کروں' آدمی کے دشمن اس کے گھر کے لوگ ہوں گے' جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ چاہتا ہے وہ میرے لائق نہیں۔'' (متی کی انجیل باب: ۱۰'۳۴)

یہی سبب ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اخلاق میں یہودیوں کے ساتھ وہ نرمی' رحم دلی اور رقیق القلبی نہ تھی' جو دوسرے نادان بت پرستوں اور گناہ گاروں کے ساتھ تھی۔ وہ یہودیوں کو بے تکلف سخت سے سخت الفاظ سے خطاب کرتے تھے۔ جب حجاز کے یہودیوں اور سرحدِ شام کے عیسائیوں سے مسلمانوں کی جنگ چھڑی اور بظاہر مال و دولت' ساز و سامان' اسلحہ اور مستحکم قلعوں کے سبب سے ان کا پلہ مسلمانوں سے زیادہ بھاری نظر آتا تھا تو مدینہ کے منافقوں اور کمزوردلوں کی عاقبت بینی اور دور اندیشی ان کو اس پر مجبور کرتی تھی کہ وہ اسلام کے ان دشمنوں سے ساز باز رکھیں تاکہ ان کے مقابلہ میں اگر مسلمانوں کو شکست ہو تو ان کو پناہ مل سکے۔ اسی کے ساتھ وہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان کو دینِ اسلام سے منحرف کرنے کی کوشش کرتے تھے' اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر مسلمانوں کو ان اہلِ کتاب سے رازدارانہ دوستی و محبت کے تعلقات رکھنے سے منع کر دیا۔ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ط فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِىَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ○ وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ○ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ (مائدہ:۵۱۔۵۴)

''اے ایمان والو! یہودیوں اور نصرانیوں کو رفیق نہ بناؤ' وہ آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور جو

کوئی تم میں سے ان سے رفاقت کرے وہ انہی میں ہے، اللہ بے انصاف لوگوں کو راہ نہیں دیتا۔ اب تو ان کو دیکھتا ہے جن کے دل میں بیماری ہے کہ وہ دوڑ کر ان سے ملے جاتے ہیں، کہتے ہیں کہ ہم کو ڈر ہے کہ ہم پر کوئی گردش نہ آ جائے۔ تو اللہ شاید جلد (مسلمانوں کی) فتح یا (ان کی کامیابی کی) کوئی اور بات اپنے پاس سے بھیجے، تو پھر وہ اپنے دل کی چھپی بات پر پچھتانے لگیں اور مسلمان کہیں کہ یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کی پکی قسم کھاتے تھے کہ تمہارے ساتھ ہیں خراب گئے ان کے عمل، پھر وہ رہ گئے نقصان میں۔ اے ایمان والو! اگر تم سے کوئی اپنے دین سے پھرے گا تو خدا کا کچھ حرج نہیں، اللہ اپنے دین کے لیے اور دوسرے لوگوں کو لائے گا، جن سے وہ راضی ہوگا اور وہ اللہ سے راضی ہوں گے جو ایمان والوں کے فرمانبردار اور کافروں پر بھاری ہوں گے۔''

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ الْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۞﴾ (مائدہ: ۵۷)

''اے ایمان والو! اہلِ کتاب اور کفار میں سے ان کو جو تمہارے دین کو ہنسی مذاق بناتے ہیں اپنا رفیق نہ بناؤ۔ اور خدا سے ڈرو۔ اگر یقین رکھتے ہو۔''

ان آیتوں میں پوری تصریح ہے کہ کن لوگوں کو اور کن حالات میں اپنا رفیق کار محرمِ اسرار اور مددگار نہ بناؤ اور اس ممانعت کا منشا کیا ہے؟ مزید تصریح آلِ عمران کی اس آیت میں ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ (آل عمران: ۱۱۸)

''اے ایمان والو! اپنے غیر کو اپنا بھیدی نہ بناؤ وہ تمہاری خرابی میں کمی نہیں کرتے، جتنی تم کو تکلیف پہنچے ان کو خوشی ہے۔ دشمنی ان کی زبان سے نکلی پڑتی ہے اور جو ان کے جی میں چھپا ہے وہ اس سے زیادہ ہے ہم نے تم کو باتیں جتا دیں اگر تم کو عقل ہے۔''

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کمزور مسلمانوں کو ملا ملا کر مسلمانوں کے منصوبوں اور نقشوں کی جاسوسی کرتے تھے اور بھیدوں کا پتہ چلاتے تھے جن کی روک تھام کے لیے مسلمانوں کو ان کی رفاقت اور ساز باز سے روکا گیا ہے سب سے زیادہ تصریح سورۂ ممتحنہ میں ہے۔ فرمایا:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَ قَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَ اِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَ اَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَ مَآ اَعْلَنْتُمْ وَ مَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۞ اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ

يَكُونُوا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّ يَبْسُطُوا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْءِ وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُوْنَ○ لَنْ تَنفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ (ممتحنہ:۱۔۳)

''اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ کہ تم ان کو دوستی کا پیغام بھیجو اور وہ اس سچائی کے جو تم کو ملی، منکر ہیں۔ وہ رسول کو اور تم کو اس لیے گھر سے نکالتے ہیں کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر ایمان لے آئے، اگر تم میری راہ میں لڑائی اور میری خوش نودی کی طلب میں نکلو تو تم ان کو دوستی کے چھپے پیغام بھیجو۔ اور مجھے خوب معلوم ہے جو تم چھپاتے اور جو تم ظاہر کرتے ہو جو تم میں سے ایسا کرتا ہے وہ سیدھی راہ بھولا ہے اگر وہ (جن کو تم دوستی کا چھپا پیغام بھیجتے ہو) تم کو موقع سے پائیں تو تمہارے دشمن ہوں اور تمہاری تکلیف پہنچانے کے لیے اپنے ہاتھ بڑھائیں اور برائی کے ساتھ اپنی زبانیں کھولیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی کسی طرح دین کے منکر ہو جاؤ۔ تم کو تمہاری قرابت اور تمہاری اولاد قیامت کے دن نفع نہیں پہنچائے گی۔''

آگے اس سے بڑھ کر تصریح سنئے:

﴿لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ○ اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ اَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَ ظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ○﴾ (ممتحنہ:۸۔۹)

''خدا تم کو ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کرنے سے باز نہیں رکھتا جو تم سے مذہب میں لڑائی نہیں کرتے اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالتے ہیں خدا انصاف والوں کو پیار کرتا ہے۔ وہ انہی سے دوستی کرنے کو منع کرتا ہے جو تم سے مذہب میں لڑائی لڑیں اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالیں اور تمہارے نکالنے پر ایک دوسرے کے مددگار بنیں۔ جو ان سے دوستی کا دم بھرے گا تو وہی بے انصاف ہوں گے۔''

اس کے ساتھ یہ خوش خبری بھی سنا دی کہ عن قریب تمہاری فتح ہوگی اور اس وقت یہ دشمنی محبت سے بدل جائے گی فرمایا:

﴿عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ط وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ﴾ (ممتحنہ:۷)

''امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اور تمہارے دشمنوں کے درمیان دوستی پیدا کر دے اور اللہ قدرت والا ہے۔''

ان آیتوں کا مطلب ان کے شان نزول کے جاننے کے بعد بالکل صاف ہو جاتا ہے، انہی میں سے ایک

واقعہ یہ ہے کہ مسلمان قریش کی بے خبری میں مکہ پر قبضہ کیا چاہتے تھے۔ تیاریاں ہو رہی تھیں کہ ایک مسلمان حاطبؓ بن بلتعہ نے اپنی ذاتی منفعت کے لیے چپکے سے ایک خط لکھ کر اور ایک عورت کو دے کر مکہ کی سمت روانہ کر دیا کہ قریش خبردار ہو جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہو گئی۔ آپؐ نے دو سواروں کو بھیجا کہ راستے سے وہ خط اس سے واپس لے آئیں۔ وہ خط آیا تو آپ نے حاطبؓ سے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ عرض کی یا رسول اللہ! جلدی نہ فرمایئے' بات یہ ہے کہ میں قریش میں رہتا ہوں۔ لیکن ان سے میرا کوئی نسبی تعلق نہیں اور جس قدر مہاجر ہیں۔ وہاں ان کی قرابتیں اور رشتہ داریاں ہیں جن کے سبب سے ان کے خاندان کے لوگ محفوظ ہیں۔ میری وہاں کوئی قرابت نہ تھی' جس کا مکہ والے لحاظ کرتے۔ تو میں نے چاہا کہ میں ان پر یہ احسان کروں تا کہ وہ میرا کچھ لحاظ کریں۔ میں نے دینِ حق سے مرتد ہو کر ایسا نہیں کیا۔ آپؐ نے فرمایا تم بدر والے لوگ ہو۔ خدا نے تمہارے گناہ معاف کیے ہیں۔ اس پر یہ آیت اتری: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا﴾ (اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔)(۱) یہ احکام اسی قسم کے ہیں جو عہدِ عتیق میں بھی مذکور ہیں۔ زبور میں ہے۔

''اے خدا تو یقیناً شریروں کو قتل کرے گا پس اے خونیو! میرے پاس سے دور ہو جاؤ کیونکہ وہ تیری بابت شرارت سے باتیں کرتے ہیں' تیرے دشمن تیرا نام عبث لیتے ہیں' اے خداوند! کیا میں ان کا کینہ نہیں رکھتا' جو تیرا کینہ رکھتے ہیں۔ کیا میں ان سے جو تیرے مخالف ہو کے روٹھے ہیں' بیزار نہیں۔ میں شدت سے ان کا کینہ رکھتا ہوں۔ میں انہیں اپنے دشمنوں میں گنتا ہوں۔'' (۱۳۹'۱۹'۲۲)

یشوع کے صحیفہ میں ہے:

''اگر تم کسی طرح سے برگشتہ ہو اور ان لوگوں کے بقیہ سے لپٹو جو تمہارے درمیان باقی ہیں اور ان کے ساتھ نسبتیں کرو اور ان سے ملو اور وہ تم سے ملیں' تو یقین جانو کہ خداوند تمہارا خدا پھر ان گروہوں کو تمہارے سامنے سے دفع نہ کرے گا بلکہ وہ تمہارے لیے پھندے اور دام اور تمہاری بغلوں کے لیے کوڑے' اور تمہارے آنکھوں میں کانٹے ہوں گے' یہاں تک کہ تم اس اچھی سرزمین پر سے جو خداوند تمہارے خدا نے عنایت کی ہے' نابود ہو جاؤ گے۔

(یشوع باب: ۲۳۔۱۲)

قرآن پاک اور احادیث میں بعض احکام ایسے بھی ہیں جن میں منکروں' ظالموں' بدکاروں اور گناہ گاروں سے علیحدہ رہنے کی نصیحت ہے۔

﴿وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (نساء:۸۹)

''وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کفر کرو' جس طرح انہوں نے کفر کیا' تو ان میں سے اپنے دوست نہ بناؤ' یہاں تک کہ وہ خدا کی راہ میں ہجرت نہ اختیار کریں۔''

---

(۱) صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۶ ۲' تفسیر سورۂ ممتحنہ۔

﴿وَاِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْھُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِہٖ وَ اِمَّا یُنْسِیَنَّکَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّکْرٰی مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ﴾ (انعام:۶۸)

''اور جب تو ان کو دیکھے کہ میری آیتوں کے شان میں لغو بکتے ہیں تو ان سے کنارہ کر لے یہاں تک کہ وہ اس کے سوا دوسری بات میں لگ جائیں اور اگر تجھ کو شیطان بھلا دے تو یاد آنے کے بعد پھر ان گناہ گار لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھ۔''

﴿وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَیْکُمْ فِی الْکِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰہِ یُکْفَرُ بِھَا وَ یُسْتَھْزَاُ بِھَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَھُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِہٖ اِنَّکُمْ اِذًا مِّثْلُھُمْ﴾ (نساء:۱۴۰)

''اور تم پر کتاب میں یہ حکم اتار چکا کہ جب سنو اللہ کی آیتوں سے انکار ہوتے اور ان پر ہنسی ہوتے، تو ان کے ساتھ جب تک وہ دوسری بات نہ کرنے لگیں نہ بیٹھو، ورنہ تم بھی ان ہی کے جیسے ہو جاؤ گے۔''

یہ احکام اس لیے ہیں تا کہ بری صحبت کا برا اثر مسلمانوں پر نہ پڑے، ان کے معنی قریب قریب وہی ہیں جو سینٹ پال کے ان فقروں کے ہیں:

''میں نے خط میں لکھا کہ حرام کاروں میں مت ملے رہو۔ لیکن نہ یہ کہ بالکل دنیا کے حرام کاروں یا لالچیوں یا لٹیروں یا بت پرستوں سے نہ ملو۔ نہیں تو تمہیں دنیا سے نکلنا ضرور ہوتا، پر میں نے اب تمہیں یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی بھائی کہلا کے حرام کار یا لالچی یا بت پرست یا گالی دینے والا یا شرابی یا لیٹرا ہو تو اس سے صحبت نہ رکھنا بلکہ ایسے کے ساتھ کھانا تک نہ کھانا۔۔۔۔۔۔ غرض کہ تم اس برے آدمی کو اپنے درمیان سے نکال دو (اول قرینتون:۵)

''اور تم بے ایمانوں کے ساتھ نالائق جوئے میں مت جٹے جاؤ کہ راستی اور ناراستی میں کونسا ساجھا ہے اور روشنی اور تاریکی میں کونسا میل ہے، ایماندار کا بے ایمان کے ساتھ کیا حصہ ہے۔ خدا کی ہیکل کو بتوں سے کونسی موافقت ہے۔۔۔۔۔ اس واسطے خدا یہ کہتا ہے کہ تم ان کے درمیان سے نکل آؤ، اور جدا ہو اور ناپاک کو مت چھوؤ (۲۔ قرینتوں ۶)

کفار و مشرکین کے ساتھ دلی بیگانگی اور روحانی غیریت کے باوجود اسلام دنیاوی معاملات اور اخلاق میں مسلمانوں کو ان سے عدل و انصاف اور رواداری کی تاکید کرتا ہے عین لڑائی کی حالت میں بھی یہ حکم ہے:

﴿وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ اسْتَجَارَکَ فَاَجِرْہُ حَتّٰی یَسْمَعَ کَلٰمَ اللّٰہِ ثُمَّ اَبْلِغْہُ مَاْمَنَہٗ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْلَمُوْنَ﴾ (توبہ:۶)

''اور اگر مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے یہاں تک کہ وہ اللہ کے کلام کو سن لے پھر اس کو تو اس کی امن کی جگہ تک پہنچا دے یہ اس لیے کہ وہ نادان لوگ ہیں۔''

کیا ایک جنگجو مذہبی دشمن کے ساتھ اس سے زیادہ بھی حسنِ سلوک ہو سکتا ہے؟ کفار سے دلی بے تعلقی کے باوجود قرآنِ پاک میں یہ صریح حکم ہے کہ اگر کسی مسلمان کے ماں باپ مشرک و کافر ہوں تو بھی ان کی خدمت بجا

انا اور دنیاوی معاملات میں ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا ان کی مسلمان اولاد پر فرض ہے۔ فرمایا:

﴿وَ اِنۡ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنۡ تُشۡرِكَ بِىۡ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡهُمَا وَ صَاحِبۡهُمَا فِى الدُّنۡيَا مَعۡرُوۡفًا وَّاتَّبِعۡ سَبِيۡلَ مَنۡ اَنَابَ اِلَىَّ ثُمَّ اِلَىَّ مَرۡجِعُكُمۡ فَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ﴾ (لقمان:۱۵)

''اور اگر وہ دونوں (والدین) اس پر ضد کریں کہ میرے ساتھ اس کو شریک کر جس کا تجھے علم نہیں تو ان کی بات نہ مان اور دنیا میں ان کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کر اور اس کی راہ چل جو میری طرف جھکا' پھر تم سب کو میری طرف آنا ہے پھر میں تم کو جتاؤں گا جو تم کرتے تھے۔''

مذہبی دشمنوں کے ساتھ اس سے زیادہ رواداری اور کیا ہو سکتی ہے کہ مذہبی مخالفت کے باوجود ان کی دنیاوی خدمت اور ان کے ساتھ نیک برتاؤ میں کوئی کوتاہی نہ کی جائے۔

سختی کا جائز موقع

اس میں شک نہیں کہ اسلام میں نہ صرف کفار بلکہ ان کے ساتھ بھی جن کو قرآن کی اصطلاح' میں منافقین کہتے ہیں' بعض موقعوں پر سختی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جیسے کسی قوم کے ساتھ مسلمانوں کو لڑائی در پیش ہو اور اس وقت خطرہ ہو کہ جو کافر یا منافق مسلمانوں کے ساتھ آباد ہیں وہ دھوکے سے دشمنوں کے ساتھ میل اور سازش نہ کر لیں یا لڑائی کے بغیر بھی وہ مسلمانوں کے اندر رہ کر ان کی جماعت میں تفرقہ پردازی کریں اور طرح طرح کے شبہوں اور افواہوں سے مسلمانوں کی جمعیت میں پریشانی پیدا کریں۔ اس حالت میں ان کافروں اور منافقوں کی سختی کے ساتھ نگرانی اور دیکھ بھال کی جائے اور مسلمانوں کو ان کے میل جول سے روک دیا جائے اور اگر وہ لڑ پڑیں تو بہادری کے ساتھ ان سے لڑا جائے' یہاں تک کہ وہ اپنی اس مذموم حرکت سے باز نہ آ جائیں' ان تمام امور کے فیصلہ کا حق امامِ وقت کو حاصل ہے۔ اس موقع کی دو آیتیں سورۂ توبہ میں ہیں:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ جَاهِدِ الۡكُفَّارَ وَالۡمُنٰفِقِيۡنَ وَ اغۡلُظۡ عَلَيۡهِمۡ وَ مَاۡوٰهُمۡ جَهَنَّمُ وَ بِئۡسَ الۡمَصِيۡرُ ○ يَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوۡا وَ لَقَدۡ قَالُوۡا كَلِمَةَ الۡكُفۡرِ وَ كَفَرُوۡا بَعۡدَ اِسۡلَامِهِمۡ وَ هَمُّوۡا بِمَا لَمۡ يَنَالُوۡا وَمَا نَقَمُوۡۤا اِلَّاۤ اَنۡ اَغۡنٰهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوۡلُهٗ مِنۡ فَضۡلِهٖ فَاِنۡ يَّتُوۡبُوۡا يَكُ خَيۡرًا لَّهُمۡ وَ اِنۡ يَّتَوَلَّوۡا يُعَذِّبۡهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيۡمًا فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ وَ مَا لَهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ مِنۡ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيۡرٍ﴾ (توبہ:۷۴)

''اے پیغمبر! ان کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان پر سختی کر اور ان کی جائے پناہ دوزخ ہے اور وہ کتنی بری بازگشت کی جگہ ہے۔ یہ اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ انہوں نے ایسا نہیں کہا۔ حالانکہ انہوں نے یقیناً کفر کی بات کہی' اور اسلام کے اظہار کے بعد کفر کیا اور اس بات کا قصد کیا تھا جس کو وہ نہ پا سکے اور

انہوں نے عیب نہیں کیا لیکن یہی کہ خدا اور اس کے رسول نے اپنی مہربانی سے ان کو دولت مند کر دیا' تو اگر وہ باز آ جائیں تو ان کے لیے یہ بہت اچھا ہے اور اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ ان کو اس دنیا میں اور آخرت میں دردناک سزا دے گا اور زمین میں ان کا کوئی دوست ہوگا نہ مددگار۔''

یہ آیتیں اس سختی کے موقع کو خود اپنے الفاظ سے ظاہر کر رہی ہے اور ان کے آگے اور پیچھے جو آیتیں ہیں' وہ اور اس کی وضاحت کرتی ہیں۔ تین رکوع کے بعد سورۃ کے خاتمہ میں مسلمانوں کو رومیوں[1] کے مقابلہ میں اپنی پوری سختی کے مظاہرہ کی ہدایت کی گئی ہے۔

﴿يَاَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً وَّ اعْلَمُوا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ﴾ (توبہ:۱۲۳)

''اے ایمان والو! ان کافروں سے لڑو جو تمہارے ہم سرحد ہیں اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں اور یقین کرو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔''

اس سختی کے مظاہرہ کا حکم اس لیے ہے تا کہ وہ مسلمانوں کو کمزور سمجھ کر ان پر حملہ کی نیت نہ کریں۔

تحریم اور ایلاء کے موقع پر جب بعض منافق اہل بیت نبوی میں پھوٹ ڈال کر مسلمانوں کی جماعت میں افتراق اور انتشار پیدا کرنا چاہتے تھے کفار اور منافقین کے ساتھ سختی سے پیش آنے کا حکم ہوا:

﴿يَاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِينَ وَ اغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَ بِئْسَ الْمَصِيرُ﴾ (تحریم:۹)

''اے پیغمبر! ان کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان پر سختی کر اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بازگشت کی نہتی بری جگہ ہے۔''

یہ تمام مواقع سیاسی انتظام اور جماعتی نظام کی برقراری سے متعلق ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کفار اور منافقین کے زمرہ میں وہ کمزور مسلمان بھی شمار کیے گئے ہیں جو اس انتظام و نظام کی بربادی میں کفار و مشرکین کے ساتھ عملاً شریک ہو گئے تھے۔

قرآن پاک میں ایک اور ایسی آیت ہے جس سے مخالف جو اسلام پر سنگدلی اور بے رحمی کا الزام لگاتے ہیں' اپنے مدعا پر غلط استدلال کر سکتے ہیں اور وہ سورۃ فتح کی حسب ذیل آیت ہے جس میں ایک طرف صحابہؓ کی بہادری اور دوسری طرف ان کی باہمی محبت اور رحم دلی کی تعریف ہے۔

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِينَ مَعَه اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُم﴾ (فتح:۲۹)

''محمد' خدا کے رسول اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت (بھاری) ہیں اور آپس میں مہر و محبت

---

(۱) تفسیر ابن جریر طبری ج' ا ص ۴۶۔

رکھتے ہیں۔‘‘

﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ کا یہ ترجمہ کہ ’’وہ کافروں پر سخت ہیں۔‘‘ اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ کافروں کے ساتھ سنگ دلی‘ بے رحمی اور بداخلاقی کے ساتھ پیش آتے ہیں بلکہ اس معنی میں ہے کہ یہ مسلمان اپنی ہمت‘ استقلال‘ باہمی اتحاد اور شدتِ ایمان کے سبب سے ایسے سخت ہیں کہ کفار ان سے مرعوب ہیں اور مقابلہ میں مسلمان ان پر ایسے بھاری ہیں کہ کفار ان پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے محاورہ کے مطابق ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ کا ترجمہ یہ نہیں کرنا چاہیے کہ وہ کافروں پر سخت ہیں بلکہ یہ کرنا چاہیے کہ وہ کفار پر بھاری ہیں‘ یعنی ان پر غالب اور ان کے مقابل میں کافی مضبوط ہیں‘ ان سے کسی طرح دبتے نہیں۔ چنانچہ علامہ زمخشری نے کشاف میں‘ ابن حیان اندلسی نے بحرالمحیط میں‘ قاضی بیضاوی نے انوار التنزیل میں اس آیت کے وہی معنی قرار دیے ہیں جو سورۂ مائدہ کی اس آیت کے ہیں۔ ﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ﴾

یہ محاورہ قرآن میں کئی جگہ آیا ہے۔ مثلاً سورۂ ہود میں ہے:

﴿يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (ہود:۹۲)

’’اے لوگو! کیا میرا خاندان تم پر خدا سے زیادہ بھاری (مضبوط) ہے۔‘‘

دوسری آیت میں ہے:

﴿عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ (توبہ:۱۲۹)

’’تمہاری تکلیف رسول پر گراں ہے۔‘‘

لسان العرب میں ہے:

﴿وَ رَجُلٌ شَدِيْدٌ قَوِيٌّ وَالْجَمْعُ اَشِدَّآءُ﴾ (ج۴ ص ۲۱۸ مصر)

’’مردِ شدید‘ یعنی قوی اور اس کی جمع اشداء ہے۔‘‘

قرآن پاک میں ﴿اَشَدُّ قُوَّةً‘ اَشَدُّ خَلْقًا‘ اَشَدُّ تَثْبِيْتًا‘ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا﴾ وغیرہ متعدد آیتوں میں استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ قوی اور مضبوط کے معنی میں آیا ہے۔ دوسرے مشتقات میں بھی یہ معنی مراد لیے گئے ہیں۔

﴿اُشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ﴾ (طٰہٰ:۳۱)

’’اس سے میری کمر کو مضبوط کر۔‘‘

﴿وَ بَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا﴾ (نبا:۱۲)

’’اور ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔‘‘

﴿وَ شَدَدْنَا مُلْكَهٗ﴾ (صٓ:۲۰)

’’اور ہم نے ان کی سلطنت مضبوط کی۔‘‘

﴿فَشُدُّوا الْوَثَاقَ﴾ (محمد:۴)

''پھر مضبوط باندھو۔''

﴿شَدِيۡدٍ﴾ کے مشترک معنی یہ ہیں کہ جو اپنی مخالف قوت کے سامنے نہ جھکے بلکہ اس کے مقابلہ میں مضبوط اور سخت رہے اور یہی صحابہ کرامؓ کی صفت تھی' انہوں نے کفار کی بڑی بڑی مخالفتوں کی پروانہ کی' تکلیفوں اور مزاحمتوں کا پرزور مقابلہ کیا' دشمنوں کی تلوار کے نیچے سر رکھ دیا' ان کے نیزوں کو سینوں میں جگہ دی' ان کے تیروں کی بوچھاڑ سے لہولہان ہوئے۔ مگر جس کو ایک کہا تھا' پھر اس کو دو نہ کہا' اور جس کی تصدیق کر چکے تھے' پھر اس سے انکار نہ کیا۔ آخر یہ ہوا کہ کفار اپنی تعداد کی کثرت کے باوجود ان سے دبنے لگے اور مسلمانوں کی ایمانی قوت کا رعب ان پر بیٹھ گیا۔ قرآن نے جو پیشین گوئی کی تھی کہ۔ ﴿سَأُلۡقِيۡ فِيۡ قُلُوۡبِهِمُ الرُّعۡبَ﴾

کہ میں ان کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب بٹھا دوں گا۔ وہ بالآخر پوری ہوئی اور فرمایا:

﴿وَ قَذَفَ فِيۡ قُلُوۡبِهِمُ الرُّعۡبَ﴾ (احزاب ۲۶ و حشر: ۲)

''ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دیا۔''

مخالفوں کے دلوں میں اسی رعب کے بٹھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہمیشہ سامان جنگ مہیا رکھنے کا حکم دیا ہے:

﴿وَ اَعِدُّوۡا لَهُمۡ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ قُوَّةٍ وَّ مِنۡ رِّبَاطِ الۡخَيۡلِ تُرۡهِبُوۡنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ﴾ (انفال: ۶۰)

''ان کے لیے تم سے جو طاقت ہو سکے' اور گھوڑوں کا باندھنا' وہ تم تیار رکھو۔ کہ اس سے دشمنوں کو مرعوب کرو۔''

اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ کفار کو ڈرایا کرو۔ بلکہ یہ ہے کہ تمہارا ساز و سامان اور جنگی تیاری اتنی ہو کہ دشمن تمہارے مقابل آنے سے رعب کھائے۔ اسی لیے جہاد کا پورا سامان ہر وقت تیار رکھنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ اور آنحضرت ﷺ نے جہاد کی غرض سے گھوڑوں کے رکھنے کو ثواب کا کام بتایا ہے۔ فرمایا جو شخص گھوڑا خدا کی راہ میں باندھتا ہے اور اس کا حق ادا کرتا ہے وہ اس کے لیے ثواب کا موجب ہے جو ضرورت کے لیے باندھتا ہے اس کے لئے پردہ پوش ہے اور جو نمائش کے لئے باندھتا ہے وہ اس کے لئے عذاب ہے۔[1] اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعتِ محمدیہ میں نیت کا سوال سب سے اہم ہے' اسی لیے ضروری ہے کہ حق کے مخالفوں کے ساتھ ایک مسلمان کو جس عدمِ موالات کا حکم دیا گیا ہے اس کا منشا ذاتی و قومی نفرت اور بیزاری نہ ہو بلکہ وہ صرف حق کی نفرت کی خاطر اور خدا کے لیے ہو۔ لیکن اس کے باوجود ان باطل کے حامیوں کے ساتھ عدل و انصاف اور نیک برتاؤ سے اسلام نے اپنے پیروؤں کو نہیں روکا ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الجہاد۔

خدا کے لیے محبت اور خدا کے لیے ناراضی

یہاں کوئی معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ اسلام نے سرے سے نفرت اور بیزاری کے جذبات ہی کا خاتمہ کیوں نہیں کر دیا، لیکن ایسا کہنا فطرت کے قوانین سے چشم پوشی کرنا ہے، محبت اور عداوت، موافقت اور مخالفت، رضامندی اور ناراضی، انسان کے فطری جذبات ہیں اور دنیا کے تمام کام، تمام تحریکیں، اور تمام جدوجہد، انہی دو برابر جذبات کے نتیجے ہیں، اگر انسان کو ان دونوں جذبات سے پاک کر دیا جائے تو اس کی نیک و بد ہر قسم کی گرم جوشیاں سرد پڑ جائیں۔ اور یہ آگ کا شعلہ جس سے انسان کا دل عبارت ہے، برف کا تودہ بن جائے۔ اس لیے یہ ناممکن ہے اور نامناسب ہے کہ اس کے محبت اور ناراضی کے جذبات کو سرے سے فنا کر دیا جائے بلکہ جو ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے اندر سے ذاتی رجحانات اور شخصی میلانات کا عنصر علیحدہ کر دیا جائے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ نہیں کہ نفس سے غیظ و غضب اور ناراضی کے فطری جذبات کو نکال کر پھینک دو۔ جو یقیناً ناممکن ہے بلکہ یہ ہے کہ ان جذبات کے استعمال کا صحیح موقع و محل متعین کیا جائے۔ چنانچہ اسلام نے ان موقعوں کی تعیین کی ہے اور بتایا ہے کہ کسی سے مخالفت اور آزردگی، ذاتی خود غرضی اور شخصی نفع و نقصان کے لیے نہ ہو بلکہ اگر یہ ہو تو صرف حق کی حمایت، نیکی کی اعانت اور خدا کی خوشنودی کے لیے ہو۔ دوستی و دشمنی، رضامندی اور ناراضی اور محبت و عداوت جو کچھ ہو خدا کے لیے ہو۔ ﴿اَلْحُبُّ فِی اللّٰهِ وَ الْبُغْضُ فِی اللّٰهِ﴾ ۔

یہ کہنا بظاہر بہت خوش نما ہے کہ ہر قسم کی ناخوشی و ناراضی کے جذبات سے انسان کو پاک کر دینا ایک اچھے مذہب کا فرض ہے مگر یہ فرض فطرت کے خلاف ہے۔ ناخوشی و ناراضی کو سرے سے فنا نہیں کیا جا سکتا ہے، بلکہ جو ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس ناخوشی و ناراضی کے موقع و محل کی اصلاح کی جائے۔ یہ ناممکن ہے کہ انسان کسی شے سے اور اس کی ضد سے بھی برابر کی محبت کرے۔ وہ جب خیر سے محبت کرے گا تو شر سے نفرت بھی کرے گا۔ وہ ایمان کو چاہے گا تو کفر سے بیزار بھی ہوگا، وہ نیکوں سے دوستی کرے گا تو شریروں سے علیحدہ بھی ہوگا، مؤمن سے خوش ہوگا تو منافق سے ناخوش بھی ہوگا۔ انسان کے سینہ میں صرف ایک دل ہے اور ایک ہی دل میں ایک شے کی اور پھر اسی کی ضد کی دونوں کی محبت یکجا نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ قرآن نے کہا:

﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَیْنِ فِیْ جَوْفِهٖ﴾ (احزاب:۴)

''خدا نے کسی کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے۔''

سینہ میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے

اسی مفہوم کو حضرت مسیح علیہ السلام نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

''کوئی آدمی دو آقاؤں کی خدمت نہیں کر سکتا اس لیے کہ یا ایک سے دشمنی رکھے گا یا دوسرے سے دوستی یا ایک کو مانے گا اور دوسرے کو ناچیز جانے گا۔ تم خدا اور مال دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔'' (متی ۶، ۲۴)

انجیل کے اسی فقرہ کی تشریح مختلف عیسائی رسولوں نے اپنے اپنے طور پر کی ہے۔ پولوس (۱) نے خدا اور آدمی یعقوب (۲) نے خدا اور دنیا، (۳) یوحنا نے خدا اور دنیا کے برے کاموں کو باہم مقابل ٹھہرا کر کہا ہے کہ جو ایک سے محبت کرے گا وہ دوسرے سے نہیں۔

یہی مفہوم احادیث کے ان الفاظ میں ہے کہ محبت اور عداوت دونوں صرف خدا کے لیے ہونی چاہییں، اپنی ذات کے لیے نہیں۔ بیہقی کی شعب الایمان میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ابوذرؓ سے پوچھا کہ ''ایمان کی کون سی زنجیر زیادہ مضبوط ہے۔'' عرض کی ''خدا اور اس کے رسول کو بہتر علم ہے۔'' فرمایا ''یہ کہ باہمی میل جول خدا میں ہی ہو۔'' مسند احمد میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے دریافت کیا کہ ''کون سی نیکی خدا کو زیادہ پیاری ہے۔'' کسی نے نماز کہا، کسی نے زکوٰۃ کہا، کسی نے جہاد بتایا، آپ نے فرمایا: ''تمام نیکیوں میں سب سے زیادہ خدا کو یہ نیکی پسند ہے کہ خدا کے لیے محبت اور خدا ہی کے لیے مخالفت ہو۔'' (۴)

اسلام میں کسی سے دائمی یا موروثی نفرت کی تعلیم نہیں

خدا کے لیے کسی سے ناخوشی یا مخالفت یا نارضامندی کے یہ معنی ہیں کہ نفسانی غرض و غایت کو اس جذبہ میں کوئی دخل نہ ہو، نیز یہ کہ شخص سے شخص کی حیثیت سے مخالفت یا بیزاری نہ ہو بلکہ دراصل اس کے افعال، اعمال اور اخلاق سے مخالفت یا بیزاری ہو اور اس کے سبب سے اس شخص سے علیحدگی و بیزاری ہو جس میں یہ صفتیں پائی جاتی ہوں۔ قرآن پاک کی ایک آیت ہے:

﴿حَبَّبَ اِلَيۡكُمُ الۡاِيۡمَانَ وَ زَيَّنَهٗ فِىۡ قُلُوۡبِكُمۡ وَ كَرَّهَ اِلَيۡكُمُ الۡكُفۡرَ وَ الۡفُسُوۡقَ وَ الۡعِصۡيَانَ﴾ (حجرات: ۷)

''خدا نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا اور اس کو تمہارے دلوں میں مزین کیا اور کفر اور بے حکمی اور نافرمانی کو تمہارے نزدیک مکروہ بنایا۔''

اس آیت پاک میں اللہ تعالیٰ نے خود مؤمن یا فاسق و عاصی کی ذات کو نہیں بلکہ ایمان کو محبت کا اور فسق و فجور اور عصیان کو نفرت و کراہت کا مورد قرار دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی بیزاری و نارضامندی کا بنیادی سبب کافر و منافق کا کفر و نفاق ہے۔ یہ دور ہو جائے تو وہ بھی برابر کا بھائی ہے، فرمایا:

﴿فَاِنۡ تَابُوۡا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخۡوَانُكُمۡ فِى الدِّيۡنِ﴾ (توبہ: ۱۱)

---

(۱) گلتیوں کے نام (۱۰،۱)

(۲) یعقوب (۴۔۴)

(۳) یوحنا (۲،۱۵)

(۴) مشکوۃ کتاب الادب باب الحب فی اللہ۔

”تو اگر وہ کفر سے توبہ کر لیں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔“

یہی سبب ہے کہ ان صفات کے ازالہ کے بعد ہی دفعتاً کراہت محبت سے‘ دشمنی دوستی سے اور ناراضامندی رضامندی سے بدل جاتی ہے کیونکہ اسلام میں شخصی یا نسلی یا وطنی کسی پیدائشی یا دائمی نفرت و کراہت کا وجود نہیں‘ نہ ہندوؤں کی طرح اس کی نظر میں کوئی قابلِ نفرت اچھوت ہے‘ نہ ملیچھ ہے نہ چنڈال ہے‘ نہ یہودیوں کی طرح کوئی ناپاک غیر مختون ہے اور نہ غیر قوم ہے اور نہ مجوسیوں کی طرح کوئی پاک نژاد اور بدگہر کی تفریق ہے اور نہ عیسائیوں کی طرح کوئی کالے گورے اور یورپین اور غیر یورپین کی تقسیم ہے۔ جو کچھ ہے وہ کفر و ایمان اور شرک و توحید کا فرق ہے۔ ایک خالص عرب اور قریشی کافر ہو کر ابوجہل و ابولہب ہو سکتا ہے اور ایک معمولی حبشی و عجمی‘ مؤمن و موحد ہو کر بلال حبشیؓ‘ صہیب رومیؓ اور سلیمان فارسیؓ کا رتبہ پا سکتا ہے۔ وہی عمرؓ‘ وہی ابوسفیانؓ‘ وہی عکرمہؓ‘ وہی خالدؓ جو کل تک کفر کے علم بردار بن کر مسلمانوں کے سخت ترین دشمن تھے۔ بیک نظر ان کی وہ کایا پلٹ ہوئی کہ وہ مسلمانوں کے سرکردہ ہو گئے اور مسلمان ان کے فدائی بن گئے اور سب آپس میں بھائی بھائی ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ احسان جتایا:

﴿اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا﴾ (آل عمران:۱۰۳)

”(یاد کرو) جب تم باہم دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں باہم الفت پیدا کر دی اور تم اس کے فضل و کرم سے بھائی بھائی بن گئے۔“

ناپسندیدگی و بیزاری کا دوسرا جذبہ وہ ہے جس کی بنا کسی انسان کی گناہ گاری اور عصیان کاری پر ہے۔ توبہ و ندامت کے ایک حرف سے یہ جذبہ رحمت و شفقت سے مبدل ہو جاتا ہے مبشرِ عالم ﷺ نے ایسے گناہ گار کو خدا کی زبان سے یہ مژدہ سنایا کہ:

﴿يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾ (زمر:۵۳)

”اے میرے وہ بندو جنہوں نے گناہ کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے‘ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ خدا سب گناہوں کو معاف کر سکتا ہے۔ وہ بخشنے والا اور رحم کھانے والا ہے۔“

آپ نے فرمایا: ﴿التائب من الذنب كمن لا ذنب له﴾ ”گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا وہ جس کا گناہ نہ ہو۔“[۱] یہی سبب ہے کہ آنحضرت ﷺ نے گنہگاروں کے ساتھ بھی شفقت فرمائی اور ان کی طرف ترحم کی نظر سے دیکھا اور ان کو رضائے الٰہی کی بشارت سنائی۔ ایک صاحب کو شراب پینے کی عادت تھی وہ اس کی سزا بار بار بھگتتے تھے‘ ایک دفعہ جب وہ اسی جرم میں پکڑے آئے تو صحابہؓ نے کہا خدا اس پر لعنت کرے کہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے یہ الفاظ سنے تو فرمایا ”تم لوگ اس پر لعنت نہ بھیجو۔ خدا کی قسم! مجھے اس

(۱) ابن ماجہ باب ذکر التوبہ۔

کے متعلق جو معلوم ہے وہ یہ ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول کو پیار کرتا ہے۔[1] اس واقعہ سے علما نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ گناہ گار پر بددعا نہ کی جائے۔[2] ماعز بن مالک ایک صاحب تھے جو بشری کمزوری سے زنا کے مرتکب ہوئے۔ واقعہ کے بعد ان کا روحانی احساس بیدار ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ اس کی سزا موت ہے تاہم انہوں نے خدمتِ نبوی میں حاضر ہو کر اپنی حالت عرض کی اور سزا کی درخواست کی۔ آنحضرت ﷺ نے کئی دفعہ ان کی درخواست رد کی۔ لوگوں سے تحقیق کی کہ یہ پاگل تو نہیں، سب نے کہا ایسا تو نہیں ہے اس کے بعد ان پر حد جاری کرنے کا حکم دیا۔ وہ میدان میں کھڑے کیے گئے اور ان پر لوگوں نے ہر طرف سے سنگ باری کی اور اسی حال میں انہوں نے جان دی۔ صحابہؓ میں بعض ایسے تھے جو اس بہادرانہ سزا پانے کے باوجود ماعز کو برا کہتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو فرمایا ''ماعز کے لیے خدا سے مغفرت کی دعا مانگو کہ اس نے وہ توبہ کی کہ اگر وہ کسی پوری قوم میں بانٹی جائے تو ان میں سب کی گنجائش ہو سکتی ہے۔''[3]

اسی طرح قبیلہ غامد کی ایک حاملہ عورت نے آ کر خود اپنے جرم کا اقرار کیا اور سزا کی درخواست کی آپؐ نے فرمایا کہ وضعِ حمل کے بعد آنا۔ وہ اس کے بعد آئی فرمایا بچہ کی پرورش کر لو۔ جب بچہ دودھ چھوڑ دے تب آنا۔ وہ کچھ زمانہ کے بعد اس فرض سے بھی سبکدوش ہو کر آئی اور اب بھی اس کے احساسِ گناہ کا جذبہ کم نہیں ہوا تھا۔ آپؐ نے اس پر حد جاری کرنے کا حکم دیا۔ اس کو سنگسار کیا گیا تو اس کے خون کی چھینٹیں اڑ کر حضرت خالدؓ بن ولید کے منہ پر پڑیں، تو انہوں نے عورت کو برا کہا۔ آنحضرت ﷺ نے سنا تو فرمایا ''خالد چپ رہو۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس نے وہ توبہ کی ہے کہ اگر شاہی محصول لینے والا بھی وہ توبہ کرتا تو بخشا جاتا۔''[4]

ترکِ ھویٰ

آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے یہ نکتہ سکھایا ہے کہ انسان کے نیک سے نیک فعل کی اچھائی بھی اس کی غرض و غایت پر موقوف ہے یعنی یہ کہ اگر وہ خدا کی خوشنودی اور رضا مندی کے لیے ہے تو وہ نیک اور اچھا ہے اور اگر اس کے علاوہ کسی اور فاسد غرض کے لیے ہے تو وہ نیکی نہیں، اسی فاسد غرض اور باطل خواہش کا نام قرآن پاک میں ہویٰ ہے۔ ضروری ہے کہ انسان اپنے تمام افعال و اعمال و اخلاق کو ہویٰ سے پاک رکھے کہ انسان کا حقیقی خدا وہی ہے جس کے لیے وہ کام کرتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو دینِ حق کے پیرو نہیں اور اپنے کاموں کی بنیاد اخلاص پر نہیں رکھتے یہ کہا کہ ان کا دین و مذہب اپنی خواہشِ نفسانی کی پیروی ہے اور ان کے سینوں کے اندر

(۱) صحیح بخاری کتاب الحدود۔
(۲) فتح الباری شرح حدیث مذکور۔
(۳) صحیح مسلم کتاب الحدود۔
(۴) کتاب الحدود۔

اغراضِ نفسانی اور خواہش و ہویٰ کے بت چھپے ہیں۔ قرآن نے فرقان اور جاثیہ دو سورتوں میں متنبہ کیا:

﴿اَفَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰهُ﴾ (جاثیہ:۲۳)

''اے پیغمبر! کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنا رکھا ہے۔''

اسی لیے نفس کے تزکیہ و صفائی اور روح کی بلندی و پاکی کے لیے شریعتِ محمدی نے ترکِ ہویٰ کا طریقہ پیش کیا۔ بودھ کی تعلیم کا اصل الاصول یہ ہے کہ انسان ہر خواہش سے پاک ہو جائے لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ انسان ہر بری خواہش سے پاک ہو جائے کیونکہ اگر وہ ہر اچھی اور بری خواہش سے پاک ہو جائے تو اس کے فعل کی کوئی غرض و غایت نہ ٹھہرے گی اور نہ اس کا کوئی محرک باقی رہے گا۔ اسی لیے اسلام کی تعلیم میں ہر خواہش کے ترک کرنے کا مطالبہ نہیں بلکہ ہر بری خواہش، ہر باطل غرض اور نفسانی ہوا و ہوس کے ترک کا مطالبہ ہے کیونکہ اسی کی پیروی سے گمراہی و ضلالت پیدا ہوتی ہے۔ وحی محمدی نے فرمایا:

﴿وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ﴾ (قصص:۵۰)

''اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہے جس نے خدا کی رہنمائی کے بغیر اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کی۔''

پھر فرمایا:

﴿وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (صٓ:۲۶)

''اور خواہشِ نفسانی کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی سے راہ ہٹا دے گی۔''

عدل و راستی جو ہر اچھائی اور نیکی کی روح ہے وہ اسی ہویٰ کے زہرِ قاتل سے مر جاتی ہے۔ فرمایا:

﴿فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا﴾ (نساء:۲)

''عدل میں نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو۔''

ہوائے نفسانی تمام برائیوں اور بدیوں کی جڑ ہے جس نے اپنے آپ کو اس سے بچایا وہ ہر برائی اور بدی سے پاک ہوا اور اس کے امن کی جگہ جنت ہے۔ فرمایا:

﴿وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ○ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ○﴾ (نازعات:۴۰۔۴۱)

''اور لیکن جو کوئی اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو بری خواہش سے روکا تو بے شک جنت ہے اس کے امن سے رہنے کی جگہ۔''

اخلاق اور محبتِ الٰہی

دین و دنیا کی سب سے بڑی نعمت محبت اور پیار ہے۔ خاص کر وہ محبت اور پیار جو خدا کو اپنے بندہ کے ساتھ ہو۔ یہ غیر فانی نعمت اور یہ لازوال دولت جن ذریعوں سے انسان کو حاصل ہو سکتی ہے ان میں دیگر ضروریاتِ دین

کے بعد سب سے بڑا اور اہم ذریعہ حسنِ اخلاق ہے۔ عقائد کے باب میں محبتِ الٰہی کے زیرِ عنوان اس کی طرف مجمل اشارہ ہو چکا ہے مگر اس کی تفصیل کا موقع اب ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت پر زور تو توراۃ اور انجیل میں بھی ہے مگر اصل سوال یہ ہے کہ خدا کی محبت کے حصول کا طریقہ کیا ہے اور یہ دولت انسان کو کیونکر مل سکتی ہے۔ اس کا جواب صرف قرآن نے دیا ہے۔ مختصراً یہ کہ ہر کام اور ہر چیز میں داعیِ خیر کی پیروی محبتِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کی زبان سے فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ (آل عمران:۳۱)

''کہہ دو اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تم سے محبت کرے گا۔''

اس لیے آنحضرت ﷺ کی تعلیمات' ارشادات' احکام' اخلاق اور اعمال کی پیروی محبتِ الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے لیکن قرآن پاک نے اس مختصر جواب پر قناعت نہیں کی ہے بلکہ نام بنام اس نے بتایا ہے کہ خدا کی محبت کے مستحق اور سزاوار کون کون ہیں اور اس دولت سے محروم کون ہیں۔ اس سے اسلامی اصولِ اخلاق کا یہ مسئلہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان کاموں سے جو خدا کی محبت کا ذریعہ ہیں' حسنِ خلق بھی ہے اور ان امور میں سے جن سے یہ نعمت چھن جاتی ہے بداخلاقی اور بدکرداری بھی ہے۔

پہلی صف میں حسبِ ذیل خوش قسمت انسانی جماعتیں داخل ہیں۔

﴿وَ اللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (آل عمران:۶۸)

''اور خدا ایمان والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (بقرہ:۱۹۵ و مائدہ:۱۳)

''خدا اچھے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ﴾ (بقرہ:۲۲۲)

''خدا توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ﴾ (آل عمران:۱۵۹)

''خدا توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ﴾ (مائدہ ۴۲ و حجرات ۹)

''خدا انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (توبہ:۴'۷)

''خدا تقویٰ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الصَّابِرِيْنَ﴾ (آل عمران:۱۴۶)

''اور خدا صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ﴾ (توبہ:۱۰۸)

''اور خدا پاک صاف رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِه﴾ (صف:۴۰)

''خدا ان سے پیار کرتا ہے جو اس کی راہ میں لڑتے ہیں''

ان آیات پاک میں تو نو باتیں ایسی بیان کی گئی ہیں جو محبتِ الٰہی کو اپنی طرف کھینچتی ہیں' ایمان' احسان' توبہ' توکل' انصاف' تقویٰ' صبر' پاکیزگی' جہاد۔

حسب ذیل صفتیں وہ ہیں جو محبتِ الٰہی کے فیضان سے انسان کو محروم کرتی ہیں۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِيْنَ﴾ (آل عمران:۵۷)

''اور خدا کافروں کو پیار نہیں کرتا۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾ (بقرہ:۱۹۰' مائدہ:۸۷)

''خدا حد سے بڑھنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا﴾ (نساء:۳۶)

''خدا اس کو پیار نہیں کرتا جو اترانے والا اور شیخی مارنے والا ہو۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا﴾ (النساء:۱۰۷)

''خدا اس کو پیار نہیں کرتا جو خیانت کار اور گناہ گار ہو۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ﴾ (انفال:۵۸)

''خدا خیانت کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ﴾ (حج:۳۸)

''خدا کسی خیانت کار ناشکرے کو پیار نہیں کرتا۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ﴾ (قصص:۷۶)

''خدا اترانے والوں کو پیار نہیں کرتا۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ﴾ (قصص:۷۶)

''خدا فساد کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ﴾ (انعام:۱۴۱)

''خدا فضول خرچ لوگوں کو پیار نہیں کرتا۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ﴾ (نحل:۲۳)

''خدا مغروروں کو پیار نہیں کرتا۔''

﴿اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ﴾ (شوریٰ:۴۰)

''خدا ظالموں کو پیار نہیں کرتا۔''

﴿وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِیْمٍ﴾ (بقرہ:۲۷۶)

''خدا ناشکر گناہ گاروں کو پیار نہیں کرتا۔''

کفر، بدگوئی، بدلہ لینے میں حد سے آگے بڑھ جانا۔ فخر وغرور، شیخی، خیانت، ناشکری، فساد، اسراف، ظلم، گناہ وہ بداخلاقیاں ہیں جو انسان کو محبتِ الٰہی کے سایہ سے دور کرتی ہیں۔

اوپر کی تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ اسلامی اخلاق کی ترکیب میں محبتِ الٰہی کا کتنا بڑا عنصر شامل ہے۔

تعلیمِ اخلاق کے طریقے اور اسلوب

آنحضرت ﷺ کی بعثت تعلیم اور تزکیہ کے لیے ہوئی، یعنی لوگوں کو سکھانا اور نہ صرف سکھانا اور بتانا بلکہ عملاً بھی ان کو اچھی باتوں کا پابند اور بری باتوں سے روک کر، آراستہ و پیراستہ بنانا اس لیے آپ کی خصوصیت یہ بتائی گئی، کہ

﴿یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ یُزَكِّیْهِمْ﴾ (بقرہ:۱۲۹)

''وہ (رسول) ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا اور پاک و صاف کر کے نکھارتا ہے۔''

اور اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ:

﴿و انما بعثت معلما﴾ (ابن ماجہ باب فضل العلماء)

''اور میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔''

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس معلمِ ربانی نے کن طریقوں سے اپنی اخلاقی تعلیم کے فرض کو انجام دیا۔

ایک کامیاب معلم کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں اپنے اپنے موقع پر سختی اور نرمی دونوں ہوں۔ وہ ایک جراح ہے جس کے ایک ہاتھ میں نشتر ہو جس سے زخم کو چیر کر فاسد مواد کو باہر نکال دے اور دوسرے ہاتھ میں مرہم ہو جس سے زخم میں ٹھنڈک پڑ جائے اور تندرست گوشت اور چمڑے کی پرورش ہو، اگر کسی جراح کے پاس ان دو میں سے صرف ایک ہی چیز ہو تو وہ زخم کو نہ تو پاک کر سکتا ہے اور نہ فاسد گوشت پوست کی جگہ تندرست گوشت و پوست پیدا کر سکتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی تعلیمِ اخلاق کے طریقوں پر غور کی ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی تعلیم میں سختی اور نرمی کے موقع و محل کو خوب پہچانتے تھے اور اس پر عمل فرماتے تھے، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آپؐ نے کبھی اپنی ذات کے لیے کسی سے بدلہ نہیں لیا مگر یہ کہ کوئی شریعت کے حدود کو توڑے تو اس کی سزا دیتے تھے۔ [1] قریش کی ایک بی بی چوری کے جرم میں پکڑی گئی، بعض مسلمانوں نے ان کی سفارش کرنی چاہی تو آپؐ نے فرمایا، تم سے پہلے کی قومیں اس لیے تباہ ہوئیں کہ جب ان میں معمولی لوگ گناہ کرتے تھے تو اس کو سزا دیتی تھیں

۱) صحیح بخاری باب قول النبی ﷺ یسروا ولا تعسروا۔

اور جب بڑے لوگ کرتے تھے تو ان کے احکام ٹال جاتے تھے۔ (۱)

یہ تو سختی کی مثالیں ہیں، نرمی کی مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ مسجد نبوی میں ایک بدوی آیا، اتفاق سے اس کو استنجا کی ضرورت معلوم ہوئی، تو وہ وہیں مسجد کے صحن میں بیٹھ گیا، صحابہؓ یہ دیکھ کر چاروں طرف سے اس کو مارنے کو دوڑے۔ آپؐ نے روکا اور فرمایا، تم سختی کے لیے نہیں بلکہ نرمی کے لیے بھیجے گئے ہو، اس کے بعد اس بدوی کو بلا کر فرمایا کہ یہ عبادت کے گھر ہیں، یہ نجاست کے لیے موزوں نہیں، یہ خدا کی یاد اور نماز اور قرآن پاک پڑھنے کے لیے ہیں۔ پھر لوگوں سے فرمایا کہ اس پر پانی بہا دو۔ (۲)

اسی طرح ایک دفعہ ایک صاحب سے رمضان میں بحالتِ روزہ ایک غلطی ہوگئی، اس نے لوگوں سے کہا کہ مجھے حضور کے پاس لے چلو، انہوں نے کہا یہ ہم سے نہ ہوگا، تو وہ اکیلا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا اور واقعہ عرض کیا، فرمایا ایک غلام آزاد کردو، عرض کی یارسول اللہ میرے پاس تو ایک غلام بھی نہیں، فرمایا دو مہینے لگاتار روزے رکھو، عرض کی روزہ ہی میں یہ گناہ ہوا، فرمایا تو اچھا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو۔ عرض کی ہم تو خود کنگال ہیں، فرمایا کہ اچھا بنی زریق کے صدقہ کے منتظم کے پاس جاؤ اور اس سے صدقہ لے کر پہلے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ اور جو بچے وہ تم اور تمہارے گھر والے کھائیں، وہ خوش ہو کر اپنے قبیلہ میں آیا اور کہا کہ تم کتنے سخت تھے اور حضور نے کتنی نرمی کی۔ (۳) یہ اور اسی قسم کے اور واقعات کو سامنے رکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں حدودِ الٰہی کی شکست کا خوف ہوتا تھا وہاں نرمی نہیں برتی جاتی تھی۔ لیکن جن امور میں وسعت ہوتی یا جہاں مستحبات اور اخلاقی فضائل اور رذائل کا موقع ہوتا تھا، آپؐ نرمی سے سمجھا دیتے اور لطف و محبت سے فرما دیتے تھے۔ ع

قاہری با دلبری پیغمبری است

اخلاقی فضائل اور رذائل کی تعلیم کے بھی مختلف طریقے اختیار کیے گئے کہیں کسی اخلاقی تعلیم کو حکمِ خداوندی بتا کر، کہیں اچھی اچھی مؤثر تشبیہوں کے ذریعہ، کہیں اس کے اچھے یا برے نتیجوں کو کھول کر اس طرح بیان کیا کہ سننے والے متاثر ہو کر اس پر عمل کرنے کو فوراً تیار ہو جاتے تھے۔ چنانچہ قرآن پاک نے اپنی تعلیم میں کہیں فرمانِ الٰہی کی صورت اختیار کی، اور کہا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَ اِيْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَ يَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ (نحل:۹۰)

”بے شک اللہ عدل اور احسان کرنے اور رشتہ دار کو دینے کا حکم کرتا ہے اور بے حیائی کی بات اور ناپسندیدہ بات اور سرکشی سے منع کرتا ہے تمہیں وہ نصیحت فرماتا ہے تا کہ تم نصیحت پکڑو۔“

(۱) صحیح بخاری کتاب الحدود۔

(۲) صحیح بخاری کتاب الادب باب یسروا ولا تعسروا و کتاب الطہارۃ و صحیح مسلم باب وجوب غسل البول۔

(۳) ابوداؤد باب فی الظہار۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک شہنشاہِ مطلق کی حیثیت سے اپنے فرمان کو نافذ فرمایا ہے اور حکم دیا ہے کہ یہ کرو اور ان سے بچو، تمام انسانوں کا جو اس قادرِ مطلق کے عاجز و درماندہ بندے ہیں یہ فرض ہے کہ وہ اس حکم کی پوری پوری تعمیل کریں اس تعمیل میں بندوں کے چون و چرا کی گنجائش نہیں۔

تعلیم کا دوسرا اسلوب یہ ہے کہ فضائل کو عمدہ تشبیہوں کے ساتھ اور رذائل کو قبیح مناظر اور قابلِ نفرت صورتوں میں اس طرح پیش کیا جائے کہ سننے والا بالطبع فضائل کی طرف مائل اور رذائل سے روگرداں ہو جائے۔ مثلاً خدا کی راہ میں دینا ایک اخلاقی فضیلت ہے جس کی تصویر یوں کھینچی گئی کہ ﴿کمثل حبة﴾ (بقرہ: ۲۶۱) ''یہ نیکی ایک دانہ ہے'' زمین سے ہر دانہ ایک بال ہو کر اگتا ہے اور ہر بال میں سینکڑوں دانے ہوتے ہیں اسی طرح نیکی کا یہ ایک دانہ سینکڑوں ربانی انعامات کا باعث ہوتا ہے۔

ریا و نمائش کی نیکی بے نتیجہ ہوتی ہے، نہ مخلوق پر اس کا اثر پڑتا ہے اور نہ خدا کے ہاں اس کا کوئی بدلہ ہے قرآن نے اس کو یوں ادا کیا ﴿کَمَثَلِ صَفْوَانٍ﴾ (بقرہ : ۲۶۴) اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی کسان اپنا بیج ایسی چٹان پر ڈالے جو دھل کر صاف ہو گئی، اس بیج سے ایک دانہ بھی پیدا نہ ہوگا۔

بے ایمانی سے یتیموں کے مال کھا جانے کو یوں ادا کیا کہ ''جو ایسا کرتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں۔'' (نساء: ۱۰) پیٹھ پیچھے مسلمان کی برائی کرنے کی کراہت یوں ظاہر کی ''کیا کوئی اپنے مردہ بھائی کی لاش کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتا ہے۔'' (حجرات: ۱۲) کسی کو کوئی چیز دے کر واپس لینا شرافت اور فیاضی کے خلاف ہے، آنحضرت ﷺ نے اس کی برائی کو یوں ظاہر فرمایا ہے۔ ''جو دے کر واپس لیتا ہے وہ گویا قے کر کے پھر چاٹتا ہے۔'' اس سے زیادہ کوئی مکروہ تشبیہ اس بد اخلاقی کی ہو سکتی ہے۔ قبیلہ اسلم کے ایک شخص سے ایک اخلاقی گناہ سرزد ہوا اور بعد کو اس پر یہ اثر ہوا کہ خود آ کر عدالتِ نبوی میں اپنے گناہ کا اقرار کیا اور شریعت کی حد اپنے اوپر جاری کرنے کی درخواست کی، حضور نے تحقیقات کے بعد اس کے سنگسار کیے جانے کا حکم دیا جب وہ سنگسار ہو چکا تو آپ نے ایک صاحب کو دوسرے سے یہ کہتے سنا کہ ''اس کو دیکھو کہ خدا نے اس کے گناہ پر پردہ ڈال دیا تھا لیکن اس نے اپنے آپ کو نہیں چھوڑا اور کتے کی طرح سنگسار کیا گیا'' حضور نے یہ سن کر خاموش رہے تھوڑی دور چلے تھے کہ ایک گدھے کی لاش پڑی ملی، آپ نے پکارا کہ فلاں صاحب کہاں ہیں، انہوں نے کہا کہ ہم یہ ہیں یا رسول اللہ! فرمایا تم اترو اور گدھے کی لاش سے کچھ کھاؤ انہوں نے عرض کی اے اللہ کے رسول! اس کو کون کھائے گا، فرمایا کہ ''تم نے ابھی اپنے بھائی کے حق میں جو کہا وہ اس لاش کے کھانے سے زیادہ گھناؤنی بات ہے۔''(۱)

غیبت کی برائی کو ذہن نشین کرنے کے لیے اس سے زیادہ مؤثر طرز کوئی ہو سکتا ہے۔

تعلیم کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اچھے کاموں کے اچھے اور برے کاموں کے برے نتیجہ کو کھول کر بیان کر دیا

(۱) تفسیر بحر محیط ابی حیان اندلسی زیر آیت مذکورہ ج ثالث ص ۳۸۵

جائے جس سے اچھے اخلاق کے اختیار اور برے کام کے ترک کا جذبہ ابھرے اسلام نے اس طریقہ کو بھی اختیار کیا ہے مثلاً شراب نوشی اور قمار بازی سے روکنا تھا تو اس کے برے نتیجوں کو قرآن میں بوضاحت بیان کیا ''مسلمانو شراب جوا اور پانسے کے تیر ناپاک ہیں شیطان کے کام' شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمہاری آپس میں عداوت اور دشمنی بڑھے اور تم کو اللہ تعالیٰ کی یاد اور نماز سے غافل رکھے۔'' (مائدہ: ۹۰) شراب اور جوئے کے برے نتیجے یہ ہیں کہ ان کا خاتمہ اکثر کھیلنے والوں کی باہمی دشمنی اور لڑائی پر بلکہ قتل اور خودکشی تک پر ہوتا ہے اور انسان ان میں پھنس کر اپنے دین و دنیا کے فرض سے غافل اور بیکار ہو جاتا ہے' نتیجہ جانی و مالی بربادی ہوتی ہے۔

اسلام نے اخلاق کی تعلیم کا ایک اور طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ وہ فضائلِ اخلاق کو الوہیت' ملکوتیت اور نبوت کے محاسن میں اور رذائل کو شیطان کے خصائص میں داخل کرتا ہے' جس سے فضائل کے اختیار اور رذائل سے اجتناب کرنے کا شوق ہوتا ہے مثلاً عفو و درگزر کی تعلیم دی تو یوں فرمایا:

﴿إِن تُبْدُوا خَيْرًا أَوْ تُخْفُوهُ أَوْ تَعْفُوا عَن سُوءٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيرًا﴾ (نساء: ۱۴۹)

''اگر تم کوئی بھلائی ظاہر کرو یا اس کو چھپاؤ یا کسی برائی کو معاف کرو تو اللہ ہے معاف کرنے والا' قدرت والا۔''

قدرت کے باوجود عفو اللہ تعالیٰ کا خاص وصف ہے' بندوں سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی کرو ﴿تخلقو باخلاق اللّٰه﴾ گو صرف ایک مشہور مقولہ ہے مگر اس کا استنباط اس آیت سے ہوتا ہے اور بعض مفسرین نے اس نکتہ کو یہاں بیان کیا ہے۔

حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے اور سلیقہ کے ہوں' اس کا جوتا' اچھا ہو تو کیا یہ بھی غرور ہے' فرمایا نہیں۔

﴿إِنَّ اللَّهَ جَمِيلٌ وَ يُحِبُّ الْجَمَالَ﴾ (صحیح مسلم و ترمذی)

''اللہ جمال والا ہے وہ جمال کو پسند کرتا ہے۔''

اس لیے بندوں کو بھی چاہیے کہ اپنے طور و طریق و لباس میں سلیقہ اور جمال کا لحاظ رکھیں:

مسلمانوں میں عزم و استقلال اور بہادری کی تعلیم دینی تھی تو اس کو قرآن نے اس طرح کہا:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (احزاب: ۲۱)

''تمہارے لیے اللہ کے رسول میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے۔''

حق کے مقابلہ میں ماں باپ' رشتہ دار کسی کے خیال نہ کرنے کی تعلیم حضرت ابراہیمؑ کے نمونہ سے دی گئی۔

﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ﴾ (ممتحنہ: ٦)

''تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے۔''

ان دونوں آیتوں میں اخلاق کی بعض صفتوں کو پیغمبرانہ اوصاف سے تعبیر کر کے اس کی بڑائی ظاہر کی ہے اور

ان کی پیروی کی ترغیب دی ہے۔

فضول خرچی کی بری صفت سے مسلمانوں کو بچانا تھا تو اس کی برائی کو یوں ذہن نشین کرایا۔

﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ﴾ (بنی اسرائیل:۲۷)

''بے شبہ فضول خرچ شیطانوں کے بھائی ہیں۔''

اب کون ہے جو شیطانوں کا بھائی ہونا پسند کرے گا۔

غرض یہ اور اسی قسم کی بلاغت کے مختلف اسلوبوں سے اسلام نے اخلاقی فضائل کی خوبی اور رذائل کی برائی جاہل عربوں کے ذہن نشین کر دی۔ جابر بنؓ سلیم ایک صحابی دربارِ نبوت میں اپنی پہلی حاضری کا قصہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ مجلس میں ایک شخص بیٹھا ہے' جو وہ کہتا ہے اُس کو سب لوگ بجالاتے ہیں۔ میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں' یہ سن کر میں نے دو دفعہ کہا اے اللہ کے رسول آپؐ پر سلام ﴿عَلَيْكَ السَّلَامُ﴾ آپؐ چپ رہے' پھر فرمایا علیک السلام نہ کہو' یہ مردہ کا سلام ہے' السلام علیک کہو' میں نے کہا کیا آپؐ اللہ کے رسول ہیں؟ فرمایا ہاں میں اس اللہ کا رسول ہوں' جس کو تم تکلیف میں پکارتے ہو تو اس تکلیف کو دور کر دیتا ہے اور جس سے خشک سالی میں مانگتے ہو تو وہ اگا دیتا ہے اور جس سے تم جب کسی لق ودق بے نشان بنجر میں ہو' تمہاری سواری وہاں گم ہو جائے تو دعا کرتے ہو تو وہ اس کو تمہارے پاس لوٹا دیتا ہے' میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! مجھے کوئی نصیحت فرمایئے' ارشاد ہوا کسی کو برا نہ کہو' جابرؓ کہتے ہیں کہ آپؐ کے اس فرمان کا یہ اثر ہوا کہ میں نے پھر کسی کو شریف ہو کہ غلام' یہاں تک کہ کسی جانور کو بھی برا نہیں کہا۔ آپؐ نے پھر یہ نصیحت فرمائی کہ تم کسی چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی حقیر نہ جانو یعنی اس کو کیے جاؤ اور تم کو چاہیے کہ اپنے بھائی سے جب بات کرو تو تمہارا چہرہ کھلتا رہے' یہ بھی نیکی ہے اور اپنا تہبند آدھی پنڈلی تک اونچا رکھو' اگر یہ نہیں تو ٹخنے سے اونچا ضرور رہے' کیونکہ تہبند کو بہت نیچے تک لٹکانا غرور کی نشانی ہے۔ (۱) اور اللہ غرور کو پسند نہیں فرماتا اور اگر تمہیں کوئی گالی دے اور تم میں جو برائی وہ جانتا ہے تم کو اس کی عار دلائے' تو تم اس کی اس برائی سے جو تم جانتے ہو اس کو عار نہ دلاؤ' کہ اس کا وبال اس کی گردن پر ہوگا۔ (۲)

اس طریقۂ تعلیم کی بلاغت پر غور کیجیے کہ آپ نے بدوی کو خدا کے آگے جھکنے اور اس سے گڑگڑا کر مانگنے کے وہی موقعے یاد دلائے جو اس کی زندگی میں خدا جانے کتنی دفعہ پیش آئے ہوں گے' اس کا اثر یہ ہوا کہ اس کا دل سچائی کو پکار اٹھا اور حضور اقدس ﷺ سے دین و دنیا کی نصیحت چاہی' ایک حکیم کا فرض یہ ہے کہ مریض کی حالت کو دیکھ کر نسخہ تجویز کرے' یہ نہیں کہ ہر ایک کو ایک ہی نسخہ' خواہ بیماری کوئی ہو پلاتا چلا جائے' یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ

(۱) عرب امراء فخر وغرور کے لیے ایسا کرتے تھے جیسے عبا کے دامن یا گون کو زمین پر گھسیٹ کر چلنا دوسری قوموں میں شاہانہ غرور کی نشانی تھی۔

(۲) سنن ابی داؤد باب فی اسبال الازار۔

نے مختلف پوچھنے والوں کے جواب میں ہر ایک کے مطابق الگ الگ باتیں بتائیں، حضرت جابرؓ کو جو تعلیم دی اس کا نچوڑ یہ ہے کہ غرور نہ کرو اور اپنے کو بڑا نہ سمجھو۔ پھر اسی بیماری کے دور کرنے کی چند تدبیریں بتائیں۔

ایک اور شخص نے عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے نصیحت فرمایئے ارشاد ہوا کہ غصہ نہ کر۔ اس نے کئی مرتبہ اپنا سوال دہرایا، آپؐ نے ہر دفعہ یہی جواب دیا کہ غصہ نہ کر۔ (۱) اس سے معلوم ہوا کہ آپؐ ہر شخص کا علاج اس کے مرض کے مطابق فرماتے تھے، اس شخص میں غصہ اتنا ہوگا اس سے اس کے سبب سے بہت سی برائیاں ہو جاتی ہوں گی، اس لیے آپؐ نے اس کے لیے یہ علاج تجویز فرمایا جس کو وہ بادی النظر میں معمولی سمجھا، اور بار بار کسی اور علاج کی خواہش ظاہر کی، لیکن آپؐ نے ہر بار یہی فرمایا کہ غصہ نہ کیا کرو۔

ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! سب کاموں میں بہتر کام کیا ہے، فرمایا خدا پر ایمان رکھنا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا سب سے بہتر ہے۔ پھر پوچھا کس غلام یا باندی کو آزاد کرنا سب سے بہتر ہے؟ فرمایا جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو اس کے مالک کی نظر میں پسندیدہ ہو، پھر دریافت کیا کہ اگر ان نیکی کے کاموں میں سے کچھ نہ کرسکوں؟ فرمایا تو کسی بے کس کی مدد کرو یا بدسلیقہ کا کام کر دو۔ پوچھا اگر یہ بھی نہ بن سکے فرمایا شر سے لوگوں کو بچاؤ کہ یہ بھی صدقہ ہے جو تم اپنے آپ پر کرسکتے ہو۔ (ادب المفرد و بخاری ص ۴۵ مصر)

کبھی آپؐ یہ کرتے کہ لوگوں سے سوال کرتے، وہ جواب دینے کی طرف توجہ کرتے، آپؐ ان کی اس توجہ کو مفید پا کر وہ جواب دیتے جو ان کے دل میں اتر جاتا، ایک دفعہ صحابہؓ سے آپؐ نے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟ لوگوں نے عرض کی، ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ روپیہ ہو، نہ سامان ہو، فرمایا میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت میں گو نماز، روزہ اور زکوٰۃ کی نیکیاں لے کر آئے گا، لیکن اس نے اس کو گالی دی ہوگی، اس پر تہمت لگائی ہوگی، اس کا مال کھا گیا ہوگا، اس کا خون بہایا ہوگا، اس کو مارا ہوگا تو اس کی نیکیوں میں سے کچھ کچھ ان لوگوں کو دے دیا جائے گا اگر اس کی نیکیاں ختم ہوگئیں اور اس کے ذمہ کچھ لوگوں کا باقی رہ گیا تو ان کی برائیاں اس کے نام لکھ دی جائیں گی، پھر وہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ (۲)

مفلس کی یہ حقیقت کیسی اثر انگیز ہے۔

اسی طرح ایک دفعہ آپؐ نے یہ دریافت کیا کہ پہلوان تم کس کو کہتے ہو؟ لوگوں نے کہا جس کو لوگ کشتی میں پچھاڑ نہ سکیں، فرمایا نہیں یہ پہلوان نہیں ہے، پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے نفس پر قابو رکھے۔ (۳) اس شخص کو جس کے بچے نہ جیتے ہوں، صبر کی تلقین کرنی تھی، تو دریافت فرمایا تم بے اولاد کس کو کہتے ہو، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی جس

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب، و ترمذی باب ماجاء فی کثرت الغضب۔

(۲) صحیح مسلم کتاب البر باب تحریم الظلم۔

(۳) ایضاً باب فضل من یملک نفسہ عن الغضب۔

کے بچہ نہ ہو، فرمایا وہ بے اولاد نہیں، بے اولاد وہ ہے جس نے اپنے سے پہلے اپنی کوئی اولاد آگے نہیں بھیجی۔ (۱)
احادیث میں ہے کہ جو بچے کم سنی میں مر جائیں اور ان کے والدین صبر کریں تو وہ قیامت میں ان کی شفاعت کریں گے) اس طریقہ ادا نے کس خوبی سے یہ دل میں بٹھا دیا کہ بے اولادی غم کی چیز نہیں بلکہ اس پر صبر کیا جائے تو وہ قیامت میں درجہ کی بلندی کا باعث ہوگی۔

ایک دفعہ کچھ لوگ بیٹھے تھے کہ آنحضرت ﷺ تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ کیا میں تمہیں بتاؤں کہ تم میں سب سے اچھا کون ہے؟ حاضرین چپ رہے (شاید یہ سمجھے ہوں کہ آپؐ اس جماعت کے اچھے اور برے لوگوں کے نام لیں گے) آپؐ نے دوسری بار یہ سوال کیا، پھر تیسری بار پوچھا، ایک شخص نے کہا، ہاں یا رسول اللہ فرمایئے، ارشاد ہوا تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس سے اچھائی کی امید کی جائے، اور جس کی برائی سے لوگ امن میں ہوں اور تم میں سب سے برا وہ ہے جس سے کسی اچھائی کی امید نہ کی جائے اور جس کی برائی سے کوئی امن میں نہ ہو۔ (۲)

ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا کہ ''مجھ سے کون یہ باتیں سیکھ کر ان پر عمل کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے کہ وہ ان پر عمل کریں۔'' ابو ہریرہؓ نے کہا میں اے اللہ کے رسول! ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، پھر پانچ باتیں گن کر فرمائیں، گناہوں سے پرہیز کرو تو تم سب سے بڑے عبادت گزار ہو جاؤ گے، خدا نے جو تم کو دیا ہے اس پر راضی رہو تو سب سے بڑھ کر دولت مند ہو جاؤ گے، اپنے پڑوسی کے ساتھ احسان کرو تو مومن ہو گے، لوگوں کے لیے وہی چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو، تو مسلمان بن جاؤ گے اور زیادہ ہنسا نہ کرو کہ زیادہ ہنسنے سے دل مر جاتا ہے (۳) (یعنی دل کی صلاحیت جاتی رہتی ہے۔)

ایک دفعہ فرمایا ''کون مجھ سے اپنے جبڑوں اور دونوں پاؤں کے بیچ کی حفاظت کی ضمانت کرتا ہے میں اس کے لیے جنت کی ضمانت کرتا ہوں۔'' (۴) کون جانتا ہے کہ کتنے مسلمان اس ضمانت کے لیے اٹھے ہوں گے، ان فقروں کی بلاغت پر غور کرو، دونوں جبڑوں کے بیچ میں زبان ہے جو ہر قسم کی قولی برائیوں کی جڑ ہے اور دونوں پاؤں کے بیچ میں انسان کی شرم گاہیں ہیں، جو ہر قسم کی بے حیائیوں اور بدکاریوں کی جگہ ہیں۔ ان دو کی حفاظت کی جائے تو انسان کی برائیوں کے بڑے حصہ کی اصلاح ہو جائے۔

ایک دفعہ فرمایا کون مجھ سے ایک بات کا وعدہ کرتا ہے، میں اس کے لیے جنت کی ضمانت کرتا ہوں، آپؐ کے غلام ثوبان نے اٹھ کر کہا میں، اے اللہ کے رسول! فرمایا کسی سے کچھ مانگا نہ کرو، چنانچہ انہوں نے کبھی کسی سے سوال

(۱) ایضاً۔
(۲) ترمذی شریف کتاب الفتن۔
(۳) جامع ترمذی ابواب الزہد۔
(۴) صحیح بخاری باب حفظ اللسان۔

نہیں کیا۔ (۱)

سب کو معلوم ہے کہ ارض حرم کے اندر اور وہ بھی حج کے دنوں میں کسی مسلمان کا خون بہانا کتنا بڑا گناہ ہوسکتا ہے حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو دریافت فرمایا' لوگو! آج کون سا دن ہے؟ لوگوں نے سمجھا کہ شاید آپ اس دن کا کوئی اور نام رکھنا چاہتے ہیں' عرض کی اللہ کے رسول کو زیادہ معلوم ہے' فرمایا کیا یہ قربانی کا دن نہیں۔ سب نے کہا جی ہاں' پھر پوچھا یہ کون سا مہینہ ہے پھر سب چپ رہے' سمجھے کہ اس کا نام کچھ اور بتائیں گے فرمایا کہ کیا یہ ذی الحجہ نہیں سب نے کہا ہاں' پھر فرمایا یہ کون سا مقام ہے' پھر سب خاموش رہے کہ آپؐ کوئی اور نام بتائیں گے' فرمایا کہ کیا یہ بلد الحرام نہیں ہے' سب نے کہا جی ہاں' ان سوالوں سے جب سننے والوں کے دلوں میں اس دن اس مقام اور اس مہینہ کی حرمت اور عظمت بیٹھ گئی تو فرمایا' مسلمانوں کا خون' مسلمانوں کا مال اور مسلمانوں کی آبرو تمہارے لیے ایسی ہی محترم ہے جیسا یہ دن' اس مقام میں اور اس مہینہ میں۔ (۲)

کبھی خاص خاص صاحبوں کو ان کی مناسبتِ طبع دیکھ کر خاص خاص طور کی نصیحتیں فرماتے' حضرت ابوذر غفاریؓ گویا فطرۃً تارکِ دنیا تھے' بڑے ہی زاہد و عابد تھے' ان کے ذوقِ طبع کو دیکھ کر آپؐ نے فرمایا' "اے ابوذرؓ! جہاں رہو خدا سے ڈرتے رہو' برائی کے پیچھے نیکی کرو تو تم اس کو مٹا ڈالو گے اور لوگوں کے ساتھ خوش خلقی سے ملا کرو۔" (۳)

لوگ عام طور سے سمجھتے ہیں کہ صدقہ اللہ کی راہ میں صرف روپیہ پیسہ دینے کا نام ہے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی اس تنگ خیالی کو دور کرنا تھا' تو حضرت ابوذرؓ سے فرمایا تمہارا اپنے بھائی سے ملتے وقت مسکرا دینا بھی صدقہ ہے' اچھی بات کہنا اور بری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے' کسی اندھے کو راستہ دکھانا بھی صدقہ ہے' راستہ سے پتھر' ہڈی یا کانٹا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔ اپنے ڈول سے دوسرے بھائی کے ڈول میں پانی انڈیل دینا صدقہ ہے۔ (۴)

صدقہ کی جو اہمیت مسلمانوں کے دلوں میں تھی اس کی بنا پر ان اخلاقی نیکیوں کو صدقہ بتا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقہ ادا سے ان نیکیوں کی کتنی اہمیت مسلمانوں کے دلوں میں بٹھا دی۔ (۵)

کبھی آپؐ مسلمانوں سے مختلف اخلاقی باتوں پر بیعت لیتے تھے' چنانچہ خود قرآن پاک میں ہے کہ جو عورتیں ایمان لانا چاہیں وہ بیعت میں رسول سے ان باتوں کا عہد کریں کہ وہ چوری نہ کریں گی' بدکاری نہ کریں گی'

---

(۱) مسند احمد ج ۵ ص ۲۷۵۔

(۲) صحیح بخاری الخطبہ ایام منیٰ۔

(۳) ترمذی باب ماجاء فی معاشرۃ الناس۔

(۴) ترمذی باب ماجاء فی معاشرۃ الناس۔

(۵) ترمذی فی صنائع المعروف۔

اپنی اولاد کو نہ مار ڈالیں گی، بہتان نہ باندھا کریں گی اور کسی بھلے کام میں رسول کی نافرمانی نہ کریں گی (سورۃ ممتحنۃ : ۱۲)

عبادہؓ بن صامت کہتے ہیں کہ آپؐ نے ہم سے ان باتوں پر بیعت لی کہ ''ہم ہر حالت میں رسول کی پیروی کریں گے اور ہم ہر موقع پر اپنی زبان عدل وانصاف کے ساتھ ٹھیک رکھیں گے اور خدا کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔''(۱)

یہی عبادہؓ کہتے ہیں کہ مکہ میں ہجرت سے پہلے جب انصار اسلام لائے اور ان میں چند آدمیوں کو چن کر آپؐ نے نقیب بنایا تو ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ہم نقیبوں سے ذیل کی باتوں پر بیعت لی۔

''ہم خدا کا کسی کو شریک نہ بنائیں گے، بدکاری نہ کریں گے، چوری نہ کریں گے اور ناحق کسی کی جان نہ لیں گے، لوٹ مار نہیں کریں گے، اگر ہم اس بیعت کو اپنی عملی زندگی میں پورا کر دکھائیں گے تو ہمیں جنت ملے گی اور اگر اس میں کمی کی تو اس کا فیصلہ خدا کے ہاتھ ہے۔''(۲) اللہ جانتا ہے کہ ان خوش نصیبوں نے اپنے اس وعدہ کو کس کس طرح خوبی سے پورا کیا ہوگا۔

بعض دفعہ حضور ﷺ ایک سوال کرتے تھے، سوال سن کر لوگ متوجہ ہو جاتے تھے، مگر اس سے پہلے کہ لوگ جواب دیں خود ہی جواب دے دیتے تھے۔ دریافت فرمایا کہ افترا کس کو کہتے ہیں؟ پھر خود ہی فرمایا۔ ''وہ چغلی ہے لوگوں کے درمیان بات کو ادھر سے ادھر پہنچانا۔'' (۳) ایک بار ارشاد ہوا کہ ''تم جانتے ہو کہ غیبت کس کو کہتے ہیں۔'' لوگوں نے جواب دیا۔ اللہ اور اس کا رسول جانتا ہے۔ فرمایا ''تم اپنے بھائی کو اس طرح یاد کرو کہ وہ اس کو ناپسند ہو۔'' کسی نے کہا اگر میرے بھائی میں وہ برائی واقعی موجود ہو تو، فرمایا اگر اس میں ہے تب ہی تو وہ غیبت ہے، ورنہ پھر وہ بہتان ہے۔ (۴) ایک موقع پر ارشاد ہوا، میں تمہیں بتاؤں کہ جنت والے کون ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کی ہاں یارسول اللہ! فرمایا ہر کمزور، نرم دل جس کو لوگ حقیر جانیں یا جو متواضع ہو (لیکن جس کی ایمانی قوت ایسی ہو کہ) اگر وہ خدا کے بھروسے پر قسم کھا بیٹھے تو خدا اس کی قسم پوری کر دے، پھر فرمایا کیا میں تمہیں بتاؤں کہ دوزخ والے کون ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کی ہاں یارسول اللہ! فرمایا ہر درشت مزاج، شیخی خور مغرور۔ (۵)

کبھی آنحضرت ﷺ آپ ہی آپ کوئی سوال کرتے اور اس کو بار بار دہراتے حاضرین بار بار کی تکرار

(۱) مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۳۱۸۔
(۲) صحیح بخاری ج ۲ ص ۵ کتاب الدیات۔
(۳) صحیح مسلم باب تحریم الغیبۃ۔
(۴) صحیح مسلم باب تحریم الغیبۃ۔
(۵) صحیح مسلم باب جہنم۔

سے اس کی اہمیت کا پورا اندازہ کر لیتے اور مشتاق ہو کر پوچھتے کہ یا رسول اللہ! یہ کیا بات ہے اس وقت آپ جواب ارشاد فرماتے جس کا اثر ان کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا۔ ایک دفعہ خود سے فرمایا ''خدا کی قسم وہ صاحب ایمان نہ ہوا، خدا کی قسم وہ صاحب ایمان نہ ہوا خدا کی قسم وہ صاحب ایمان نہ ہوا۔'' صحابہؓ نے مشتاقانہ پوچھا، کون یا رسول اللہ! فرمایا ''جس کا پڑوسی اس کی برائیوں سے امن میں نہ ہوا۔''(۱) ایک مرتبہ ارشاد فرمایا ''دین داری اخلاص کا نام ہے'' صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ کس کے ساتھ فرمایا ''اللہ کے ساتھ اس کی کتاب کے ساتھ، اس کے رسول کے ساتھ مسلمانوں کے سرداروں کے ساتھ اور عام مسلمانوں کے ساتھ''۔(۲)

اخلاقی تعلیمات کی قسمیں

اسلام کے اصولِ اخلاق کی اس تفصیل اور تشریح کے بعد یہ موقع آیا ہے کہ اس کے ان اخلاقی تعلیمات کا استقصا کیا جائے جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے عالم کائنات کو ملیں، ان اخلاقی تعلیمات کو اسلام نے تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ (۱) حقوق (۲) فضائل ورزائل اور (۳) آداب۔

اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسان پر دوسرے انسانوں بلکہ حیوانوں اور بے جان چیزوں تک کے کچھ فرائض عائد ہیں اور یہ ان کے حقوق ہیں جنہیں ہر انسان کو اپنے امکان بھر ادا کرنا ضروری ہے۔ یہ حقوق اور فرائض اسلامی اخلاق کی پہلی قسم ہیں۔

دوسری چیز انسان کے ذاتی چال چلن اور کردار کی اچھائی اور بلندی ہے اس کا نام فضائلِ اخلاق اور اس کے مقابل کا نام رذائل ہے مثلاً سچ بولنا اخلاقی فضائل اور جھوٹ بولنا رذائل میں سے ہے۔

تیسری قسم کاموں کو اچھے اور عمدہ طریقہ سے بجالانا ہے اس کو آداب کہتے ہیں مثلاً اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کا طور وطریق، ذیل میں اسلامی اخلاق کی ان تینوں قسموں کی الگ الگ تفصیل درج ہوتی ہے۔

حقوق وفرائض

حقوق کے معنی

حقوق کی مجمل تشریح تو اوپر ہو چکی، لیکن اس موقع پر ضرورت ہے کہ اس کی مزید تفصیل کر دی جائے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

﴿خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ (بقرہ:۲۹)

---

(۱) مشکوٰۃ باب الشفقۃ علی الخلق بحوالہ صحیحین۔

(۲) مشکوٰۃ باب الشفقۃ علی الخلق بحوالہ مسلم وصحیح بخاری۔

''خدا نے تمہارے (کام کے) لئے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔''

اس لیے انسان کو دنیا کی ہر اس چیز سے جس سے اس کو نفع کا تعلق ہے ایک گونہ لگاؤ ہے۔ اس لگاؤ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی ترقی و حفاظت میں کوشش کی جائے۔ اس شے سے، وہ نفع اٹھایا جائے جس کے لیے خدا نے اس کو پیدا کیا ہے اور ان موقعوں پر اس کو صرف کیا جائے جن میں خدا نے اس کے صرف کرنے کا حکم دیا ہے' اور اس کو ہر اس پہلو سے بچایا جائے جس سے اس کی نفع رسانی کو نقصان پہنچے' اسی ذمہ داری کا نام ''حق'' ہے جس کو از خود ادا کرنا ضروری ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿وَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ﴾ (ذاریات:۱۹)

''اور ان کے مالوں میں سائل کا اور اس کا حق ہے جس پر مالی افتاد پڑی ہو۔''

﴿وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ○ لِّلسَّآئِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ﴾ (معارج:۲۴۔۲۵)

''اور ان کے مالوں میں سائل کا اور اس کا مقررہ حق ہے جس پر مالی افتاد پڑی ہو۔''

﴿وَ اٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ﴾ (بنی اسرائیل:۲۶)

''اور قرابت والے کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور مسافر کو۔''

﴿فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّه وَالْمِسْكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ﴾ (روم:۳۸)

''تو قرابت والے کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور مسافر کو۔''

اللہ تعالیٰ نے جب کسی انسان کو دولت عطا فرمائی ہے تو اس کا تقاضہ یہ ہے کہ جن کو یہ چیز نہیں ملی ہے ان کو اس میں سے تھوڑا تھوڑا دیا جائے' یہ ان کا حق ہے اور اس میں سب سے مقدم رشتہ دار ہیں' پھر غریب پھر مسافر' ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت مال کی طرف کی ہے۔

﴿وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ وَ لَا تُسْرِفُوْا﴾ (انعام:۱۴۱)

''اور پیداوار کا حق اس کے کاٹنے کے دن ادا کرو' اور فضول خرچی نہ کرو۔''

یعنی جب کسی کو اللہ تعالیٰ نے زمین کا کوئی حصہ عنایت کیا اور اس نے اس میں کچھ بویا اور اللہ نے اس میں برکت دی اور پھل پھول نکلے' اور ہری بھری کھیتی تیار ہوئی تو انسان کا فرض ہوا کہ اس کا حق ادا کرے اور اس میں ان کو بھی کچھ دے' جن کو یہ نعمت نہیں ملی' اور اس نعمت کو بے موقع خرچ نہ کرے اور ضائع نہ کرے کہ یہ بھی اس کے حق کے منافی ہے اور اس کی نفع رسانی کے ضروری موقع محل کو نقصان پہنچانا ہے۔

حدیث میں آتا ہے۔

((اِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَ لِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا)) (بخاری' صوم)

''تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیرے ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے۔''

((وَ لِاَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا)) (بخاری' صوم)

''تیری بیوی بچوں کا تجھ پر حق ہے۔''

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ بیوی کا حق شوہر پر یہ ہے کہ اس کو کھانا کھلائے' کپڑے پہنائے اور اس کے چہرہ پر تھپڑ نہ مارے (ابوداؤد نکاح) ان احکام سے معلوم ہوا کہ ہر انسان پر دوسرے انسان کے کچھ حقوق ہیں بلکہ ہر انسان کا خود اپنے اوپر بھی حق ہے اس کے ایک ایک عضو کا اس کے اوپر حق ہے' آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((فَاِنَّ لِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقًّا)) (بخاری صوم)

''بے شک تیری جان کا تجھ پر حق ہے۔''

((فَاِنَّ لِجَسَدِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَ لِعَیْنَیْکَ عَلَیْکَ حَقًّا)) (بخاری صوم)

''تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے' اور تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے۔''

اس تفصیل سے معلوم ہو گا کہ اسلام میں حقوق کی وسعت اس سے بہت زیادہ ہے' جتنی عام طور سے سمجھی جاتی ہے۔

حقوق کی وسعت

جب انسان کا تعلق کائناتِ ارضی کی ایک ایک چیز سے ہے' تو ظاہر ہے اس کی ذمہ داری بھی اس کی ہر چیز سے متعلق ہے' جمادات سے بھی کہ ان کو بے موقع نہ صرف کیا جائے' نباتات سے بھی کہ ان کو نشو و نما اور تربیت کا موقع دیا جائے' حیوانات سے بھی کہ ان کو بے سبب تکلیف نہ پہنچائی جائے اور ان کے آرام آسائش کا خیال کیا جائے اور انسانوں سے بھی کہ ان کی ہر ضرورت میں مدد کی جائے اور ان کے فریضۂ محبت کو ادا کیا جائے اور خود انسان کا اپنے اوپر بھی حق ہے کہ اس کا ہر عضو جس غرض کے لیے بنایا گیا ہے اس سے مناسب طور سے کام لے۔

غرض اسلام نے ان حقوق کو تمام کائنات میں اس طرح تقسیم کیا ہے کہ اس کا دائرہ محیطِ اعظم بن کر پھر آہستہ آہستہ سمٹتا ہوا بتدریج کم ہوتا ہوا مرکز پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔

انسانیت کے باہمی حقوق تو بہت کچھ ظاہر ہیں' لیکن انسان کے علاوہ اس کائناتِ ارضی کی دوسری بے جان اور جان دار چیزوں کے حقوق کی طرف تھوڑا سا مزید اشارہ توضیحِ مقصد کے لیے مفید ہے۔

انسان کے علاوہ دوسری جان دار بے جان چیزوں کے دو حق انسان پر ہیں ایک یہ کہ جس غرض اور منفعت کے لیے وہ پیدا کی گئی ہیں ان سے وہی کام لیا جائے' دوسرا یہ کہ ان کے قدرتی نشو و نما' پرورش اور ترقی میں وہ رکاوٹ نہ پیدا کرے' بلکہ اس کے مناسب اسباب فراہم کرے اور اس کے مناسب غذا' سیرابی اور آرام کی فکر رکھے' یہ دونوں حقوق اصل میں قرآن پاک کی اسی حقیقت کے کہ

﴿خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ (بقرہ:۲۹)

''زمین میں جو کچھ ہے وہ خدا نے تمہارے (یعنی انسانوں کے) لیے پیدا کیا۔''

کے صریح نتیجے ہیں' کہ جب انسان کے لیے یہ سب چیزیں پیدا ہوئیں تو انسان کا فرض ہے کہ ان سے وہی کام لے جس کے لیے وہ بنائی گئیں اور اس لئے تاکہ وقتِ مقررہ تک انسانوں کو اپنا نفع پہنچا سکیں ان کی پرورش و ترقی کے قدرتی اسباب کو مہیا کرنا ان پر ضروری قرار دیا گیا۔

آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ کے مجمع میں ایک تمثیلی حکایت میں اس نکتہ کو واضح کیا ہے' فرمایا کہ ایک دفعہ ایک آدمی بیل پر سوار جا رہا تھا کہ دفعتاً اس نے منہ پھیر کر سوار سے کہا کہ میں تو اس کے لیے پیدا نہیں کیا گیا ہوں۔ (۱) میں تو کھیتی کے لئے پیدا کیا گیا ہوں اور اسی لیے درخت لگانا ثواب کا کام کہا گیا اور فرمایا گیا کہ ''جو مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے تو جو پرندے یا جانور یا انسان اس کا پھل کھاتے ہیں اس کا ثواب درخت لگانے والے کو ملتا ہے۔'' (۲) اسی سبب سے پھل دار درخت کو بے سبب کاٹنا ناپسندیدہ ہے (۳) ایک اور تمثیلی حکایت میں آپؐ نے فرمایا کہ ایک شخص صرف اس لیے بخشا گیا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلا کر اس کی جان بچائی تھی اور ایک اور شخص پر صرف اس لیے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بلی کو باندھا اور اس کو کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں دیا یہاں تک کہ وہ اسی طرح سسک سسک کر مر گئی' ایک اور شخص نے چیونٹی کو جلا دیا تھا' اس پر اس سے باز پرس ہوئی۔ (۴)

یہ چند اشارات اس موقع پر اس لیے بھی کیے گئے ہیں' تاکہ معلوم ہو کہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا دائرہ کتنا وسیع ہے وہ صرف انسانوں تک نہیں بلکہ تمام جاندار اور بے جان چیزوں تک پھیلا ہوا ہے' جن کی تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔

حقوق کی ترتیب

مگر ان تمام حقوق کی ادائیگی میں اسلام نے ایک خاص ترتیب ملحوظ رکھی ہے جس کی تفصیل ذیل میں ہے۔

اگر ہم اسلام کے تمام اخلاقی فرائض اور تعلیمات کو صرف ایک لفظ سے ادا کرنا چاہیں تو توراۃ اور انجیل کی طرح مختصریوں کہہ سکتے ہیں کہ دوسروں سے محبت کرنا لیکن صرف ''محبت کرنا'' کہہ دینا کافی نہیں' بلکہ ان چیزوں کی تفصیل کرنی چاہیے۔ جو اس محبت کا تقاضا ہیں اور اس کے مظاہر ہیں' یہی تفصیل و تکمیل اسلام کی اخلاقی تعلیم کا کارنامہ ہے آپؐ نے فرمایا کہ ''ایمان کا کمال یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کے لیے بھی وہی محبوب رکھو جو اپنے لیے رکھتے ہو۔'' (۵) اس سے معلوم ہوا کہ جسم و جان اور مال و ملکیت کے وہ تمام معاملات جو انسان اپنے جسم و جان اور مال و ملکیت کے لیے چاہتا اور پسند کرتا ہے' وہی دوسروں کے لیے چاہنا اور پسند کرنا توراۃ و انجیل کی طرح اسلام کی

(۱) صحیح بخاری باب الحرث والمزارعۃ جلد اول صفحہ ۳۱۲۔
(۲) صحیح بخاری مسلم باب مذکور۔
(۳) فتح الباری شرح صحیح البخاری شرح باب مذکورہ جلد خاص صفحہ ۷ مصر۔
(۴) یہ دونوں واقعے صحیح بخاری میں ہیں۔
(۵) صحیحین کتاب الایمان

اخلاقی تعلیم کا بھی سرِ عنوان ہے۔ لیکن اسلام میں یہ سرِ عنوان تشریح کا محتاج ہے اور اس تشریح کے ضمن میں انسا
تعلقات کی تدریجی ترتیب کی بحث آ جاتی ہے' جن کو اسلام نے ہمیشہ پیشِ نظر رکھا ہے اور ان فرائض کو ہر انسان ۔
تعلقات کی کمی وبیشی' دوری ونزدیکی کی تدریج اور ترتیب کے ساتھ متعین اور ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ الگ الگ مق
کر دیا ہے مثلاً ایک حیوان کے مقابلہ میں ایک انسان کی مدد' ایک اجنبی شخص کے مقابلہ میں ایک دوست کی' غیر و
اور بیگانوں کے مقابلہ میں ایک عزیز کی اور ان عزیزوں میں بھی قرابت کی دوری ونزدیکی کی ترتیب اسی طرح ر
گئی' مگر یہ ترتیبی امداد حق کے ساتھ ہے اگر کوئی عزیز سے عزیز بھی باطل پر ہو' تو اس کے مقابلہ میں اس غیر و بیگانہ
امداد جو حق پر ہے فرض ہے کہ جو مدد محض قرابت اور عزیز داری کی بنا پر باطل پر کی جاتی ہے' اس کا نام اسلام
اصطلاح میں عصبیت (تعصب) ہے جس سے بچنے کی ہر[1] مسلمان کو تاکید کی گئی ہے۔

اسلام کے سوا دوسرے مذاہب میں انسانی حقوق کی درجہ وار کوئی تفصیل نہیں ہے' انسان اور حیوان ۔
درمیان بھی خطِ فاصل نہیں قائم کیا گیا ہے۔ مثلاً بودھ کی اخلاقی تعلیمات میں انسان اور حیوان کے اور پھر انسانو
میں اہلِ ملک' قوم' قبیلہ اور خاندان کی کوئی تمیز نہیں بلکہ سرے سے رشتہ اور قرابت ہی کی اس میں کوئی دفعہ نظر نہیں
آتی' اسی طرح ہندو قانون میں ایک جانور اور ایک انسان کا قتل برابر درجہ رکھتا ہے اور ایک جانور بھی اپنی کہ
منفعت رسانی کے باعث انسان کی ماں کا درجہ پا سکتا ہے' یہودیت اور عیسائیت میں تمام قرابت داروں کو چھوڑ
صرف ماں باپ کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے برترانہ حقِ اطاعت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن دوسرے قرابت مندوا
اور رشتہ داروں کو ان میں کوئی مرتبہ نہیں دیا گیا ہے' لیکن اسلام نے اس مسئلہ میں پوری تفصیل سے کام لیا ہے۔

اس ترتیب کا فلسفہ یہ ہے کہ ترتیب میں جس کا درجہ بڑھ کر ہے اس کے ساتھ تعلقات کی وابستگی دوہر
تہری ہوتی ہے مثلاً ایک شخص جو ایک وقت میں ایک ہی کی مدد کر سکتا ہے اس کی ایک غریب بیمار ماں ہے' ایک
غریب اور بیمار باپ ہے ایک غریب اور بیمار بھائی ہے ایک اسی طرح کا اس کا پڑوسی ہے۔ پھر اسی حالت میں اس
کا ایک ہم محلّہ بھی ہے اور اسی حالت میں اس کا کوئی ہم وطن بھی ہے' تو اس کو کس کی امداد کرنی چاہیے۔ یہی وہ مو
ہے جس میں تدریجی تعلقات کی ترتیب کا سوال پیش آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تعلقات کے دوہرے تہرے حقوق پہ
ماں کے ہیں' پھر باپ کے ہیں پھر بھائی کے ہیں' پھر پڑوسی کے ہیں' پھر ہم محلّہ کے ہیں' پھر ہم وطن کے ہیں اور ا
ترتیب سے اس کا ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ نیکی نہ ہوگی کہ اپنی غریب اور بیمار ماں کو چھوڑ کر کوئی اپنے غریب او
بیمار پڑوسی کی خدمت کے لیے آمادہ ہو جائے یہ ایثار نہیں بلکہ ظلم ہے' ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اپنے اوپر مزید مزاحمت
گوارہ کر کے دونوں کے حقوق سے عہدہ برآ ہو' اگر ایسا وہ نہ کر سکے تو اخلاقاً اس کو معذور سمجھا جائے گا شریعتِ محمد
نے اسی فطری ترتیب کو ان آیتوں میں پیش کیا ہے۔

(۱) سنن ابی داؤد ج ۲ باب فی العصبیۃ۔

﴿وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسَاكِيْنِ وَ الْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ (نساء:۳۶)

''اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ داروں کے ساتھ اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اور رشتہ دار پڑوسی کے ساتھ اور بیگانہ پڑوسی کے ساتھ اور ساتھی کے ساتھ اور مسافر کے ساتھ اور لونڈی غلام کے ساتھ۔''

﴿قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ﴾ (بقرہ:۲۱۵)

''اے پیغمبر! ان سے کہہ کہ تم جو خرچ کرو وہ اپنے ماں باپ اور عزیزوں اور یتیموں اور غریبوں اور مسافر کے لیے اور جو بھی نیکی کا کام تم کرو اللہ اس سے آگاہ ہے۔''

﴿وَاٰتِ ذَالْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا﴾ (بنی اسرائیل:۲۶)

''اور رشتہ دار کا حق ادا کر اور مسکین کا اور مسافر کا اور فضول خرچی نہ کر۔''

عام طور سے اکثر مذہبوں نے سب سے زیادہ اہمیت ماں باپ کو دی ہے اور اسلام میں بھی یہ اہمیت یہی درجہ رکھتی ہے مگر اس کی تکمیلی شان اس باب میں بھی اسی طرح نمایاں ہے جس طرح تعلیمات کے دوسرے ابواب ہیں۔

والدین کا حق

والدین یعنی ماں باپ کی عزت، خدمت اور اطاعت، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں یکساں ضروری قرار دی گئی ہے، بلکہ تینوں میں ان کا درجہ خدا کے بعد انسانی رشتوں میں سب سے بڑا بتایا گیا ہے، اور خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ ان کی اطاعت کی تاکید کی گئی ہے تورات میں توحید کی تعلیم کے بعد ہے۔

''تو اپنے ماں باپ کو عزت دے، تا کہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے دراز ہو'' (خروج ۲۰:۱۲)

پھر دوسری جگہ ہے:

''تم میں سے ہر ایک اپنی ماں اور اپنے باپ سے ڈرتا رہے۔'' (احبار ۱۹۔۳)

انتہا یہ ہے کہ تورات نے قانوناً یہ حکم نافذ کیا کہ

''اور جو کوئی اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کرے مار ڈالا جائے گا اس نے اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کی ہے اس کا خون اسی پر ہے۔'' (احبار ۲۰۔۹)

’’اور وہ جو اپنے ماں باپ پر لعنت کرے مار ڈالا جائے گا۔‘‘ (خروج ۲۱۔۷)

حضرت عیسیٰ نے انجیل میں انہی احکام کو دہرایا اور اس بات پر زور دیا کہ ان احکام کی صرف لفظی تعمیل نہ کی جائے بلکہ ان کے روح و معنی کا خیال کیا جائے۔ فرمایا:

’’کیونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ اپنے ماں باپ کی عزت کر اور جو ماں یا باپ پر لعنت کرے جان سے مار جائے پر تم کہتے ہو کہ جو کوئی اپنے باپ یا ماں کو کہے کہ جو کچھ مجھے تجھ کو دینا واجب ہے سو خدا کی نذر ہوا اور اپنے ماں باپ یا ان کی عزت نہ کرے تو کچھ مضائقہ نہیں پس تم نے اپنی روایت سے خدا کے حکم کو باطل کیا۔‘‘ (متی ۱۰، ۴)[1]

نبوتِ محمدی جس کی بعثت ہی اخلاق کی تکمیل کے لیے ہوئی ہے اس نے تورات و انجیل کی طرح نہ صرف والدین کی عزت اور ان سے ڈرتے رہنے کی تاکید کی بلکہ اس مسئلہ کے ہر گوشہ کی تفصیل کی اور ہر ممکن سوال کا تشفی بخش جواب دیا۔

(۱) اس نے سب سے پہلے ماں اور باپ کی مشترکہ حیثیت کی بھی تفصیل کی اور بتایا کہ ماں اور باپ میں بھی سب سے بڑا درجہ ماں کا ہے، عورت کی فطری کمزوری، بیچارگی اور حمل، وضعِ حمل اور تربیتِ اولاد کی تکلیفوں کو ہنسی خوشی برداشت کرنا، ماں کی بڑائی اس کی سب سے پہلے دل دہی کرنے اور اس کی فرمان برداری کرنے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

﴿وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّ فِصٰلُه فِىْ عَامَيْنِ﴾ (لقمان: ۱۴)

’’اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے واسطے تاکید کی اس کی ماں نے اس کو تھک تھک کر اپنے پیٹ میں رکھا، اور دو برس تک دودھ پلایا۔‘‘

﴿وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسَانًا حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّ وَضَعَتْهُ كُرْهًا وَ حَمْلُهٗ وَ فِصٰلُه ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا﴾ (احقاف: ۱۵)

’’اور ہم نے انسان کو تاکید کی کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ نیکی کرے، اس کی ماں نے اس کو تکلیف کے ساتھ جنا، پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ جنا پیٹ میں رکھنا اور دودھ پلا کر چھڑانا تیس مہینے ہیں۔‘‘

آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشادات میں اس کی مزید تاکید کی، ایک شخص نے خدمت اقدس میں آ کر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ سب سے زیادہ میرے حسنِ سلوک کا مستحق کون ہے؟ فرمایا تیری ماں، پوچھا پھر کون فرمایا تیری ماں، اس نے عرض کی، پھر کون، فرمایا تیری ماں، تین دفعہ آپؐ نے یہی جواب دیا، چوتھی دفعہ پوچھنے پر ارشاد ہو تیرا باپ[2] ایک دن آنحضرت ﷺ نے چار بڑے بڑے گناہوں کا ذکر کیا اور سر فہرست ماں کی

(۱) اس کے علاوہ انجیل کے دوسرے ابواب اور صحیفوں میں تورات کے الفاظ کا بعینہ اعادہ ہے مثلاً متی ۱۹، ۱۹ مرقس ۷، ۱۰، ۱۰، ۱۹ الوط ۱۸، ۲۰۔

(۲) صحیح بخاری کتاب الادب۔

نافرمانی کو قرار دیا اور فرمایا کہ تمہارے خدا نے ماؤں کی نافرمانی تم پر حرام کی ہے۔[۱] ایک دفعہ ایک شخص نے آ کر عرض کی یا رسول اللہ! میں نے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے‘ کیا میرے لیے کوئی توبہ ہے؟ فرمایا کیا تیری ماں زندہ ہے؟ جواب دیا نہیں! دریافت کیا خالہ ہے؟ گزارش کی ہے‘ فرمایا ’’تو اس پر نیکی کر۔‘‘[۲] یہی اس کی توبہ بتائی ایک اور صحابیؓ نے دریافت کیا یا رسول اللہ! میں نے جہاد میں شرکت کا ارادہ کیا ہے اور آپؐ سے مشورہ چاہتا ہوں‘ فرمایا کیا تمہاری ماں ہے؟ جواب اثبات میں دیا۔ فرمایا کہ تم اسی کے ساتھ چمٹے رہو کہ جنت اس کے پاؤں کے پاس ہے۔[۳]

ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم میں مخلوقاتِ انسانی میں جنسِ لطیف کی ہی ایک صنف کو سب سے بڑی برتری حاصل ہے اور یہ برتری بالکل فطری ہے۔ انسان سب سے زیادہ اپنے وجود میں جن کا ممنون ہے اور جو اس کی تخلیق کی مادی علت ہیں‘ وہ خالقِ اکبر کی علتِ فاعلہ ذات کے بعد ماں اور باپ ہیں‘ لیکن باپ کی مادی علیت چند لمحوں اور چند قطروں سے زیادہ نہیں‘ مگر ماں وہ ہستی ہے جس نے اس کی ہستی کو اپنا خون پلا پلا کر بڑھایا اور نو مہینے تک اس کی مشکل سہہ کر اور سختی اٹھا کر اپنے پیٹ میں رکھا‘ پھر اس کے جننے کی ۔۔۔۔۔۔۔۔ ناقابلِ برداشت تکلیف کو ہنسی خوشی برداشت کیا پھر اس نوپید امضغہ‘ گوشت کو اپنی چھاتیوں سے لگا کر اپنا خون پانی کر کے پلایا اور اس کی پرورش اور غور و پرداخت میں اپنی ہر راحت قربان اپنا ہر آرام ترک‘ اور اپنی ہر خوشی نثار کر دی اور ایسی حالت میں کیا ماں سے بڑھ کر انسان اپنے وجود میں مخلوقات میں کسی اور کا محتاج ہے؟ اس لیے شریعت محمدی نے اپنی تعلیم میں جو بلند سے بلند مرتبہ اس کو عنایت کیا ہے وہ اس کی سزاوار ہے۔

(۲) ماں کے ساتھ جو دوسری ہستی‘ بچہ کی تولید و تکوین میں شریک ہے۔ وہ باپ ہے اور شک نہیں کہ اس کی نشوونما اور تربیت میں ماں کے بعد باپ کی جسمانی و مالی کوششیں شامل ہیں اس لیے جب بچہ ان کی محنتوں اور کوششوں سے قوت کو پہنچے تو اس پر فرض ہے کہ اپنی ماں باپ کی کوششوں سے حاصل کی ہوئی قوت کا شکرانہ ماں باپ کی خدمت کی صورت میں ادا کرے۔ چنانچہ اسلام نے نہ صرف پہلے صحیفوں کی طرح ان کی ’’عزت‘‘ کرنے اور ان سے ڈرتے رہنے کے وعظ پر اکتفا کی‘ بلکہ ان کی خدمت ان کی اطاعت‘ ان کی امداد اور ان کی دلدہی‘ ہر چیز فرض قرار دی‘ بلکہ یہاں تک تاکید کی کہ ان کی کسی بات پر اف تک نہ کرو‘ ان کے سامنے ادب سے جھکے رہو‘ ان کی دعاؤں کو اپنے حق میں قبول سمجھو‘ انہی کی خدمت انسان کا سب سے بڑا جہاد ہے بلکہ انہی کی خوشنودی سے خدا کی خوشنودی ہے۔ قرآن پاک میں والدین کے ساتھ حسن سلوک‘ نیکی اور خدمت کی تاکید ۱۲ مختلف آیتوں میں نازل ہوئی ہے۔ اور اکثر موقعوں پر یہ تعلیم‘ توحید اور خدا پرستی کی تعلیم کے بعد ہی آئی ہے کہ پہلی تخلیقِ انسانی کی علت فاعلی

(۱) ایضاً۔

(۲) جامع ترمذی کتاب البر والصلۃ۔

(۳) ترغیب و ترتیب منذری جلد ۲ صفحہ ۱۲۴ بحوالہ ابن ماجہ‘ نسائی‘ حاکم۔

اور دوسری علت مادی ہے، سب سے پہلی آیت سورۂ بقرہ میں ہے، جس میں تورات کے حکم کی طرف بھی اشارہ فرمایا:

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا﴾ (بقرہ:۸۳)

''اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ تم نہ پوجو گے مگر اللہ کو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔''

یہ آیت پاک گو اس حکم کا اعادہ ہے جو توراۃ کی آیتوں میں ہے، لیکن یہاں توراۃ کی طرح صرف ماں کی عزت اور ڈر کے محدود لفظ نہیں بلکہ ''نیکی کرنے'' کا وسیع المعنی لفظ رکھا گیا ہے، جس سے تعلیم کے مفہوم میں وسعت آگئی ہے اور ہر قسم کی خدمت، اطاعت اور عزت کا مفہوم اس کے اندر پیدا ہے۔

اسی سورت میں دوسری جگہ والدین کی مالی خدمت اور امداد کی نصیحت ہے:

﴿قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ﴾ (بقرہ:۲۱۵)

''فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو، وہ ماں باپ اور رشتہ داروں (وغیرہ) کے لیے۔''

سورۂ نساء میں توحید کے حکم اور شرک کی ممانعت کے بعد ہی والدین کے ساتھ بھلائی کی تاکید کی جاتی ہے۔

﴿وَ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا﴾ (نساء:۳۶)

''اور اللہ کو پوجو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو۔''

کفار کو جنہوں نے اپنے وہم وخیال اور رسم ورواج سے حلال وحرام کی ہزاروں رسمی وخیالی باتیں پیدا کر رکھی تھیں اللہ تعالیٰ خطاب کر کے فرماتا ہے کہ یہ کھانے پینے کی چیزیں حرام نہیں آؤ ہم بتائیں کہ حقیقت میں حرام چیزیں کیا ہیں؟ خدا کے ساتھ شرک کرنا اور ماں باپ کے ساتھ نیکی سے پیش نہ آنا۔

﴿قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّکُمْ عَلَیْکُمْ اَلَّا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا﴾ (انعام:۱۵۱)

''کہہ (اے پیغمبر!) آؤ میں تمہیں پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا۔''

معراج کے احکام دوازدہ گانہ میں خدا کی توحید کے بعد والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم اس تاکید کے ساتھ دی جاتی ہے کہ ان کے سامنے اف بھی نہ کرو، عاجزی سے پیش آؤ، ان کے حق میں دعائے خیر کرو، بڑھاپے میں ان کی خدمت کرو، فرمایا:

﴿وَ قَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُھُمَآ اَوْ کِلٰھُمَا فَلَا تَقُلْ لَّھُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْھَرْھُمَا وَ قُلْ لَّھُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا○ وَاخْفِضْ لَھُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَۃِ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْھُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا○﴾ (بنی اسرائیل:۲۳۔۲۴)

''اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کو نہ پوجو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرنا اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اف بھی نہ کہو اور نہ ان پر خفا ہو اور ان سے ادب سے بولو اور ان کے لیے اطاعت کا بازو محبت سے جھکاؤ اور کہو کہ اے میرے پروردگار تو ان پر رحمت فرما جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے پالا۔''

اللہ اللہ! کس ادب اور محبت کی تعلیم ہے۔

خدا کی دائمی اور غیر متبدل شریعت میں شرک سے زیادہ بری چیز کوئی نہیں قرار دی گئی اس پر بھی اگر کسی کے باپ مشرک ہوں تو اس حالت میں بھی ان کی خدمت سے ہاتھ اٹھانا روا نہیں، بجز اس کے کہ اگر وہ شرک کی ت دیں تو ان کی اس بات کو قبول نہ کیا جائے۔ ارشاد ہوا:

﴿وَ وَصَّيۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَيۡهِ حُسۡنًا وَ اِنۡ جَاهَدٰكَ لِتُشۡرِكَ بِىۡ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡهُمَا اِلَىَّ مَرۡجِعُكُمۡ فَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ﴾ (عنکبوت:۸)

''اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور اگر وہ تجھ کو مجبور کریں کہ تو خدا کے ساتھ اس کو شریک کر جس کا تجھ کو علم نہیں تو ان کا کہا نہ مان، تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے، تو میں تم کو تمہارے کرتوت سے آگاہ کروں گا۔''

اتنا ہی نہیں، بلکہ اگر تمہارے بت پرست ماں باپ تم کو بت پرستی کی دعوت دیں تو صرف ان کی دعوت کو قبول رو لیکن ان کی دنیاوی خدمت اور حسن سلوک میں کوئی فرق نہ آنے پائے، بلکہ وہ اس حالت میں بھی اپنی جگہ پر ئم رہے فرمایا:

﴿وَ وَصَّيۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَيۡهِ حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ وَهۡنًا عَلٰى وَهۡنٍ وَّ فِصٰلُهٗ فِىۡ عَامَيۡنِ اَنِ اشۡكُرۡ لِىۡ وَلِوَالِدَيۡكَ اِلَىَّ الۡمَصِيۡرُ ○ وَ اِنۡ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنۡ تُشۡرِكَ بِىۡ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡهُمَا وَ صَاحِبۡهُمَا فِى الدُّنۡيَا مَعۡرُوۡفًا﴾ (لقمان:۱۴۔۱۵)

''اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کر، اس کی ماں نے اس کو تھک تھک کر پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑایا کہ میرا اور اپنے ماں باپ کا احسان مانے، میرے ہی پاس پھر آنا ہے اگر وہ دونوں اس پر تجھ کو مجبور کریں کہ میرے ساتھ اس کو شریک کر جس کو تو نہیں جانتا تو ان کا یہ کہنا نہ مان اور دنیا میں ان کے ساتھ بھلائی سے گزران کر۔''

اس اہتمام کو دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ ماں باپ کی احسان مندی کا ذکر خود اپنی احسان پذیری کے ساتھ کرتا ہے اور س شرک پرستی کی دعوت اور اس دعوت کے قبول پر اولاد کو بزور مجبور کرنے کے باوجود صرف اسی قدر کہا جاتا ہے کہ مذہب کے باب میں ان کی بات اولاد نہ مانے، مگر دوسری باتوں میں ان کا ادب، ان کی اطاعت اور ان کی خدمت کا وہی عالم رہے۔

حضرت ابراہیمؑ کو دیکھیے کہ باوجود اس کے کہ ان کا باپ مسلمان نہ تھا مگر اپنے وعدہ کی بنا پر خدا سے دعا مانگی جس سے غالباً ان کی مراد یہ ہوگی کہ وہ ایمان لاکر حسنِ خاتمہ پر مرے۔

﴿رَبَّنَا اغْفِرْلِیْ وَ لِوَالِدَیَّ﴾ (ابراہیم:۴۱)

''اے میرے پروردگار! مجھے اور میرے ماں باپ کو بخش دے۔''

حضرت نوحؑ نے بھی یہی دعا کی:

﴿رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَ لِوَالِدَیَّ﴾ (نوح:۲۸)

''میرے پروردگار مجھے اور میرے ماں باپ کو بخش دے۔''

اس لیے والدین کے حسنِ خاتمہ اور مغفرت کی دعا مانگنا انبیاء علیہم السلام کی پیروی ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ وہ لوگ جو والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرتے ہیں ان کی خدمت بجا لاتے ہیں اور ان کے لیے خدا سے دعائے خیر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس نیکی کے بدلہ میں ان کے سارے گناہ معاف کر دیتا اور اپنی خوش نودی کی لازوال دولت ان کو عطا فرماتا ہے۔(1)

﴿وَ وَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ اِحْسَانًا حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّ وَضَعَتْهُ كُرْهًا وَ حَمْلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ بَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَ عَلٰى وَالِدَیَّ وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَ اَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَ اِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ○ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ نَتَجَاوَزُ عَنْ سَیِّاٰتِهِمْ فِیْۤ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِیْ كَانُوْا یُوْعَدُوْنَ ○﴾ (احقاف:۱۵-۱۶)

''اور ہم نے انسان کو تاکید کر کے کہہ دیا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا اس کی ماں نے اس کو تکلیف کر کے پیٹ میں اٹھایا اور تکلیف کر کے جنا اور تیس مہینوں تک اس کو پیٹ میں رکھنا اور دودھ چھڑانا یہاں تک کہ وہ بچہ سے بڑھ کر جوان ہوا اور چالیس برس کا ہوا۔ اس نے کہا کہ میرے پروردگار مجھ کو توفیق دے کہ تیرے اس احسان کا شکریہ کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیا۔ اور اس کی کہ میں وہ کام کروں۔ جس کو تو پسند کرے اور میری اولاد نیک کر میں تیری طرف لوٹ کر آیا اور میں تیرے فرمان برداروں میں ہوں یہی وہ ہیں جن کے اچھے کام ہم قبول، اور ان کے برے کاموں سے در گزر کرتے ہیں یہ جنت والوں میں ہوں گے یہ سچائی کا وہ عہد ہے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا۔''

ان آیتوں نے والدین اور خصوصاً ماں کی خدمت واطاعت ورضا مندی کو وہ پانی بتایا ہے جس سے گناہوں

(۱) مشکوۃ المصابیح بحوالہ احمد ونسائی وبیہقی کتاب الادب فی البر والصلۃ۔

لی فرد ڈھل کر صاف ہو جاتی ہے' احادیث میں رسول ﷺ نے اسی منشائے الٰہی کو مختلف عبارتوں اور طریقوں میں دا فرمایا ہے۔ کہیں فرمایا ہے کہ ''ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔'' کبھی ارشاد ہوا ''رب کی خوش نودی باپ کی نوش نودی میں ہے۔'' کسی نے پوچھا یا رسول اللہ! میرے حسنِ معاشرت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے' فرمایا نیری ماں' دریافت کیا پھر کون' فرمایا تیری ماں' عرض کی پھر کون؟ فرمایا تیری ماں' گزارش کی پھر کون' چوتھی بار فرمایا' نیرا باپ اور اس کے بعد جو اس سے قریب ہے' پھر جو اس سے قریب ہے ایک دفعہ حضورِ انور ﷺ مجلسِ قدس یں تشریف فرما تھے' جان نثار حاضر تھے فرمایا وہ خوار ہوا' وہ خوار ہوا' وہ خوار ہوا۔ صحابہؓ نے پوچھا کون یا رسول اللہ! رشاد ہوا' وہ جس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور پھر ان کی خدمت کر کے جنت نہ حاصل کر لی۔ ایک اور مجلس میں صحابہؓ نے دریافت کیا کہ تمام کاموں میں خدا کو ہمارا کون سا کام زیادہ پسند آتا ہے' فرمایا وقت پر نماز پڑھنا' عرض کی پھر کون؟ ارشاد ہوا ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا' دریافت کیا پھر کون' فرمایا خدا کی راہ میں محنت اٹھانا (جہاد)۔

ایک دفعہ آپؐ نے والدین کی اطاعت کے ثواب کو ایک نہایت مؤثر حکایت میں بیان فرمایا ارشاد ہوا کہ تین مسافر راہ میں چل رہے تھے اتنے میں موسلا دھار پانی برسنے لگا' تینوں نے بھاگ کر ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی' قضارا ایک چٹان اوپر سے ایسی گری کہ اس سے اس غار کا منہ بند ہو گیا۔ اب ان کی بے کسی و بیچارگی اور اضطراب و بے قراری کا کون اندازہ کر سکتا ہے' ان کی موت سامنے کھڑی نظر آتی تھی۔ اس وقت انہوں نے پورے خضوع و خشوع کے ساتھ دربارِ الٰہی میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے' ہر ایک نے کہا اس وقت ہر ایک کو اپنی خالص نیکی کا واسطہ خدا کو دینا چاہیے' ایک نے کہا بارِ الٰہا تو جانتا ہے کہ میرے والدین بوڑھے تھے اور میرے چھوٹے چھوٹے بچے تھے' میں بکریاں چراتا تھا اور انہی پر ان کی روزی کا سہارا تھا۔ میں شام کو جب بکریاں لے کر گھر آتا تھا تو دودھ دوہ کر پہلے اپنے والدین کی خدمت میں لاتا تھا جب وہ پی چکتے تب اپنے بچوں کو پلاتا تھا۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں بکریاں چرانے کو دور نکل گیا' لوٹا تو میرے والدین سو چکے تھے۔ میں دودھ لے کر ان کے سرہانے کھڑا ہوا نہ ان کو جگاتا تھا کہ ان کی راحت میں خلل آ جاتا اور نہ ہٹتا تھا کہ خدا جانے کس وقت ان کی آنکھیں کھلیں اور دودھ مانگیں' بچے بھوک سے بلک رہے تھے مگر مجھے گوارا نہ تھا کہ میرے والدین سے پہلے میرے بچے سیر ہوں' میں اسی طرح پیالہ میں دودھ لئے رات بھر سرہانے کھڑا رہا اور وہ آرام کرتے رہے خداوند! اگر تجھے معلوم ہے کہ میں نے یہ کام تیری خوش نودی کے لیے کیا تو اس چٹان کو اس غار کے منہ سے ہٹا دے؟ یہ کہنا تھا کہ چٹان کو خود بخود جنبش ہوئی اور غار کے منہ سے تھوڑا سرک گئی اس کے بعد باقی مسافروں کی باری آئی اور انہوں نے بھی اپنے نیک کاموں کو وسیلہ بنا کر دعا کی اور غار کا منہ کھل گیا۔

اسلام میں جہاد کی اہمیت جو کچھ ہے وہ ظاہر ہے مگر والدین کی خدمت گزاری کا درجہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ ان کی اجازت کے بغیر جہاد بھی جائز نہیں کہ جہاد کے میدان میں سر ہتھیلی پر رکھ کر جانا ہوتا ہے اور ہر وقت

جان جانے کا امکان رہتا ہے اس لیے والدین کی اجازت کے بغیر ان کو اپنے جسم و جان کو کھونے کا حق نہیں جس کو ان کی خدمت گزاری کے لیے وقف ہونا چاہیے تھا' اسی لیے ابھی اوپر گزر چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نیک کاموں میں جہاد کا درجہ والدین کی خدمت گزاری کے بعد رکھا' ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے آ کر خدمتِ اقدس میں شرکتِ جہاد کی اجازت طلب کی۔ دریافت فرمایا کہ تمہارے ماں باپ بھی ہیں' عرض کی جی ہاں' ارشاد ہوا تو پھر انہی کی خدمت کا فریضۂ جہاد ادا کرو۔

قرآن پاک کی صریح آیتوں میں خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ جس طرح والدین کی اطاعت کا ذکر ہے' احادیث میں بھی وہی درجہ رکھا گیا ہے۔ صحابہؓ سے فرمایا کہ ''تم پر خدا نے ماؤں کی نافرمانی حرام کی ہے۔'' ایک دفعہ صحابہؓ سے جو خدمت میں حاضر تھے' دریافت کیا کہ کیا تم کو بتاؤں کہ دنیا میں سب سے بڑے گناہ کیا ہیں؟ انہوں نے عرض کی' ضرور یا رسول اللہ! فرمایا کہ خدا کے ساتھ شرک کرنا' ماں باپ کی نافرمانی کرنا آپؐ تکیہ لگائے بیٹھے تھے سیدھے ہو کر برابر ہو گئے' اور فرمانے لگے ''اور جھوٹی گواہی اور ہاں جھوٹی گواہی۔''(۱)

توراۃ میں حقوقِ والدین کے متعلق جو بعض ایسے احکام تھے جو بے حد سخت تھے وحیِ محمدی نے بعض حیثیتوں سے ان میں تخفیف کر دی ہے اور بعض حیثیتوں سے اور زیادہ سخت کر دیا ہے' مثلاً توراۃ کا یہ حکم تھا کہ کوئی شخص جو اپنے ماں باپ پر لعنت کرے وہ قتل کر دیا جائے' اسلام نے اس گناہ کو دنیا کی قانونی سزا کے بجائے اخروی سزا کا موجب قرار دیا جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ توبہ و استغفار سے معاف ہو سکتے ہیں اور مجرم کو اپنے فعل پر نظر ثانی کی تازندگی مہلت ملتی ہے' لیکن اگر اس نے اس مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا تو پھر عذاب بھی ہے جو دنیاوی سزا سے زیادہ سخت ہے' اسلام کے قانون میں ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی سنگ دل باپ اپنی اولاد کے قتل کا مرتکب ہو تو بعض حالتوں میں وہ اس کے قصاص میں قتل نہ ہوگا بلکہ کسی اور سزا کا مستحق ہوگا' کیونکہ باپ کو اپنی اولاد سے جو فطری محبت ہوتی ہے اس کا مقتضا یہی ہے کہ اس کے فعل کو قتل بالقصد کے بجائے اتفاقی سمجھا جائے تا آنکہ اس کے برخلاف کوئی قوی شہادت موجود نہ ہو۔(۲)

اسی سلسلہ میں ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ تورات نے ایک طرف والدین کو یہ اہمیت دی مگر دوسری طرف بیوی کے سامنے ان کو بالکل بے قدر کر دیا ہے' لکھا ہے:

---

(۱) یہ تمام واقعات اور اقوال عام کتب حدیث میں مذکورہ ہیں' خصوصیات کے ساتھ دیکھو صحیح بخاری کتاب الادب' صحیح مسلم کتاب البر و الصلہ' جامع ترمذی کتاب البر و الصلہ' مشکوۃ باب مذکور۔

(۲) فقہائے اسلام کے خیالات اس قانون کی تشریح کے متعلق مختلف ہیں' احناف اور شوافع کے نزدیک لڑکے کے قتل پر باپ سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ امام مالک کے نزدیک اگر وہ بے رحمی سے پچھاڑ کر ذبح کرے تو قصاص ہے ورنہ نہیں اور ظاہریہ کے اصول کے مطابق قتلِ عمد کی ہر صورت میں قصاص ہے اور یہی قرآن کا منشا معلوم ہوتا ہے' اصل یہ ہے کہ باپ کے وفورِ شفقت کی وجہ سے اس کا ہر قتل بلاقصد سمجھا گیا ہے اس لیے اکثر فقہا نے اس کو قتلِ خطا سمجھ کر قصاص کے بجائے اس پر دیت لازم کی ہے الا یہ کہ دلائل و قرائن باپ کے قصد کو ظاہر کرتے ہوں۔

اس واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور اپنی جورو سے ملا رہے گا اور وہ ایک تن ہوں گے (پیدائش ۲۔ ۲۴)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی جو گو (انجیل کے بیان کے مطابق) ماں باپ اور بیوی تینوں سے نا آشنا تھے تاہم جیسا کہ انجیل کے موجودہ نسخہ میں ہے ماں باپ کے مقابلہ میں بیوی کی طرف داری اور حمایت کی' اور اسی لیے طلاق کو ناجائز قرار دیا' (مرقس ۱۰۔ ۷۔ ۸) مگر سوال یہ ہے کہ اگر بیوی اور والدین کے درمیان ناقابلِ حل اختلاف ہو اور اس لیے ان دونوں میں سے کسی کو مجبوراً ترجیح دینا پڑے تو کیا صورت اختیار کی جائے۔ اسلام کا حکم ہے کہ اس حال میں بھی والدین کی اطاعت کرو کہ بیوی کا تعلق ایسا ہے جس کو قانون اور عہد نے پیدا کیا ہے جو ٹوٹ کر جڑ سکتا ہے' اور مٹ کر بدل سکتا ہے' لیکن والدین کا فطری تعلق ناقابلِ شکست اور ناقابلِ تغیر ہے' حضرت ابن عمرؓ کی ایک بیوی تھیں جن سے وہ راضی تھے' مگر ان کے پدر بزرگوار حضرت عمرؓ کو بہو پسند نہ تھیں' اس اختلاف نے خانگی جھگڑے کی صورت اختیار کی' آنحضرت ﷺ نے ابن عمرؓ کو مشورہ دیا کہ وہ باپ کی اطاعت کریں۔

❀❀❀

اولاد کا حق

اصولِ تعلیم

جس طرح ماں باپ کے حقوق اولاد پر ہیں اسی طرح اولاد کے بھی کچھ حقوق ماں باپ پر ہیں اور یہ وہ عنوان ہے جس کا سراغ دوسری آسمانی کتابوں میں نہیں ملتا اور اس سے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام سے پہلے والدین کو تو اپنی اولاد پر غیر محدود اختیارات حاصل تھے' مگر اولاد کا باپ پر کوئی حق تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور اس کو والدین کی بزرگی کے خلاف سمجھا گیا تھا۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ جو مذہب لے کر تشریف لائے اس کی شریعت میں حقوق کے مسئلہ میں بڑوں چھوٹوں کی تفریق نہیں' وہ جس طرح چھوٹوں پر بڑوں کے جائز حقوق تسلیم کرتا ہے' اسی طرح وہ چھوٹوں کے بھی بڑوں پر مناسب حقوق قائم کرتا ہے' آنحضرت ﷺ نے ایک نہایت چھوٹے سے فقرہ میں وہ اصول بتا دیا ہے جو ان تمام حقوق کا نہایت جامع متن ہے ان حقوق کی جس طرح تشریح کی جائے یہ متن ان سب پر محیط ہے' فرمایا:

((لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَ لَمْ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا)) (ترمذی)

''جو ہمارے چھوٹے پر شفقت نہ کرے اور ہمارے بڑے کا ادب نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔''

بڑے چھوٹے کے ساتھ شفقت سے پیش آئیں اور چھوٹے بڑے کا ادب اور لحاظ کریں' یہ وہ اصول ہے جس پر چھوٹوں اور بڑوں کے باہمی حقوق کی بنیاد اسلام میں قائم کی گئی ہے' اور حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ ترازو ٹھیک اور سیدھی رہے تو ہر انسانی جماعت میں چھوٹوں' بڑوں' افسروں' ماتحتوں' آقاؤں' نوکروں اور بزرگوں اور عزیزوں کے درمیان کسی قسم کی ناگواری اور آزردگی پیدا نہ ہونے پائے' جب کبھی چھوٹوں اور بڑوں میں کسی قسم کی ناگواری پیش آئی ہے تو اس کا سبب یہی ہوا ہے کہ ترازو کے ان دونوں پلڑوں میں توازن قائم نہیں رہا ہے۔ حکیموں' اور مقننوں کے بنائے ہوئے نظم و انتظام کے سارے مشرح و مفصل قانون اور قاعدوں کا بے پایاں دفتر جو کام نہیں کر سکتا وہ نبیِ امی علیہ السلام کے یہ دو مختصر سادہ فقرے بڑی خوبی سے انجام دے سکتے ہیں' اور دیتے ہیں اگر واقعاً کسی جماعت میں یہ ترازو بے نظام ہو جائے تو بڑے بڑے قانونوں کا بارِ گراں بھی پھر اس کو برابر نہیں کر سکتا۔

اولاد کا سب سے پہلا حق اپنے والدین پر یہ ہے کہ جب خدا نے ان کی اولاد کی زندگی کا واسطہ ان کو بنایا ہے تو وہ بالقصد اس کے نقشِ زندگی کے مٹانے کا سبب نہ بنیں بلکہ اس کی حیات کی تکمیل اور اس کی نشو و نما کی ترقی کے وہ تمام ذریعے مہیا کریں جو ان کی قوت اور استطاعت میں ہیں یہی سبب ہے کہ اسلام نے حمل کو بالقصد ضائع کرنے (اسقاط) کو گناہ قرار دیا ہے اور ذریعۂ حمل کے ضائع کرنے (عزل) کو اچھا نہیں سمجھا ہے اور پیدا ہونے

کے بعد اس کے مار ڈالنے کی جاہلانہ رسم کو جڑ پیڑ سے اکھاڑنے کی پوری کوشش کی ہے۔

اولاد کشی کا انسداد

عرب کے سفاکانہ مراسم میں سب سے زیادہ بے رحمی و سنگ دلی کا کام معصوم بچوں کو مار ڈالنا اور لڑکیوں کو زندہ گاڑ دینا تھا یہ بے رحمی کا کام والدین خود اپنی خوشی اور مرضی سے انجام دیتے تھے اس رسم کے جاری ہونے کے کئی اسباب تھے ایک تو مذہبی تھا' یعنی والدین اپنے بچوں کو اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے خود ذبح کر کے ان پر چڑھادیتے تھا' منت مانتے تھے کہ فلاں کام ہوگا تو اپنے بچہ کی قربانی کریں گے۔ (۱) یہ قابلِ نفرت رسم نہ صرف عرب میں بلکہ بہت سی بت پرست قوموں میں جاری تھی رومۃ الکبریٰ کے عظیم الشان متمدن قانون میں اولاد کو مار ڈالنے کا باپ کو بالکل اختیار تھا اس قتل کی کوئی باز پرس نہ تھی اور اولاد کشی کا علانیہ کثرت سے رواج تھا۔ (۲) اور سب سے زیادہ ہندوستان کے راج پوتوں میں یہ دردناک منظر لڑکیوں کی شادی کی شرم و عار سے سے بچنے اور بیواؤں کی ستی کی صورت میں اور لڑائیوں میں جوہر کی صورت میں رائج تھا اور سب سے زیادہ یہ کہ بتوں' دیوتاؤں کی خوشی اور نذرانے کے لیے ان معصوموں کی جانیں بہت آسانی سے لی جاتی تھیں قرآن پاک کی اس آیت میں نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا کی قوموں کے لیے اسی عقیدہ کو باطل کیا گیا ہے۔ (۳)

﴿وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآءُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَ لِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَافَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ﴾ (انعام:۱۳۷)

''جس طرح کھیتوں اور جانوروں میں خدائے برحق کے ساتھ ان کے دیوتاؤں نے اپنا حصہ لگالیا ہے اس طرح بہت سے مشرکوں کو ان کے دیوتاؤں نے یہ بات خوب صورت کر کے دکھائی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کر دیں تاکہ یہ دیوتا ان کو (ہمیشہ کے لیے) ہلاک کر دیں اور ان کے دین کو ان پر مشتبہ کر دیں اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے تو ان مشرکوں کو اور جو کچھ خدا پر وہ افترا کرتے ہیں کہ خدا نے ان کو ایسا حکم دیا ہے۔ اس کو چھوڑ دے۔''

اسی سلسلہ میں آگے چل کر خدا فرماتا ہے۔

﴿قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا ۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (انعام:۱۴۰)

''گھاٹے میں ہیں' وہ جنھوں نے اپنی اولاد کو نادانی سے ان جانے قتل کیا۔''

---

(۱) سیرۃ ابن ہشام' وطبقات ابن سعد و تاریخ طبری وغیرہ کتب سیر میں عبدالمطلب کا عبداللہ کو قربانی دینے کا واقعہ نیز موطا امام مالک باب مالا یجوز من النذر فی معصیۃ اللہ۔

(۲) لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ جلد اول ص ۲۳۰۔

(۳) کشاف زمخشری تفصیل آیت ذیل۔

اس ہولناک گناہ کے ارتکاب کا دوسرا سبب عربوں کا عام فقر و فاقہ تھا وہ سمجھتے تھے کہ اولاد ہوگی تو اِن کے کھانے پینے کا سامان کرنا ہوگا اس لیے وہ اس کے خون سے اپنا ہاتھ رنگ کر اس فرض سے سبکدوش ہوتے تھے۔ نبوتِ محمدی نے ان کو یہ بتایا کہ ہر بچہ اپنا رزق اور اپنی قسمت ساتھ لے کر آتا ہے ایک انسان دوسرے انسان کو نہیں کھلاتا بلکہ وہ خدا ہی ہے جو سب کو کھلاتا ہے اور وہی ہر جاندار کی روزی کا میر سامان ہے۔

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ (ھود:٦)

''اور زمین پر کوئی جاندار نہیں لیکن یہ کہ اس کی روزی کا فرض خدا ہی پر ہے۔''

اس لیے جاہل عربوں کو تعلیم دی گئی۔

﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ اِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا﴾ (اسراء:۳۱)

''اور اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف سے مار نہ ڈالا کرو ہم ہی ہیں جو ان کو اور تم کو دونوں کو روزی دیتے ہیں ان کا مار ڈالنا بے شبہ بڑا گناہ ہے۔''

قتلِ اولاد کے جرم کو اتنی اہمیت دی گئی کہ اس کی ممانعت کو شرک کی ممانعت کے پہلو بہ پہلو جگہ دی گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ ان عربوں کو جنہوں نے اپنی طرف سے بہت سی چیزیں حرام بنالی ہیں بتا دو کہ اصلی چیزیں انسان پر کیا حرام ہیں۔

﴿قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ﴾ (انعام:۱۵۱)

''کہہ دے اے پیغمبر! آؤ میں تم کو پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے، خدا کا کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور مفلسی کے ڈر سے اپنے بچوں کو نہ مار ڈالو ہم تم دونوں کو روزی دیتے ہیں۔''

ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے دریافت کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ فرمایا شرک، پوچھا اس کے بعد فرمایا والدین کی نافرمانی پھر عرض کی اس کے بعد، فرمایا کہ تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے مار ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گی۔[1] یہ جواب حقیقت میں آیتِ بالا کی تفسیر ہے، انہی تعلیمات اور نبوت کے اس پرتوِ فیض نے دلوں میں یقین پیدا کر دیا کہ رزاق خدا ہے اسی کے ہاتھ میں رزق کی کنجی ہے، ہر بچہ اپنے رزق کا آپ سامان لے کر آتا ہے اس ایمان اور یقین نے اس جرم کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا ہے اور عرب کی سرزمین اس لعنت سے ہمیشہ کے لیے پاک ہوگئی۔

---

(۱) صحیح بخاری کتاب التوحید وتفسیر سورۃ بقرہ وسورہ فرقان وکتاب الادب وکتاب المحاربین وصحیح مسلم کتاب الایمان۔

اولاد کشی کی تیسری صورت جو سب سے زیادہ قابلِ افسوس تھی وہ لڑکیوں کا زندہ دفن کر دینا تھا کہ لڑکیاں شرم و عار کا باعث سمجھی جاتی تھیں' جب گھر میں لڑکی پیدا ہوتی تو باپ کو سخت رنج ہوتا اور وہ لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا تھا۔ اہل عرب کا عقیدہ تھا کہ فرشتے خدا کی لڑکیاں ہیں' قرآن نے کہا کہ تم کو لڑکی ہو تو تمہاری شرم کا باعث ہو اور خدا کو لڑکیوں کا باپ کہو تو شرم نہ آئے۔

﴿وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ﴾ (زخرف:۱۷)

''اور جب ان میں کسی کو اس کے ہونے کی خوش خبری دی جائے جس کی وہ رحمت والے خدا پر تہمت باندھتے ہیں تو اندر ہی اندر غصہ کے مارے اس کا منہ سیاہ پڑ جاتا ہے۔''

رفتہ رفتہ یہ حالت پہنچی کہ اس شرم و عار کے مجسمہ کو پردۂ خاک میں چھپا کر باپ اس مصیبت سے نجات پانے کی فکریں کرتا' قرآن پاک نے اہلِ عرب کی اس حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

﴿وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ ۝ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ﴾ (نحل:۵۸۔۵۹)

''اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوش خبری دی جاتی ہے۔ تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور غصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے اس خوش خبری کے رنج سے وہ لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا ہے کہ آیا ذلت اٹھا کر اس کو اپنے پاس رہنے دے یا اس کو مٹی میں چھپا دے'' (یعنی زندہ دفن کر دے۔)

یوں تو اس رسمِ بد کا رواج تمام عرب میں تھا' مگر اخبار عرب کے بعض واقف کہتے ہیں کہ ایک خاص سبب سے بنوتمیم میں اس کا رواج سب سے زیادہ تھا'[۱] بنوتمیم کے رئیس قیس بن عاصم نے خود آنحضرت ﷺ سے اقرار کیا کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ دس لڑکیوں کو زندہ دفن کیا ہے'[۲] یہ رسم جس شقاوت اور سنگ دلی کے ساتھ انجام دی جاتی تھی اس کا حسرتناک نقشہ ایک صاحب نے آنحضرت ﷺ کے سامنے خود اپنی آپ بیتی سنا کر اس طرح کھینچا کہ رحمت عالم ﷺ بے چین ہو گئے۔

دارمی میں وضین تبع تابعی سے ایک موقوف روایت ہے[۳] کہ ایک شخص نے آ کر خدمتِ اقدس میں عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! ہم لوگ جاہلیت والے تھے' بتوں کو پوجتے تھے اور اولاد کو مار ڈالتے تھے۔ میری ایک لڑکی تھی جب میں اس کو بلاتا تو دوڑ کر میرے پاس آتی ایک دن وہ میرے بلانے پر خوش خوش دوڑی آئی' میں

(۱) مجمع الامثال کرمانی مطبوعہ ایران صفحہ ۳۴۸ و کتاب مجمع الامثال میدانی جلد اول صفحہ ۲۸۷ مطبوعہ خیریہ مصر زیر مثل اضل من موودہ۔

(۲) ابن جریر ابن کثیر و در منثور سیوطی بحوالہ سنن بیہقی و سند بزار (مصنف عبدالرزاق زیر تفسیر سورۂ تکویر)

(۳) سنن دارمی صفحہ اول' روایت گو مرفوع اور قوی نہیں' لیکن اس لیے نقل کر دی ہے کہ کم از کم آج اس جرم کا تخیل ہی ہمارے سامنے آ جائے۔

آگے بڑھا اور وہ میرے پیچھے چلی آئی میں آگے بڑھتا چلا گیا' جب ایک کنوئیں کے پاس پہنچا جو میرے گھر سے کچھ دور نہ تھا اور لڑکی اس کے قریب پہنچی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کنوئیں میں ڈال دیا' وہ ابا ابا کہہ کر پکارتی رہی اور یہی اس کی زندگی کی آخری پکار تھی' رحمت کونین ﷺ اُس پر درد افسانہ کو سن کر آنسو ضبط نہ کر سکے۔ ایک صحابیؓ نے ان صاحب کو ملامت کی کہ تم نے حضور ﷺ کو غمگین کر دیا۔ فرمایا اس کو چھوڑ دو کہ جو مصیبت اس پر پڑی ہے وہ اس کا علاج پوچھنے آیا ہے۔ پھر ان صاحب سے فرمایا ''ہاں میاں! تم اپنا قصہ پھر سناؤ۔'' انہوں نے دوبارہ پھر بیان کیا آنحضرت ﷺ کی یہ حالت ہوئی کہ روتے روتے ریش مبارک تر ہوگئی' پھر فرمایا ''جاؤ کہ جاہلیت کے گناہ اسلام کے بعد معاف ہو گئے اب نئے سرے سے اپنا عمل شروع کرو۔''

قبیلہ بنی تمیم کے رئیس قیس بن عاصم جب اسلام لائے تو انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! میں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیاں زندہ دفن کی ہیں' فرمایا اے قیس ہر لڑکی کے کفارہ میں ایک غلام آزاد کرو' عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میرے پاس اونٹ ہیں فرمایا اے قیس ہر لڑکی کے کفارہ میں ایک اونٹ قربانی کرو۔ (۱)

مردوں کے علاوہ یہ کس قدر تعجب انگیز ہے کہ خود عورتیں بھی اس جرم میں مردوں کی شریک تھیں' مائیں خود اپنی لڑکیوں کو اپنے ہاتھ سے اس قربانی کے لیے حوالہ کرتی تھیں' ابن الاعرابی جاہلیت کے ایک شاعر کا ایک شعر سناتا ہے:

مالقی المؤد من ظلم امه
کما لقیت ذهل جمیعًا و عامر

''زندہ دفن ہونے والے بچہ نے اپنی ماں کے ظلم سے بھی وہ تکلیف نہیں اٹھائی جو ذہل اور عامر نے اٹھائی۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں ایک عورت نے آ کر کہا کہ میں نے نذر مانی تھی کہ اپنے لڑکے کی قربانی کروں گی' فرمایا ''ایسا نہ کرو بلکہ کفارہ دے دو۔''

اسلام سے پہلے اس رسم کے انسداد کے لیے صرف اسی قدر ہوا کہ ایک دو نیک آدمیوں نے ایسی لڑکیوں کو قیمت دے کر ان کے والدین سے خرید لیا اور ان کی پرورش کی' چنانچہ مشہور شاعر فرزدق کے دادا صعصعہ نے اس میں بڑا نام پیدا کیا تھا' اسلام کے بعد جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا تو عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں نے اسلام سے پہلے ۳۶۰ لڑکیوں کو خرید کر موت سے بچایا ہے کیا مجھ کو اس کا ثواب ہوگا۔ فرمایا ہاں تم کو اس کا ثواب ملے گا' کہ خدا نے تم کو مسلمان بنا کر تم پر احسان کیا ہے۔ (۲) اسی طرح زید بن عمرو بن نفیل جو بعثتِ نبوی سے پہلے

(۱) تفسیر ابن جریر طبری بروایت قتادہ تابعی و تفسیر ابن کثیر بحوالہ عبدالرزاق و بزار و در منثور سیوطی بحوالہ مسند بزار و حاکم فی الکنی و بیہقی فی السنن زیر سورۂ الشمس کورت۔

(۲) موطا امام مالک باب النہی عن النذر فی معصیۃ اللہ۔

دینِ ابراہیم کے پیرو تھے، وہ بھی اس قسم کی لڑکیوں کو اپنے آغوشِ شفقت میں لیتے تھے اور ان کی پرورش کرتے تھے، جب وہ بڑی ہو جاتی تھیں تو وہ ان کے باپ کو کہتے کہ کہو تو میں تم کو واپس کروں چاہے ان کو میرے پاس ہی رہنے دو۔"(۱) یہ شخصی کوششیں تھی جو ملک میں بارآور نہ ہوئیں۔ لیکن بعثتِ محمدی ﷺ کی رحمتِ عام کی جب بہار آئی تو ان شقاوتوں کے موسم پر ہمیشہ کے لیے خزاں چھا گئی۔

لوگ عموماً لڑکیوں کے وجود کو بلا اور مصیبت سمجھتے تھے نبوتِ محمدی ﷺ نے اس بلا اور مصیبت کو ایسی رحمت بنا دیا کہ وہ نجاتِ اخروی کا ذریعہ بن گئیں۔ "فرمایا جو کوئی ان لڑکیوں میں سے کسی لڑکی کی مصیبت میں مبتلا ہو اور پھر اس کے ساتھ محبت و مہربانی کا سلوک کرے تو وہ دوزخ کے عذاب سے اس کو بچالے گی، وہ اس کے اور دوزخ کے درمیان پردہ بن کر حائل ہو جائے گی۔ (۲) نیز فرمایا جو دو لڑکیوں کی بھی پرورش کرے، یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں تو قیامت میں میرا اور اس کا مرتبہ دو انگلیوں کو اٹھا کر فرمایا کہ یوں برابر ہوگا،(۳) غور کیجیے کہ وہی حقیر ہستی جو پہلے شرم و عار کا موجب تھی، عہدِ محمدی ﷺ میں آ کر عزت اور سعادت کا وسیلہ بن گئی۔

ان اخلاقی نصیحتوں کے علاوہ اس رسم کے انسداد کے لیے آپ ﷺ نے عورتوں اور مردوں سے بیعت لی۔ صلح حدیبیہ کے بعد حکم ہوا کہ جو عورتیں اسلام لائیں ان سے توبہ کی جو بیعت لی جائے اس میں ایک دفعہ یہ بھی ہو کہ

﴿وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ﴾ (ممتحنۃ:۱۲)

کہ وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی۔"

چنانچہ اس حکم کے مطابق آنحضرت ﷺ نے عورتوں سے خصوصیت کے ساتھ اس کی بیعت لی، فتح مکہ کے دن عورت مرد جوق در جوق اسلام کے لیے حاضر ہو رہے تھے تو آپ ﷺ نے عورتوں سے خاص طور پر اس کا اقرار لیا اور انہوں نے اقرار کیا۔ (۴) عید کے اجتماعِ عام میں عورتوں کے مجمع میں آپ ﷺ تشریف لائے اور دوسری باتوں کے علاوہ اس کا بھی عہد لیا کہ وہ قتل اولاد کی مرتکب نہ ہوں گی،(۵) دوسرے موقعوں پر بھی جو خواتین دربارِ رسالت میں حاضر ہوتیں ان سے بھی اس کا عہد لیا جاتا تھا،(۶) بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پیشِ نظر عرب کی جو ابتدائی اصلاحیں تھیں ان میں ایک چیز یہ بھی تھی، چنانچہ بیعتِ عقبہ میں

(۱) تفسیر درمنثور بحوالہ طبرانی تفسیر اذا الشمس کورت۔
(۲) صحیح بخاری باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل جلد اول صفحہ ۵۴۰۔
(۳) صحیح بخاری کتاب الادب و صحیح مسلم کتاب البر۔ مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم کتاب الادب فی شفقۃ علی الخلق۔
(۴) صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۷۲۶ تفسیر سورۂ ممتحنہ و صحیح مسلم باب بیعۃ النساء۔
(۵) صحیح بخاری جلد اول ص ۱۳۳ باب موعظۃ الامام النساء یوم العید۔
(۶) ترمذی و نسائی و ابن ماجہ باب مصافحۃ النساء و مسند امام احمد حدیث امیمہ بنت رقیقہ و سلمی بنت قیس۔

سب سے پہلے انصار سے جن باتوں پر عہد لیا گیا تھا ان میں ایک یہ بھی تھا کہ وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے۔ (۱) حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ بن صامت کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ دربارِ رسالت میں حاضر تھے' آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہم سے اس پر بیعت کرو کہ تم کسی کو خدا کا شریک نہ ٹھہراؤ گے' چوری نہ کرو گے' بدکاری نہ کرو گے اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے' جو اس عہد کو پورا کرلے گا تو اس کا معاوضہ خدا پر ہے اور اگر کسی نے ان میں سے کسی فعل کا ارتکاب کیا اور اس کو قانونی سزا دی گئی تو یہ اس کے گناہ کا کفارہ ہو جائے گا اور اگر اس کا یہ گناہ دنیا میں مخفی رہا تو خدا کو اختیار ہے چاہے بخش دے چاہے عذاب دے (۲) عبادہؓ سے فرمایا کہ خدا نے تم پر ماؤں کی نافرمانی اور لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا حرام کیا ہے۔ (۳) ان تمام تدبیروں کے علاوہ قرآن پاک کی ایک مختصر سی آیت نے عرب کی ان تمام قساوتوں' ان تمام سنگ دلیوں اور ان تمام سفاکیوں کو مٹانے کے لیے وہ کام کیا جو دنیا کی بڑی بڑی تصنیفات نہیں کرسکتی تھیں' قیامت کی عدالت گاہ قائم ہے' مجرم اپنی اپنی جگہ کھڑے ہیں' غضبِ الٰہی کا آفتاب اپنی پوری تمازت پر ہے' دانائے غیب قاضی اپنی معدلت کی کرسی پر ہے' اعمال نامے شہادت میں پیش ہیں کہ ایک طرف سے ننھی ننھی معصوم بے زبان ہستیاں خون سے رنگین کپڑوں میں آکر کھڑی ہو جاتی ہیں' شہنشاہِ قہار کی طرف سے سوال ہوتا ہے' اے ننھی معصوم جانو! تم کس جرم میں ماری گئیں۔

﴿وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝﴾ (التکویر: ۸۔۹)

''یاد کرو جب (قیامت میں) زندہ دفن ہونے والی لڑکی سے پوچھا جائے گا تو کس جرم میں ماری گئی۔''

کس درجہ بلیغ اور مؤثر طرزِ ادا ہے' اس کا یہ اثر تھا کہ یا تو لوگ لڑکیوں کو خود اپنے ہاتھوں سے دفن کردیتے تھے یا یہ زمانہ آیا کہ ادائے عمرہ کے موقع پر آنحضرت ﷺ مکہ سے روانہ ہونے کا قصد کرتے ہیں' سید الشہداء حمزہ رضی اللہ عنہ کی یتیم بچی امامہ جو مکہ میں رہ گئی تھی چچا چچا کہتی دوڑی آتی ہیں' حضرت علی رضی اللہ عنہ ہاتھوں میں اٹھا لیتے اور حضرت فاطمہ زہرہ رضی اللہ عنہا کے حوالہ کرتے ہیں کہ یہ لو تمہارے چچا کی بیٹی ہے' حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ بچی مجھ کو ملنی چاہیے کہ میرے چچا کی لڑکی ہے اور اس کی خالہ میرے گھر ہے۔ حضرت زیدؓ بڑھ کر کہتے ہیں کہ حضور یہ لڑکی مجھ کو ملنی چاہیے کہ حمزہ رضی اللہ عنہ میرے مذہبی بھائی تھے' حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دعویٰ ہے کہ یہ میری بہن بھی ہے اور پہلے میرے ہی گود میں آئی ہے آنحضرت ﷺ اس دل خوش کن منظر کو دیکھتے ہیں' پھر سب کے دعوے مساوی دیکھ کر اس کو یہ کہہ کر اس کی خالہ کی گود میں دے دیتے ہیں کہ خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے۔ (۴)

(۱) تفسیر ابن کثیر جلد ۹ صفحہ ۳۴۴ برحاشیہ فتح البیان۔ بحوالہ ابن ابی حاتم و مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۶۲۴ علی شرط مسلم۔
(۲) صحیح بخاری کتاب الایمان و باب وفود الانصار مسلم کتاب الحدود و مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۳۱۴ مستدرک حاکم جلد ۳ صفحہ ۳۱۸۔
(۳) صحیح بخاری کتاب الادب و کتاب فی الاستقراض و صحیح مسلم باب النہی عن کثرۃ المسائل۔
(۴) صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۱۰ باب عمرۃ القضاء۔

کیا یہ وہی جنس نہ تھی جن کی ہستی شرم و عار کا موجب تھی' جس کی پیدائش کی خبر سن کر باپ کے چہرہ کا رنگ سیاہ پڑ جاتا تھا' اور وہ لوگوں کے مجمع میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا تھا۔ یہ حال ہے کہ ایک ایک لڑکی کی پرورش کے لیے دفعتاً چار چار گود خالی ہو جاتے ہیں' اور فیصلہ مشکل ہوتا ہے' وہی اولاد جو پہلے بلا اور مصیبت تھی آنکھوں کی ٹھنڈک کا ذریعہ بنتی ہے۔

﴿وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ﴾ (فرقان:۷۴)

(''جنت ان کو بھی ملے گی جو) اور جو کہتے ہیں کہ ہمارے پروردگار ہماری بیویوں اور ہماری اولاد سے ہم کو آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فرما۔''

اور آخر وہ زمانہ آیا ایک بدوی شاعر کو طنزاً کہنا پڑا:

غدا الناس مذقام النبی الجواریا

''پیغمبر کی بعثت کے بعد تو یہ کثرت ہے کہ سب لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں۔''

رضاعت و حضانت

اولاد کے جینے کا حق تسلیم کرانے کے بعد پہلا فرض یہ ہے کہ اس کی نشوونما اور دودھ پلانے کے حق کو تسلیم کیا جائے اور جب تک وہ خود سے کھانے پینے کے قابل نہ ہو جائے اس کی خبر گیری کی جائے اور اس کے بعد اس کی نابالغی کے زمانہ تک اس کی نگرانی اور اس کے خرچ کی کفالت کی جائے' چنانچہ اسلام نے ان دونوں باتوں کا بوجھ والدین پر اور خاص طور سے جہاں تک مصارف کا تعلق ہے تنہا باپ پر رکھا ہے' رضاعت اور حضانت کے عنوان سے اس کی تشریح فقہ کی کتابوں میں مل سکتی ہے' مختصر یہ ہے کہ بچہ کو شیر خوارگی کے عالم میں ماں دودھ پلائے اگر ماں نہ ہو یا ماں کسی قانون (طلاق وغیرہ) کے سبب سے شوہر سے علیحدہ ہو چکی ہو تو باپ پر اس کی رضاعت کا سامان کرنا اور اس کی اجرت ادا کرنا فرض قرار دیا گیا اور اس شیر خواری کی مدت بھی دو برس کی مقرر کر دی گئی ہے۔

﴿وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (بقرہ:۲۳۳)

''اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس دودھ پلائیں' یہ مدت اس کے لیے ہے جو چاہے کہ رضاعت کی مدت پوری کرے اور لڑکے والے (باپ) پر ان دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق واجب ہے۔''

اور شیر خوارگی کے دنوں میں ماں کے علاوہ کوئی دوسری عورت بھی اپنا دودھ پلا کر اس کی زندگی کا سہارا بنے تو اسلام ہی ایک مذہب ہے جس نے قانوناً اس اہمیت کو قبول کیا' اور اس کا درجہ بھی ماں کے قریب قریب قائم کر کے اس کی اولاد کو بھی بھائی اور بہن کے رشتہ کا منصب عطا کیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَ اُمَّهَاتُكُمُ الّٰتِیْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ﴾ (نساء:۲۳)

''اور تمہاری وہ مائیں تم پر حرام ہیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا اور تمہاری دودھ شریک بہنیں۔''

دکھانا یہ ہے کہ ان ننھے بچوں کی نشو ونما کی خدمت اسلام میں وہ عزت اور احترام رکھتی ہے کہ نسبی رشتہ داریوں کے قریب قریب پہنچ جاتی ہے۔

اوپر کی پہلی آیت میں جب دودھ پلانے والی کے کھانے اور کپڑے کی ذمہ داری باپ پر ڈالی گئی ہے تو ظاہر ہے کہ بچپن تک بچہ کے کھانے کپڑے کی ذمہ داری بھی باپ پر ہے اور باپ نہ ہو تو دادا پر' اور اس کے بعد درجہ بدرجہ ورثہ پر ہے۔

تعلیم و تربیت

ظاہری اور جسمانی نشو ونما کے بعد اولاد کی باطنی وروحانی تربیت کا درجہ ہے قرآن پاک نے ایک مختصر سے مختصر فقرہ میں جو صرف چار لفظوں سے مرکب ہے' اس حق کو ایسے جامع طریقہ سے ادا کر دیا ہے کہ اس کی تفصیل و تشریح میں دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں' فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ نَارًا﴾ (تحریم:۶)

''اے ایمان والو تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ۔''

اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچانا بزرگ خاندان کا فرض ہے' یہ آگ جہنم کی آگ ہے' مگر اس سے مقصود ان تمام برائیوں' خرابیوں اور ہلاکتوں سے ان کی حفاظت ہے' جو بالآخر انسان کو دوزخ کی آگ کا مستحق بنا دیتی ہیں' اس طرح گھر کے سردار پر اولاد کی اخلاقی تربیت' دینی تعلیم اور نگہداشت کا فرض عائد کیا ہے۔

خدا نے ان لوگوں کی تعریف فرمائی جو اپنے بیوی بچوں کے حق میں دعائے خیر کیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بار الہا! تو ان کو ظاہر وباطن کا حسن' صورت وسیرت کی خوبی' اور دین ودنیا کی بھلائی دے کر میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا فرمایا۔

﴿وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ﴾ (فرقان:۷۴)

''اور (جنت کے مستحق وہ بھی ہیں) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو ہماری بیویوں اور ہماری اولادوں کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فرما۔''

مقصود یہ ہے کہ اولاد کو نیک اور سعادتمند بنانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس کی نیکی وسعادتمندی کی دعا بھی مانگتے رہنا چاہیے۔ ایک سورۃ میں خدا ارشاد فرماتا ہے' کہ نیک بندے جس طرح اپنے ماں باپ کے حق میں مغفرت کی دعا مانگتے ہیں اور ان کی خدمت کی توفیق چاہتے ہیں' اسی طرح وہ اپنی اولاد کے حق میں اپنی کوششوں کی کامیابی کی بھی دعا کرتے ہیں:

﴿وَ اَصۡلِحۡ لِیۡ فِیۡ ذُرِّیَّتِیۡ اِنِّیۡ تُبۡتُ اِلَیۡکَ وَ اِنِّیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ﴾ (احقاف:۱۵)

''اور (اے خداوند!) میرے لیے میرے کاموں کو میری اولاد میں صالح بنا میں اپنے گناہوں سے تیری طرف باز آیا، اور میں فرمان برداروں میں سے ہوں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کو ہر طرح صالح اور کارآمد بنانے کی تدبیر اور دعا بھی ایک اچھے باپ کا فرض ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اس باب میں وحیِ الٰہی کے مقصود کو تعلیمِ ربانی پا کر مختلف طریقوں سے واضح فرمایا:

ایک اعرابی اقرع بن حابس دربارِ نبوی ﷺ میں آیا، حضور ﷺ حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پیار کر رہے تھے، اس کو یہ بات ادب اور وقار کے خلاف معلوم ہوئی اس نے کہا کیا آپ ﷺ بچوں کو پیار کرتے ہیں، میرے دس بچے ہیں، میں نے ان میں سے کسی کو پیار نہیں کیا۔ حضور ﷺ نے اس کی طرف نظر اٹھائی، پھر فرمایا ''جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔'' (۱) دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''اگر اللہ تعالیٰ نے تیرے دل سے رحم و شفقت کو نکال لیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔'' (۲) ان دونوں کا منشا یہ ہے کہ بچوں کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آنا چاہیے کہ جو اپنے بچوں پر رحم نہیں کرتا خدا اس پر رحم نہیں کرتا۔

ایک دفعہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک غریب عورت سائل بن کر آئی، اس کے ساتھ اس کی دو کمسن بچیاں بھی تھیں، اس وقت کاشانۂ نبوی ﷺ میں ایک کھجور کے سوا کھانے کو کچھ اور نہ تھا، ام المومنین رضی اللہ عنہا نے وہی ایک کھجور اس کے نذر کر دی۔

ماں کی مامتا نے گوارا نہ کیا کہ وہ کھجور آپ کھا لے اور ان ننھی جانوں کو اس سدِّ رمق سے محروم رکھے، اس نے اس کھجور کے دو آدھے ٹکڑے کر کے دونوں بچیوں کو ایک ایک ٹکڑا دے دیا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو غریب ماں کی محبت کے اس منظر کو دیکھ کر تعجب ہوا۔ آنحضرت ﷺ جب تشریف لائے تو یہ واقعہ عرض کیا، حضور ﷺ نے سن کر فرمایا ''جب کسی کو لڑکیوں کی کوئی مصیبت پیش آئے اور وہ ان کے ساتھ نیکی کرے تو وہ دوزخ کی آگ سے اس کے لیے آڑ بن جائیں گی۔'' نیز یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ''جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ عمرِ تمیز کو پہنچ جائیں تو قیامت کے دن اس کا یہ رتبہ ہوگا کہ وہ اور میں (دو انگلیوں کو جوڑ کر فرمایا) اس طرح ملے ہوں گے۔'' (۳)

اس رتبہ کی بلندی کا کوئی اندازہ ہو سکتا ہے؟ ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ باپ کا اپنے بچہ کو کوئی ادب سکھانا ایک صاع صدقہ سے بہتر ہے، ایک دفعہ فرمایا کہ کوئی باپ اپنے بچہ کو اس سے بہتر کوئی عطیہ نہیں دے سکتا کہ وہ اس کو اچھی تعلیم دے۔ (۴)

---

(۱) (۲) یہ دونوں روایتیں صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الوالدین میں ہیں۔ نیز دیکھو ابوداؤد کتاب الادب باب قبلۃ الرجل ولدہ۔

(۳) صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ باب فضل الاحسان الی البنات۔

(۴) ترمذی کتاب البر والصلہ باب ماجاء فی ادب الولد، سنن ابی داؤد کتاب الادب باب فضل من عال یتیما۔

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لڑکے کو لڑکی پر صرف جنس کے سبب سے ترجیح نہ دے ارشاد ہوا کہ جس کے لڑکی ہو اور وہ اس کو زندہ باقی رہنے دے اور اس کی بے توقیری نہ کرے اور نہ اس پر لڑکے کو ترجیح دے تو خدا اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔ باہم لڑکوں میں بھی چھوٹے اور بڑے کے حقوق کا امتیاز شریعت محمدی ﷺ میں قائم نہیں، اسی لیے دنیا کی اکثر شریعتوں اور قانونوں کے خلاف اسلام میں بڑے اور پہلوٹے کے امتیازی حقوق نہیں، کہ ہر ایک کو ان میں سے اپنے باپ کے ساتھ برابر کی نسبت ہے، یہاں تک کہ اگر لڑکوں میں سے کسی ایک کو بلاوجہ کوئی ایسا عطیہ دیا جائے جو دوسرے کو نہ ملا ہو تو آنحضرت ﷺ نے اس کو ظلم سے تعبیر فرمایا، ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ ایک صحابی نے اپنے لڑکوں میں کسی ایک کو ایک غلام ہبہ کیا، اور چاہا کہ اس پر آنحضرت ﷺ کی شہادت ہو، انہوں نے خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر اپنی خواہش ظاہر کی، دریافت کیا کہ کیا تم نے اپنے سب بچوں کو ایک ایک غلام دیا ہے، عرض کی نہیں، فرمایا تو میں ایسے ظالمانہ عطیہ پر گواہ نہ بنوں گا۔[1] اس سے اس قانون کی جو اسرائیلیوں، رومیوں، ہندوؤں اور دوسری پرانی قوموں میں رائج تھا اور اب بھی ہے کہ صرف بڑا لڑکا جائداد کا مالک بنے، یا اس کو کوئی ترجیحی حق ہو، اصلاح کردی گئی، اور باپ کی نظر میں اس کے تمام لڑکوں کو برابر کا منصب حاصل ہوا، اور چھوٹوں پر ظلم کا جو مسلسل قانونی طریقہ جاری تھا اس کا خاتمہ ہوا۔

حقوقِ زوجین

ماں باپ اور اولاد کے بعد قریب ترین تعلقات کی فہرست میں تیسرا درجہ زن وشو کا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح والدین کے حقوق کی توضیح بوڑھوں کی تسکینِ روحانی کا ذریعہ، اور اولاد کے حقوق کی تفصیل پر ننھے بچوں کی ہستی اور زندگی کا مدار تھا، اسی طرح حقوقِ زوجین کی تشریح پر جوانوں کے بلکہ ہر گھر کے عیش و مسرت کا انحصار ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلام سے پہلے جو اخلاقی مذاہب قائم تھے ان سب میں عورت کو اور عورت و مرد کے ازدواجی تعلق کو بہت حد تک اخلاق و روح کی ترقی و مدارج کے لیے عائق و مانع تسلیم کیا گیا تھا۔ ہندوستان میں بودھ، جین، ویدانت، جوگ اور سادھوپن کے تمام پیرو اسی نظریہ کے پابند تھے، عیسائی مذہب میں تجرد اور عورت سے بے تعلقی ہی کمالِ روحانی کا ذریعہ تھا،[2] اسلام نے آ کر اس نظریہ کو باطل کیا اور بتایا کہ اخلاق اور روح کی تکمیل جس قدر تجرد میں ہو سکتی ہے، اس سے بدرجہا زیادہ تعلق ازدواج میں ممکن ہے کہ اخلاق نام حسنِ معاملہ اور حسنِ سلوک کا ہے، جو کسی کا شوہر نہ ہو، جو کسی کی بیوی نہ ہو، جو کسی کا باپ نہ ہو، جو کسی کی ماں نہ ہو، جو کسی کا بھائی نہ ہو اور نہ کسی کی بہن ہو، نہ کسی سے رشتہ ناتہ رکھے اس پر دنیا کے کیا فرائض عائد ہو سکتے ہیں؟ اور اخلاق کی تکمیل کے لیے اس کو

---

(۱) ابوداؤد کتاب البیوع باب فی الرجل یفضل بعض ولدہ فی النحل۔

(۲) انجیل قرنتیون ۸،۷۔

لون سے فطری موقع مل سکتے ہیں؟ پھر دنیا میں اس عفت و عصمت کی موت جو اخلاقی قالب کی روح ہے اس بُرد کی زندگی میں کتنی یقینی ہے۔ مذہبی تجرد کی پوری اخلاقی تاریخ جو دنیا کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اس دعویٰ کی ری شہادت ہے۔

اسلام نے نکاح کو ہر عمر کے مرد و عورت بلکہ آزاد و غلام ہر ایک کے لیے بہتر بلکہ خیر و برکت کا سبب قرار یا۔ حکم ہوا:

﴿وَ اَنۡکِحُوا الۡاَیَامٰی مِنۡکُمۡ وَ الصّٰلِحِیۡنَ مِنۡ عِبَادِکُمۡ وَ اِمَآئِکُمۡ اِنۡ یَّکُوۡنُوۡا فُقَرَآءَ یُغۡنِہِمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ﴾ (نور:۳۲)

''اور اپنے میں سے بن شوہر کی عورتوں کا (خواہ وہ کنواری ہوں یا بیوہ) اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں میں سے صالحوں کا نکاح کر دیا کرو' اگر وہ غریب ہوں گے تو اللہ ان کو اپنی مہربانی سے غنی کر دے گا اور اللہ گنجائش رکھنے والا اور علم والا ہے۔''

اس آیت پاک کا یہ فقرہ کہ ''اگر وہ غریب و تنگدست ہوں گے تو خدائے تعالیٰ اپنی مہربانی سے ان کو غنی بنا دے گا۔'' یہ معنی رکھتا ہے کہ ازدواجی زندگی خیر و برکت کا ذریعہ ہے' مذہبی حیثیت سے تو اس بنا پر کہ اگر ایک کی تقدیر میں غربت ہوگی تو شاید دوسرے کی تقدیر میں فارغ البالی ہو' تو ایک کے ذریعہ سے دوسرے کو فائدہ پہنچے گا اور دنیاوی لحاظ سے دو سببوں سے' ایک تو یہ کہ ایک کام کرنے والے کے بجائے گھر میں دو کام کرنے والے ہوں گے اور آگے اولاد کے ذریعہ اور کام کرنے والے پیدا ہوں گے' اس فلسفہ کا راز اہلِ دولت نہیں' غریب ہی سمجھ سکتے ہیں خصوصاً مزدور اور کاشت کار۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ جب نکمے سے نکمے آدمی پر بھی بار پڑتا ہے تو وہ ہاتھ پاؤں ہلانے پر تیار ہوتا ہے اس لئے جو بے کاری سے غریب ہے' بیوی کے بوجھ سے مجبور ہوگا کہ وہ کام کہیں سے پیدا کرے خصوصاً اس لیے کہ اس کی محبت اس کو بعض ایسے بڑے بڑے کاموں پر آمادہ کر دے گی جس کے لیے وہ بغیر اس نشہ کے کبھی آمادہ نہ ہوسکتا' آخر میں فرمایا کہ خدا بڑی وسعت والا ہے اس کی گنجائش میں سب کچھ ہے اور پھر علم والا ہے۔' غیب کا علم اسی کو ہے اس لیے اس کا حکم حکمت سے خالی نہیں' پھر اس فرض کو یہاں تک ضروری قرار دیا کہ فرمایا اگر کوئی غریب مسلمان کسی شریف خاتون کا خرچ نہ اٹھا سکتا ہو تو کسی مسلمان باندی ہی سے نکاح کر لے' فرمایا:

﴿وَ مَنۡ لَّمۡ یَسۡتَطِعۡ مِنۡکُمۡ طَوۡلًا اَنۡ یَّنۡکِحَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ فَمِنۡ مَّا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ مِّنۡ فَتَیٰتِکُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ وَ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِاِیۡمَانِکُمۡ بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ﴾ (نساء:۲۵)

''جو تم میں سے اس کی قدرت نہ رکھتا ہو کہ شریف مومن عورتوں سے نکاح کر سکے تو تمہاری ان مومن باندیوں میں سے کسی سے نکاح کرے جو تمہارے قبضہ میں ہوں اور اللہ تعالیٰ تمہارا ایمان زیادہ جانتا ہے تم ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔''

آیت کا آخری ٹکڑا خاص غور کے قابل ہے۔ یہ فرمایا کہ اگر شریف و آزاد بیوی کا خرچ اٹھانے کی صلاحیت

نہ ہو تو کسی با ایمان باندی ہی سے نکاح کر لو۔ اب یہاں سے دو شبہے پیش آتے ہیں ایک یہ کہ کیا نومسلم باندیا پرانے مسلمانوں کے برابر ہو سکتی ہیں؟ تو فرمایا کہ نئے اور پرانے مسلمان ہونے سے کچھ نہیں ہوتا خدا ہی کو معلوم ہے کہ کس کا ایمان زیادہ اچھا اور خدا کے نزدیک قبول ہے۔ دوسرا شبہ یہ تھا کہ یہ نومسلم عورتیں شریف خاندانوں کے ہم رتبہ کیسے ہوں گی تو فرمایا یہ تفریق بھی غلط ہے۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے برابر ہے اور سارے بنی آدم ایک ہی جنس کے افراد ہیں۔

یہ اہتمامِ بیان اس لیے ملحوظ ہوا کہ غریب مسلمان ان وسوسوں میں پڑ کر نکاح سے باز نہ رہیں اس سے اندازہ ہوگا کہ شخصی مسرت کی تکمیل میں کسی رفیقۂ حیات کی رفاقت کو اسلام نے کتنی اہمیت دی ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

اتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی [1]

''میں تو عورتوں سے نکاح کرتا ہوں' تو جس نے میرے طریقہ سے روگردانی کی تو وہ مجھ سے نہیں۔''

اس نکاح کا مقصد صرف ایک فرض کو ادا کرنا نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کو اپنی رفاقت کے لیے اپنے ایک ہم جنس کی تلاش ہوتی ہے اور یہ خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت ہے چنانچہ زن و شوہر کے باہمی اخلاص و محبت کو خدا نے اپنی نشانیوں میں سے ایک قرار دیا ہے' فرمایا:

﴿وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَ جَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ (روم:۲۱)

''اور اس (خدا کی) نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہاری بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان کے پاس سکون پاؤ اور تمہارے آپس میں پیار اور مہر پیدا کر دیا بے شک اس میں سوچنے والوں کے لیے کتنی نشانیاں ہیں۔''

قرآن پاک نے ایک لفظ ''سکون'' سے بیوی کی رفاقت کی جس حقیقت کو ظاہر کیا ہے' وہ اس ازدواجی تعلق کے فلسفہ کے پورے دفتر کو اپنے اندر سمیٹے ہے' اس کا خلوت خانۂ عالم کی کشاکش' دنیا کے حوادث اور مشکلات کے تلاطم میں امن اور سکون اور چین کا گوشہ ہے' اس لیے میاں بیوی کے باہمی تعلقات میں اتنی خوش گواری ہونی چاہیے کہ اس سے اس تعلق کے وہ خاص اغراض جن کے لیے خدا نے اس زن و شوہر کے تعلق کو اپنے عجیب و غریب آثارِ قدرت میں شمار کیا ہے' پورے ہوں' یعنی باہمی اخلاص اور پیار مہر و محبت اور سکون اور چین' اگر کسی نکاح سے قدرت کے یہ اغراض پورے نہ ہوں تو اس میں دونوں کا یا ایک کا قصور ہے۔

میاں بیوی کی باہمی موافقت اور میل جول کو اسلام نے اتنی اہمیت دی ہے کہ ان لوگوں کی سخت برائی کی ہے

(۱) صحیح بخاری و مسلم کتاب النکاح۔

جوزن وشوہر کے باہمی میل جول اور مہر ومحبت میں فرق ڈالیں، فرمایا:

﴿فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ ...... وَمَالَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾ (بقرہ:۱۰۲)

''تو وہ (یہود) ان سے وہ سیکھتے ہیں جس سے شوہر اور اس کی بیوی میں تفرقہ ڈالتے ہیں۔اس کے لیے آخرت کوئی حصہ نہیں ہے۔''

یہ باہمی میل جول کس طرح قائم رہ سکتا ہے؟ اس کی صورت صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ بیوی شوہر کی فرمان برداری اور شوہر بیوی کی دل جوئی کرے، زن وشوہر باہم اپنے اپنے حقوق کے لحاظ سے گو برابر ہیں لیکن مرد کو تھوڑا سا مرتبہ اس لیے زیادہ دیا گیا ہے کہ وہ عورت کی دیکھ بھال اور خبر گیری کرتا ہے۔

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ﴾ (نساء:۳۴)

''مرد عورتوں کے سر دھرے ہیں اس لیے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بزرگی دی ہے اور اس لیے کہ مرد اپنا مال ان پر خرچ کرتے ہیں تو نیک بیبیاں فرمان بردار ہوتی ہیں اور غائبانہ نگہبانی کرتی ہیں کہ خدا نے ان کی حفاظت کی ہے۔''

آیت کے اخیر حصہ کا مطلب ذہن میں آتا ہے کہ نیک بیبیاں شوہر کی غیر حاضری میں اپنی اور شوہر کی عزت وآبرو اور مال کا خیال رکھتی ہیں اور ان کی یہی فطرت اللہ نے بنائی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان میں اپنی عصمت کا خیال اور شوہر کی وفاداری کا فطری جذبہ پیدا کر کے ان کو محفوظ کر دیا ہے اب اگر کسی سے اس کے خلاف ظہور میں آئے تو وہ فعل خلافِ فطرت ہے۔

مرد وعورت کو ایک دوسرے سے ملا کر اللہ تعالیٰ نے دونوں کے جنسی میلان کو ان کی معاشی اور معاشرتی کمی کی تکمیل کا ذریعہ بنایا ہے، اس لیے یہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ایک دوسرے کی پردہ پوشی ایک دوسرے کی زینت، اور ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ہیں، قرآن پاک کی بلاغت دیکھیے کہ اس نے ان سارے مطالب کو صرف ایک تشبیہ میں ادا کر دیا ہے۔

﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ (بقرہ:۱۸۷)

''عورتیں تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔''

اس پوشاک کے پردہ میں جیسا کہ ابھی کہا گیا بیسیوں معنی پوشیدہ ہیں تم ان کے ستر پوش ہو وہ تمہارے لیے، تم ان کی زینت ہو، تمہاری وہ، تم ان کی خوب صورتی ہو، وہ تمہاری، تم ان کی تکمیل کا ذریعہ ہو، وہ تمہاری، یہی نکاح کے اغراض ہیں، اور انہی اغراض کو پورا کرنا حقوقِ زوجین کو ادا کرنا ہے۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد کی تخلیق، اور ان کے باہمی فرائض کی تشریح کی ہے، فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّ نِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا﴾ (نساء:۱)

''اے لوگو! اپنے پروردگار کا لحاظ کرو، جس نے تم کو ایک ذات سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلایا' اس خدا کا جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو' اور رحموں (رشتوں) کا لحاظ رکھو' اللہ تمہاری دیکھ بھال کر رہا ہے۔''

آنحضرت ﷺ ان آیات کو نکاح کے خطبوں میں عموماً پڑھا کرتے تھے ان آیتوں میں انسانیت کے پہلے جوڑے کی پیدائش کا ذکر ہے جس سے کروڑوں مرد اور عورتیں پیدا ہوئے' اور پھر اس واقعہ کو تمہید بنا کر یہ نتیجہ ذہن نشین کرایا ہے کہ تو پھر چاہیے کہ ہم اپنے کاروبار اور معاملات میں اپنے اس خالق حقیقی کا اور ان رحموں (رشتوں) کا لحاظ کریں جو ہماری خلقت کا ذریعہ اور واسطہ ہیں' غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ہر قسم کی قرابتوں اور رشتہ داریوں کی جڑ یہی نکاح ہے' یہ نہ ہوتا تو دنیا کا کوئی رشتہ پیدا نہ ہوتا' اس لیے دنیا کی ہر قرابت اور تعلق کا رشتہ اسی کی بدولت وجود میں آیا ہے اور اس نقطۂ خیال سے بھی نکاح کی اہمیت دنیا میں بہت بڑی ہے کہ اسی سے ساری دنیا کی عزیزانہ مہر و محبت اور الفت و مودت کا آغاز ہوتا ہے۔

نکاح کی اخلاقی غرض یہ ہے کہ مرد و عورت میں صلاح و عفت پیدا ہو۔ قرآن نے نکاح کے سلسلہ میں کہا ہے کہ مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ (المائدۃ: ۵) ''پاکدامنی کے لیے' نہ شہوت رانی کے لیے'' اسی لیے آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ''اے نوجوانوں کے گروہ! تم میں نکاح کی جس کو طاقت ہو وہ نکاح کرے کہ اس سے نگاہیں نیچی رہیں گی اور جس کو اس کی استطاعت نہ ہو وہ روزہ رکھے کہ اس سے شہوت کا زور ٹوٹتا ہے۔'' (ابن ماجہ: نکاح)

نکاح کے ان اغراض کا پورا ہونا اس پر موقوف ہے کہ دونوں میں صلح اور یکجہتی کا رجحان نمایاں رہے اور ہر موقع پر جہاں تعلقات کے شیشہ کو ٹھیس لگنے کا ڈر ہو' باہم صلح کے لیے آمادہ رہنا چاہیے اور اصلاح حال کے لیے دونوں کو برابر کوشش کرنی چاہیے' اس لیے زوجین میں مناقشہ پیش آنے کی صورت میں بھی اصلاح حال کی بار بار تاکید کی گئی ہے فرمایا: اِنْ اَرَادُوْا اِصْلَاحًا (بقرہ: ۲۳۰) ''اگر یہ شوہر اصلاح چاہیں'' وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَ تَتَّقُوْا (النساء: ۱۲۹) ''اگر اصلاح کرو اور تقویٰ کرو'' کہیں اسی اصلاح کا نام اللہ کی حدود کو قائم کرنا کہا گیا ہے۔

اَنْ یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ (بقر: ۲۳۰) ''یہ کہ میاں بیوی دونوں اللہ کی حدود کو قائم رکھیں گے۔''

جاہلیت میں دستور تھا کہ مرد قسم کھا لیتے تھے کہ اپنی بیویوں کے ساتھ حسن سلوک اور نیک برتاؤ نہیں کریں گے اور جب انہیں کوئی سمجھاتا تو کہتے کہ ہم تو قسم کھا چکے ہیں ہم مجبور ہیں' محمد رسول اللہ ﷺ نے وحی کی زبان مبارک سے ایسے لوگوں کو منع فرمایا۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَ تَتَّقُوْا وَ تُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (البقرۃ:۲۲۴)

''اور خدا کو اپنی قسموں کا ہتھکنڈا نہ بناؤ' کہ سلوک نہ کرو اور تقویٰ اور لوگوں کے درمیان صلح جوئی نہ اختیار کرو اور اللہ جانتا اور سنتا ہے۔''

اس آیت میں اس کے بعد عورتوں سے قسم کھا کر علیحدگی اختیار کر لینے اور طلاق دینے کا ذکر ہے' اس سے معلوم ہوا کہ ان نصیحتوں کا زیادہ تر تعلق زن وشو کے معاملے سے ہے' اور یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت کے ساتھ حسن سلوک (بر) پرہیزگاری کا برتاؤ (تقویٰ) اور صلح جوئی اور درستی کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

نیک بیویوں کے اوصاف قرآن پاک نے یہ بتائے ہیں:

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ (النساء:۳۴)

''تو نیک بیویاں شوہروں کی فرمانبردار ہوتی ہیں اور شوہر کی پیٹھ پیچھے شوہر کے مال و دولت اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتی ہیں۔''

گویا عورت کے فرائض یہ ہیں کہ وہ اپنے مردوں کی فرمانبردار رہیں ان کے مال و دولت اور ملکیت کی حفاظت ان کے سپرد ہے' پوری نگرانی رکھیں اور ان کی عزت اور آبرو کی جو خود ان کی عزت و آبرو ہے' شوہر کی غیر حاضری میں بھی حفاظت کریں' مختصر لفظوں میں عورت کے سہ گانہ فرائض' اطاعت' سلیقہ مندی اور عصمت و عفت ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''تقویٰ کے بعد صالح عورت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں' کہ شوہر کو جو کہے وہ مانے شوہر جب اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے اور اگر شوہر اس کو قسم دے کر کچھ کہے تو وہ اس کی قسم پوری کر دے اور شوہر گھر پر نہ ہو تو آپ کی اور اس کے مال کی پوری حفاظت کرے۔'' (ابن ماجہ نکاح)

زن و شوہر کے باہمی حقوق کی تشریح آنحضرت ﷺ نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں ان الفاظ میں فرمائی' لوگو! عورتوں کے حق میں میری نیکی کی وصیت کو مانو کہ یہ تمہارے ہاتھوں میں قید ہیں' تم سوائے اس کے کسی اور بات کا حق نہیں رکھتے' لیکن یہ کہ وہ کھلی بے حیائی کا کام کریں' اگر ایسا کریں تو ان کو خوابگاہ میں علیحدہ کر دو اور ان کو ہلکی مار مارو تو اگر وہ تمہاری بات مانیں تو پھر ان پر الزام لگانے کے پہلو نہ ڈھونڈو' بے شک تمہارا عورتوں پر' اور عورتوں کا تم پر حق ہے' تمہارا حق عورتوں پر یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر کو دوسروں سے پامال نہ کرائیں جن کو تم پسند نہیں کرتے اور نہ تمہارے گھروں میں ان کو آنے کی اجازت دیں' جن کا آنا تم کو پسند نہیں' اور ہاں ان کا حق تم پر یہ ہے کہ ان کے پہنانے اور کھلانے میں نیکی کرو۔ (ابن ماجہ نکاح)

ایک اور موقع پر ایک شخص نے آکر دریافت کیا یا رسول اللہ! بیوی کا حق شوہر پر کیا ہے' فرمایا' جب خود کھائے تو اس کو کھلائے' جب خود پہنے تو اس کو پہنائے' نہ اس کے منہ پر تھپڑ مارے' نہ اس کو برا بھلا کہے' اور نہ گھر کے

علاوہ اس کی سزا کے لیے اس کو علیحدہ کرے۔ (ابن ماجہ ایضاً)

دوسری طرف آپ نے عورتوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے شوہروں کی پوری اطاعت کریں، یہاں تک فرمایا کہ ''اگر خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنے کا میں کسی کو حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔'' آپ نے یہ طریقۂ تعبیر شوہر کی اطاعت کی اہمیت کے لیے اختیار فرمایا ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ اسلام میں خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ جائز نہیں۔

ایک مشہور حدیث میں آپ نے فرمایا:

خیر کم خیر کم لاھلہ (ترمذی، دارمی و ابن ماجہ)

''تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیویوں کے لیے سب سے بہتر ہے۔''

خیار کم خیار کم لنسائھم (ترمذی)

''تم میں سب سے بہتر وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے لیے بہترین ہیں۔''

انسان کے بہتر اور خوب ہونے کی یہ ایک پہچان بتادی گئی ہے کہ اس آئینہ میں ہر شخص اپنا چہرہ آپ دیکھ سکتا ہے، جو اپنوں کے ساتھ انصاف اور احسان نہیں کرسکتا وہ دوسروں سے کیا کرسکتا ہے، کیونکہ نیکی گھر سے شروع ہونی چاہیے۔

ایک صحابی بڑے عابد و زاہد تھے، لیکن وہ اپنی بیوی کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کا یہ حال سنا تو ان کو بلوا کر فرمایا:

﴿وَ لِزَوْجِکَ عَلَیْکَ حَقًّا﴾ (بخاری کتاب النکاح)

''اور تیری بیوی کا تجھ پر حق ہے۔''

اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانہ میں بیویوں کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی، وہ ہر وقت معمولی معمولی قصوروں پر ماری پیٹی جاسکتی تھیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے اپنی بیوی کو ڈانٹا تو اس نے بھی برابر کا جواب دیا، پھر وہ کہتے ہیں کہ ''ہم لوگ اسلام سے پہلے عورتوں کو کسی شمار و قطار میں نہیں سمجھتے تھے اسلام آیا تو اس نے ان کے بارہ میں احکام اتارے اور ان کے حق مقرر کیے۔

اسلام نے ان کی قدر و منزلت کو یہاں تک بڑھایا کہ ان کو قانوناً مردوں کے دوش بدوش کھڑا کردیا اور آپس کے قانونی حقوق میں ان کو برابر کا درجہ عطا کیا، البتہ اخلاقاً رتبہ میں مردوں کو تھوڑی سی اعزازی برتری دی گئی۔ ارشاد ہوا کہ

﴿وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَ لِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ (بقرہ: ۲۲۸)

''اور عورتوں کا حق دستور کے مطابق مردوں پر ویسا ہی ہے جیسا مردوں کا عورتوں پر اور مردوں کو ان پر ایک منزلت حاصل ہے۔''

لیکن یہ منزلت بھی ان کو بے وجہ نہیں دی گئی ہے' یہ اس لیے ہے تا کہ وہ عورتوں کی نگرانی اور نگہبانی کا فرض انجام دے سکیں' یعنی گویا اپنی گھریلو عدالت کے اعزازی صدر بنائے گئے ہیں' یہ نکتہ اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ اوپر کی آیت میاں بیوی کے خانگی جھگڑوں کو دور کرنے کے سلسلہ میں ہے' گھر کے روزمرہ کے مناقشوں کا فیصلہ اسی طرح ہوسکتا ہے کہ دونوں کے قانونی حقوق یکساں ماننے کے ساتھ شوہر کو اعزازی فوقیت کا مرتبہ دیا جائے تا کہ وہ اپنے گھر کے نظام کو اچھی طرح چلا سکے۔

اس اعزازی منصب کے لیے شوہر کا انتخاب بھی بے وجہ نہیں قرآن پاک نے اس کی مصلحتیں بھی بتا دی ہیں۔فرمایا:

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّ بِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ﴾ (نساء:۳۴)

''مرد عورتوں کے نگران ہیں' اس سبب سے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے اور اس لیے کہ انہوں نے اپنا مال خرچ کیا۔''

یعنی مردوں کی اس اعزازی ترجیح کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطری طور سے مردوں کو عورتوں پر جسم وطاقت اور عقل وفراست وغیرہ میں جسمانی وذہنی فوقیت اور بڑائی عطا کی ہے۔طبی تحقیقات' انسانیت کی پوری تاریخ اور روزانہ کے مشاہدے دم بدم اس کی تائید میں ہیں' اس لیے اسی کو اس صدارت کا حق فطرۃً ملنا چاہیے' دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام نے دین مہر' نان ونفقہ اور پرورشِ اولاد وغیر خانگی معاملات کی ہر قسم کی مالی ذمہ داری مرد پر عائد کی ہے اور وہی اس بوجھ کو اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے ہے اس لیے انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کو اپنے گھر کا حاکم اور صدر نشین بنایا جائے' تا کہ گھر کا نظام درست اور آپس میں تعلقات کی خوش گواری قائم رہے۔

اکثر عورتوں میں ضد اور ہٹ ہوتی ہے' جو شاید ان کی فطری کمزوری یا عدم تربیت کا نتیجہ ہو' بعض مرد یہ چاہتے ہیں کہ ان کی ضد اور ہٹ کے مقابلہ میں سختی اور درشتی سے کام لے کر ان کی یہ ٹیڑھ نکال دیں آپ ﷺ نے ان کو ایک نہایت عمدہ تشبیہ دے کر نصیحت فرمائی کہ ''عورتوں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو کہ ان کی پیدائش پسلی سے ہوئی جس سے اس کے اسی ٹیڑھے پن کے ساتھ تم کام لے سکو تو لے سکتے ہو' اگر اس کو سیدھی کرنے کی فکر کرو تو تم اس کو توڑ ڈالو گے۔'' (۱) آپ ﷺ نے مردوں کو بیویوں کے معاملہ میں خوش اور قانع وراضی رہنے کا ایک نہایت عمدہ نسخہ بتایا فرمایا ''اپنی بیوی میں کوئی برائی دیکھ کر اس سے نفرت نہ کرو کہ غور کرو گے تو اس میں کوئی دوسری اچھی بات نکل آئے گی۔'' (۲) یہ نصیحت حقیقت میں قرآن پاک کی اس آیت کی تعمیل ہے۔

﴿وَ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤی اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّ یَجْعَلَ اللّٰهُ فِیْهِ

(۱) صحیح بخاری ومسلم نکاح۔

(۲) صحیح بخاری مسلم کتاب النکاح باب الوصیۃ بالنسا۔

خیرا کثیرا۞ (نساء:۱۹)

''اور بیویوں کے ساتھ معقول طریقہ سے گزران کرو اگر تم کو وہ نہ بھائیں تو ممکن ہے کہ تم کو ایک چیز پسند نہ آئے اور خدا نے اس میں بہت خوبی رکھی ہے۔''

اسلام نے انسانی زندگی کی مشغولیتوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے، خانگی اور اندرونی خانگی مشغولیتوں کی ذمہ داری عورت پر، اور بیرونی مشغولیتوں کا بارِ گراں مرد کے کندھوں پر رکھا ہے، اور اس طرح انسانی زندگی کے اندرونی کاموں کی عظیم الشان عمارت کو ایک دوسرے کے تعاون، موالات اور یکجہتی کے ستونوں پر قائم کیا ہے اپنے لیے خود روزی کمانا اور سرمایہ بہم پہنچانا عورت کا نہیں، بلکہ مرد کا فرض قرار دیا ہے اور مرد پر واجب کیا ہے کہ وہ عورت کے نان ونفقہ، اور ضروریات کا کفیل ہو اگر وہ ادا نہ کرے تو حکومتِ وقت کے ذریعہ عورت کو اس کی وصولی کا حق حاصل ہے۔ اور اگر اس پر بھی مرد نہ دے تو بیوی کو اس سے علیحدگی کے دعویٰ کا اختیار حاصل ہے۔ (۱) انتہا یہ ہے کہ خاص خاص حالات میں عورت چاہے تو مرد سے اس کے بچہ کو دودھ پلانے کا معاوضہ بھی لے سکتی ہے جس کی تفصیلات قرآن میں مذکور ہیں۔

اگر کوئی مرد بخالت سے اپنی بیوی اور اولاد کی جائز ضرورتوں کے لیے اپنی حیثیت سے کم دے تو عورت کو حق ہے کہ وہ شوہر کی لاعلمی میں اس کی دولت سے اس کی حیثیت کے مطابق بقدرِ ضرورت لے لیا کرے۔ فتح مکہ کے دن ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے آنحضرت ﷺ کی خدمتِ اقدس میں آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ ابوسفیان بخیل آدمی ہیں، وہ مجھے میری اور میرے بچوں کی ضرورت سے کم دیا کرتے ہیں لیکن یہ کہ میں ان کے مال میں سے ان کی لاعلمی میں کچھ لے لوں فرمایا تم قاعدہ کے مطابق اتنا لے سکتی ہو جو تم کو اور تمہارے بچوں کو کافی ہو۔ (۲)

ایک مشہور حدیث ہے جس میں مرد اور عورت کے باہمی حقوق کی ذمہ داری چند ایسے مختصر لفظوں میں ظاہر کی گئی ہے، جن کی تفصیل ایک دفتر میں سما سکتی ہے، فرمایا تم میں سے ہر ایک اپنی رعایا کا نگہبان ہے اور تم میں سے اس کی نسبت ہر ایک سے باز پرس ہوگی، مرد اپنی بیوی بچوں کا رکھوالا ہے اس سے اس کی پوچھ ہوگی اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگران ہے، اس سے اس کی پوچھ ہوگی۔'' (بخاری اول صفحہ ۷۷۹ باب ﴿قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَ اَھْلِیْکُمْ﴾ نبوت کے ان دو معجزانہ فقروں میں کیا کچھ نہیں کہہ دیا گیا۔

مرد کو کس عورت کے مارنے کا اختیار دیا گیا ہے

قرآن پاک میں ایک آیت ہے جس میں مرد کو اختیار ہے کہ بعض حالتوں میں وہ عورت کو مار پیٹ بھی سکتا

(۱) اس اختیار کی تشریح میں فقہا مختلف ہیں تفصیلات کے لیے فقہ کی کتابوں میں کتاب النفقہ دیکھنا چاہیے نیز دیکھو نیل الاوطار شوکانی جلد ۶ ۲۶۳ مصر۔

(۲) صحیح بخاری باب اذا لم ینفق الرجل صفحہ ۸۰۸۔

ہے، وہ آیت یہ ہے:

﴿وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا﴾ (نساء:۳۴)

''اور جن بیویوں کے نشوز کا تم کو ڈر ہو تو ان کو سمجھاؤ اور خواب گاہوں میں ان سے علیحدگی برتو، اور ان کو مارو، تو اگر وہ تمہارا کہنا مان لیں، تو پھر ان پر راہ مت تلاش کرو۔''

لغت میں ''نشوز'' کے معنی ''اٹھ جانے'' کے ہیں اور عورت کے حق میں اس کے اصطلاحی معنی جو ہیں وہ مفسر ابن جریر کے الفاظ میں حسب ذیل ہیں۔

و معنی ذلک اِذَا رَأَيْتُمْ مِنْهُنَّ مَا تَخَافُوْنَ اَنْ يَنْشِزْنَ عَلَيْكُمْ مِنْ نَظْرٍ اِلَى مَا لَا يَنْبَغِی لَهُنَّ اَنْ يَنْظُرْنَ اِلَيْهِ وَ يَدْخُلْنَ وَ يَخْرُجْنَ وَ اسْتَرَبْتُمْ [1] بِاَمْرِهِنَّ۔ (تفسیر طبری ۵، ۳۸ مصر)

''اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تم ان عورتوں کی وہ حالت دیکھو جس سے تم کو ان کے ''نشوز'' کا ڈر ہو، یعنی ادھر دیکھنا جدھر انہیں دیکھنا نہیں چاہیے، اور وہ آئیں اور نکل جائیں اور تم کو ان کی بابت شک ہو جائے۔''

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ كَعْبَ الْقَرْظِيِّ اِذَا رَاَى الرَّجُلُ تَفْصِيْرَهَا فِی حَقِّهٖ فِی مُدْخِلِهَا وَ مَخْرِجِهَا قَالَ يَقُوْلَ لَهَا بِلِسَانِهٖ قَدْ رَاَيْتُكِ مِنْكِ كَذَ اَوْ كَذَا فَانْتَهِی۔ (ایضاً)

''محمد بن کعب قرظی سے ہے کہ جب مرد دیکھے کہ عورت (گھر سے) باہر آنے جانے میں اس کے حق میں قصور کر رہی ہے تو اس سے زبان سے کہے کہ میں نے تجھ سے یہ حرکت دیکھی یہ دیکھی تو اب باز آجا۔''

فقہ کی کتابوں میں ہے۔

الناشزة هی الخارجة عن منزل زوجها المانعة نفسها منه. (عالم گیری: نفقات)

''نشوز والی عورت وہ ہے جو اپنے شوہر کے گھر سے باہر نکل جائے اور اپنے آپ کو اس کے سپرد نہ ہونے دے۔''

غرض یہ کہ ناشزہ عورت وہ ہے جس میں بداخلاقی کی بعض مشتبہ علامتیں پائی جائیں، کچھ مفسروں نے اس کو اور وسعت دی ہے، اور بتایا ہے کہ ناشزہ وہ عورت ہے جو اپنے شوہر پر بلندی چاہے اس کا حکم نہ مانے اس سے بے رخی کرے اور اس سے بغض رکھے۔ (تفسیر ابن کثیر)

میرے خیال میں یہ دونوں تفسیریں درست ہیں، اور درحقیقت پوری آیت پڑھنے سے نشوز کے معنی آپ کھل جاتے ہیں، آیت مذکور پوری یہ ہے۔

---

(۱) اصل متن تفسیر میں واستبریتم غلط چھپا ہے۔

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا﴾ (نساء:۳۴)

''مرد عورتوں کے نگران ہیں (ایک) اس لیے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے اور (دوسرے) اس لیے کہ مرد اپنا مال (ان پر) خرچ کرتے ہیں، تو نیک بیویاں فرمان بردار ہوتی ہیں، اور (شوہر کے) پیٹھ پیچھے (شوہر کے گھربار اور عزت وآبرو کی) حفاظت کرتی ہیں، کہ اللہ نے ان کی (یعنی عورتوں کی) حفاظت کی ہے اور جن کے نشوز کا تم کو ڈر ہو تو ان کو سمجھاؤ، اور ان کو خواب گاہوں میں علیحدہ کردو اور ان کو مارو، تو اگر وہ تمہارا کہنا مان لیں تو پھر ان پر راستہ تلاش نہ کرو۔''

اس آیت پاک میں مرد کی ترجیح کی جو باتیں بیان کی ہیں، ان کے نتیجہ پر یہ فرمایا ہے کہ نیک بیویاں وہ ہیں جو اپنے شوہروں کی فرمانبردار ہیں اور ان کے پیٹھ پیچھے ان کے گھربار اور عزت اور آبرو کی حفاظت کرتی ہیں، اس کے بعد ہے کہ اب جس عورت سے تمہیں نشوز کا ڈر ہو تو اس کو پہلے سمجھاؤ، نہ مانے تو خلوت میں اس سے کنارہ کرو یا اس سے بات کرنا چھوڑ دو، اس پر بھی نہ مانے تو اس کو ذرا مارو، اب بھی اگر کہا مان لے تو پھر اس کو ستانے یا طلاق وغیرہ دینے کے لیے حیلہ اور بہانہ مت ڈھونڈو۔

اب جب اوپر میں بتا چکا کہ مردوں کو عورتوں کی نگرانی اور دیکھ بھال کا حق حاصل ہے، پھر یہ بھی کہا جا چکا کہ نیک بیویاں وہ ہیں جو شوہروں کی فرمان بردار ہیں اور شوہروں کے پیچھے ان کے گھربار، مال ودولت اور عزت وآبرو کی حفاظت کرتی ہیں اور اس کے بعد یہ ہے کہ اگر تمہیں عورت کے نشوز کا ڈر ہو تو یہ کرو، اس سے معلوم ہوا کہ عورت کا نشوز یہ ہے کہ اس کے جو دو فرض پہلے بتائے گئے ہیں یعنی شوہر کی فرمان برداری اور شوہر کے پیچھے اس کے گھربار، اور عزت وآبرو کی حفاظت جو عورت ان دونوں کو یا دونوں میں سے کسی ایک فرض کو بھی ادا نہیں کرتی وہی ناشزہ ہے اور ایسی ہی عورت کی تنبیہ کی اجازت دی گئی ہے۔

''شوہر کی عزت وآبرو کی حفاظت'' کے الفاظ سے جس طرف اشارہ ہے اس کی تصریح احادیث میں موجود ہے آپ ﷺ نے فرمایا ''سب سے بہتر عورت وہ ہے کہ جب مرد اس کو دیکھے تو خوش ہو جائے، اور جب حکم دے تو مان لے، اور جب شوہر گھر پر موجود نہ ہو تو اپنی جان اور اس کے مال کی حفاظت کرے۔'' اپنی جان کی حفاظت سے مقصود عفت وعصمت ہے۔[1]

حجۃ الوداع کے خطبہ میں عورتوں کے حقوق کی نسبت آنحضرت ﷺ کے جو فقرے ہیں ان میں نشوز کے معنی کی پوری تصریح ہے، صحیح مسلم میں ہے۔

---

(۱) اس آیت کی یہ تفسیر قرآن پاک کے ارشادات اور احادیث کی تصریحات سے معلوم ہوتی ہے۔

((وَ اتَّقُوا اللّٰهَ فِي النِّسَاءِ فَاِنَّهُنَّ عِنْدَكُمْ عَوَانٍ وَ لَكُمْ عَلَيْهِنَّ اَنْ لَا يُوْطِئْنَ فُرُشَكُمْ اَحَدًا تَكْرَهُوْنَهُ فَاِنْ فَعَلْنَ فَاضْرِبُوْهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ)) (مسلم)

''عورتوں کے بارہ میں خدا سے ڈرو کہ وہ تمہارے بس میں ہیں۔ تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ تمہارے بستر کو کسی سے نہ رندوائیں جس کو تم ناپسند کرتے ہو، اگر وہ ایسا کریں تو ان کو اتنا مارو جو تکلیف دہ نہ ہو۔''

ابن ماجہ میں یہ الفاظ ہیں۔

﴿اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا فَاِنَّهُنَّ عِنْدَكُمْ عَوَانٍ لَيْسَ تَمْلِكُوْنَ مِنْهُنَّ شَيْئًا غَيْرَ ذٰلِكَ اِلَّا اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ فَاِنْ فَعَلْنَ فَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَ اضْرِبُوْهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا﴾ (کتاب النکاح)

''عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کے بارہ میں میری وصیت کو قبول کرو، وہ تمہارے قبضہ میں ہیں تم کو اس کے سوا ان پر کوئی اختیار نہیں، مگر یہ کہ کوئی کھلی بے حیائی کا کام کریں اور اگر ایسا کریں تو ان کو خواب گاہوں میں علیحدہ کر دو اور ان کو اتنا ہی مارو جو تکلیف دہ نہ ہو، تو اگر وہ تمہارا کہا مان لیں ان پر کوئی راستہ نہ ڈھونڈو۔''

شوہر کے بستر کو روندوانے کا کنایہ اس طرف ہے، کہ ایسے لوگ اس کے گھر میں آنے جانے نہ پائیں جن کا آنا جانا شوہر کو ناگوار یا مشکوک معلوم ہو اور ''کھلی بے حیائی'' سے جدھر اشارہ ہے وہ چھپا نہیں، لیکن بعض نے اس میں بھی توسیع کی ہے، یعنی عورت کی نافرمانی اور بدزبانی اور مشتبہ چال چلن سب کو فاحشہ کی تفسیر میں داخل کیا ہے (تفسیر سورۂ نساء رکوع:۲)

الغرض آخری درجہ پر عورت کی تنبیہ کی یہ اجازت خاص حالات میں ہے اور شرع کی تصریح ہے کہ یہ ﴿ضرب غیر مبرح﴾ یعنی ایسی مار ہو جس سے عورت کے کسی عضو کو نقصان نہ پہنچے بلکہ یہاں تک تصریح ہے کہ اس سے مقصود مسواک وغیرہ سے مارنا ہے[1] (تفسیر طبری جلد ۵ ص ۴۱ مصر) جس سے تنبیہ کے سوا کوئی چوٹ نہیں آتی۔ ورنہ عورتوں کو عام طور سے یوں مارنا اسلامی تہذیب کے خلاف ہے۔ یہ زمانۂ جاہلیت کا دستور تھا، جس کی اسلام نے اصلاح کی ہے، ایاس بن عبداللہ کہتے ہیں آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ حکم دیا کہ خدا کی بندیوں (اپنی بیویوں) کو مارا نہ کرو۔ تو حضرت عمرؓ نے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! بیویاں اپنے شوہروں پر دلیر ہوگئیں تو آپ ﷺ نے مارنے کی رخصت عطا کی، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی عورتیں اہل بیت نبوی ﷺ کے سامنے اپنے شوہروں کی شکایتیں لے کر آئیں، یہ دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''آل محمد (ﷺ) کے گرد بہت سی عورتیں چکر کاٹتی رہیں جو اپنے شوہروں کی شکایتیں لے کر آئی تھیں، یہ (یعنی بیویوں سے ایسی بدسلوکی کرنے والے) تم میں سے اچھے

(۱) یہ پیش نظر رہے کہ یہ خانگی سزا مشکوک و مشتبہ حالات میں عورت کی اصلاح کے لیے ہے ورنہ ثبوت کی صورت میں اس جرم کی سزا سنگساری یا تازیانہ ہے، جس کا اجرا قاضی کا فرض ہے۔

لوگ نہیں۔'' (ابوداؤد وابن ماجہ ودارمی)

ایک صحابیہؓ نے اپنے نکاح کے متعلق آپ ﷺ سے مشورہ لیا اور ایک شخص کے پیغام کا ذکر کیا' آپ ﷺ نے فرمایا ''وہ اپنا ڈنڈا اپنے کندھے سے نیچے نہیں اتارتا۔'' (۱) یعنی وہ مار پیٹ کیا کرتا ہے اور ذرا ذرا سی بات پر خفا ہوتا رہتا ہے' اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے اس کے اس فعل کو ناپسند فرمایا۔

ایک صحابیؓ نے آ کر شکایت کی کہ یا رسول اللہ! میری بیوی بدزبان ہے' فرمایا طلاق دے دو' عرض کی اس سے میری اولاد ہے اور مدت سے میرے ساتھ ہے فرمایا تو اس کو سمجھایا کرو' اس میں صلاحیت ہوگی تو قبول کرے گی لیکن اپنی بیوی کو لونڈی کی طرح مارا نہ کرو۔'' (۲) ایک دوسرے موقع پر فرمایا ''کوئی اپنی بیوی کو غلام کی طرح کوڑے نہ مارا کرے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ ایک وقت کوڑے مارے اور دوسرے وقت اس سے ہم بستر ہو۔'' (۳)

❀❀❀

(۱) صحیح مسلم المطلقۃ ثلثا ۱۲۔

(۲) مشکوۃ کتاب النکاح باب عشرۃ النساء بحوالہ ابوداؤد۔

(۳) مشکوۃ کتاب النکاح باب عشرۃ النساء بحوالہ صحیح بخاری ومسلم۔

اہلِ قرابت کے حقوق

ماں باپ، اولاد اور زن وشوہر کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے اہلِ قرابت کا حق ہے۔ عربوں کے محاورہ میں اس کا نام صلۂ رحم ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی اخلاقی تعلیم میں صلۂ رحم اور حقوقِ قرابت کی اہمیت دنیا کے تمام مذاہب سے زیادہ ہے یہی سبب ہے کہ وحیِ محمدی ﷺ میں اس کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے۔ قرآن پاک میں کم از کم بارہ آیتوں میں اس کی صریح تاکید ہے۔ اور اس کو انسان کا احسان نہیں بلکہ اس کا فرض اور حق بتایا ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿فَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰی حَقَّهٗ﴾ (روم:۳۸)

''تو قرابت دار کو حق ادا کرو۔''

﴿وَ اٰتِ ذَاالْقُرْبٰی حَقَّهٗ﴾ (بنی اسرائیل:۲۶)

''اور قرابت والے کو اس کا حق ادا کرو۔''

دوسری جگہ تصریح فرمائی ہے کہ مال و دولت کی محبت اور ذاتی ضروریات اور خواہش کے باوجود صرف خدا کی مرضی کے لیے خود تکلیف اٹھا کر اپنے قرابت مندوں کی امداد اور حاجت روائی اصلی نیکی ہے۔

﴿وَ اٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی﴾ (بقرہ:۱۷۷)

''اور اصل نیکی اس کی ہے جس نے اپنے مال کو اس کی محبت پر قرابت مندوں کو دیا۔''

والدین کے بعد اہلِ قرابت ہی ہماری مالی امداد کے مستحق ہیں، فرمایا:

﴿قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ﴾ (بقرہ:۲۱۵)

''فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو۔ تو وہ ماں باپ اور رشتہ داروں کے لیے۔''

ماں باپ کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک خدائے تعالیٰ کے ان خاص احکام میں ہے جن کا انسان سے عہد لیا گیا۔

﴿وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِی الْقُرْبٰی﴾ (بقرہ:۸۳)

(''اور بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا کہ خدا ہی کو پوجنا) اور ماں باپ اور رشتہ داروں کے ساتھ نیکی کرنا۔''

سورۂ نحل میں اہل قرابت کی امداد کو عدل اور احسان کے بعد اپنا تیسرا خاص حکم بتایا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی﴾ (نحل:۹۰)

''بے شک اللہ انصاف اور حسن سلوک اور قرابت دار کو دینے کا حکم کرتا ہے۔''

ایک مسلمان کی دولت کے بہترین مستحق والدین کے بعد اس کے قرابت والے ہیں۔ فرمایا:

﴿قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَ الْاَقْرَبِیْنَ وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسَاکِیْنَ﴾ (بقرہ:۲۱۵)

''کہہ دے اے پیغمبر کہ فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو تو وہ اپنے ماں باپ اور قرابت والوں، یتیموں اور غریبوں کے لیے۔''

اگر کسی قرابت مند سے کوئی قصور ہو جائے تو اہلِ دولت کو زیبا نہیں کہ وہ اس کی سزا میں اپنی امداد کا ہاتھ اس سے روک لیں، ارشاد ہوا:

﴿وَلَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْکُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ یُّؤْتُوْا اُولِی الْقُرْبٰی وَالْمَسٰکِیْنَ﴾ (نور:۲۲)

''اور جو لوگ تم میں بڑائی اور کشائش والے ہوں قرابت مندوں اور محتاجوں کے نہ دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں۔''

خدا کی خالص عبادت اور توحید اور ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کے بعد تیسری چیز اہلِ قرابت کے ساتھ نیکی ہے، فرمایا:

﴿وَ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِهٖ شَیْئًا وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِی الْقُرْبٰی﴾ (نساء:۳۶)

''اور اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اس کا ساجھی نہ بناؤ اور ماں باپ اور قرابت والے کے ساتھ نیکی کرنا۔''

حقِ قرابت کو اسلام میں وہ اہمیت حاصل ہے کہ داعیِ اسلام علیہ السلام اپنی ان تمام محنتوں، زحمتوں، تکلیفوں اور مصیبتوں کا جو تبلیغ اور دعوتِ حق میں ان کو پیش آئیں اور اپنے اس احسان و کرم کا جو ہدایت، تعلیم اور اصلاح کے ذریعہ ہم پر فرمایا بدل، معاوضہ اور مزدوری اپنی امت سے یہ طلب فرماتے ہیں کہ رشتہ داروں اور قرابت مندوں کا حق ادا کرو اور ان سے لطف و محبت سے پیش آؤ، فرمایا:

﴿قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی﴾ (شوریٰ:۲۳)

''کہہ اے پیغمبر! کہ میں تم سے اس پر بجز اس کے کوئی مزدوری نہیں مانگتا کہ ناتے میں محبت اور پیار کرو۔''

عربی زبان میں قرابت کا حق ادا کرنے کو وصلِ رحم (رحم ملانا) کہتے ہیں۔ اسی لفظ کی دوسری معروف شکل قطعِ رحم (رحم کاٹنا) کہتے ہیں کہ رحمِ مادری ہی تعلقاتِ قرابت کی جڑ ہے۔ کسی امر میں دو انسانوں کا اشتراک ان کے باہمی تعلقات اور حقوقِ محبت و اعانت کی اصلی گرہ ہے۔ یہ اشتراک کہیں ہم عمری، کہیں ہم درسی، کہیں ہمسائگی، کہیں ہم مذاقی، کہیں ہم پیشگی، کہیں ہم وطنی، کہیں ہم قومی کی مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے، اس اشتراک کے

عقدِ محبت کو استوار اور مضبوط رکھنے کے لیے جانبین پر حقوق کی نگہداشت اور فرائضِ محبت کی ادائیگی واجب ہے۔ لیکن ان تمام بندھنوں کے ٹوٹ جانے والے اشتراکوں سے بڑھ کر وہ اشتراک ہے جس کا موطن رحمِ مادر ہے۔ یہ ہم رحمی خالقِ فطرت کی باندھی ہوئی گرہ ہے۔ اور جس کا توڑنا انسان کی قوت سے باہر ہے۔ اس لیے اس کے حقوق کی نگہداشت بھی انسانوں پر سب سے زیادہ ضروری ہے۔ ان لوگوں کو جو محبت کی اس فطری گرہ کو توڑنے کی کوشش کریں۔ وحیِ محمدی ﷺ نے فاسق کا خطاب دیا ہے اور ان کو ضلالت کا مستحق ٹھہرایا ہے۔

﴿وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفَاسِقِيْنَ ○ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ﴾ (بقرہ:۲۶۔۲۷)

''اس سے وہ انہی کو گمراہ کرتا ہے جو حکم نہیں مانتے جو خدا کا عہد باندھ کر توڑتے ہیں۔ اور خدا نے جس کے جوڑنے کو کہا' اس کو کاٹتے ہیں۔''

ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے انسانوں کی اسی فطری گرہ کی تشریح استعارہ کے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ رحم (شکمِ مادر کا نام) رحمان (اللہ) سے مشتق ہے۔ اس لیے محبت والے خدا نے رحم کو خطاب کر کے فرمایا ''جس نے تجھ کو ملایا اس کو میں نے ملایا۔ جس نے تجھ کو کاٹا اس کو میں نے کاٹا۔''[1] اس مفہوم کو استعارہ کے اور گہرے رنگ میں آنحضرت ﷺ نے یوں ادا فرمایا کہ ''رحمِ انسانی عرشِ الٰہی کو پکڑ کر کہتا ہے۔ جو مجھے ملائے اس کو خدا ملائے' اور جو مجھے کاٹے اس کو خدا کاٹے۔''[2] ایک اور موقع پر آنحضرت ﷺ نے حسنِ تعبیر کا اس سے بھی زیادہ نازک طریقہ اختیار فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ جب اللہ نے مخلوقات کو پیدا کیا تو رحم انسانی نے اس رحمت والے خدا کا دامن (اصل میں حقوہ ہے) تھام لیا' خدا نے فرمایا ''ٹھہر جا! یہ اس کا مسکن ہوگا۔ جو تیری گرہ کاٹنے سے بچے گا۔ کیا تم اس سے خوش نہیں کہ جو تجھ کو ملائے اس کو میں اپنے سے ملاؤں' جو تجھ کو کاٹے اس کو میں اپنے سے کاٹوں۔''[3] یعنی رحمِ مادر اور اس رحمان کے رحم (وکرم) کے درمیان حرفوں کا یہ اشتراک محبت کے معنوی اشتراک کے بھید کو فاش کرتا ہے اور اس سے وہ اہمیت ظاہر ہوتی ہے جو اسلام کی نظر میں اہلِ قرابت کی ہے۔

رحم اور رحمان کے اس جوڑ کی طرف خود قرآن پاک کی ایک آیت میں بھی اشارہ ہے۔ سورۂ نساء میں فرمایا:

﴿وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ﴾ (نساء:۱)

''اور جس خدا کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے درخواست کرتے ہو اس کا' اور رشتوں کا خیال رکھو۔''

اس آیتِ پاک کی تشریح ذیل کی حدیث سے سمجھئے۔

---

(۱) صحیح بخاری' کتاب البر والصلۃ۔

(۲) صحیح بخاری و مسلم البر والصلۃ۔

(۳) صحیح بخاری و مسلم البر والصلۃ۔

''ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسی بات بتایئے مجھے جنت میں لے جائے۔ فرمایا خدا کی بندگی کرو' کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ' نماز پوری ادا کرو' زکوۃ دو اور قرابت حق (صلۂ رحم) ادا کرو۔[۱]

جبیر رضی اللہ عنہ بن مطعم صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو صلۂ رحمی یعنی قرابت کا حق ادا کرے گا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا (یعنی جنت میں اس کا داخلہ اس وقت تک رکا رہے گا۔ جب تک اس کا یہ گ معاف نہ ہو لے گا یا وہ اس گناہ سے پاک نہ ہو چکے گا۔)[۲]

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ صحابی کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''جس کو یہ پسند ہو کہ اس کی روزی م وسعت اور اس کی عمر میں برکت ہو تو اس کو چاہیے کہ صلۂ رحمی کرے۔''[۳] اس حدیث کا مطلب یہ بھی سکتا۔ کہ ان نیک اعمال کا اثر اللہ نے یہ رکھا ہے کہ اس سے مال و دولت میں فراخی اور عمر میں زیادتی ہوتی ہے۔ کیو صلۂ رحم کی دو ہی صورتیں ہیں' ایک یہ کہ ضرورت مند رشتہ داروں کی مالی مدد کی جائے دوسری یہ کہ خدا کی دی ہوئی میں سے کچھ حصہ ان کی خدمت میں صرف کیا جائے۔ پہلے کا نتیجہ خدا کی طرف سے مالی وسعت اور کشادگی ا دوسرے کا نتیجہ عمر میں برکت اور زیادتی کی صورت میں ملتا ہے۔ اس حدیث کی تشریح مادی توجیہ سے بھی کی جا ہے۔ انسان کے خانگی افکار اور خاندانی جھگڑے بہت کچھ اس کے لیے اضمحلال' تکدر اور دلی پریشانی کا سب ہوتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اپنے خاندان والوں کے ساتھ نیکی کے برتاؤ' صلۂ رحم اور خوش خلقی سے پیش آتے ہیں ان کی زندگی میں خانگی مسرت' انشراح اور طمانیتِ خاطر رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی دولت اور عمر دونوں م برکت اور زیادتی ہوتی ہے۔ ترمذی میں یہ حدیث ان لفظوں میں ہے۔ ''صلۂ رحم سے قرابت والوں میں محبت' ما میں کثرت اور عمر میں برکت ہوتی ہے۔''

احادیث میں اس کی بھی تصریح ہے کہ صلۂ رحم کا کمال یہ نہیں ہے کہ جو بدلہ کے طور پر صلۂ رحم کا جواب صد رحم سے دے۔ بلکہ یہ ہے کہ جو قطعِ رحم کرتا ہے اس کے ساتھ صلۂ رحم کیا جائے۔ یعنی جو قرابت کا حق ادا نہیں کر ہیں ان کا حق ادا کیا جائے۔[۴]

❀❀❀

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الادب باب فضل صلۃ الرحم۔

(۲) ایضاً۔ باب اثم القاطع۔

(۳) صحیح بخاری کتاب الادب باب من بسط لہ فی الرزق لصلۃ الرحم۔

(۴) صحیح بخاری کتاب الادب باب لیس الواصل بالمکافی۔

ہمسایہ کے حقوق

ہمسایہ اور پڑوسی وہ دو آدمی ہیں جو ایک دوسرے کے قریب رہتے اور بستے ہیں۔ انسانیت اور اس کے تمدن
ا بنیاد ہی باہمی اشتراک عمل، تعاون اور موالات پر قائم ہے۔ اس دنیا میں ہر انسان دوسرے انسان کی مدد کا محتاج
ے۔ اگر ایک بھوکا ہے تو دوسرے پر حق ہے کہ اپنے کھانے میں سے اس کو بھی کھلائے، اگر ایک بیمار ہے تو جو
رست ہو اس کی تیمارداری کرے، ایک پر اگر کوئی مصیبت آئے تو دوسرا اس کا شریک اور ہمدرد بنے۔ اور اس
اقی نظام کے ساتھ انسانوں کی مجموعی آبادی باہمی محبت اور حقوق کی ذمہ داریوں کی گرہ میں بندھ کر ایک ہو
ئے۔ ہر انسان بظاہر جسمانی اور مادی حیثیت سے جتنا ایک دوسرے سے علیحدہ اور بجائے خود مستقل ہے اخلاقی
روحانی حیثیت سے فرض ہے کہ وہ اتنا ہی زیادہ ایک دوسرے سے ملا ہوا اور ایک کا وجود دوسرے کے وجود سے
ہی پیوستہ ہو۔ اسی لیے ہر مذہب نے ان دونوں انسانوں پر جو ایک دوسرے کے قریب آباد ہوں آپس کی محبت
امداد کی ذمہ داری رکھی ہے کہ وہی وقت پر اوروں سے پہلے ایک دوسرے کی مدد کو پہنچ سکتے ہیں۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ انسان کو اسی سے تکلیف اور دکھ پہنچنے کا اندیشہ بھی زیادہ ہوتا ہے جو ایک دوسرے سے
دہ قریب ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے باہمی تعلقات خوش گوار اور ایک دوسرے سے ملائے رکھنا ایک سچے
ب کا سب سے بڑا فرض ہے۔ تاکہ برائیوں کا سد باب ہو کر یہ پڑوس دوزخ کے بجائے بہشت کا نمونہ ہو اور
دوسرے کی محبت اور مدد پر بھروسہ کر کے گھر سے باہر نکلے اور گھر میں قدم رکھے۔

اسلام نے انہی اصولوں کو سامنے رکھ کر ہمسائیگی کے حقوق کی دفعات بنائی ہیں۔ عربوں میں دوسری قوموں
زیادہ اسلام سے پہلے بھی پڑوس اور ہمسائیگی کے حقوق نہایت اہم تھے۔ بلکہ وہ عزت و افتخار کا موجب تھے۔
سی پڑوسی پر کوئی ظلم ہو جائے تو وہ دوسرے پڑوسی کے لیے بے غیرتی اور عار کا موجب تھا اور اس لیے اس کی
رلڑنے مرنے کو وہ اپنی شرافت کا نشان سمجھتا تھا۔ اسلام نے آ کر عربوں کے اس احساس کو چند ترمیموں اور
احوں کے ساتھ اور زیادہ قوی کر دیا۔ وحیِ محمدی نے ہمسایہ کے پہلو بہ پہلو ایک اور قسم کے ہمسایہ کو جگہ دی ہے
کو عام طور سے پڑوسی اور ہمسایہ نہیں کہتے۔ مگر وہ ہمسایہ ہی کی طرح اکثر ساتھ ہوتا ہے جیسے ایک سفر کے دو رفیق،
مدرسہ کے دو طالب علم، ایک کارخانہ کے دو ملازم، ایک استاد کے دو شاگرد، ایک دوکان کے دو شریک کہ یہ بھی
نت ایک طرح کی ہمسائیگی ہے اور اس کا دوسرا نام رفاقت اور صحبت ہے ان سب قسموں کے ہمسایوں میں تقدم

اس کو حاصل ہے۔ جس کو ہمسایہ ہونے کے علاوہ قرابت، یا ہم مذہبی کا، یا کوئی اور دوہرا تعلق بھی ہو۔ قرآن پاک نے یہ تصریح پوری طرح کی ہے۔ ارشاد ہے:

﴿وَ الْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ﴾ (نساء:۳۶)

''اور (خدا نے) ہمسایۂ قریب اور ہمسایۂ بیگانہ اور پہلو کے ساتھی کے ساتھ نیکی کا حکم دیا ہے۔''

اس ''قریب اور بیگانہ'' کے معنوں میں اہلِ تفسیر نے اختلاف کیا ہے۔ ایک کہتا ہے کہ ''قریب کے معنی رشتہ دار و عزیز اور بیگانہ کے معنی غیر اور اجنبی کے ہیں'' دوسرے کی رائے ہے کہ ''نزدیک'' کے معنی ہم مذہب کے ہیں اور ''دور'' سے مطلب دوسرے مذہب والے ہیں۔ جیسے یہودی، عیسائی، مشرک وغیرہ[1] لیکن حقیقت میں یہ اختلاف بے معنی ہے، تعلیمِ محمدی کا منشا یہ ہے کہ پڑوسیوں اور ہمسائیوں میں ان کو ترجیح دی جائے گی جن کے ساتھ اس پڑوس اور ہمسائیگی کے علاوہ محبت اور رابطہ کا کوئی دوسرا تعلق بھی موجود ہو۔ وہ خواہ قرابت اور عزیز داری ہو یا ہم مذہبی ہو۔ یا کسی اور قسم کی رفاقت ہو۔ بہر حال حق کے ساتھ دوہرے تعلقات کو اکہرے تعلق پر ترجیح حاصل ہے۔

اس حکمِ الٰہی کی تفسیر آنحضرت ﷺ نے مختلف طریقوں سے فرمائی، سب سے بڑھ کر یہ کہ آپؐ نے اس کو ایمان کا راہِ راست اثر اور نتیجہ فرمایا۔ ایک دن صحابہ کے مجمع میں آپؐ تشریف رکھتے تھے کہ ایک خاص دل نشین انداز سے فرمایا ''خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا۔ خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا۔'' جان نثاروں نے پوچھا ''کون یا رسول اللہ! فرمایا وہ جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہیں۔''[2] ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا ''جو خدا اور روزِ جزا پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے۔''[3] ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا ''جو شخص خدا اور روزِ جزا پر اعتقاد رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ دے۔''[4]

ایک اور موقع پر اس کو تقربِ الٰہی کا ذریعہ ظاہر کیا۔ ارشاد فرمایا ''خدا کے نزدیک ساتھیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لئے بہتر ہے اور پڑوسیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لیے بہتر ہے۔''[5] ام المومنین حضرت عائشہؓ کی تعلیم کی غرض سے ان سے فرمایا کہ ''جبریلؑ نے مجھے پڑوسی کے حقوق کی اتنی تاکید کی کہ میں سمجھا کہ کہیں ان کو وراثت کا حق نہ دلا دیں۔''[6] حقیقت میں یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ہمسایوں کا تعلق رشتہ داروں کے تعلق کے قریب قریب پہنچ جاتا ہے۔

---

(۱) ابن جریر طبری، تفسیر آیت مذکور۔

(۲) صحیح بخاری کتاب الادب اثم من لا یامن جارہ بوائقہ۔

(۳) صحیح بخاری کتاب الادب۔

(۴) صحیح بخاری کتاب الادب۔

(۵) ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی حق الجار۔

(۶) صحیح بخاری کتاب الادب۔

پڑوسیوں میں محبت کی ترقی' اور تعلقات کی استواری کا بہترین ذریعہ باہم ہدیوں اور تحفوں کا تبادلہ ہے آنحضرت ﷺ خود اپنی بیویوں کو اس کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ اسی بنا پر ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے پوچھا ''یا رسول اللہ ﷺ میرے دو پڑوسی ہیں تو میں ان میں سے کس کے پاس بھیجوں۔'' فرمایا جس کے گھر کا دروازہ تمہارے گھر سے زیادہ قریب ہو۔ (۱) اس ہدیہ اور تحفہ کے لیے کسی بیش قیمت چیز کی ضرورت نہیں' بلکہ کھانے پینے کی معمولی چیزیں بھی اس کے لیے کافی ہیں۔ کچھ نہ ہو سکے تو گوشت کا شوربا ہی ہو اور وہ زیادہ پانی بڑھا کر ہی کیوں نہ ہو۔ اپنے ایک توکل پیشہ صحابی ابوذرؓ کو نصیحت فرمائی کہ ''اے ابوذر! جب شوربا پکاؤ تو پانی بڑھا دو اور اس سے اپنے ہمسایوں کی خبر گیری کرتے رہو۔'' (۲) ان تحفوں کے بھیجنے بھجوانے کا زیادہ موقع عورتوں کو پیش آتا ہے اس لیے آپؐ نے خصوصیت کے ساتھ عورتوں کو مخاطب کر کے فرمایا ''اے مسلمانوں کی بیویو! تم میں کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے لیے کوئی چیز حقیر نہ سمجھے اگرچہ بکری کی کھر ہی کیوں نہ ہو۔'' (۳) یہ نصیحت دونوں بیویوں کے لیے ہے۔ یعنی نہ تو بھیجنے والی بیوی اپنے معمولی تحفہ کو حقیر سمجھ کر اپنی پڑوسن کو نہ بھیجے اور نہ دوسری بیوی اس معمولی تحفہ کو حقیر سمجھ کر اس کی حقارت کرے۔

ایک مسلمان کی مروت اور شرافت کا یہ اقتضا نہیں کہ خود آرام سے رہے اور اپنے پڑوسی کے رنج و تکلیف کی پروا نہ کرے آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''مومن وہ نہیں جو خود سیر ہو۔ اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا رہے۔'' (۴)

برائی برائی ہے جہاں بھی ہو' اور گناہ گناہ ہے جہاں بھی سرزد ہو۔ لیکن اگر وہ اس جگہ ہو جہاں لازمی طور سے نیکی ہونی چاہیے تھی تو ظاہر ہے کہ اس گناہ اور برائی کا درجہ عام گناہوں اور برائیوں سے بدرجہا زیادہ ہے۔ بد قسمت انسان چوری ہر جگہ کر سکتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ پڑوسی' کے مکان میں چوری کرنا کتنا برا ہے۔ بدکاری ہر جگہ اس سے ممکن ہے مگر پڑوس کے گھر میں جہاں سے دن رات کی آمد و رفت ہے اور جہاں کے مرد پڑوس کے شریف مردوں پر بھروسہ کر کے باہر جاتے ہیں' اخلاقی خیانت کس قدر شرم ناک ہے اس لیے توراۃ میں یہ حکم تھا۔

''تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے' تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر' تو اپنے پڑوسی کی جورو اور س کے غلام' اور اس کی لونڈی' اور اس کے بیل اور اس کے گدھے اور کسی چیز کا جو تیرے پڑوسی کی ہے لالچ نہ کر۔'' (خروج ۲۰۔۱۷) تو اپنے پڑوسی سے دغابازی نہ کر نہ اس سے کچھ چھین لے۔'' (احبار ۱۹۔۱۳)

اسلام نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کی زبانِ حکمت سے اس اگلی تعلیم کی تکمیل ان الفاظ میں فرمائی۔ جن میں

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الادب باب حق الجوار فی قرب الابواب۔

(۲) صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب ماجاء فی الجوار۔

(۳) صحیح بخاری کتاب الادب باب لاتحقرن جارۃ لجارتہا۔

(۴) مشکوۃ از بیہقی وادب المفرد امام بخاری باب لایشبع دون جارہ۔

توارات کی طرح صرف ممانعت پر بس نہیں کی ہے۔ بلکہ اس کو دس گنا زیادہ برا کر کے دکھایا' ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

''زنا حرام ہے' خدا اور رسول نے اس کو حرام کیا ہے۔ لیکن دس بدکاریوں سے بڑھ کر بدکاری یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرے۔ چوری حرام ہے' خدا اور رسول نے اس کو حرام کیا ہے لیکن دس گھروں میں چوری کرنے سے بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کے گھر سے کچھ چرالے۔''(۱)

دو صحابیہؓ تھیں جن میں سے ایک رات بھر نمازیں پڑھا کرتیں' دن کے روزے رکھتیں' صدقہ و خیرات بھی بہت کرتیں مگر زبان کی تیز تھیں۔ زبان سے پڑوسیوں کو ستاتی تھیں۔ لوگوں نے ان کا حال آپؐ سے عرض کیا۔ تو فرمایا ان میں کوئی نیکی نہیں ان کو دوزخ کی سزا ملے گی۔ پھر صحابہؓ نے دوسری بیوی کا حال سنایا جو صرف فرض نماز پڑھ لیتیں اور معمولی صدقہ دے دیتیں مگر کسی کو ستاتی نہ تھیں۔ فرمایا یہ بیوی جنتی ہوگی۔

حضرت مسیحؑ نے فرمایا تھا تو اپنے پڑوسی کو ایسا پیار کر جیسا کہ آپ کو (مرقس ۱۲۔۳۰)

آنحضرت ﷺ نے اپنی تکمیلِ تعلیم میں نہ صرف یہ کہ پڑوسی کو خود اپنے مانند پیار کرنے پر قناعت فرمائی بلکہ جو نہ کرے اس کی سب سے بڑی دولت یعنی ایمان کے چھن جانے کا خطرہ ظاہر فرمایا' ارشاد ہے:

''تم میں کوئی مومن نہ ہوگا جب تک اپنے پڑوسی کی جان کے لیے وہی پیار نہ رکھے' جو خود اپنی جان کے لیے پیار رکھتا ہے۔''(۲)

اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنی جان کی محبت نہیں۔ بلکہ خدا اور رسول کی محبت کا اس کو معیار قرار دیا' فرمایا:

''جس کو یہ پسند ہو کہ خدا اور اس کا رسول اس کو پیار کرے یا جس کو خدا اور اس کے رسول کی محبت کا دعویٰ ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کا حق ادا کرے۔''(۳) اسی لیے فرمایا کہ قیامت کے دن بارگاہِ الٰہی میں سب سے پہلے وہ دو مدعی اور مدعا علیہ پیش ہوں گے جو پڑوسی ہوں گے'(۴) انسان کی خوش خلقی اور بدخلقی کا سب سے بڑا معیار یہ ہے کہ اس کو وہ اچھا کہے جو اس سے سب سے زیادہ قریب ہو۔ چنانچہ ایک دن صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ! ہمیں کیسے معلوم ہو کہ ہم اچھا کر رہے ہیں یا برا۔ فرمایا جب اپنے پڑوسی کو تم اپنی نسبت اچھا کہتے سنو تو سمجھو کہ اچھا کر رہے ہو اور جب برا کہتے سنو تو سمجھو کہ برا کر رہے ہو۔(۵)

کوئی پڑوسی اگر برائی کرے تو گھر چھوڑ کر دوسرا بہتر پڑوس تلاش کرو۔ مگر اس کی برائی کے بدلہ میں تم اس

(۱) ادب المفرد امام بخاری باب حق الجار۔
(۲) ادب المفرد امام بخاری باب لا یوذی جارہ۔
(۳) صحیح مسلم کتاب الایمان۔
(۴) مشکوٰۃ از بیہقی۔
(۵) احمد بن حنبل مسند عقبہ بن عامر۔

کے ساتھ برائی نہ کرو۔ یہ احسان خود اس کو شرمندہ کرے گا۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے آ کر شکایت کی کہ یا رسول اللہ! میرا پڑوسی مجھے ستاتا ہے۔ فرمایا جاؤ صبر کرو۔ اس کے بعد پھر شکایت لے کر آئے پھر یہی نصیحت کی۔ وہ پھر آئے اور یہی عرض کی۔ فرمایا تم اپنے گھر کا سامان راستہ میں ڈال دو (یعنی گھر منتقل ہونے کی صورت بناؤ) ان صحابیؓ نے یہی کیا۔ آنے جانے والوں نے پوچھا بات کیا ہے۔ انہوں نے حقیقت حال بتائی۔ سب نے ان کے پڑوسی کو برا بھلا کہا۔ یہ دیکھ کر وہ ایسا شرمندہ ہوا کہ وہ ان کو منا کر پھر گھر میں لایا اور وعدہ کیا کہ وہ آئندہ نہ ستائے گا۔ (۱) ان تعلیمات کا یہ اثر تھا کہ ہر صحابیؓ اپنے پڑوسی کا بھائی اور خدمت گزار بن گیا تھا۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ حضرت جابرؓ گوشت کا بڑا لوتھڑا لٹکائے جا رہے ہیں۔ پوچھا کیا ہے؟ عرض کی امیر المومنین' گوشت کھانے کو جی چاہا تھا۔ تو ایک درم کا گوشت خریدا ہے' فرمایا اے جابرؓ! کیا اپنے پڑوسی یا عزیز کو چھوڑ کر صرف اپنے پیٹ کی فکر کیا چاہتے ہو' کیا یہ آیت یاد نہ رہی۔ (۲)

﴿يَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَ اسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا﴾ (احقاف: ۲۰)

''جس دن کافر دوزخ پر پیش ہوں گے ان سے کہا جائے گا: تم اپنے مزے اپنی دنیا کی زندگی میں لے چکے اور اس سے فائدہ اٹھا چکے۔''

غور کرو کہ گوشت کا وہ لوتھڑا بھی جس میں اپنے پڑوسی اور محتاج عزیز کا حصہ نہ ہو وہ دنیا کی مکروہ لذت قرار پاتی ہے جس کے مواخذہ کا ان کو ڈر لگتا ہے۔

ہمسایوں میں دوست و دشمن اور مسلم و غیر مسلم کی تمیز بھی اٹھ گئی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک دفعہ ایک بکری ذبح کی۔ ان کے پڑوس میں ایک یہودی بھی رہتا تھا۔ انہوں نے گھر کے لوگوں سے دریافت کیا کہ تم نے میرے یہودی ہمسایہ کو بھی بھیجا۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے سنا ہے کہ مجھے جبریلؑ ہمسایہ کے ساتھ نیکی کرنے کی اتنی تاکید کرتے رہے کہ میں سمجھا کہ وہ اس کو پڑوسی کے ترکہ کا حق دار بنا دیں گے۔ (۳)

یتیموں کے حقوق

وہ کمسن بچہ جو باپ کے سایۂ محبت سے محروم ہے جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ اس کو آغوشِ محبت میں لے' اس کو پیار کرے' اس کی ہر طرح خدمت کرے' اس کے متروکہ مال و اسباب کی حفاظت کرے' اس کی تعلیم و تربیت کی فکر رکھے۔ عقل و شعور کے پہنچنے کے بعد اس کے باپ کی متروکہ جائداد اس کو واپس دے اور یتیم لڑکیوں کی

(۱) ادب المفرد بخاری باب شکایۃ الجار و ابوداؤد کتاب الادب باب حق الجوار۔
(۲) موطا امام مالک باب ماجاء فی اکل اللحم۔
(۳) ابوداؤد کتاب الادب باب حق الجوار۔

حفاظت اوران کی شادی بیاہ کی مناسب فکر کرے۔ یہ وہ احکام ہیں جو مکہ کا یتیم پیغمبر اپنے ساتھ لایا عربوں میں روزانہ کے قتل و غارت اور بدامنی کے سبب سے یتیموں کی کثرت تھی۔ مگر جیسا کہ چاہیے ان کے غور و پرداخت کا سامان نہ تھا۔ وہ اپنے باپ کی وراثت سے محروم رہتے تھے۔ کیونکہ چھوٹے بچوں کو وہ وراثت نہیں دیا کرتے تھے۔ (۱) اور نہ سنگدل عربوں میں عام طور سے ان کے ساتھ رحم و شفقت کا جذبہ تھا۔ قرآن پاک میں ان کی اس بدسلوکی کا ذکر بار بار ہے:

﴿اَرَاَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ○ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ﴾ (ماعون: ۱۔۲)

''کیا تو نے اس کو دیکھا جو انصاف کو جھٹلاتا ہے' سو وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔''

ایک اور آیت میں ان متولیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ جو یتیموں کے جوان ہو جانے کے ڈر سے ان کے باپوں کی متروکہ وراثت کو جلد جلد کھا کر ہضم کر جانا چاہتے ہیں۔

﴿کَلَّا بَلْ لَّا تُکْرِمُوْنَ الْیَتِیْمَ ○ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ○ وَ تَاْکُلُوْنَ التُّرَاثَ اَکْلًا لَّمًّا وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا﴾ (الفجر: ۱۷۔۱۹)

''نہیں یہ بات نہیں' بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے اور نہ ایک دوسرے کو مسکین کے کھانے پر آمادہ کرتے ہو اور مردے کا مال پورا سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور دنیا کے مال و دولت پر جی بھر کر ریجھتے ہو۔''

اسلام سے پہلے کے مذاہب میں اس واجب الرحم فرقہ کے ساتھ رحم و شفقت اور ان کی امداد و پرورش کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ توراۃ میں عشر اور زکوٰۃ کے مستحقین میں دوسرے لوگوں کے ساتھ یتیم کا نام بھی دو ایک جگہ ملتا ہے کہ ''شہر کے پھاٹک کے اندر جو یتیم ہوں وہ آئیں اور کھائیں اور سیر ہوں۔'' (استثنا ۱۴۔۲۹' ۲۶۔۱۲) انجیل نے ان بیچاروں کی کوئی دادرسی نہیں کی ہے اور نہ کسی تعلیم میں ان کا ذکر کیا ہے۔ اس مظلوم فرقہ کی دادرسی کا وقت اس وقت آیا جب مکہ کا یتیم دینِ کامل کی شریعت لے کر دنیا میں آیا۔ وحیِ الٰہی نے سب سے پہلے خود اسی کو خطاب کر کے یاد دلا دیا:

﴿اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ...... فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ﴾ (الضحیٰ: ۶......۹)

''کیا تجھ کو خدا نے یتیم نہیں پایا' تو اس نے پناہ دی۔۔۔۔۔۔۔ تو یتیم کو نہ دبا۔''

آنحضرت ﷺ جب تک مکہ معظمہ میں بے بسی کے عالم میں رہے' یتیموں کے متعلق اخلاقی ہدایتیں فرماتے رہے اور قریش کے جفا پیشہ رئیسوں کو اس بے کس گروہ پر رحم و کرم کی دعوت دیتے رہے۔ چنانچہ مکی آیتوں میں یہ تعلیمات وحی ہوتی رہیں' دولت مندوں کو غریبوں کے ساتھ فیاضی کی تلقین کے سلسلہ میں فرمایا گیا کہ انسانی زندگی کی گھاٹی کو پار کرنا اصلی کامیابی ہے۔ اس گھاٹی کو تم کیونکر پار کر سکتے ہو' ظلم و ستم کے گرفتاروں کی گردنوں کو چھڑا کر' بھوکوں کو کھلا کر اور یتیموں کی خدمت کر کے۔

---

(۱) تفسیر ابن جریر طبری' سورۂ نساء ج ۴ ص ۱۷۰۔

﴿اَوْ اِطْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ○ یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ○﴾ (بلد:۱۴۔۱۵)

’’یا بھوک والے دن میں کسی رشتہ داریتیم کو کھلانا۔‘‘

نیکوں اور نیک بختوں کی تعریف میں فرمایا کہ یہ وہ ہیں جو

﴿وَ یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا وَّ یَتِیْمًا﴾ (دھر:۸)

’’اوراس کی محبت کے ساتھ کھانا کسی غریب اور یتیم کو کھلاتے ہیں۔‘‘

مدینہ میں آنے کے بعدان اخلاقی ہدایتوں نے قانون کی صورت اختیار کی۔سورۂ نساء میں اس بیکس گروہ کے متعلق خاص احکام آئے۔ان کووراثت کا حق دلایا گیا۔اورمتولی جو جاہلیت میں طرح طرح کی بددیانتی کرتے تھےان سے کہا گیا۔

﴿وَ اٰتُوا الْیَتٰمٰۤی اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤی اَمْوَالِكُمْ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِیْرًا﴾ (نساء:۲)

’’اور یتیموں کو ان کے وارثوں کا چھوڑا ہوا مال دے دو،اوران کے اچھے مال کو اپنے برے مال سے بدلا نہ کرواور نہ اپنے مال کے ساتھ ملاکران کا مال کھاجاؤ۔یہ بڑے گناہ کی بات ہے۔‘‘

دولت مند یتیم لڑکیوں کوان کی جائداد پر قبضہ کرلینے کی غرض سے متولی اپنے نکاح میں لے آتے تھےاور بے والی ووارث پاکران کوستاتے تھے۔اس پرحکم آیا:

﴿وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ﴾

’’اگرتم کوڈرہے کہ ان یتیم بچیوں کے حق میں انصاف نہ کرسکو گےتو(ان کو چھوڑ کراور)عورتوں سے جو تمہیں پسند ہونکاح کرلو۔‘‘

یتیم بچوں کے مال کو بددیانتی اوراسراف سے خرچ بھی نہیں کردینا چاہیےاورنہ جب تک ان کو پورا شعور آئے وہ ان کے سپرد کیا جائے۔بلکہ ان کے سنِ رشد کوپہنچنے کے بعدان کی عقل کودیکھ بھال کران کی یہ امانت ان کو واپس کی جائے فرمایا:

﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَ اكْسُوْهُمْ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ○ وَابْتَلُوا الْیَتٰمٰی حَتّٰۤی اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ﴾ (نساء:۵۔۶)

’’اور بےوقوفوں کواپنے مال جس کوخدانے تمہارے قیام کا ذریعہ بنایا ہے نہ پکڑادو۔اوران کوکھلاتے اور پہناتے رہواوران سے معقول بات کہو۔اور یتیموں کو جانچتے رہو جب وہ نکاح کی (طبعی) عمر کو پہنچیں توان میں اگر ہوشیاری دیکھوتوان کا مال ان کے حوالہ کردو۔‘‘

ان آیاتِ پاک میں بلاغت کاایک عجیب نکتہ ہے۔غورکروکہ آیت کے شروع میں جہاں متولیوں کوناسمجھ

یتیموں کے مال کو اپنے پاس سنبھال کار کھنے کا حکم ہے وہاں مال کی نسبت متولیوں کی طرف کی ہے کہ تم اپنا مال ان کو نہ دو۔ اور آیت کے آخر میں جہاں بلوغ اور سنِ رشد کے بعد متولیوں کو یتیموں کو مال واپس کر دینے کا حکم ہے۔ وہاں اس مال کی نسبت یتیموں کی طرف گئی کہ ''تم ان کا مال ان کو واپس کر دو۔'' اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک یہ امانت متولیوں کے پاس رہے تو اس کی ایسی ہی حفاظت اور نگہداشت کرنی چاہیے جیسی اپنے مال کی اور جب واپسی کی نوبت آئے تو اس طرح ایک ایک تنکا تک چن کر واپس کیا جائے' جیسا کسی غیر کا مال دیانت کے ساتھ واپس کیا جاتا ہے جس پر تمہارا کوئی حق نہیں' متولیوں کو جو یتیموں کے مال کو اس ڈر سے جلد خرچ کر کے برابر کر دیتے ہیں کہ یہ بڑے ہو کر تقاضا نہ کر بیٹھیں' اس بد دیانتی پر تنبیہ فرمائی گئی۔

﴿وَلَا تَاْكُلُوْهَا اِسْرَافًا وَّ بِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا﴾ (نساء:۶)

''اور اڑا کر اور جلدی کر کے ان کا مال نہ کھا جاؤ کہ یہ بڑے نہ ہو جائیں۔''

صاحبِ جائداد یتیموں کے متولی اگر خود کھاتے پیتے ہوں' تو ان کے لیے ان یتیموں کی جائداد کی دیکھ بھال اور نگرانی کا معاوضہ قبول کرنا بھی خلافِ اخلاق قرار دیا گیا' اور اگر تنگدست ہوں تو منصفانہ معاوضہ لینے کی اجازت دی گئی۔

﴿وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (نساء:۶)

''اور جو (متولی) بے نیاز ہے اس کو چاہیے کہ بچتا رہے اور جو محتاج ہے تو منصفانہ دستور کے مطابق کھائے۔''

اور آخر میں یہ جامع تعلیم دی گئی۔

﴿وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ﴾ (نساء:۱۲۷)

''اور یہ کہ یتیموں کے لیے انصاف پر قائم رہو۔''

سورۂ انعام میں یہودیوں کی ظاہری شریعت نوازی اور جانوروں کی حلت و حرمت میں بے معنی جزئیات پرستی اور روحانی گناہوں سے بے پروائی دکھا کر جن اصلی روحانی و اخلاقی تعلیمات کی طرف توجہ دلائی ان میں ایک یہ ہے کہ

﴿وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ﴾ (انعام:۱۵۲)

''اور بہتری کی غرض کے سوا یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ اپنی طاقت کی عمر کو پہنچے۔''

سورۂ اسراء کے آٹھ اخلاقی اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سوائے بہتری کی نیت اور اصلاح کے خیال کے صاحبِ جائداد یتیموں کی جائداد کے پاس کسی اور غرض سے نہ پھٹکنا چاہیے۔ اور دیانت داری کے ساتھ ہمیشہ اپنا دامن بچائے رکھنا چاہیے۔ (سورۂ بنی اسرائیل: ۳۴)

یہ تو صاحبِ جائداد یتیموں کی نسبت تعلیم ہے۔ جو یتیم غریب و مفلس ہوں ان کی مناسب پرورش اور امدادِ

عام مسلمانوں کا فرض ہے۔ چنانچہ قرآن پاک نے بقرہ، نساء، انفال اور حشر میں بار بار ان کی پرورش اور ان کے ساتھ نیک سلوک اور احسان کرنے کی ہدایت کی ﴿وَالْیَتٰمٰی وَ الْمَسَاکِیْنَ﴾ خیرات وصدقات کے بہترین مصرف قرار دیے گئے۔

اپنی اس متواتر وحی کی تشریح میں بے والی و وارث امت کے سرپرست ﷺ نے اپنی امت کے ان نیک دلوں کو جو بے والی و وارث یتیموں کے کفیل ہوں خود اپنے برابر جگہ دی، فرمایا ''میں اور کسی یتیم کی کفالت کرنے والے جنت میں یوں دو انگلیوں کی طرح قریب ہوں گے۔''(۱) یہ بھی فرمایا کہ ''جو کسی یتیم بچہ کو اپنے گھر بلا کر لائے اور اس کو کھلائے پلائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کی نعمت عطا فرمائے گا۔ بشرطیکہ اس نے کوئی ایسا گناہ نہ کیا ہو جو بخشائش کے لائق نہ ہو۔''(۲) نیز ایک دفعہ ارشاد فرمایا ''مسلمانوں کا سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بھلائی کی جارہی ہے۔ اور سب سے بدتر گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہو۔''(۳)

آنحضرت ﷺ کی ان تعلیمات نے عرب کی فطرت بدل دی۔ وہی دل جو بیکس و ناتواں یتیموں کے لیے پتھر سے زیادہ سخت تھے وہ موم سے زیادہ نرم ہوگئے۔ ہر صحابی کا گھر ایک یتیم خانہ بن گیا۔ ایک ایک یتیم کے لطف و شفقت کے لیے کئی کئی ہاتھ ایک ساتھ بڑھنے لگے۔ اور ہر ایک اس کی پرورش اور کفالت کے لیے اپنے آغوش محبت کو پیش کرنے لگا۔(۴) بدر کے یتیموں کے مقابلہ میں جگر گوشۂ رسول فاطمہ بتول اپنے دعویٰ کو اٹھا لیتی ہے۔(۵) حضرت عائشہؓ صدیقہ اپنے خاندان(۶) اور انصار(۷) وغیرہ کی یتیم لڑکیوں کو اپنے گھر لیجا کر دل و جان سے پالتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ صحابی کا یہ حال تھا کہ وہ کسی یتیم بچہ کو ساتھ لیے بغیر کبھی کھانا نہیں کھاتے تھے۔(۸)

صحابہؓ نے صرف یہی نہیں کیا کہ یتیموں کو ان کا حصہ دینے اور ان کے مال و دولت کی تولیت اور نگرانی میں دیانت داری برتنے لگے بلکہ ان کی جائدادوں کی حفاظت میں فیاضی اور سیرچشمی کا پورا ثبوت دیا۔ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کی عدالت میں ایک یتیم نے ایک شخص پر ایک نخلستان کے متعلق دعویٰ پیش کیا مگر وہ دعویٰ ثابت

---

(۱) صحیح بخاری باب فضل من یعول یتیما و صحیح مسلم باب فضل الاحسان الی الیتیم۔

(۲) ترغیب و ترہیب منذری جلد ۲ ص ۱۳۲، ص ۱۳۳ بحوالہ ترمذی (حدیث حسن صحیح)

(۳) ترغیب و ترہیب منذری جلد ۲ ص ۱۳۲، ص ۱۳۳ بحوالہ ماجہ و ادب المفرد باب من یعول یتیما۔

(۴) صحیح بخاری باب عمرۃ القضا۔

(۵) ابوداؤد باب مواضع قسم الخمس۔

(۶) موطا امام مالک کتاب مذکورۃ وزکوٰۃ اموال الیتمیٰ وزکوٰۃ الحلی و کتاب الطلاق۔

(۷) مسند احمد جلد ۶ ص ۲۶۹۔

(۸) تذکرۃ الحفاظ ذہبی ذکر مسروق بن اجدع تابعی و مسند جلد ۶ ص ۳۲۔

نہ ہوسکا۔ اور آپؐ نے وہ نخلستان مدعا علیہ کو دلا دیا۔[1] وہ یتیم اس پر رو پڑا' آپ کو رحم آیا اور اس مدعا علیہ سے فرمایا کہ تم نخلستان اس کو دے دو' خدا تم کو اس کے بدلہ جنت دے گا۔ وہ اس ایثار پر راضی نہ ہوا۔ ابوالدحداحؓ صحابی حاضر تھے انہوں نے اس شخص سے کہا کیا تم یہ نخلستان میرے فلاں باغ سے بدلتے ہو۔ اس نے آمادگی ظاہر کی انہوں نے فوراً بدل دیا اور وہ نخلستان اپنی طرف سے اس یتیم کو ہبہ کر دیا۔[2]

آج دنیا کے شہر شہر میں یتیم خانے قائم ہیں۔ مگر اگر یہ سوال کیا جائے' کیا محمد رسول اللہ ﷺ سے پہلے بھی یہ بدقسمت گروہ اس نعمت سے آشنا تھا تو تاریخ کی زبان سے جواب نفی میں ملے گا۔ اسلام پہلا مذہب ہے جس نے اس مظلوم فرقہ کی دادرسی کی۔ عرب پہلی سرزمین ہے جہاں کسی یتیم خانہ کی بنیاد پڑی اور اسلام کی حکومت دنیا کی پہلی حکومت ہے جس نے اس ذمہ داری کو محسوس کیا اور عرب' مصر' شام' عراق' ہندوستان جہاں جہاں مسلمانوں نے اپنی حکومتوں کی بنیادیں ڈالیں ساتھ ساتھ ان مظلوموں کے لیے بھی امن و راحت کے گھر بنائے' ان کے وظیفے مقرر کئے' مکتب قائم کیے' جائیدادیں وقف[3] کیں اور دنیا میں ایک نئے انسٹیٹیوشن کی طرح ڈالی اور قانوناً اپنے قاضیوں کا یہ فرض قرار دیا کہ وہ بے والی وسرپرست یتیموں کے سرپرست ہوں۔ ان کی جائدادوں کی نگرانی' ان کے معاملات کی دیکھ بھال اور ان کی شادی بیاہ کا انتظام کریں۔[4] اور یہ وہ دستور ہے جس کی پیروی آج یورپ کے ملکوں میں کی جاتی ہے۔ اور لندن کے لارڈ میئر یا آرفنز کورٹ کے حکام مسلمان قاضیوں کے ان فرائض کی نقل کرتے ہیں۔

بیوہ کے ساتھ حسنِ سلوک

یتیموں کے بعد اصنافِ انسانی میں سب سے ناچار اور ناتواں گروہ جنسِ لطیف کے ان افراد کا ہے جن کو قدرت نے شوہروں کے سایہ سے محروم کر دیا ہے۔ اب وہ بے یارو مددگار' اور بے مونس و غم خوار ہیں۔ نہ ان کے کھانے پینے کا کہیں سہارا ہے اور نہ ان کے تن ڈھانکنے اور ستر پوشی کی کسی کو فکر ہے۔ عورت جس کو خدا نے دنیا کے عملی مشکلات سے پرے (دور) رکھا تھا اور اس کی ذمہ داری اس کے شوہر کے حوالے کر دی تھی۔ اب وہ ناچار ان سے دوچار ہے۔ اب غم والم' اور فکر و تردد کے علاوہ بڑی مشکل یہ درپیش ہے کہ ایک بے حامی و بے محافظ عورت کو دیکھ کر' نہ صرف اس کے جسمانی ستانے والے' بلکہ اس کے روحانی اور اخلاقی حملہ آور گدھ کی طرح اس کے پس و

(۱) ادب المفرد امام بخاری باب فضل من یعول یتیماً۔
(۲) استیعاب ابن عبدالبر تذکرۂ ابوالدحداح۔
(۳) تاریخ اسلام میں یہ واقعات مذکور ہیں۔
(۴) حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا السلطان ولی من لا ولی لہ (کتاب النکاح) فقہ کی کتابوں میں قاضیوں کے یہ فرائض لکھے ہیں۔ قاضیوں کو جو شاہی فرامین تقرر کے وقت ملتے تھے ان میں بھی خصوصیت کے ساتھ ان کی تصریح ہوئی تھی ۱۲۔

پیش منڈلاتے رہتے ہیں اور موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ دنیا کے روزمرہ کے واقعات اور اخبارات کی اطلاعیں کافی سے زیادہ ثبوت ہیں۔

یہودی مذہب میں بیوہ عورت ایک بھائی کے مرنے کے بعد اس کے دوسرے بھائی کی ملک ہو جاتی تھی وہ جس طرح چاہتا تھا اس سے معاملہ کر سکتا تھا۔ عورت کی مرضی کو اس زن وشوئی کے مجبورانہ تعلق میں کوئی دخل نہ تھا۔ عیسوی مذہب میں یہ جبری قانون تو جاتا رہا مگر وہ کوئی دوسرا ایجابی پہلو پیش نہ کر سکا۔ ہندوؤں میں اب اس کی زندگی کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اب اس کو اپنے شوہر کی چتا سے لپٹ کر بے موت مر جانا چاہیے۔ اور اگر زندہ رہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ وہ دنیا کی تمام آرائشوں اور لذتوں سے علیحدہ ہو کر ساری عمر سوگ میں گزار دے۔ عربوں میں رواج یہ تھا کہ وہ شوہروں کے وارثوں کی ملکیت بن جاتی تھی اور وہ جو چاہتے اس کے ساتھ کر سکتے تھے۔ اس کو تکلیفیں دے دے کر اس سے دین مہر معاف کراتے تھے اور اس کو اپنی مرضی کے بغیر کہیں شادی نہیں کرنے دیتے تھے۔

اسلام آیا تو اس مظلوم گروہ کی فریاد رسی ہوئی۔ اس نے سب سے پہلے تو یہ کیا کہ ان کے غیر محدود سوگ کے زمانہ کو محدود کر دیا اور صرف اتنی مدت تک کے لیے رکھا جس میں تھوڑا بہت اس کا طبعی غم فراموش ہو سکے اور یہ بھی پتہ لگ سکے کہ اس کو اپنے شوہر سے کوئی حمل تو نہیں۔ اس کے لیے سوگ کا ایک زمانہ متعین کیا جس کی حد چار مہینے دس دن قرار دی اور اس کا نام عدت رکھا' یعنی شمار کے دن۔ اس مدت کے گزر جانے کے بعد قانونی حیثیت سے اس کو ہر قسم کے جائز زیب وآرائش کی اجازت دے دی۔ اس کا دین مہر اگر اب تک ادا نہ ہو تو اس قرض کا ادا کرنا اس شوہر کے ترکہ میں سب سے اول ضروری ٹھہرایا۔ پس اس ترکہ میں اگر شوہر کی اولاد ہو تو عورت کو آٹھواں حصہ اور نہ ہو تو چوتھائی حصہ دلوایا۔ عورت کو اپنی دوسری شادی کے متعلق پوری آزادی بخشی' اور اس کے سر سے دیوروں اور شوہر کے دوسرے عزیزوں کی ہر قسم کی جابرانہ حکومت کا قلع قمع کر دیا اور ان تمام امور کو نہ صرف اخلاق بلکہ اسلام کے قانون کا جز بنا دیا۔ اس بے یار و مددگار طبقہ کی دوسری ضروری امداد یہ ہے کہ جس سوسائٹی سے اس کو اوروں نے نکال دیا ہے۔ اس میں دوبارہ اس کو عزت کے ساتھ داخلہ کا موقع دیا جائے اور کسی شریکِ زندگی کی معیت کا شرف اس کو دوبارہ بخشا جائے اور جس مہر و عنایت کے سایہ سے وہ محروم ہو گئی ہے' وہ اس کو پھر عطا کیا جائے۔ قرآن نے اس کے بارہ میں صرف نصیحت و موعظت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کو صریحاً یہ حکم دیا۔

﴿وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ﴾ (نور: ۳۲)

''اور اپنے میں سے بے شوہر والی عورتوں کا نکاح کر دو۔''

اس سے پہلے کہ یہ حکم اترے' بلکہ خود نبوت سے پہلے آنحضرت ﷺ نے اس بے کس فرقہ کی امداد کی طرف توجہ فرمائی اور عین اس وقت جب ایک نوجوان کے تمام ولولے برانگیختہ ہوتے ہیں اور بہتر سے بہتر اور نوجوان سے نوجوان عورت کا مشتاق ہوتا ہے آپ نے پچیس برس کی عمر میں چالیس برس کی ایک ادھیڑ عمر بیوہ سے شادی کی اور

پچیس برس تک اس طرح اس کے ساتھ کامل رفاقت کی کہ اس اثنا میں کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا۔ ان کی وفات کے بعد وقتاً فوقتاً دس عورتوں سے نکاح کیے جن میں سے آٹھ حضرت سودہؓ، حفصہؓ، زینب ام المساکینؓ، ام سلمہؓ، جویریہؓ، ام حبیبہؓ، میمونہؓ اور صفیہؓ بیوہ تھیں۔ جن کی کفالت کا بار آپؐ نے اپنے دوش مبارک پر اٹھایا اور اس طرح اپنے پیرووں کے لیے اس کو مستحسن اور مسنون طریقہ خود اپنے عمل سے بھی بنا دیا۔ یہ تو آپؐ کا عمل تھا۔ قول یہ ہے کہ اس مظلوم فرقہ کی امداد کو آپؐ نے ایسی نیکی قرار دیا کہ رات رات بھر (نفل) نمازیں پڑھ پڑھ کر اور اکثر (نفل) روزے رکھ رکھ کر جو ثواب حاصل کیا جا سکتا ہے وہ اس کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا آسانی حاصل کر سکتا ہے فرمایا۔

السَّاعِیُ عَلَی الْاَرْمَلَةِ وَ الْمِسْکِیْنِ کَا لسَّاعِی فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ اَحْسَبُهُ قَالَ کَالْقَائِمِ لَا یَفْتُرُ وَ کَالصَّائِمِ لَا یُفْطِرُ. (۱)

”بیوہ اور مسکین کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے جیسا خدا کی راہ میں دوڑنے والا اور راوی کہتا ہے کہ میں گمان کرتا ہوں کہ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ اور جیسا کہ وہ نمازی جو نماز سے نہیں تھکتا اور وہ روزہ دار جو کبھی اپنا روزہ نہیں توڑتا۔“

صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں:

السَّاعِیُّ عَلَی الْاَرْمَلَةِ وَ الْمِسْکِیْنِ کَالْمُجَاهِدِ فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ کَالَّذِیْ یَصُوْمُ النَّهَارَ وَ یَقُوْمَ اللَّیْلَ. (کتاب الادب)

”بیوہ اور غریب کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا خدا کی راہ کے مجاہد کی طرح ہے اور اس کے برابر ہے جو دن بھر روزہ رکھے اور رات بھر نماز پڑھا کرے۔“

ان بیواؤں کی تسکین کی خاطر جو اپنی گود میں ننھے بچے رکھتی ہوں اور اس لیے وہ تکلیف اٹھاتی ہوں۔ لیکن ان ننھے بچوں کی پرورش کی مصروفیت کے سبب سے اپنے کو اس وقت تک دوسرے نکاح کے بندھن میں نہیں باندھتی ہیں جب تک وہ بڑے ہو کر ان سے علیحدہ نہ جائیں اور یا وہ دنیا سے رخصت نہ ہو جائیں۔ یہ فرمایا ”میں اور محنت و مشقت کے سبب سے وہ کالی پڑ جانے والی بیوی قیامت کے دن مرتبہ میں ان دو انگلیوں کی طرح قریب ہوں گے وہ حسن و جمال اور جاہ و عزت والی بیوی جو شوہر کے مرنے کے بعد بیوہ ہو جائے۔ لیکن اپنے ننھے یتیم بچوں کی خدمت کی خاطر اپنے کو روکے رہے یہاں تک کہ وہ اس سے علیحدہ ہو جائیں یا مر جائیں“ (۲) اسی مقصد کو ابو یعلی کی مسند میں ہے کہ آپؐ نے اس طرح ایک واقعہ کی صورت میں بھی بیان فرمایا کہ ”قیامت کے دن میں سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھولوں گا کہ ایک عورت مجھ سے بھی پہلے اندر جانا چاہتی ہے۔ میں پوچھوں گا تو کون

(۱) صحیح بخاری و صحیح مسلم و موطا امام مالک بحوالہ مشکوۃ باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق۔

(۲) سنن ابوداؤد، کتاب الادب باب فضل من عال یتیماً۔

ہے۔تو وہ کہے گی کہ میں ایک بیوہ ہوں جس کے چند ننھے یتیم بچے تھے۔" (۱)

حاجت مندوں کے حقوق

ہر انسان خواہ وہ کسی قدر صاحبِ دولت اور بے نیاز ہو کسی نہ کسی وقت اس پر ایسی افتاد پڑتی ہے کہ اس کو دوسروں کا دستِ نگر بننا پڑتا ہے اور اس کو دوسروں سے مدد لینے کی ضرورت ہو جاتی ہے۔اس لیے انسانی جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ وہ اپنے ایسے مصیبت زدہ بھائی کی ہر طرح مدد کرے اور اپنی موجودہ بہتر حالت پر مغرور ہو کر کبھی کسی حاجت مند کی حاجت روائی سے بے پروائی نہ برتے اور نہ یہ سمجھے کہ اس کو کبھی کسی دوسرے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔قرآن پاک میں دو موقعوں پر ذرا سے فرق سے ایک آیت ہے:

﴿فِیۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَ الۡمَحۡرُوۡمُ﴾ (ذاریات:۱۹)

"جن (مسلمانوں) کے مالوں میں مانگنے والوں اور محروم کے لیے حق ہے۔"

﴿فِیۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَ الۡمَحۡرُوۡمِ ۝﴾ (معارج:۲۴-۲۵)

"جن (مسلمانوں) کے مالوں میں مانگنے والوں اور محروم کے لیے مقررہ حق ہے۔"

سائل مانگنے والے کو کہتے ہیں۔لیکن عام شہرت کی بنا پر سائل کے معنی صرف "بھیک منگے" کے لینا ٹھیک نہیں ہے بلکہ اس سے ہر وہ ضرورتمند مراد ہو سکتا ہے جو تم سے کسی مالی مدد کا خواستگار ہو۔محروم کی تشریح میں اہلِ تفسیر کا اختلاف ہے بعض اس کو محروم کہتے ہیں جس کا مالِ غنیمت میں کوئی حصہ نہیں۔کسی نے اس کے ظاہر معنی لیے ہیں کہ جو دولت سے محروم ہو۔کوئی متعفف کے لیتا ہے۔لیکن صحیح یہ ہے کہ اس سے مراد وہ مصیبت زدہ ہے جس کی کمائی یا کھیتی پر کوئی آسمانی افتاد پڑ گئی ہو۔اور اب وہ دوسروں کی مدد کا محتاج ہو گیا ہو۔اسی معنی کی تائید اہلِ لغت اور بعض اہلِ تفسیر کے بیان اور قرآنِ پاک سے ہوتی ہے۔ (۲)

دوسری بحث یہ ہے کہ اس حق سے مراد زکوٰۃ ہے۔یا عام صدقہ۔مفسرین دونوں آیتوں میں دونوں طرف گئے ہیں مگر صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذاریات میں جس میں مطلق حق کا بیان ہے اس سے مطلق صدقہ اور مالی امداد مراد ہے اور معارج میں جس میں مطلق "حق" کا نہیں بلکہ "مقررہ حق" کا بیان ہے "زکوٰۃ" مراد ہو کیونکہ "مقررہ حق" کا مفہوم عام صدقہ پر نہیں ہے بلکہ زکوٰۃ ہی پر صادق آتا ہے۔نتیجہ یہ نکلا کہ ایسے حاجت مندوں کی جن پر کوئی مالی مصیبت اور افتاد پڑی ہو دونوں طرح سے مدد مسلمانوں کے حقوق میں سے ایک حق ہے۔قرآن پاک میں دوسرے موقع پر ہے:

(۱) حاشیہ سنن ابی داؤد محشیہ ابی الحسنات محمد بن عبداللہ ابن نور الدین پنجابی مطبوعہ اصح المطابع لکھنؤ۔

(۲) دیکھو لسان العرب لفظ محروم المحارف اور تفسیر ابن جریر میں سورۂ ذاریات و معارج کی آیت مذکور اور سورۂ قلم میں اصحاب الجنۃ کے قصہ میں محروموں اور سورۂ واقعہ میں بَلۡ نَحۡنُ مَحۡرُوۡمُوۡنَ کے معنی۔

﴿وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ (ضحیٰ:۱۰)

''اور تو سوال کرنے والے کو جھڑ کا نہ کر۔''

یہاں سوال کرنے والے کے معنی اغنیٰ کے قرینہ سے عام طور سے بھیک مانگنے والے کے سمجھے جاتے ہیں۔ مگر لفظ کا عموم وسعت کو چاہتا ہے۔ یعنی ہر ضرورت مند جو تم سے کسی قسم کی مدد کا خواستگار ہو خواہ وہ جسمانی ہو مالی ہو علمی ہو۔ (۱) یہاں تک کہ کوئی لنگڑا تم سے صرف تمہارے کندھے کا سہارا چاہتا ہے تو وہ بھی سائل کے تحت میں ہے اس کے سوال کو بھی سختی سے رد نہ کرو بلکہ امکان بھر اس کو پورا کرو۔ اور نہ کر سکو تو نرمی اور خوب صورتی سے عذر کرو۔ مدد کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ تم کسی دوسرے سے اس مستحق کی مدد کی سفارش کرو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهُ نَصِيبٌ مِّنْهَا وَ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهُ كِفْلٌ مِّنْهَا وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيتًا﴾ (نساء:۸۵)

''جو نیک بات کی سفارش کرے گا۔ تو اس کے ثواب میں اس کا بھی حصہ ہے۔ اور جو بری بات کی سفارش کرے گا تو اس کے گناہ میں وہ بھی حصہ پائے گا اور اللہ ہر چیز کا نگہبان ہے۔''

اگر چہ یہ آیت عبارت کے نظم و نسق کے لحاظ سے لڑائی کے سلسلہ میں ہے' یعنی اگر کوئی کمزور قبیلہ درخواست کرے کہ طاقتور قبیلہ کے مقابلہ میں اس کی امداد کی سفارش کی جائے تو اس نیک کام میں اس کی سفارش کی جائے اور وہ قبول کی جائے' تاہم الفاظ قرآنی کی وسعت ہر نیک کام کی سفارش تک وسیع ہے۔ اور اس میں یہ اصول بتا دیا گیا ہے کہ کسی نیک غرض کی جد و جہد میں جتنا حصہ بھی لیا جائے حصہ لینے والا بھی اس نیک کام کے ثواب میں شریک ہوگا۔ ایسی ہی برے کام کی جد و جہد میں حصہ لینا اس کے گناہ میں شریک ہونا ہے ایک اور آیت میں ارشاد ہے۔

﴿وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ (مائدہ:۲)

''اور نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو۔ اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کے مددگار نہ بنو' اور ڈرو اللہ سے بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔''

غرض یہ کہ حاجت مندوں کی حاجت برآری' ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرنا اور جو جس قدر بھی مدد تم سے چاہے اگر تمہاری طاقت میں ہو تو وہ اس کو دینا ہر مسلمان پر ایک حق کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کو ہر مسلمان کو ادا کرنا چاہیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا انہی آیات کی تشریح اپنے ان الفاظ میں فرمائی ہے:

﴿مَنْ كَانَ فِيْ حَاجَةِ اَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِيْ حَاجَتِهٖ وَ مَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللّٰهُ

(۱) طبری میں ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے۔﴿و اما من سائلک من ذی حاجۃ فلا تنہر﴾ زمخشری نے کشاف میں لکھا ہے۔ کہ بعضوں نے اس سائل سے مراد طالب علم لیا ہے۔

عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرُبَاتِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ﴾ (صحیحین)

''جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرنے میں لگا رہے گا تو خدا اس کی ضرورت پوری کرنے میں لگا رہے گا اور جو مسلمان کسی مسلمان کی مصیبت کو دور کرے گا تو اللہ قیامت کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت کو اس سے دور فرمائے گا۔''

ایک دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا:

﴿وَ اللّٰهُ فِي عَوْنِ عَبْدِهٖ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ اَخِيْهِ﴾ (ترمذی باب ماجاء فی الستر علی المسلمین)

''اللہ اپنے بندہ کی مدد میں اس وقت تک رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے۔''

صحیح بخاری میں ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کے پاس کوئی سائل یا حاجت مند آتا تو آپ صحابہؓ سے فرماتے کہ تم سفارش کرو تو تمہیں بھی ثواب ملے گا۔ (۱) ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ اگر کچھ اور نہ ہو سکے تو بیکس حاجت مند کی مدد ہی کیا کرو۔ (۲) یہ بھی فرمایا کہ بھولے بھٹکے ہوئے کو اور کسی اندھے کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے۔ (۳) یہ بھی ارشاد ہوا کہ جو شخص راستہ چلنے میں کوئی کانٹا راستہ سے ہٹا دے تو خداوند تعالیٰ اس کے اس کام کی قدر کرتا ہے اور اس کا گناہ معاف کرتا ہے۔ (۴)

بیمار کے حقوق

دنیا کا ایک اور کمزور طبقہ جو ہماری ہمدردی کا مستحق ہے۔ بیماروں اور مریضوں کا ہے۔ یہ عموماً اپنی اس حالت میں اپنی خبر گیری اور خدمت آپ نہیں کر سکتے۔ ان ہمدردی کے لائق انسانوں کی دیکھ بھال، خدمت، غم خواری اور تیمارداری بھی انسانیت کا ایک فرض ہے اور اس فرض کا نام عربی میں ''عیادت'' ہے۔ (۵) ان بیماروں کے ساتھ اسلام نے سب سے پہلی ہمدردی تو یہ سکھائی ہے کہ وہ بہت سے فرائض جن کے ادا کرنے سے وہ مجبور ہو رہے ہیں یا جن کے ادا کرنے سے ان کی تکلیف کی زیادتی کا خیال ہے ان کو یک قلم معاف یا کم کر دیا ہے اور قرآن پاک

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الادب باب تعاون المومنین و باب قول اللہ من یشفع شفاعۃ حسنۃ۔

(۲) ایضاً باب کل معروف صدقۃ۔

(۳) ترمذی کتاب البر والصلۃ۔

(۴) ترمذی کتاب البر والصلۃ۔

(۵) عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ عیادۃ المریض کے معنی صرف بیمار پُرسی کے ہیں یعنی کسی بیمار کو بیماری کی حالت میں دیکھنے کو جانا لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے بیمار کی عیادت کے معنی بیمار پرسی کے بھی ہیں۔ اور اس کی تیمارداری، غم خواری اور خدمت گزاری کے بھی۔ بیمار کو بیماری کی حالت میں صرف دیکھنے کو جانا تو عیادت کی معمولی قسم ہے اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس کی غم خواری کرے اس سے زیادہ یہ ہے کہ اس کی پوری تیمارداری اور خدمت گذاری کرے۔ عرب کا ایک قدیم شاعر جو حجاج کے زمانہ میں تھا کہتا ہے۔

نے اس کے لیے ایک کلی اصول بنادیا ہے:

﴿وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ﴾ (نور:۶۱)

''اور نہ بیمار پر کوئی تنگی ہے۔''

﴿لَيْسَ عَلَى الْأَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ﴾ (فتح: ۱۷)

''نہ اندھے پر تنگی ہے (کہ وہ جہاد میں شریک ہو) اور نہ لنگڑے پر اور نہ بیمار پر۔''

﴿لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى﴾ (توبہ:۹۱)

''نہ کمزوروں پر اور نہ بیماروں پر (جہاد کے عدم شرکت کی بازپرس ہے)۔''

بیماروں کے لیے وضو معاف ہے ﴿وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى﴾ (یا تم بیمار ہو تو تیمّم کرو) اسی طرح ان سے تہجد کی لمبی نمازیں معاف ہیں ﴿عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى﴾ (مزمل:۲۰) (خدا کو معلوم تھا کہ تم میں کچھ بیمار بھی ہوں گے) اسی طرح حج کے احکام میں بھی بیمار کے لیے رعایت فرمائی گئی۔ ﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا﴾ تو تم میں جو بیمار ہو (بقرہ:۱۸۴) روزہ توڑنے کی اس کو اجازت دی گئی۔ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی قوت نہ ہو تو بیٹھ کر، اور بیٹھنے کی بھی طاقت نہ ہو تو لیٹ کر نماز کی رخصت دی گئی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب خدا نے اس سے اپنے فرائض معاف کر دیے تو بندوں کو کس حد تک ان سے اپنے اخلاقی مطالبہ میں کمی کر دینی چاہیے۔ (۱)

اسلام نے مسلمانوں کی بیماری کی تکلیف کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرنے کی حالت میں غم کے بجائے خوش خبری بنا دیا ہے۔

اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ مومن کو دنیا میں جو تکلیف بھی پہنچتی ہے۔ وہ اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے۔

---

(۱) ذَهَبَ الرُّقَادُ فَمَا يُحَسُّ رِقَادُ
مِمَّا شَجَاكَ وَ نَامَتِ الْعُوَّادُ

''تجھے جو غم پہنچا اس سے نیند چلی گئی تو نیند معلوم نہیں ہوتی اور عیادت کرنے والے سو گئے۔''

قاعدہ یہ ہے کہ کسی بیمار کے تیمار دار اور خدمت گزار اس کی آخری حالت میں شب و روز اس کی خدمت میں جاگتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کی کئی کئی راتیں کٹ جاتی ہیں۔ لیکن جب بیمار سے مایوسی ہو جاتی ہے اور وہ موت کے قریب ہو جاتا ہے یا مر جاتا ہے تو پھر ان پر نیند طاری ہو جاتی ہے اور وہ سو جاتے ہیں۔ اب اگر ''عیادت'' کے معنی صرف بیمار پرسی کے ہوتے تو عیادت کرنے والوں کے سو جانے کا کوئی مطلب نہ ہوتا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ''عیادت'' کی وسعت میں خدمتِ گزاری اور تیمار داری سے لے کر بیمار پرسی تک سارے مدارج داخل ہیں۔ اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ عیادت کے معنی صرف بیمار کے دیکھنے کو جانے ہی کے ہوں تب بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ جب صرف اس کے دیکھنے جانے کا ثواب اتنا ہے تو اس کی خدمت اور تیمار داری کا ثواب کتنا ہوگا۔

اگر وہ بیمار ہو جائے اور صبر کے ساتھ بیماری کی تکلیفوں کو برداشت کرے تو آخرت کے عذابِ شدید سے بچانے کے لیے وہ اس کے گناہوں کا معاوضہ بن جاتی ہیں۔ اور وہ پاک وصاف ہو جاتا ہے۔[۱]

آنحضرت ﷺ نے بیماروں کی عیادت کی خاص تاکید فرمائی ہے۔ اس کے آداب تعلیم کیے ہیں اس کی دعائیں سکھائی ہیں۔ اور اس کا ثواب بتایا ہے۔ فرمایا جو کوئی مسلمان کے کسی غم کو ہلکا کرے گا۔ خدا اس کے غم کو ہلکا کرے گا[۲] اور یہ بھی فرمایا ہے کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حق ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ جب وہ بیمار پڑے تو اس کی عیادت کرے[۳] صحابہؓ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا تھا جن میں سے ایک بیمار کی عیادت ہے[۴] ارشاد ہوا کہ جب کوئی صبح کو کسی بیمار کی عیادت کرتا ہے تو فرشتے شام تک اس کی مغفرت کی دعا مانگتے ہیں، اور جب وہ شام کو عیادت کرتا ہے تو صبح تک فرشتے اس کی مغفرت کے لیے بارگاہِ الٰہی میں دعا کرتے ہیں۔[۵] یہ بھی آیا ہے کہ ''جب کوئی کسی بیمار کی عیادت کو جاتا ہے تو واپسی تک وہ جنت کے میوے چنتا رہتا ہے''[۶] فرمایا کہ جب کوئی کسی کی عیادت کے لیے جائے تو اس کے ہاتھ اور پیشانی پر ہاتھ رکھے اور اس کو تسلی اور دلاسہ دیوے اور اس کو شفا پانے کے لیے خدا سے دعا کرے۔[۷] آنحضرت ﷺ اور آپؐ کی تعلیم سے صحابہ کرامؓ کو بیماروں کی عیادت کا اس قدر اہتمام تھا کہ وہ اس کو ایک اسلامی حق جانتے تھے بلکہ اس معاملہ میں مسلمان اور غیر مسلم کی تفریق نہ تھی آپؐ نے یہودیوں کی عیادت فرمائی ہے۔[۸] منافقوں کی عیادت کو تشریف لے گئے ہیں۔[۹] اور اسی سے علما نے غیر مسلموں کی عیادت کی بھی اجازت دی ہے۔[۱۰]

حضرت سعد بن معاذؓ جب زخمی ہوئے تو آپؐ نے ان کا خیمہ مسجد میں نصب فرمایا تا کہ بار باران کی عیادت کی جا سکے۔[۱۱] رفیدہؓ ایک صحابیہ تھیں جو ثواب کی خاطر زخمیوں کا علاج اور ان کی خدمت کیا کرتی تھیں۔ ان کا

---

(۱) صحیح مسلم باب ثواب المومن فیما یصیبہ و سنن ابی داؤد اوائل کتاب الجنائز۔

(۲) ابوداؤد کتاب الادب فی المعونۃ للمسلم۔

(۳) صحیح بخاری کتاب الجنائز۔

(۴) ایضاً۔

(۵) سنن ابی داؤد کتاب الجنائز۔

(۶) صحیح مسلم باب عیادۃ المریض بطریق مختلفۃ۔

(۷) سنن ابی داؤد کتاب الجنائز۔

(۸) صحیح بخاری کتاب الجنائز۔

(۹) ایضاً

(۱۰) مجمع البحار علامہ طاہر فتنی لفظ عیادت۔

(۱۱) سنن ابی داؤد کتاب الجنائز۔

خیمہ بھی اسی مسجد میں رہتا تھا تاکہ لڑائیوں کے مسلمان زخمیوں کی تیمارداری اور مرہم پٹی کریں۔ [1] غزوات اور لڑائیوں میں بھی بعض ایسی بیبیاں فوج کے ساتھ رہتی تھیں۔ جو بیماروں کی خدمت اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ [2] آپ نے اپنے پیرووں کو عمومیت کے ساتھ حکم دیا ہے کہ ''بھوکے کو کھلاؤ'' قیدی کو چھڑاؤ اور بیمار کی عیادت کرو [3] ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے عیادت کی فضیلت حسب ذیل مؤثر و دلکش طرزِ ادا میں ظاہر فرمائی کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ دریافت فرمائے گا کہ ''اے آدم کے بیٹے! میں بیمار پڑا تو میری عیادت تو نے نہ کی۔'' وہ کہے گا اے میرے پروردگار تو تو سارے جہاں کا پروردگار ہے میں تیری عیادت کیونکر کرتا فرمائے گا ''کیا تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا بندہ بیمار ہوا مگر تو نے اس کی عیادت نہ کی اگر کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ [4] تعلیم کی یہ طرزِ ادا بیمار پرسی بیماروں کی تیمارداری اور غم خواری کی کیسی دل نشین تلقین ہے اور صابر و شاکر بیمار کی کیسی ہمت افزائی ہے کہ اس کا رب گویا اس کے سرہانے کھڑا اپنی مہربانیوں سے اسے نوازتا رہتا ہے اور اس کے درجوں اور رتبوں کو بلند کرتا رہتا ہے اور کیسے خوش قسمت وہ لوگ ہیں، جو ان بیماروں کی خدمت کر کے خدا کا قرب پاتے ہیں۔

غلاموں کے حقوق

انسانیت کے کمزور اور ناتواں طبقوں میں غلاموں کی بھی ایک جماعت ہے۔ ہم کو دنیا کی تاریخ جب سے معلوم ہے یہ طبقہ موجود نظر آتا ہے، قوی اور فاتح قوموں نے ہمیشہ مفتوح قوم کے افراد کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہے، یعنی خود بادشاہ بن کر عیش و راحت سیر و تفریح اور حکومت و شہنشاہی کے کام کیے اور مفتوح افراد سے کان کنی، کاشت کاری اور محنت مزدوری کے مشقت والے کام لیے۔ ہندوؤں میں اچھوت قومیں اس کی یادگار ہیں، مصریوں میں قیدی بنی اسرائیل کی یہی کیفیت تھی، رومیوں میں غیر رومی اسی غلامی اور مشقت و محنت کے کاموں میں مصروف رکھے جاتے تھے اور عربوں میں بھی ان کے ساتھ یہی برتاؤ تھا۔ بلکہ عربوں میں قبائلی نظام ہونے کے سبب سے ہر وہ شخص جو کسی قبیلہ سے وابستہ نہ تھا۔ وہ مظلوم ہر قبیلہ کے آدمیوں کے ظلم و ستم کا تختۂ مشق تھا۔ کیونکہ اس کو اپنی حفاظت کے لیے کسی قبیلہ کی قوت حاصل نہ تھی۔ چنانچہ اسلام کے آغاز میں ظالم قریشیوں نے جن لوگوں پر سب سے زیادہ ستم ڈھائے وہ یہی تھے۔ اسلام زیردستوں کی مدد اور کمزوروں کی حمایت میں اٹھا تھا۔ نبوت سے پہلے آنحضرت ﷺ نے جس معاہدۂ فضول میں شرکت کی تھی اور جس کو نبوت کے بعد بھی پورا کرنا اپنا فرض جانتے تھے وہ اسی غرض سے منعقد ہوا تھا کہ ان زیردستوں کی حفاظت اور حمایت کی جائے۔ اسی لیے اسلام کی آواز پر

(۱) سیرۃ ابن ہشام غزوۂ بنی قریظہ و ادب المفرد بخاری باب کیف اصبحت و ابن حجر وغیرہ میں حضرت رفیدہؓ کا حال پڑھیے۔

(۲) صحیح مسلم غزوۃ النساء۔

(۳) مسند احمد صفحہ ۳۹۴/۴۔

(۴) صحیح مسلم باب فضل عیادۃ المریض۔

قریش کے رئیسوں سے پہلے قریش کے غلاموں اور کنیزوں نے لبیک کہا۔ چنانچہ زیدؓ بن حارثہ خبابؓ بن الارت بلال حبشیؓ یاسر یمنیؓ عمار صہیبؓ رومی ابوفکیہہؓ عامر بن فہیرہ اور سالمؓ غلاموں میں اور لبینہؓ زنیرہؓ نہدیہؓ ام عبیسؓ اور سمیہؓ لونڈیوں میں سب سے پہلے اسلام کے آغوش میں آئیں اور زیدؓ بن حارثہ کے سوا جو آنحضرت ﷺ کے سایہ میں پرورش پا رہے تھے۔ سب نے اسلام کی محبت اور الفت میں سخت سے سخت کڑیاں جھیلیں اور بعض نے اسی راہ میں اپنی جانیں بھی دیں۔

اسلام نے غلاموں کی آزادی اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کو اپنی تحریک کا لازمی جز بنالیا تھا۔ غلاموں کی آزادی کو بڑے ثواب کا کام قرار دیا تھا۔ سورہ بلد میں جو مکہ میں نازل ہوئی تھی جن کاموں کو ''گھاٹی'' بتایا گیا ہے ان میں ایک ﴿فَكُّ رَقَبَةٍ﴾ (گردن سے غلامی کی رسی کو کھولنا) بھی ہے۔ چنانچہ مکہ کی پر خطر زندگی میں بھی حضرت خدیجہؓ حضرت ابوبکرؓ اور دوسرے اہلِ ثروت مسلمانوں نے بہت سے غلاموں کو کافروں سے خرید کر آزاد کر دیا۔ (۱)

مدینہ آکر اس تحریک نے اور فروغ پایا ''تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ'' یعنی گردن کو آزاد کرنا بہت سی فرو گذاشتوں کا کفارہ قرار پایا اور غلاموں کے آزاد کرنے کے لیے بہت سی ترغیبات کا اعلان کیا گیا۔ صحابہ نے اپنے پیغمبر کی اس آواز پر لبیک کہا اور چند روز میں غلاموں کی دنیا کچھ سے کچھ ہوگئی۔ حضرت حکیم بنؓ حزام نے جو فتح مکہ کے دن اسلام لائے ہیں اسلام کے بعد سو غلام آزاد کیے۔ (۲) حضرت عائشہؓ نے صرف ایک قسم کے کفارہ میں چالیس غلام آزاد کیے۔ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ نے ایک ہزار اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے تیس ہزار غلاموں کو آزادی کی نعمت عطا کی۔ (۳) شرک کی ممانعت کے بعد اللہ کا دوسرا حکم یہ کہ اس کے بندوں کے ساتھ نیکی کی جائے ان بندوں میں سرِ فہرست جن لوگوں کے نام ہیں ان میں یہ مظلوم فرقہ بھی ہے فرمایا:

﴿وَ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسَاكِيْنِ وَ الْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا﴾ (نساء:۳۶)

''اور اللہ کو پوجو اور کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ دار کے ساتھ اور یتیموں کے ساتھ اور عزیز پڑوسی اور بیگانہ پڑوسی کے ساتھ اور پہلو کے رفیق کے ساتھ اور مسافر کے ساتھ اور اس کے ساتھ جس کے تمہارے ہاتھ مالک بن گئے ہیں اور اللہ غرور اور فخاری کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔''

(۱) صحیح مسلم کتاب الایمان۔
(۲) صحیح بخاری جلد دوم کتاب الآداب باب الہجرۃ۔
(۳) یہ دونوں تعدادیں امیر اسماعیل نے شرح بلوغ المرام کتاب العتق میں نقل کی ہیں۔

یہ آخری ہستی وہی ہے جس کو دنیا غلام کہہ کر پکارتی ہے لیکن اسلام نے اس کی بھی ممانعت کر دی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ کوئی آقا اپنے غلام کو میرا عبد نہ کہے بلکہ فتائی میرا جوان کہے اور اس طرح غلاموں کو ممانعت کی کہ وہ اپنے آقاؤں کو رب نہ کہیں بلکہ مولیٰ کہیں۔ (۱) اس طرح ان ذلت کے الفاظ کا بھی خاتمہ کر دیا اور فرمایا کہ یہ جن کو تم غلام کہتے ہو یہ بھی تمہارے بھائی ہیں جن کو خدا نے تمہارے تحت میں کر دیا ہے۔ پس جس کو خدا نے تمہارے تحت کر دیا ہے تو اس کو وہ کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو۔ اور اس کو اتنا کام دے دو جو اس پر بھاری نہ ہو جائے اور جو بھاری کام بھی دے تو اس کے کام میں خود بھی شریک ہو کر اس کی مدد کرے۔ (۲) حضور ﷺ کے اس حکم پر صحابہؓ نے اس طرح عمل کیا کہ ان کے غلاموں اور آقاؤں کے درمیان تمیز مشکل ہو گئی تھی (۳) ان بے خانماں افراد کو ان کے آقاؤں کے گھروں کا غلام بنا کر نہیں بلکہ ایک طرح سے ارکان اور ممبر بنا رکھا ہے کہ جس غلام کو آزاد کرے گا وہ اسی کے علاقہ مندون (موالی) میں شمار ہوگا۔ (۴) حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں فوجی افسروں کو حکم دیا تھا کہ رومی اور عجمی آزاد غلام جو مسلمان ہو گئے ہوں۔ ان کو ان کے قدیم آقاؤں کے خاندانوں میں شمار کرو۔ جو ان کا حق ہو وہ ان کا ہو اور اگر یہ غلام چاہیں تو اپنا ایک الگ مستقل قبیلہ بنا لیں۔ (۵) ان تعلیمات نے ان غلاموں کو غلام نہیں بلکہ اسلام کا سردار اور مملکتوں کا بادشاہ بنا دیا' اسلام کی تاریخ ان واقعات سے لبریز ہے جس کی تفصیل آئندہ جلد میں اپنے مناسب موقع پر آئے گی۔

مہمان کے حقوق

موجودہ نظامِ تمدن میں گو مہمانی کی زحمت ہوٹلوں اور ریسٹرانوں نے اپنے سر لے لی ہے۔ مگر گذشتہ نظامِ تمدن میں اس کی جگہ نہایت اہم تھی اور اب بھی مہمان نوازی مشرقی تمدن کے خمیر میں داخل ہے اور مغربی تمدن نے بھی اس کی رسمی حیثیت کو باقی رکھا ہے۔ ہر انسان کسی نہ کسی وقت کسی کا مہمان ہوتا ہے۔ اس لیے کہنا چاہیے کہ سوسائٹی کے نظام میں اس کی حیثیت مبادلۂ اخلاق کی ہے۔ آج ہم اپنے مہمان کے ساتھ نیک سلوک اور عزت کا برتاؤ کریں گے تو کل وہ ہمارے ساتھ کرے گا۔ گذشتہ مذاہب کے اخلاق میں مہمان نوازی کی تعلیم کا ذکر

(۱) صحیح بخاری کتاب العتق۔

(۲) صحیح بخاری جلد دوم کتاب الاداب باب ما نھی عن السباب۔

(۳) صحیح بخاری جلد دوم کتاب الاداب باب ما نھی عن السباب۔

(۴) حدیث میں ہے **انما الولاء لمن اعتق** ولاء کا حق اسی کو ہے جو آزاد کرے۔ دوسری حدیث میں او انتمی الی غیر موالیه فعلیه لعنة الله۔ الخ جو غلام آزاد ہو کر اپنے غیر آقا کی طرف اپنے کو منسوب کرے تو اس پر خدا کی لعنت' امام نووی شرح میں لکھتے ہیں بل ہو لحمة کلحمة النسب یعنی آزاد غلام اور آقا کے درمیان ولاء تعلق نسب کے تعلق کی طرح ہے۔ (صحیح مسلم کتاب العتق)

(۵) کتاب الاموال ابی عبید قاسم بن سلام المتوفی ۲۲۴ھ مطبوعہ مصر ص ۲۲۵۔

خصوصیت کے ساتھ نہیں لیکن اہل عرب میں مہمان کا بہت بڑا حق سمجھا جاتا تھا۔ مہمان کی خدمت اور حفاظت میزبان اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اسلام آیا تو اس نے اس فرض کی اہمیت کو اور بڑھایا۔

قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا ذکر سورۂ الذاریات کی ان آیتوں میں آیا ہے:

﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ○ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ○ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ○ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ○ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً قَالُوْا لَا تَخَفْ وَ بَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ○﴾ (ذاریات: ۲۴۔۲۸)

''(اے پیغمبر!) ابراہیم کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی تم تک پہنچی ہے کہ جب (یہ لوگ) ان کے پاس آئے تو (آتے ہی) سلام علیک کی۔ ابراہیم نے سلام کا جواب دیا (اور دل میں کہا کہ یہ) لوگ (تو کچھ) اجنبی (سے معلوم ہوتے) ہیں۔ پھر جلدی سے اپنے گھر جا (ایک) موٹا تازہ بچھڑا (یعنی اس کا گوشت بھنوا کر مہمانوں کے لیے) لائے اور ان کے سامنے رکھا تو انہوں نے تامل کیا (ابراہیم نے) پوچھا آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں۔ (اس پر بھی انہوں نے کھانے سے انکار کیا تب) تو ابراہیم ان سے جی ہی جی میں ڈرے انہوں نے (ان کی حالت دیکھ کر) کہا کہ آپ (کسی طرح کا) اندیشہ نہ کریں اور ان کو ایک ہوشیار فرزند کی خوش خبری بھی دی۔''

اس حکایت سے آدابِ مہمان داری کے متعلق حسب ذیل نتیجے نکالے جا سکتے ہیں۔ (۱) مہمان اور میزبان میں کلام کی ابتدا باہمی سلام سے ہونا چاہیے۔ (۲) مہمان کے کھانے پینے کا فوراً سامان کرنا چاہیے کیونکہ ''روغان'' کے معنی سرعت کے ہیں۔ (۳) روغان کے ایک معنی چپکے چلے جانے یا دزدیدہ نگاہوں سے دیکھنے کے بھی ہیں۔ اس لیے مہمانوں کے کھانے کا سامان مخفی طور پر ان کی نگاہ سے بچا کر کرنا چاہیے۔ کیونکہ اگر مہمانوں کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے لیے کچھ سامان کیا جا رہا ہے۔ تو وہ ازراہِ تکلف اس کو روکیں گے۔ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اہل و عیال سے یہ نہیں کہا کہ کھانے پینے کا سامان کرو۔ بلکہ چپکے سے خود کھانے پینے کا سامان کرنے چلے گئے۔ (۴) کسی بہانے تھوڑی دیر کے لیے مہمانوں سے الگ ہو جانا چاہیے تاکہ ان کو آرام کرنے یا دوسری ضروریات سے فارغ ہونے میں تکلیف نہ ہو۔ اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کھانے پینے کا سامان کرنے کے لیے ان سے الگ ہو گئے۔ (۵) مہمانوں کے سامنے عمدہ سے عمدہ کھانا پیش کرنا چاہیے۔ اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک موٹا تازہ بچھڑا ذبح کیا۔ (۶) کھانا مہمانوں کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔ ان کو کھانے کا حکم نہیں دینا چاہیے۔ اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے کہا آپ لوگ کیوں نہیں کھاتے یہ نہیں کہا کہ آپ لوگ کھائیے۔ (۷) مہمانوں کے کھانے سے مسرور اور نہ کھانے سے مغموم ہونا چاہیے کیونکہ جو لوگ بخیل ہوتے ہیں وہ کھانے تو مہمانوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں لیکن ان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ مہمان نہ

کھائے تاکہ وہ کھانا ان کے اوران کے اہل وعیال کے کام آئے۔اسی لیے جب ان لوگوں نے کھانے سے انکار کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو ناپسند کیا۔اوران کے دل میں خطرہ پیدا ہوا کہ یہ دشمن بن کر تو نہیں آئے ہیں۔(۸) نہ کھانے کی حالت میں مہمانوں کو عمدہ الفاظ میں عذر کرنا چاہیے اسی لیے ان فرشتوں نے کہا اگر ہم نہیں کھاتے تو آپ کو خوف زدہ نہ ہونا چاہیے کیونکہ ہم لوگ کھا پی نہیں سکتے بلکہ صرف آپ کو ایک لائق فرزند کے تولد کی بشارت دینے کے لیے آئے ہیں۔

سورۂ حجر میں حضرت لوط علیہ السلام کے مہمان فرشتوں کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آرام وآسائش کے ساتھ میزبان مہمان کی عزت وآبرو کا بھی محافظ ہوتا ہے۔اس لیے اگر کوئی شخص اس کے ساتھ اہانت آمیز برتاؤ کرنا چاہے تو میزبان کا یہ فرض ہے کہ مہمان کی جانب سے مدافعت کرے کیونکہ اس سے خود میزبان کی توہین ہوتی ہے۔اسی لیے جب قوم لوط نے ان مہمان فرشتوں کے ساتھ توہین آمیز برتاؤ کرنا چاہا تو حضرت لوط علیہ السلام نے۔

﴿قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَیْفِیْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ○ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ﴾ (حجر:۵)

''کہا یہ میرے مہمان ہیں۔تو (ان کے بارے میں) مجھ کو فضیحت نہ کرو۔اور خدا سے ڈرو اور مجھے رسوا نہ کرو۔''

یہ تو قرآن مجید کے ضمنی اشارات تھے لیکن رسول اللہ ﷺ نے مکارمِ اخلاق میں مہمان نوازی کو بہ تصریح اس قدر اہمیت دی کہ اس کو ایمانِ کامل کا ایک جزو قرار دیا۔اور جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے اور جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کا جائزہ عزت کے ساتھ دے۔'' کہا گیا ہے کہ یا رسول اللہ اس کا جائزہ کیا ہے؟ فرمایا ''کہ ایک دن اور ایک رات اور مہمانی تین دن کی ہے اس کے آگے مہمان پر صدقہ ہوگا۔'' نیز فرمایا کہ جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان [1] لایا ہے۔اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے اور جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے قرابت کے تعلقات کو جوڑے رکھے۔[2]

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کیا مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم رات بھر نماز پڑھتے ہو اور دن کو روزہ رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا بے شک۔فرمایا ایسا نہ کرو نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی روزہ بھی رکھو اور بے روزہ بھی رہو کیونکہ تمہارے اوپر تمہارے جسم کا بھی حق ہے تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے، تمہارے مہمانوں کا بھی حق ہے اور تمہاری بی بی کا بھی حق ہے۔[3] ایک حدیث میں ہے کہ ایک شب کی

(۱) بخاری کتاب الادب باب من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلا یوذ جارہ۔

(۲) بخاری کتاب الادب باب اکرام الضیف وخدمتہ ایاہ بنفسہ وقولہ تعالیٰ ضیف ابراہیم المکرمین۔

(۳) بخاری کتاب الادب باب حق الضیف۔

مہمانی تو واجب ہے۔ پھر اگر مہمان کسی کے یہاں رہ جائے تو مہمانی اس پر قرض ہے چاہے وہ لے لے چاہے چھوڑ دے۔"(۱)

چونکہ کہیں مہمان ہونا میزبان کے لیے بہرحال یک گونہ تکلیف کا باعث ہے اور کسی کے ہاں بے وجہ مفت کھانا انسانی اور اسلامی غیرت کے خلاف ہے۔ اس لیے ضرورت تھی کہ جہاں میزبان کو مہمان کی خاطر تواضع اور تعظیم و تکریم کی ہدایت کی گئی ہے۔ وہاں مہمان کو بھی یہ بتا دیا جائے کہ وہ کسی دوسرے کے خوانِ کرم سے حدِ ضرورت سے زیادہ فائدہ نہ اٹھائے چنانچہ احادیث میں یہ تصریح کر دی گئی ہے کہ مہمان کو کسی کے یہاں تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہرنا چاہیے کیونکہ اس سے صاحبِ خانہ کو تکلیف ہوگی اور اس پر بار پڑے گا۔(۲) اس کے علاوہ تین دن سے زیادہ کی مہمانی صدقہ ہو جائے گی، جس کو خود غیور اور خوددار مہمان پسند نہ کرے گا۔

مسلمانوں کے باہمی حقوق

آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے عرب کا بچہ بچہ ایک دوسرے کے خوں کا پیاسا اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا دشمن تھا۔ ایک ایک خون کا بدلہ کئی کئی پشتوں تک جا کر لیتے تھے۔ اس طرح خاندانوں میں لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا اور ہر شخص اپنی جگہ پر اپنے کو ہمیشہ خطروں میں گھرا ہوا پاتا تھا اور اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے ہر وقت چوکنا رہتا تھا کہ کوئی اس پر حملہ نہ کر بیٹھے۔ آنحضرت ﷺ تشریف لائے تو اپنے ساتھ خون کے رشتہ سے بڑھ کر ایک اور رشتہ لائے۔ اور وہ دین کا رشتہ تھا۔ جس نے مدت کے بچھڑوں کو ملا دیا۔ دشمنوں کو بھائی بھائی بنا دیا اور خاندانی و قبائلی یگانگی سے بڑھ کر اسلامی برداری کی یگانگی ان کے اندر پیدا کر دی جس نے اس طرح ان کی ہر قسم کی عداوتوں کا خاتمہ کر دیا اور باہمی دشمنیوں کو ان کے دلوں سے ایسا بھلا دیا کہ وہ حقیقت میں بھائی بھائی ہو گئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا﴾ (آل عمران:۱۱)

"اے مسلمانو! خدا سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور نہ تم مرو لیکن مسلمان۔ اور خدا کی رسی سب مل کر مضبوطی سے پکڑے رہو اور ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو، اور تم اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو کہ تم دشمن تھے۔ تو اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا پھر تم بھائی بھائی ہو گئے۔"

مسلمانوں کے اس باہمی میل ملاپ اور محبت کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص فضل ظاہر فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اگر

(۱) ابن ماجہ کتاب الادب باب حق الضیف۔

(۲) بخاری کتاب الادب باب اکرام الضیف وخدمتہ ایاہ بنفسہ۔

کوئی روئے زمین کا سارا خزانہ بھی لٹا دیتا تو ان دشمنوں کو باہم ملا کر ایک نہیں کر سکتا تھا۔

﴿وَ اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ (انفال:۶۳)

''اور خدا نے مسلمانوں کے دل ملا دیے! اگر تو زمین میں جو کچھ ہے سب خرچ کر دیتا تب بھی تو ان کے دلوں کو ملا نہ سکتا لیکن خدا نے ملا دیا بے شک وہ (ہر مشکل پر) غالب آنے والا اور مصلحت جاننے والا ہے۔''

تو اب مسلمانوں کو یہ چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل کی قدر کریں۔ اور سب مل کر خدا کے دین کی رسی کو جو ان کی یگانگی کا اصلی رشتہ ہے، مضبوط پکڑیں اور باہم اختلاف پیدا کر کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائیں کیونکہ اس رسی کی مضبوطی اسی وقت تک ہے جب تک سب مل کر اس کو پکڑے رہیں، فرمایا:

﴿وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ﴾ (انفال:۴۶)

''اور اللہ اور رسول کا کہا مانو، اور آپس میں جھگڑا نہ کرو (کہ ایسا ہو گا تو) ہمت ہار دو گے، اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔''

یہی باہمی اتفاق واتحاد، ملتِ اسلامیہ کی عمارت کا ستون ہے اور مسلمانوں کی جماعت کا شیرازہ اس شیرازہ کے استحکام کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ مسلمانوں میں باہم الفت ومحبت ہو اب اگر اتفاق سے ان میں اختلاف پیش آ جائے تو اس کے دور کرنے کی صورت یہ ہے کہ دونوں خدا اور رسول کے حکم کی طرف رجوع کریں۔

﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ﴾ (نساء:۵۹)

''تو اگر تم (مسلمانوں) میں کسی بات میں جھگڑا ہو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔''

اگر یہ جھگڑا بڑھتے بڑھتے جنگ تک پہنچ جائے تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ جو فریق ظالم ہو سب مل کر اس سے لڑیں اور اس کو صلح پر مجبور کریں اور جب وہ راضی ہو جائے تو عدل وانصاف سے ان میں صلح کرا دیں۔

﴿وَ اِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَ اَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۞ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ﴾ (حجرات:۹۔۱۰)

''اگر مسلمان کے دو گروہ لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو، پھر اگر ایک دوسرے پر ظلم کرے تو ظلم کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو تو اگر وہ رجوع کر لے تو ان میں عدل کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو۔ خدا منصفوں کو دوست رکھتا ہے۔ مومن تو آپس میں بھائی ہی ہیں۔ اپنے دونوں بھائیوں کے درمیان صلح کرا دو۔''

آیت کے اخیر ٹکڑے نے بتایا کہ باہم مسلمانوں میں بھائی کا رشتہ ہے۔ یہ رشتہ جنگ وخون ریزی کے بعد بھی نہیں کٹتا۔ انہی آیتوں کے تحت میں وہ حدیث ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

﴿انصرا خاک ظالمًا او مظلوما﴾ (بخاری)

''تم اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔''

صحابہؓ نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر وہ ظالم ہو تو اس کی مدد کیونکر کی جائے' فرمایا اس طرح کہ اس کے ہاتھوں کو ظلم سے روکا جائے۔

کیسا ہی بڑے سے بڑا کافر اور سخت سے سخت دشمن ہو' جس وقت اس نے کلمۂ شہادت پڑھا اور شریعتِ اسلامی کو قبول کیا وہ دفعتاً ہمارا مذہبی بھائی ہو گیا۔ خدا نے فرمایا:

﴿فَاِنۡ تَابُوۡا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخۡوَانُکُمۡ فِی الدِّیۡنِ﴾ (توبہ:۱۱)

''تو اگر یہ کافر (کفر سے) توبہ کرلیں' اور نماز کھڑی کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے مذہبی بھائی ہیں۔''

غلام بھی اگر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائے تو وہ اسلام کے رشتہ میں داخل ہو گیا۔ اگر اس کے باپ کا نام ونسب نہیں معلوم تو کوئی حرج نہیں' وہ دین کے رشتہ سے ہر مسلمان کا بھائی ہے' فرمایا:

﴿فَاِنۡ لَّمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اٰبَآءَ ھُمۡ فَاِخۡوَانُکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَ مَوَالِیۡکُمۡ﴾ (احزاب:۵)

''تو اگر تم ان کے باپوں کے نام نہ جانو تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں' اور علاقہ مند۔''

ایک مسلمان کسی مسلمان کو قتل کر دے' تب بھی اللہ تعالیٰ مقتول کے رشتہ داروں کو قاتل کا بھائی قرار دے کر اس کے جذبۂ رحم کی تحریک فرماتا ہے' ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَمَنۡ عُفِیَ لَہٗ مِنۡ اَخِیۡہِ شَیۡءٌ﴾ (بقرہ:۱۷۸)

''تو اگر قاتل کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے۔''

ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کی غیبت حرام ہے' کیونکہ:

﴿اَیُحِبُّ اَحَدُکُمۡ اَنۡ یَّاۡکُلَ لَحۡمَ اَخِیۡہِ مَیۡتًا﴾ (حجرات:۱۲)

''کیا تم میں کوئی پسند کرے گا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔''

یتیموں کے مال کی دیکھ بھال اور خوبی سے اس کا انتظام کرنا متولیوں کا فرض ہے۔ اور اگر وہ ان کو اپنے اندر شامل کر کے نیک نیتی کے ساتھ ان کو اپنے کنبہ کا جزو بنالیں۔ اور ملا جلا کر خرچ کریں تو یہ بھی درست ہے کیونکہ یہ ان کے بھائی ہیں۔ جن کی خیرخواہی ان کا فرض ہے' فرمایا:

﴿وَ اِنۡ تُخَالِطُوۡھُمۡ فَاِخۡوَانُکُمۡ﴾ (بقرہ:۲۲۰)

''اور اگر تم ان کو اپنے میں ملا لو تو یہ بھی جائز ہے کیونکہ وہ تمہارے بھائی ہیں۔''

ایک مسلمان بھائی کا دوسرے مسلمان پر یہ بھی حق ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حق میں دعائے خیر کریں۔ وہ یوں کہتے ہیں۔:

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ﴾ (حشر:۱۰)

''اے ہمارے پروردگار! ہم کو اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لائے معاف کر۔''

ایک مسلمان کے دل میں دوسرے مسلمان کی طرف سے کینہ ہونا ایسی برائی ہے جس کے دور کرنے کے لیے خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگنی چاہیے اور کہنا چاہیے:

﴿وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (حشر:۱۰)

''اور ہمارے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے کینہ مت رہنے دے اے ہمارے پروردگار تو مہربان' رحم والا ہے۔''

مسلمانوں کی یہ صفت ہے کہ باہم وہ ایک دوسرے سے رحم وشفقت کے ساتھ پیش آتے ہیں' خدا نے مدح فرمائی:

﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ (المائدۃ) ''وہ (مسلمان) آپس میں رحم وشفقت رکھتے ہیں۔''

مسلمانوں کی یہ صفت ہونی چاہیے کہ وہ دوسرے مسلمان سے جھک کر ملے اور نرمی کا برتاؤ کرے۔

﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (المائدۃ)

''مسلمانوں سے جھکنے اور نرمی کرنے والے۔''

مسلمانوں کی اس باہمی اخوت' محبت اور مہربانی کی مزید تشریح اور تاکید محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان فیض ترجمان سے یوں فرمائی ہے۔ ''مسلمانوں کو باہم ایک دوسرے پر رحم کرنے' محبت کرنے' اور شفقت کرنے میں جسم انسانی کی طرح دیکھو گے کہ اس کے ایک عضو میں بھی تکلیف ہو تو بدن کے سارے اعضا بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ (۱) صحیح مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ فرمایا ''سارے مسلمان مل کر ایک آدمی کے مثل ہیں کہ اگر اس کی آنکھ بھی دکھے تو سارا بدن دکھ محسوس کرتا ہے اور اگر سر میں درد ہو تو پورا جسم تکلیف میں ہوتا ہے۔''(۲) مقصود یہ ہے کہ امتِ مسلمہ ایک جسم ہے اور اس کے سارے افراد اس کے اعضا ہیں' بدن کے ایک عضو میں بھی اگر کوئی تکلیف یا دکھ درد ہو تو سارے اعضا اس تکلیف کو محسوس کرتے ہیں اور اس دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ یہی مسلمانوں کا حال ہونا چاہیے کہ ان میں سے ایک کو بھی تکلیف پہنچے تو سارے مسلمانوں کو وہ تکلیف محسوس ہونی چاہیے۔

ایک دوسری تمثیل میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ ''مسلمان باہم ایک دوسرے سے مل کر اس طرح مضبوط

(۱) صحیح بخاری جلد۲ صفحہ ۸۸۳ کتاب الادب وصحیح مسلم ج۲ ص ۳۸۹ کتاب البر والصلۃ والاداب مصر۔

(۲) صحیح مسلم ج۲ ص ۳۸۹ مصر کتاب البر والصلۃ والادب۔

ہوتے ہیں جیسے دیوار کہ اس کے ایک حصہ سے اس کا دوسرا حصہ زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔[۱] بخاری میں ہے کہ یہ کہہ کر آپؐ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھایا' کہ کیسے ایک حصہ مضبوط ہوتا ہے اس تمثیل میں آپؐ نے یہ ارشاد فرمایا کہ جس طرح دیوار کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے مل کر مضبوط ہو کر نا قابل تسخیر حصن وحصار بن جاتی ہے اسی طرح جماعتِ اسلامیہ ایک قلعہ ہے جس کی ایک ایک اینٹ ایک ایک مسلمان ہے۔ یہ قلعہ اسی وقت تک محفوظ ہے۔ جب تک اس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے ملی ہوئی ہے۔ جب یہ اینٹ اپنی جگہ سے کھسک جائے گی تو پوری دیوار دھم سے زمین پر آ جائے گی۔ ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ ''ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ وہ اس پر ظلم کرے' نہ اس کو بے مدد چھوڑے۔ اور نہ اس کی تحقیر کرے۔ مسلمان کا ہر حصہ دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔ اس کا خون' اس کا مال اور اس کی آبرو۔''[۲] یہ صحیح مسلم کی روایت ہے۔ ابوداؤد میں ہے کہ فرمایا۔ ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے' تو وہ نہ اس پر ظلم کرے اور نہ اس کو اس کے دشمن کے حوالہ کرے جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں رہے گا تو خدا اس کی ضرورت پوری کرے گا۔[۳] جو کوئی کسی مسلمان کی تنگی کو دور کرے گا تو خدا اس کے بدلہ قیامت میں اس کی تنگی کو دور فرمائے گا اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کا پردہ رکھے گا۔''[۴]

ابوداؤد کی دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا ''جو کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا' تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکلیفوں میں سے کسی پر آسانی کرے گا اور جو کسی مسلمان کا پردہ رکھے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا میں اور آخرت میں اس کا پردہ رکھے گا۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی مدد میں رہتا ہے جب تک وہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔

فرمایا ''مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں۔''[۵] یہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے۔ دوسری میں ہے کہ لوگوں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! سب سے اچھا مسلمان کون ہے فرمایا جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں۔[۶] یعنی جو مسلمان اپنے ہاتھ اور زبان سے کسی دوسرے مسلمان کو تکلیف نہیں پہنچاتا وہی سب سے بہتر مسلمان ہے۔ جریرؓ بن عبداللہ بجلی جو ایک مشہور صحابی تھے کہتے ہیں کہ ''میں نے رسول اللہ ﷺ سے تین باتوں پر بیعت کی نماز کو قائم رکھنا' زکوٰۃ دینا' اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا۔''[۷] کئی

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الآداب ج ۲ ص ۸۹۰ صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ والآداب ۲ صفحہ ۳۸۹ مصر۔
(۲) صحیح مسلم کتاب مذکور ج ۲ ص ۳۸۲ مصر۔
(۳) سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۱۹۴۔
(۴) صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۱۳۔
(۵) صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۱۲
(۶) صحیح مسلم کتاب ایمان ج ۱۔
(۷) صحیح بخاری کتاب ایمان ج ۱ ص ۶۔

روایتوں میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔ ''مسلمان کو گالی دینا خدا کی نافرمانی (فسوق) ہے۔ اور اس سے لڑنا (قتال) خدا کا انکار (کفر) ہے۔''(۱) یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں باہم برادری اور صلح و آشتی کا حکم دیا ہے اب جو اس کے خلاف کرتا ہے وہ خدا کے حکم کو نہیں مانتا اور یہ ایک معنی میں خدا کا انکار ہی ہے۔ چنانچہ اسی لیے قرآن پاک میں مسلمان کے ناحق اور بالارادہ قتل کرنے کی سزا وہی رکھی ہے جو کافروں کے لیے مخصوص ہے' فرمایا ''کسی مسلمان کو سزاوار نہیں کہ وہ دوسرے مسلمان کو قتل کرے الا یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔''

﴿وَ مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَه وَ اَعَدَّلَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا﴾ (نساء:۹۳)

''اور جو کوئی کسی مسلمان کو قصداً قتل کرے گا' تو اس کا بدلہ دوزخ ہے وہ اس میں پڑا رہے گا' اور خدا اس پر خفا ہوا اور لعنت کی اور اس کے لیے بڑا عذاب تیار کیا۔''

حجۃ الوداع کے نہایت اہم خطبہ میں آپؐ نے پہلے لوگوں کو چپ کرایا۔ پھر فرمایا: ''دیکھو میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔''(۲) ایک اور موقع پر فرمایا کہ جو ہم (مسلمانوں) پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں نہیں۔''(۳) جان تو بڑی چیز ہے کسی مسلمان کی آبرو کے پیچھے پڑنا بھی بڑا گناہ ہے۔ فرمایا ''سب سے بڑا ربا کسی مسلمان کی آبرو کی طرف بے سبب ہاتھ بڑھانا ہے۔(۴) اگر کوئی مسلمان کسی ایسے مخمصہ میں گرفتار ہو جس میں اس کی آبرو جانے کا ڈر ہو تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کے بچانے کی کوشش کرے۔'' ارشاد ہوا ''جو کوئی کسی مسلمان کو کسی ایسے موقع پر بے مدد چھوڑ دے گا جس میں اس کی عزت پر حرف آتا ہے اور اس کی آبرو جاتی ہو تو خدا بھی اس کو ایسی جگہ بے مدد چھوڑے گا۔ اور جو کوئی کسی مسلمان کی ایسے موقع پر مدد کرے گا تو خدا بھی اس کی ایسے موقع پر مدد فرمائے گا۔'' (۵)

اگر دو مسلمانوں میں کسی ناراضگی کے سبب سے بول چال بند ہو جائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین روز سے زیادہ ایسا کرنے سے منع فرمایا: ارشاد ہوا کہ کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی کو چھوڑ دے ملاقات ہو تو وہ ادھر منہ پھیر لے اور یہ ادھر منہ پھیر لے' اور ان میں بہتر وہ ہے کہ جو پہلے سلام کی ابتدا کرے۔(۶) ایک اور طریقہ سے یہ روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا ''آپس میں کینہ نہ رکھو' حسد نہ کرو اور ایک

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۱۳ و ج ۲ ص ۸۹۳۔

(۲) صحیح بخاری کتاب الایمان صفحہ ۲۳۔

(۳) صحیح بخاری کتاب الدیات ج ۲ ص ۱۰۱۵ و کتاب الفتن ج ۲ ص ۱۰۴۰۔

(۴) سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۱۸۹۔

(۵) ایضاً۔

(۶) صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ ص ۹۲۱ سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۱۹۲۔

دوسرے کو پیٹھ پیچھے برا نہ کہو' اے خدا کے بندو! بھائی بھائی ہو جاؤ' اور کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ بولنا چالنا چھوڑ دے۔''(۱) ایک مسلمان کے لیے اس کی عزت و آبرو سے بڑھ کر معاملہ اس کے ایمان کا ہے قرآن نے کہا کہ جب تم کو کوئی اپنے اظہارِ اسلام کے لیے سلام کرے تو اس کو یہ نہ کہو کہ تو مسلمان نہیں۔

﴿وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰی اِلَیْکُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا﴾ (نساء:۹۴)

''اور اس کو جو تمہاری طرف سلامتی کا کلمہ ڈالے یہ نہ کہو تو مومن نہیں۔''

مقصد یہ ہے کہ کوئی اپنے کو مسلمان کہے یا وہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے کسی مسلمان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کہے کہ تم مسلمان نہیں۔ ایک لڑائی میں ایک صحابیؓ نے ایک کافر کو زد میں پا کر حملہ کیا۔ اس نے فوراً کلمہ پڑھ دیا۔ مگر اس پر بھی ان صحابیؓ نے اس کو قتل ہی کر دیا۔ یہ خبر آنحضرت ﷺ تک پہنچی۔ آپؐ نے ان کو بلا کر دریافت کیا۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اس نے صرف ڈر سے کلمہ پڑھا تھا۔ آپؐ نے کس بلیغ انداز میں فرمایا ''تم اس کے لا الہ الا اللہ کے ساتھ کیا کرو گے۔'' ایک روایت میں ہے کہ فرمایا کیا تم نے اس کا سینہ چیر کر دیکھ لیا تھا۔ (۲)

ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ ''مومن کو لعنت کرنا یا اس پر کفر کی تہمت رکھنا اس کے قتل کے برابر ہے۔''(۳) یہ بھی فرمایا کہ جو کوئی اپنے بھائی کو اے کافر کہے۔ تو وہ کفر دو میں سے ایک پر لوٹے گا۔''(۴) یعنی اگر وہ درحقیقت کافر نہ تھا تو اس نے ایک مسلمان کو کافر کہا' اور یہ خود ایک درجہ کا کفر ہے' جان' ایمان اور آبرو کے بعد مال کا درجہ ہے' ارشاد ہوا کہ ''جو کوئی قسم کھا کر کسی مسلمان کا حق مارے گا تو خدا اس کے لیے دوزخ واجب' اور جنت حرام کرے گا' ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اگر کوئی معمولی سی چیز ہو تب بھی فرمایا درخت کی ایک شاخ ہی کیوں نہ ہو۔ (۵) فرمایا ہر مسلمان پر اس کے مسلمان بھائی کے پانچ حق ہیں۔ سلام کا جواب دینا' اس کے چھینکنے پر خدا تم پر رحمت کرے کہنا' اس کی دعوت کو قبول کرنا' بیمار ہو تو عیادت کرنا' اور مر جائے تو اس کے جنازہ کے ساتھ چلنا' (۶) یعنی یہ کم سے کم حقوق ہیں جن سے دو مسلمانوں کے درمیان خوش خلقی اور حسنِ تعلق کا اندازہ ہوتا ہے۔ ارشاد ہوا کہ ''جب کوئی مسلمان اپنے بیمار مسلمان بھائی کی عیادت کو جاتا ہے تو وہ جب تک واپس نہ ہو۔ جنت کی روش پر ہوتا

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ص ۸۹۶۔

(۲) پہلی روایت صحیح بخاری غزوہ حرقات اور کتاب الدیات میں ہے' دوسری روایت کے لیے دیکھو فتح الباری کتاب الدیات شرح حدیث مذکور۔

(۳) صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ص ۸۹۳۔

(۴) ایضاً ص ۹۰۱ صحیح مسلم کتاب الایمان ج ۱ص ۴۳ مصر۔

(۵) صحیح مسلم کتاب الایمان ج ۱ص ۶۵ مصر۔

(۶) سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ص ۳۰۱۔

ہے۔“[۱] حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ ”جو کوئی ایمان و اخلاص کے ساتھ کسی کے جنازہ کے پیچھے چلتا ہے یہاں تک کہ اس پر نماز پڑھتا ہے اور اس کے دفن سے فراغت پاتا ہے تو اس کو ثواب کی دو رتی (قیراط) ملتی ہے۔ جس میں سے ہر رتی احد کے پہاڑ کے برابر ہوگی۔“[۲] یعنی یہ رتی دنیاوی پیمانہ کے حساب سے نہ ہوگی بلکہ یہ اس پیمانہ سے ہوگی جس کا ایک ذرہ اپنی بڑائی میں پہاڑ کا حکم رکھتا ہے۔

یہ تمام حقوق جن کے جزئیات کا احاطہ نہیں ہوسکتا اس برادرانہ الفت و محبت کے فروغ ہیں۔ جن کے بغیر کسی مومن کا ایمان کامل نہیں ہوتا۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے اسلام کا کلمہ پڑھنے والوں کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ ”تم میں سے کوئی کامل مومن نہ ہوگا۔ جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لئے چاہتا ہے۔“[۳] الغرض ملتِ اسلامیہ کی جماعت کا ہر رکن دوسرے کے ساتھ ایسی محبت کرے جیسی وہ خود اپنے ساتھ کرتا ہے۔ اس کا نفع اپنا نفع اور اس کا نقصان اپنا نقصان سمجھے۔ ابوداؤد میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا مسلمان مسلمان کا آئینہ ہے اور مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ اس کے نقصان کو دور کرتا ہے اور اس کے پیچھے میں اس کی حفاظت کرتا ہے۔“[۴] دیکھیے کہ آنحضرت ﷺ نے جماعتِ اسلامیہ کی عمارت کیسی مستحکم بنیادوں پر قائم فرمائی تھی، اگر آج بھی ان ہدایتوں پر عمل کیا جائے تو اس عمارت کی دیواریں ایسی شکستہ نہ رہیں، جیسی آج ہیں، ہر جماعت انہی اصولوں پر دنیا میں بنی ہے۔ اور آئندہ بھی بنے گی۔

انسانی برادری کا حق

ایک انسان کے دوسرے انسان پر انسانی برادری کی حیثیت سے بھی کچھ فرائض ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا ہر مسلمان کا مذہبی فرض ہے تبلیغ یعنی غیر مسلم انسانوں کو اسلام کی دعوت کا جو حکم ہے اس کے دوسرے اسباب کے علاوہ ایک سبب یہ بھی ہے کہ جس چیز کو ایک مسلمان سچائی سمجھتا ہے اس کا انسانی فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے انسان کو آگاہ اور باخبر کرے اور یہ انسانی خیر خواہی کا لازمی نتیجہ ہے۔

قرآن پاک نے تورات کے بعض احکام کو دہرایا ہے، جن میں سے ایک یہ بھی ہے:

﴿وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ (بقرہ:۸۳)

”اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔“

لوگوں سے اچھی بات کہنا اور اچھائی سے پیش آنا انسانیت کا فرض ہے جس میں کسی دین و مذہب کی تخصیص

(۱) صحیح مسلم ص ۳۸۴ کتاب البر والصلۃ۔

(۲) صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۱۲۔

(۳) صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۶۔

(۴) سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۱۹۲ تیسرے فقرہ کے مطلب میں شارحین کا اختلاف ہے۔

نہیں، دین ومذہب اور نسل وقومیت کا اختلاف اس منصفانہ برتاؤ سے باز نہ رکھے اسی لیے ارشاد ہوا:

﴿وَ لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی﴾ (مائدہ:۸)

''اور کسی قوم کی عداوت تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل اور انصاف نہ کرو، عدل اور انصاف (ہر حال میں) کرو کہ یہ بات تقویٰ کے قریب ہے۔''

ہر قسم کا برا سلوک اور بے رحمانہ برتاؤ جو ایک انسان دوسرے انسان، اور ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ کرتی ہے اس کا اصل سبب یہی ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے حق میں عدل سے کام نہیں لیتا، بلکہ اس پر ظلم اور بے انصافی کے لیے آمادہ رہتا ہے یہ آیت پاک انسان کے اسی مادۂ فاسد کے سرچشمہ کو بند کرتی ہے ابوہریرہؓ اور انسؓ ابن مالک سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا تَبَاغَضُوْا وَ لَا تَحَاسَدُوْا وَ لَا تَدَابَرُوْا وَ کُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا)) (بخاری:۲)

''آپس میں ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، ایک دوسرے پر حسد نہ کرو اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو اور سب مل کر خدا کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔''

بعض روایتوں میں الفاظ یہ ہیں:

((لَا تَبَاغَضُوْا وَ لَا تَحَاسَدُوْا وَ لَا تَدَابَرُوْا وَ کُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا)) (بخاری)

''ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، نہ ایک دوسرے پر حسد کرو، اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو اور اے خدا کے بندو آپس میں بھائی بن جاؤ۔''

اس حدیث پاک میں انسانی برادری کا وہ نقشہ کھینچا گیا ہے۔ جس پر سچائی سے عمل کیا جائے تو یہ شر اور فساد سے بھری ہوئی دنیا دفعتاً جنت بن جائے۔ من لا یرحم لا یرحم۔ (بخاری) ''جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔'' جو بندوں پر رحم نہیں کرتا اس پر خدا رحم نہیں کرتا۔ یا یہ کہ جو دوسرے پر رحم نہیں کرتا دوسرا بھی اس پر رحم نہیں کرے گا۔ مستدرک حاکم میں ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا کہ تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا۔[1] یہ حدیث رحمۃ للعالمین ﷺ کی تعلیم کی شانِ رحمت کو کتنی عمومیت کے ساتھ ظاہر کرتی ہے۔ ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ ''جو مسلمان کوئی درخت لگائے گا اس سے جو انسان یا پرندہ بھی کچھ کھائے گا اس کا ثواب اس لگانے والے کو ملے گا۔'' (بخاری) اس فیض کے عموم میں انسانیت کی قید بھی نہیں ہے۔ ایک دفعہ آپ ؐ نے ایک شخص کا قصہ بیان کیا جس نے ایک جانور کے ساتھ نیک سلوک کیا تھا کہ اس کو اس کے اس کام پر ثواب ملا، صحابہؓ نے پوچھا اے خدا کے رسول! کیا جانوروں کے ساتھ نیک سلوک کرنے میں بھی ثواب ہے۔ فرمایا: ''ہر تر جگر کے ساتھ نیک سلوک کرنے میں ثواب ہے''[2] (بخاری) اس ثواب کے دائرہ میں ہر وہ ہستی شریک ہے۔ جو زندگی سے بہرہ ور ہے۔ جامع

(۱) مستدرک حاکم کتاب البر والصلۃ ج۴ص ۱۵۹۔

(۲) یہ حدیثیں صحیح بخاری جلد دوم کتاب الادب کے مختلف ابواب میں ہیں۔

ترمذی میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ابوذرؓ سے ارشاد فرمایا ''جہاں بھی ہو خدا کا خیال رکھو برائی کے پیچھے بھلائی کرو تو اس کو مٹا دو گے۔ اور لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آؤ۔'' (باب ماجاء فی معاشرہ الناس صفحہ ۳۳۱)

ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضور نے پانچ باتیں گنائیں جن میں ایک یہ تھی کہ ﴿احب للناس ماتحب لنفسک﴾ (یعنی) تم لوگوں کے لیے وہی چاہو جو تم اپنے لیے چاہتے ہو تو مسلمان بن جاؤ گے[1] الناس کا لفظ عام ہے جس میں تمام انسان داخل ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب تک سارے انسانوں کی بھلائی کا جذبہ دل میں نہ ہو انسان پورا مسلمان نہیں بنتا۔

کیونکہ دوسروں کے لیے وہی چاہنا جو اپنے لیے چاہو اخلاق کی وہ تعلیم ہے جو انسانی برادری کے ہر قسم کے حقوق کی بنیاد ہے۔ ایک اور حدیث میں یہ تعلیم ان لفظوں میں ہے کہ ''تم اپنے بھائی کے لیے وہی چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو۔'' بھائی کے لفظ سے مسلمان بھی مراد ہو سکتا ہے اور ایک عام انسان بھی تورات اور انجیل کے اندر یہی تعلیم ان لفظوں میں ہے کہ تم اپنے پڑوسی کو ایسا چاہو جیسا کہ تم اپنے آپ کو چاہتے ہو۔ اسلام میں پڑوسیوں کے حقوق کا بیان علیحدہ باب میں گزر چکا ہے اس پر یہاں ایک نظر ڈال لینی چاہیے کہ صحابہ کرام نے اس تعلیم کی پیروی میں یہودی اور عیسائی پڑوسیوں کا حق بھی مسلمان پڑوسیوں کی طرح جانا ہے۔

صدقہ وخیرات کے باب میں گو فقرا اور مساکین میں مسلمانوں کی ترجیح ایک قدرتی باب ہے۔ تاہم حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں نامسلمان ذمی مسکینوں کے حق کو بھی تسلیم کیا۔ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ایک بڈھا جو اندھا بھی تھا' ایک دروازہ پر کھڑا بھیک مانگ رہا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پیچھے سے اس کے بازو پر ہاتھ مارا اور پوچھا کہ تم کو بھیک مانگنے کی ضرورت کیا پڑی' اس نے کہا جزیہ ادا کرنے اور اپنی ضرورت پوری کرنے اور اپنی اس عمر کے سبب سے بھیک مانگتا ہوں۔ حضرت عمرؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لائے اور اپنے گھر سے اس کو کچھ دیا۔ پھر اس کو بیت المال کے خزانچی کے پاس بھیجا اور کہلوایا کہ اس کو اور اس جیسے لوگوں کو دیکھو' خدا کی قسم! ہم انصاف نہیں کریں گے۔ اگر ہم اس کی جوانی کی کمائی تو کھائیں اور اس کے بوڑھے ہونے پر اس کی مدد چھوڑ دیں۔ قرآن میں صدقہ کی اجازت فقراء اور مساکین کے لیے ہے۔ فقراء تو وہی ہیں جو مسلمان ہیں اور یہ لوگ مساکینِ اہلِ کتاب میں ہیں۔ ان سے جزیہ نہ لیا جائے۔[2] اسلام کا یہ عام فیصلہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے عام صدقے غیر مسلموں کو دیے جا سکتے ہیں آنحضرت ﷺ نے ایک یہودی خاندان کو صدقہ دیا۔ ام المومنین حضرت صفیہؓ نے اپنے دو یہودی رشتہ داروں کو ۳۰ ہزار کی مالیت کا صدقہ دیا۔ امام مجاہد نے مشرک رشتہ دار کا قرض معاف کرنے کو ثواب کا کام بتایا۔ ابن جریج محدث کہتے ہیں۔ کہ قرآن

(۱) ترمذی ابواب الزہد غریب۔

(۲) کتاب الخراج ابو یوسف صفحہ ۷۲ مصر۔

نے (۱) ''اسیر'' کے کھلانے کو ثواب بتایا ہے اور ظاہر ہے کہ صحابہؓ کے قبضہ میں مشرک ہی قید ہو کر آتے ہیں۔ بومیسرہؓ اور عمرؓ بن شرجیل صدقۂ فطر سے عیسائی راہبوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں حضرت عمرؓ نے اپنے مشرک بھائی کو تحفہ بھیجا۔ (۲) اور خود حضور ﷺ نے بعضوں کو ان کے مشرک والدین کے ساتھ صلۂ رحمی کی اجازت دی، (۳) تفسیر کی روایتوں میں ہے کہ صحابہؓ جب مذہبی اختلاف کی بنا پر غریب مشرکوں کی مدد سے کنارہ کرنے لگے تو یہ آیت اتری۔ (۴)

﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ﴾ (بقرہ:۲۷۲)

''ان کو راہ پر لے آنا تیرے اختیار کی بات نہیں، لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے راہ پر لے آتا ہے، اور جو بھلائی خرچ کرو وہ تمہارے ہی لیے ہے۔''

یعنی تم کو تمہاری نیکی کا ثواب بہرحال ملے گا۔ مسند احمد میں ہے کہ آپؐ نے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا:

لَايُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبُّ لِلنَّاسِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ وَ حَتّٰى يُحِبُّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهٗ اِلَّا لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ. (جلد۳ص۲۷۲)

''تم میں سے کوئی اس وقت تک پورا مومن نہیں ہوگا جب تک وہ اور لوگوں کے لیے وہی نہ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے اور جب تک وہ آدمی کو صرف خدا کے لیے پیار نہ کرے۔''

اس حدیث میں محبت انسانی کی وسعت ساری انسانی برادری تک وسیع کر دی گئی ہے۔

جانوروں کے حقوق

اسلام دنیا میں لطف و محبت کا جو عام پیغام لے کر آیا تھا اس کا سلسلہ حیوانات تک وسیع ہے۔ اس نے حیوانات کے ساتھ متعدد طریقوں سے سلوک کرنے کی ہدایت کی، اہلِ عرب وحشت اور قساوت کی وجہ سے حیوانات پر طرح طرح کے ظلم کرتے تھے وہ جانوروں کو اندھا دھند مار کر گرا دیتے تھے اور لوگوں کو کہتے تھے کہ تم ان کو کھاؤ اور اس کو فیاضی سمجھتے تھے۔ دو آدمی شرط باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور باری باری سے اپنا اپنا ایک اونٹ ذبح کرتا چلا جاتا تھا جو رک جاتا وہ ہار جاتا، یہ سب جانور دوست واحباب کی دعوت میں نذر ہو جاتے تھے۔ یہ بھی فیاضی سمجھی جاتی تھی۔ ان واقعات کا ذکر اشعارِ عرب میں موجود ہے۔ ایک دستور یہ بھی تھا کہ جب کوئی مر جاتا تو

(۱) سورۂ دہر۔

(۲) کتاب الاموال امام ابوعبید ہ صفحہ ۶۱۳، ۶۴۱ مصر۔ کتاب الجمعہ۔

(۳) مسلم باب الصدقۃ علی الاقربین۔

(۴) طبری۔

اس کی سواری کے جانور کو اس کی قبر پر باندھتے تھے اور اس کو دانہ گھاس اور پانی نہیں دیتے تھے اور وہ اسی حالت میں سوکھ کر مر جاتا ایسے جانور کو بلیّہ کہتے تھے۔ اسلام آیا تو اس نے اس سنگ دلی کو مٹا دیا۔ عرب میں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ جانور کو کسی چیز سے باندھ کر اس پر نشانہ لگاتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے اس قسم کے جانوروں کے گوشت کو ناجائز قرار دیا اور حکم دیا کہ کسی ذی روح کو اس طرح نشانہ نہ بنایا جائے'[1] ایک بار ایک لڑکا اسی طرح ایک مرغی کو باندھ کر تیر کا نشانہ بنا رہا تھا حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے مرغی کو کھول دیا' اور مرغی کے ساتھ اس لڑکے کو لے کر اس کے خاندان میں آئے اور کہا کہ اپنے لڑکے کو اس سے منع کرو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس طریقہ سے جانور یا کسی اور جاندار کو نشانہ بنانے کی ممانعت فرمائی ہے۔ اسی طرح کچھ اور لوگ مرغی کو باندھ کر نشانہ بنا رہے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا گزر ہوا تو وہ لوگ بھاگ گئے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ ایسا کس نے کیا ہے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو ملعون قرار دیا ہے۔[2] اس سے بھی زیادہ بے رحمانہ طریقہ تھا کہ زندہ اونٹ کے کوہان اور دنبہ کے دم کی چکی کاٹ کر کھاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں آ کر یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ اس طریقہ سے زندہ جانوروں کا جو گوشت کاٹ کر کھایا جاتا ہے۔ وہ مردار ہے[3] یہ ایک خاص صورت تھی' لیکن عموماً زندہ جانوروں کے مثلہ کرنے یعنی ان کے کسی عضو کے کاٹنے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والے پر لعنت بھیجی۔[4]

بلاضرورت کسی جانوروں کے قتل کرنے کو بہت بڑا گناہ قرار دیا'[5] ایک حدیث میں ہے کہ کسی نے اگر کنجشک یا اس سے بھی کسی چھوٹے جانور کو اس کے حق کے بغیر ذبح کیا تو خدا اس کے متعلق اس سے باز پرس کرے گا۔ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ' اس کا حق کیا ہے؟ فرمایا یہ کہ اس کو ذبح کرے اور کھائے' یہ نہیں کہ اس کا سر کاٹ کر پھینک دے۔[6] اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن جانوروں کا گوشت کھایا نہیں جاتا اور وہ درندہ بھی نہیں ان کا مارنا جائز نہیں۔ سنن نسائی میں ہے کہ جو شخص کنجشک کو بلاضرورت مارے گا وہ قیامت کے دن خدا کے یہاں فریاد کرے گی کہ فلاں نے مجھ کو بلاضرورت مارا ہے اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔[7] جو جانور کوئی نقصان نہیں پہنچاتے یا ان سے انسانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ہے ان کا مارنا بھی جائز نہیں۔ چنانچہ آپؐ نے خاص طور پر چیونٹی' شہد کی مکھی'

(۱) ترمذی ابواب الصید باب ماجاء فی کراہۃ اکل المصبورۃ ص ۲۵۵۔

(۲) بخاری کتاب الذبائح والصید باب ما یکرہ من المثلہ المصبورہ والمجثمہ۔

(۳) ترمذی ابواب الصید باب ماجاء ما قطع من الحی فھو میت۔

(۴) بخاری کتاب الذبائح والصید باب ما یکرہ من المثلۃ والمصبورۃ والمجثمہ۔

(۵) مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۱۴۴۔

(۶) مشکوٰۃ کتاب الصید والذبائح صفحہ ۲۵۰۔

(۷) نسائی کتاب الضحایا صفحہ ۶۷۹۔

ہدہد اور صرد کے مارنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ (۱) جو جانور ضرورۃً مارے یا ذبح کیے جاتے ہیں ان کے مارنے یا ذبح کرنے میں بھی ہر طرح کی نرمی کرنے کا حکم دیا۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ خدا نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کیا ہے اس لیے جب تم لوگ کسی جانور کو مارو تو اچھے طریقہ سے مارو اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقہ سے ذبح کرو تم میں ہر شخص اپنی چھری کو تیز کرلے اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچائے۔ (۲) ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے کہا کہ یارسول اللہ ﷺ میں بکری کو ذبح کرتا ہوں تو مجھے اس پر رحم آتا ہے یا یہ کہ مجھے اس پر رحم آتا ہے کہ بکری کو ذبح کروں' فرمایا کہ اگر تم بکری پر رحم کرتے ہو تو خدا تم پر رحم کرے گا (۳) یہی وجہ ہے کہ دانت سے کاٹ کر یا ناخن سے خراش دے کر جانوروں کے ذبح کرنے کی ممانعت فرمائی۔ کیونکہ اس سے جانوروں کو تکلیف ہوتی ہے۔ کنکر' پتھر یا غلیل چلانے کی بھی ممانعت فرمائی۔ (۴) اور فرمایا کہ اس سے نہ شکار ہوسکتا نہ دشمن شکست کھا سکتا ہے البتہ اس سے دانت ٹوٹ سکتا ہے اور آنکھ پھوٹ سکتی ہے' (۵) مطلب یہ کہ بلاضرورت جانوروں اور پرندوں کو جسمانی صدمہ پہنچانا جائز نہیں۔ جانوروں کے ساتھ جو بے رحمیاں کی جاتی تھیں ان کا اصل سبب یہ تھا کہ اہلِ عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جانوروں کو دکھ درد پہنچانا گناہ کا کام ہے اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اہلِ عرب کو بتایا کہ جس طرح انسانوں کی ایذ ارسانی ایک شرعی جرم ہے اسی طرح جانوروں کی ایذ ارسانی بھی ایک مذہبی گناہ ہے۔

چنانچہ ایک عورت کی نسبت آپؐ نے فرمایا کہ اس پر صرف اس لیے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بلی کو باندھ دیا اور اس کو کھانا پانی کچھ نہ دیا اور آخر وہ اسی طرح بندھی مرگئی۔ (۶) بلکہ لوگ چونکہ انسانوں کی بہ نسبت جانوروں کو زیادہ ستاتے ہیں اس لیے وہ اس معاملہ میں بہت زیادہ گناہ گار ہیں۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا کہ تم لوگ جانوروں کے ساتھ جو بدسلوکیاں کرتے ہو' اگر خدا ان کو معاف کردے تو سمجھو اس نے تمہارے بہ کثرت گناہ معاف کردیے' ایک دفعہ آپؐ صحابہؓ کے ساتھ کسی سفر کے پڑاؤ میں تھے۔ آپؐ ضرورت سے کہیں تشریف لے گئے تھے۔ جب واپس آئے تو دیکھا کہ ایک صاحب نے اپنا چولھا ایسی جگہ جلایا ہے جہاں زمین پر یا درخت پر چیونٹیوں کا سوراخ تھا۔ یہ دیکھ کر آپؐ نے دریافت کیا کہ یہ کس نے کیا ہے؟ ان صاحب نے کہا یارسول اللہ! یہ میں نے کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا بجھاؤ بجھاؤ۔ (۷) (غرض یہ تھی کہ ان چیونٹیوں کو تکلیف نہ ہو یا جل نہ جائیں) ایک حدیث میں ہے کہ

(۱) مشکوٰۃ کتاب الصید والذبائح ص ۳۶۶۔
(۲) مسلم کتاب الصید والذبائح باب الامر باحسان الذبح والقتل وتحدید الشفرۃ۔
(۳) مسند ابن حنبل ص ۴۳۶۔
(۴) نسائی ص ۶۷۴ بخاری کتاب الذبائح والصید باب الخذف والبندقہ۔
(۵) بخاری کتاب الانبیا صفحہ ۴۹۵۔
(۶) مسند ابن حنبل جلد ۲ صفحہ ۴۴۱۔
(۷) مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۳۹۶ عن عبداللہ بن مسعودؓ۔

ایک پیغمبر کسی درخت کے نیچے اترے تو ان کو ایک چیونٹی نے کاٹ لیا۔ انہوں نے پہلے سامان اس جگہ سے ہٹایا پھر تمام چیونٹیوں کو آگ سے جلا دیا۔ اس پر خدا نے ان کو وحی کے ذریعہ سے متنبہ کیا کہ صرف ایک ہی چیونٹی کو کیوں نہیں جلایا۔ [۱] یعنی قصاص کی مستحق صرف وہی چیونٹی تھی۔ جس نے کاٹا تھا۔ تمام چیونٹیوں کا قصور نہ تھا۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک سفرِ جہاد میں صحابۂ کرامؓ ایک چڑیا کے دو بچے پکڑ لائے چڑیا فرطِ محبت سے ان کے گرد منڈلانے لگی۔ رسول اللہ ﷺ قضائے حاجت کے لیے گئے ہوئے تھے واپس آ کر یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ اس کے بچوں کو پکڑ کر کس نے اس کو بے قرار کیا ہے اس کے بچوں کو چھوڑ دو۔ صحابہ کرامؓ نے چیونٹیوں کے ایک گھر کو بھی جلا دیا تھا۔ دریافت کرنے پر جب معلوم ہوا کہ یہ خود صحابہؓ کا فعل تھا تو فرمایا کہ آگ کی سزا دینا صرف خدا ہی کے لیے سزاوار ہے۔

اسی طرح اہلِ عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جس طرح انسانوں کے ساتھ سلوک کرنا ثواب کا کام ہے بعینہ اسی طرح جانوروں اور پرندوں کے ساتھ سلوک کرنا بھی موجبِ ثواب ہے۔ اسی عدم واقفیت کی بنا پر ایک صحابیؓ نے آپؐ سے دریافت کیا کہ میں نے خاص اپنے اونٹوں کے لیے پانی کے جو حوض بنائے ہیں۔ ان پر بھولے بھٹکے اونٹ بھی آ جاتے ہیں، اگر میں ان کو پانی پلا دوں تو کیا مجھ کو اس پر ثواب ملے گا؟ فرمایا کہ ہر پیاسے یا ہر ذی حیات کے ساتھ سلوک کرنے پر ثواب ملتا ہے۔ [۲] ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص راستہ میں جا رہا تھا کہ اس کو سخت پیاس لگ گئی اتفاق سے اس کو ایک کنواں مل گیا اور اس نے کنوئیں میں اتر کر پانی پی لیا۔ کنوئیں سے نکلا تو دیکھا کہ ایک کتا پیاس سے زبان نکال رہا ہے۔ اور کیچڑ چاٹ رہا ہے اس نے اپنی پیاس کی شدت کو یاد کر کے اس پر ترس کھایا اور کنوئیں میں اتر کر پانی لایا اور اس کو پلایا۔ خدا کے نزدیک اس کا یہ عمل مقبول ہوا اور خدا نے اس کو بخش دیا۔ [۳] صحابۂ کرامؓ نے اس واقعہ کو سنا تو بولے کہ یا رسول اللہ! کیا جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے سے بھی ثواب ملتا ہے، فرمایا کہ ہر ذی حیات کے ساتھ سلوک کرنا موجب ثواب ہے۔ صرف جانوروں ہی تک نہیں بلکہ نباتات تک کی خدمت اور پرورش کو بھی اجر کا موجب بتایا اور فرمایا کہ جو مسلمان درخت نصب کرتا ہے یا کھیتی باڑی کرتا ہے اور اس کو چڑیا یا انسان یا جانور کھاتا ہے تو یہ ایک صدقہ [۴] یعنی ثواب کا کام ہے، اس اصول کے بتانے کے بعد عملی طور پر جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے کے متعدد اصول بتائے، یعنی۔

(۱) جو جانور جس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس سے وہی کام لینا چاہیے۔ چنانچہ فرمایا کہ ایک شخص ایک بیل پر سوار ہو کر جا رہا تھا۔ بیل نے مڑ کر کہا کہ میں اس کے لیے نہیں پیدا کیا گیا ہوں۔ صرف کھیتی باڑی کے لیے

(۱) بخاری جلد اول کتاب الخلق صفحہ ۴۶۷۔

(۲) ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی کراہۃ حرق العدو بالنار۔

(۳) ابن ماجہ باب الادب باب فضل صدقۃ الماء۔

(۴) بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم۔

پیدا کیا گیا ہوں۔ [1] نیز فرمایا کہ اپنے جانوروں کی پیٹھ کو منبر نہ بناؤ خدا نے ان کو تمہارا فرمان بردار صرف اس لیے بنایا ہے کہ وہ تم کو ایسے مقامات میں پہنچا دیں جہاں تم بڑی مشقت سے پہنچ سکتے تھے تمہارے لیے خدا نے زمین کو پیدا کیا ہے اپنی ضرورتیں اسی پر پوری کرو۔ [2] اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے بعض موقعوں پر اونٹ کی پشت پر بیٹھ کر خطبہ دیا ہے۔ اس لیے اس حدیث کا مطلب ہے کہ بلاضرورت سواری کے جانوروں کی پیٹھ پر بیٹھے رہنا مناسب نہیں کہ اس سے جانور کو غیر ضروری تکلیف ہوتی ہے' صرف سفر کی حالت میں اس پر سوار ہونا چاہیے۔

(۲) جانوروں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا چاہیے' چنانچہ فرمایا کہ جب تم لوگ سرسبزی اور شادابی کے زمانہ میں سفر کرو تو اونٹوں کو زمین کی سرسبزی سے فائدہ پہنچاؤ' اور جب قحط کے زمانہ میں سفر کرو تو اس کو تیزی کے ساتھ چلاؤ [3] تاکہ قحط کی وجہ سے اس کو گھاس یا چارے کی جو تکلیف راستہ میں ہوتی ہے اس سے وہ جلد نجات پائیں' ایک بار آپؐ نے ایک اونٹ دیکھا جس کا پیٹ بھوک کی وجہ سے پیٹھ سے لگ گیا تھا' فرمایا ان بے زبان جانوروں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو' ان پر سوار ہو تو ان کو اچھی حالت میں رکھ کر سوار ہو' اور ان کو کھاؤ تو ان کو اچھی حالت میں رکھ کر کھاؤ۔ [4]

ایک بار آپؐ ایک انصاری کے باغ میں رفعِ حاجت کے لیے گئے' اس میں ایک اونٹ تھا جو رسول اللہ ﷺ کو دیکھ کر بلبلایا اور آب دیدہ ہو گیا' آپؐ اس کے پاس گئے اور اس کے کنپٹی پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا یہ کس کا اونٹ ہے؟ ایک انصاری نوجوان نے آ کر کہا کہ "میرا یا رسول اللہ (ﷺ) فرمایا اس جانور کے بارہ میں جس کا خدا نے تم کو مالک بنایا ہے خدا سے نہیں ڈرتے' اس نے مجھ سے شکایت کی تم اس کو بھوکا رکھتے ہو اور اس پر جبر کرتے ہو۔ [5]

(۳) جانوروں کے منہ پر مارنے یا اس پر داغ دینے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والے کو ملعون قرار دیا۔ [6]

(۴) جانوروں کے باہم لڑانے سے بھی منع فرمایا [7] کہ اس سے وہ بے فائدہ گھائل اور زخمی ہو کر تکلیف پاتے ہیں۔ پچھلے صفحوں پر پھر ایک نظر ڈال لیجیے تاکہ معلوم ہو کہ اسلام کے سینہ میں جو دل ہے وہ کتنا نرم ہے اور کس طرح رحم و کرم سے بھرا ہوا ہے۔

---

(۱) بخاری ابواب الحرث والمزارعۃ باب فضل الزرع والغرس اذا اکل منہ۔
(۲) بخاری ابواب الحرث والمزارعۃ باب استعمال البقر للحراثۃ۔
(۳) مسلم کتاب الامارۃ باب مراعاۃ مصلحۃ الدواب فی السیر والنہی عن التعریس فی الطریق۔
(۴) ابوداؤد کتاب الجہاد باب مایومر بہ من القیام علی الدواب والبہائم۔
(۵) ایضاً۔
(۶) ابوداؤد کتاب الجہاد باب وسم الدواب۔
(۷) ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التحریش بین البہائم۔

فضائل اخلاق

اخلاقِ حسنہ کے جزئیات اس کثرت سے ہیں کہ ان کا احاطہ بھی مشکل ہے، قدیم حکمائے اخلاق نے ان کی دو قسمیں کی ہیں، ایک امہاتِ اخلاق اور دوسری فروعِ اخلاق۔ امہاتِ اخلاق سے مراد اخلاق کے وہ جوہری ارکان ہیں جو دوسرے اخلاق کی اصل و مرجع ہیں اور جن میں کمی و بیشی سے اخلاق کی مختلف قسمیں پیدا ہوتی ہیں، اور جن کے اعتدال سے فضائلِ اخلاق کا وجود ہوتا ہے۔

ان کے نزدیک انسان کے اندر تین فطری قوتیں ہیں، قوتِ علمیہ، قوت شہوانیہ، اور قوت غضبیہ۔ قوت علمیہ کے اعتدال کا نام حکمت، قوتِ شہوانیہ کے اعتدال کا عفت اور قوتِ غضبیہ کے اعتدال کا شجاعت ہے، اور انہی کے عدمِ اعتدال کو رذائل کہتے ہیں، پھر ان دونوں قسموں کے اختلافِ مدارج سے اچھے اور برے اخلاق کے مختلف مراتب ظہور میں آتے ہیں۔

یہ تقسیمیں محض فلسفیانہ ہیں، یا یوں کہیے کہ علمی اور نظری ہیں، لیکن اسلام کے پیشِ نظر اخلاق کی علمی و نظری حیثیت نہیں بلکہ عملی ہے، کیونکہ اس کا منشا انسان کو فقط اخلاق کا علم بخشنا نہیں، بلکہ انسان کو فضائلِ اخلاق کا عامل بنانا اور رذائلِ اخلاق سے عملاً بچانا ہے، اس لیے اس کو اس سے بحث نہیں کہ فلاں خُلق کی اصلیت کیا ہے اور اس سے دوسرے اخلاق کس طرح پیدا ہوتے ہیں، بلکہ اس سے بحث ہے کہ انسان کو کس طرح اچھے اخلاق کا پابند بنایا اور برے اخلاق سے بچایا جائے، اسی لیے اپنی تعلیم میں اس نے اہلِ فلسفہ کا رنگ اختیار نہیں کیا ہے اور نہ یہ طریقہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم اور تربیت کا ہے۔

اسلام کی ہر [illegible] اہ وہ عقیدہ سے متعلق ہو یا عبادت سے یا اخلاق و معاملات سے مرکزی چیز اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے۔ ہر وہ [illegible] چھا ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور وہ برا ہے جس کو وہ ناپسند فرمائے۔ گو یہ دوسری بات ہے کہ وہ جس کو پسند فرماتا ہے اس میں عقلی خوبیاں اور جمہور کا فائدہ بھی ہوتا ہے، اور جس کو وہ ناپسند فرماتا ہے اس میں عقلی برائیاں اور خلقِ خدا کا نقصان بھی ہوتا ہے، اس بنا پر اسلام کی نظر سے اخلاق کی یہ دو قسمیں ہیں! وہ اخلاق جن کو خدا پسند فرماتا ہے، یہ فضائل کہلاتے ہیں اور وہ کام جن کو وہ ناپسند کرتا ہے، رذائل ہیں۔ ہم نے اوپر اخلاق اور محبتِ الٰہی کے عنوان میں وہ آیتیں لکھ دی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے اوصاف کو پسند یا ناپسند فرمایا ہے۔

جن اوصاف کو خدا پسند فرماتا ہے ان کو ابھی ہم نے اصطلاح میں فضائل کا نام دیا ہے۔ یہ فضائل بہت سے

ہیں اور قرآن پاک اور احادیثِ شریفہ میں جابجا ان کی تصریح ہے لیکن ان کے بیان میں اخلاقِ شرعی کے مصنفوں نے کوئی خاص ترتیب نہیں رکھی ہے اسی لیے ان کی اہمیت کے درجے اور رتبے نہیں مقرر ہوئے۔

میرا خیال یہ ہے کہ فضائل میں سب سے پہلے اس اخلاقی فضیلت کو جگہ ملنی چاہیے جو خود اللہ تعالیٰ کا وصف ہو اور جس کے ساتھ رسولوں اور پیغمبروں کی توصیف اکثر کی گئی ہو اور مسلمانوں کو اس سے متصف ہونے پر کتابِ الٰہی اور پیامِ نبوی میں زیادہ زور دیا گیا ہو اور جو بجائے خود بہت سی اخلاقی خوبیوں کی بنیاد ہو۔

گو اس معیار کو سامنے رکھ کر فضائل کی ترتیب کو قائم کرنا بہت مشکل کام ہے اور غور وفکر کرنے والوں میں اس بارہ میں اختلاف بھی ممکن ہے لیکن جہاں تک میری تلاش اور محنت کو دخل ہے اس میں کامیابی کی کوشش کروں گا۔

فضائل کی مختصر فہرست

جن فضیلتوں کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور جن کو گنا کر اس نے اپنے اچھے بندوں کی توصیف کی ہے یا ان اوصاف والوں کے لیے اپنی بخشش اور بخشایش کا وعدہ فرمایا ہے قرآن پاک اور احادیث نبوی میں جابجا ان کی تفصیل ہے جیسے

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ○ وَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ○ وَ الَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ○ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ○ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ○ وَ الَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ ○ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ○﴾ (مومنون: ۱۔۱۱)

''ایمان والے مراد کو پہنچ گئے جو اپنی نماز میں عاجزی کرتے ہیں جو بیکار باتوں کی طرف رخ نہیں کرتے، جو زکوٰۃ دیتے اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں لیکن اپنی بیویوں سے اور اپنی (شرعی) باندیوں سے کہ ان پر کوئی الزام نہیں تو جو اس کے سوا کے خواہاں ہوں تو وہی حد سے بڑھنے والے ہیں اور وہ اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کے پابند ہیں، یہی اصلی وارث ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

ان آیتوں میں جن اخلاقی فضائل کا بیان آیا ہے وہ یہ ہیں نکمی اور بیکار باتوں سے کنارہ کشی، عصمت اور پاک دامنی، امانت داری اور ایفائے عہد، ایک دوسری جگہ ہے:

﴿وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِیّٖنَ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنَ وَ ابْنَ السَّبِیْلِ وَ السَّآئِلِیْنَ وَ فِی الرِّقَابِ

وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ﴾ (بقرہ:۱۷۷)

''اور لیکن اصل نیکی اس کی ہے جو اللہ پر اور آخرت پر اور فرشتوں پر اور کتاب (الٰہی) پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا اور اپنا مال اس کی محبت کے ساتھ رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور غریبوں کو اور مسافروں کو اور مانگنے والوں کو اور گردنوں کو چھڑانے میں دیا، اور نماز کھڑی کی اور زکوۃ دی اور اپنے قول کو جب انہوں نے اقرار کرلیا، پورا کرنے والے اور مصیبت میں اور تکلیف میں اور لڑائی کے ہل چل کے وقت ثابت قدم رہنے والے۔''

ان آیتوں میں جو اخلاقی اوصاف گنائے گئے ہیں وہ یہ ہیں سخاوت، قول وقرار کو پورا کرنا اور مشکلوں میں ثابت قدمی سورۂ آل عمران میں ہے:

﴿اَلصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰدِقِيْنَ وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْمُنْفِقِيْنَ﴾ (آل عمران:۱۷)

''ثابت قدم رہنے والے، اور سچ بولنے والے اور (خدا کی) فرمان برداری کرنے والے اور (خدا کی راہ میں) خرچ کرنے والے۔''

اس آیت میں ثابت قدمی، سچائی اور فیاضی کو سراہا گیا ہے۔ اسی سورہ میں ان متقیوں کا حال ہے جو خدا کی مغفرت اور آسمان وزمین کے برابر کی جنت کے مستحق ہوں گے۔

﴿اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (آل عمران:۱۳۴)

''جو خوش حالی اور تنگ دستی دونوں حالتوں میں (خدا کے نام) خرچ کرتے ہیں اور غصہ کو روکتے اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

اس اوپر کی آیت میں فیاضی عفوو درگذر اور احسان کی تعریف کی گئی ہے، سورہ معارج میں ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ○ لِّلسَّآئِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ ○ وَ الَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ○ وَ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ○ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ○ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ○ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ○ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ○ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ○ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ○﴾ (معارج:۲۴-۳۳)

''ان جن کے مال میں مانگنے والے اور مصیبت زدہ کا حصہ مقرر ہے، اور جو روز جزا کو سچ مانتے ہیں، اور اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں، بے شبہ ان کے رب کا عذاب نڈر ہونے کی چیز نہیں، اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، مگر اپنی بیویوں اور شرعی باندیوں سے کہ اس میں ان پر کوئی ملامت

نہیں، جو اس کے علاوہ چاہیں وہ حد سے آگے بڑھنے والے ہیں اور جو اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں اور جو اپنی گواہیوں پر قائم رہتے ہیں۔''

ان آیتوں میں سخاوتِ نفس، عفت و عصمت، امانت داری، ایفائے عہد اور سچی گواہی کو ایک مومن کی ان فضیلتوں میں شمار کیا ہے جو اس کے جنت میں جانے کی سبب ہوئی ہیں۔

سورۂ احزاب میں ان مردوں اور عورتوں کا ذکر ہے جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی بخشائش اور بڑی مزدوری کا وعدہ فرمایا ہے:

﴿وَ الصّٰدِقِیْنَ وَ الصّٰدِقٰتِ وَ الصّٰبِرِیْنَ وَ الصّٰبِرٰتِ وَ الْخٰشِعِیْنَ وَ الْخٰشِعٰتِ وَ الْمُتَصَدِّقِیْنَ وَ الْمُتَصَدِّقَاتِ وَ الصَّآئِمِیْنَ وَ الصّٰٓئِمٰتِ وَ الْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ﴾ (احزاب:۳۵)

''اور سچ بولنے والے اور سچ بولنے والیاں صبر کرنے والے اور صبر کرنے والیاں اور عاجزی کرنے والے اور عاجزی کرنے والیاں اور صدقہ دینے والے اور صدقہ دینے والیاں اور روزہ رکھنے والے اور روزہ رکھنے والیاں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے اور حفاظت کرنے والیاں۔''

ان میں سچائی، صبر، عاجزی، اور عصمت و عفت کے اوصاف کا ذکر ہے۔

سورۂ فرقان میں خدا کے اچھے بندوں کی پہچان یہ بتائی گئی ہے:

(۱) ﴿وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا﴾ (الفرقان:۶۳)

''اور رحم والے اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین میں ہولے چلتے ہیں، اور جاہل جب ان سے جہالت کی باتیں کریں تو وہ کہیں سلامت رہیے۔''(۱)

(۲) ﴿وَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَ لَمْ یَقْتُرُوْا وَ کَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا﴾ (الفرقان: ۶۷)

''اور جب وہ خرچ کریں تو نہ تو فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں اور دونوں کے بیچ کی راہ ہو۔''

(۳) ﴿وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لَا یَزْنُوْنَ﴾ (الفرقان:۶۸)

''اور جو ناحق کسی بے گناہ کی جان نہیں لیتے اور نہ بدکاری کرتے ہیں۔''

(۴) ﴿وَ الَّذِیْنَ لَا یَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا﴾ (الفرقان:۷۲)

اور جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب وہ بے ہودہ مشغلہ کے پاس سے گزریں تو شریفانہ وضع سے گزر

(۱) یا سلام کہیں۔

جائیں۔‘‘

پہلی آیت میں عاجزی اور فروتنی اور بردباری دوسری آیت میں اعتدال اور میانہ روی، اور تیسری مین عدم ظلم اور عفت اور چوتھی میں سچائی اور متانت وسنجیدگی کی تعریف کی گئی ہے، سورۂ رعد میں وہ صفتیں بتائی گئی ہیں جو عقبیٰ میں کام آئیں گی۔

﴿اَلَّذِیْنَ یُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ لَا یَنْقُضُوْنَ الْمِیْثَاقَ ○ وَ الَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَ یَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ○ وَ الَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً وَّ یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ○﴾ (رعد: ۲۰، ۲۲)

’’جو لوگ اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور قول کو توڑتے نہیں اور جس کے جوڑنے کو خدا نے کہا ہے اس کو جوڑے رکھتے ہیں اور اپنے مالک سے ڈرتے ہیں اور بری طرح حساب ہونے سے سہمے رہتے ہیں اور جنہوں نے اپنے مالک کی خوشی کے لیے صبر کیا، اور نماز کھڑی کی اور ہم نے جو ان کو دیا اس سے چھپے اور کھلے (اچھے کاموں میں) خرچ کیا اور برائی کو بھلائی سے دور کرتے ہیں، انہی کے لیے پچھلا گھر ہے۔‘‘

اس ایفائے عہد سے وہ عہد بھی مراد ہو سکتا ہے جو بندہ اپنے خدا سے کرتا ہے اور اس سے وہ عہد بھی سمجھا جا سکتا ہے جو خدا کا نام لے کر بندہ بندہ سے کرتا ہے، اور جس کے جوڑنے کا حکم ملا ہے، وہ اہلِ قرابت اور حق داروں کے حقوق ہیں ان دو کے سوا ان آیتوں میں ان کی تعریف کی گئی ہے جو برائی کے بدلہ لوگوں سے بھلائی کرتے ہیں، یا یہ کہ بھلائی کر کے برائی کو دھودیتے ہیں۔

﴿تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَ لَا فَسَادًا وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ﴾ (قصص: ۸۳)

’’اس پچھلے گھر کو ہم ان کے لیے کریں گے جو زمین میں غرور اور فساد کرنا نہیں چاہتے، اور آخر انجام پرہیز گاروں کے لیے ہے۔‘‘

یعنی غرور ونخوت نہیں کرتے۔

﴿وَ الَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ یَغْفِرُوْنَ﴾ (شوریٰ: ۳۷)

’’اور جو بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں اور جب انہیں غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔‘‘

یعنی غصہ آنے پر بھی بے قابو نہیں ہوتے اور معاف کر دیتے ہیں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ﴾ (بقرہ:۴۲)

''بے شک اللہ انصاف والوں کو پیار کرتا ہے۔''

عدل وانصاف کی فضیلت کے لیے اس سے بڑھ کر کیا چاہیے کہ وہ خدا کے پیار اور محبت کا ذریعہ ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (بقرہ:۱۹۵)

''بے شک اللہ نیک کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

اس پیار اور محبت کے استحقاق میں ہر نیکی کا کام کرنے والا داخل ہے۔

حدیثوں میں جن اخلاقی فضیلتوں کا بیان ہے وہ متفرق طور سے پچھلے صفحوں میں گزر چکی ہیں' اور آگے بھی اپنی اپنی جگہ پر آئیں گی۔

صدق

اوپر کے معیار کے مطابق اخلاقی خوبیوں کے سرِ فہرست ہونے کی حیثیت جس فضیلت کو حاصل ہے وہ میرے خیال میں سچائی ہے' اس ایک فضیلت کے نیچے منطقی اور نفسیاتی نتیجہ کے طور پر بہت سی اہم اخلاقی فضیلتیں آ جاتی ہیں۔

انسان کے ہر قول اور عمل کی درستی کی بنیاد یہ ہے کہ اس کے لیے اس کا دل اور اس کی زبان باہم ایک دوسرے سے مطابق اور ہم آہنگ ہوں' اسی کا نام صدق یا سچائی ہے' جو سچا نہیں' اس کا دل ہر برائی کا گھر ہو سکتا ہے' اور جو سچا ہے اس کے لیے ہر نیکی کے حصول کا راستہ آسان ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! مجھ میں چار بری خصلتیں ہیں' ایک یہ کہ بدکار ہوں' دوسری یہ کہ چوری کرتا ہوں' تیسری یہ کہ شراب پیتا ہوں' چوتھی یہ کہ جھوٹ بولتا ہوں۔ ان میں سے جس ایک کو فرمایئے' آپؐ کی خاطر سے چھوڑ دوں' ارشاد یہ ہوا کہ جھوٹ نہ بولا کرو' چنانچہ اس نے اس کا عہد کیا' اب جب رات ہوئی تو شراب پینے کو جی چاہا' اور پھر بدکاری کے لیے آمادہ ہوا تو اس کو خیال گزرا کہ صبح کو جب آنحضرت ﷺ پوچھیں گے کہ رات تم نے شراب پی اور بدکاری کی؟ تو کیا جواب دوں گا۔ اگر ہاں کہوں گا تو شراب اور زنا کی سزا دی جائے گی' اگر ''نہیں'' کی تو عہد کے خلاف ہوگا۔ یہ سوچ کر ان دونوں سے باز رہا' جب رات زیادہ گزری اور اندھیرا خوب چھا گیا تو چوری کے لیے گھر سے نکلنا چاہا تو پھر اسی خیال نے اس کا دامن تھام لیا۔ کہ کل پوچھ گچھ ہوئی تو کیا کہوں گا' ہاں کروں گا تو ہاتھ کٹیں گے' اور نہیں کرتا تو بدعہدی ہوتی ہے' اس خیال کے آتے ہیں اس جرم سے بھی باز آیا' صبح ہوئی تو وہ دوڑ کر خدمت نبوی میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! جھوٹ نہ بولنے سے میری چاروں بری خصلتیں مجھ سے چھوٹ گئیں' یہ سن کر آنحضرت ﷺ مسرور ہوئے۔ (۱)

(۱) اس قصہ کو مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی نے تفسیرِ عزیزی سورہ ن میں کتبِ سیر کے حوالہ سے نقل کیا ہے لیکن مجھے اس کا ماخذ نہیں معلوم ہوا۔

یہ روایت سند کی روح سے کتنی ہی کمزور ہو مگر نتیجہ کے لحاظ سے سے بالکل درست ہے سچائی کی عادت انسان کو بہت سی برائیوں سے بچاتی ہے جو سچا ہوگا وہ ہر برائی سے پاک ہونے کی کوشش ضرور کرے گا وہ راست باز ہوگا راست گو ہوگا۔ وعدہ کو پورا کرے گا عہد کو وفا کرے گا دلیر ہوگا دل کا صاف ہوگا۔ ریا کار نہ ہوگا۔ اس کے دل میں نفاق نہ ہوگا۔ پیچھے کچھ اور سامنے کچھ اس کی شان نہ ہوگی خوشامدی نہ ہوگا سب کے بھروسہ کے قابل ہوگا لوگوں کو اس کے قول و فعل پر اعتبار ہوگا۔ جو کہے گا کرے گا غرض جس پہلو سے دیکھیے سچائی بہت سی اخلاقی خوبیوں کی اصلی بنیاد قرار پائے گی۔

صدق صفاتِ ربانی میں سے بھی سب سے بڑی صفت ہے خدا سے بڑھ کر سچا کون ہوسکتا ہے قیامت کے وعدہ کے سلسلہ میں خدا آپ فرماتا ہے۔

﴿وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِیْثًا﴾ (نساء:۸۷)

''اور کون اللہ سے زیادہ سچا ہے۔''

اسی طرح بہشت کے وعدہ کی تقریب سے ارشاد فرمایا:

﴿وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِیْلًا﴾ (نساء:۱۲۲)

''وعدہ کیا اللہ نے سچ اور کون ہے اللہ سے زیادہ سچا بات میں۔''

خدا سچا ہے اس لیے اسی کی ساری شریعت سچی ہے فرمایا۔

﴿وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ﴾ (انعام:۱۴۶)

''اور ہم ہیں سچے۔''

﴿قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا﴾ (آل عمران:۹۵)

''کہہ (اے پیغمبر!) اللہ نے سچ فرمایا تو ابراہیم حنیف کے دین کی پیروی کرو۔''

﴿وَ الَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَ صَدَّقَ بِهٖ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ (زمر:۳۳)

''اور جو سچائی کو لے کر آیا اور اس سچائی کو سچ مانا وہی تو پرہیز گار ہیں۔''

اس آخری آیت میں ''سچائی'' سے مراد خدا کی شریعت یا کتاب ہے مگر لفظ کا عموم ہر سچائی تک وسیع ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پرہیز گاروں کی شان یہ ہے کہ وہ سچائی کے ساتھ ہوتے ہیں ہر سچی بات کو قبول کرتے ہیں اور اپنے ہر قول اور عمل میں سچائی کو پیش کرتے ہیں۔

اہلِ ایمان کا یہ حال ہے کہ جب خدا اور اس کے رسولوں کے وعدوں کو سچا ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو پکار اٹھتے ہیں ﴿وَ صَدَقَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ﴾ (احزاب:۳۰) ''اور خدا اور اس کے رسول نے سچ کہا۔''

چونکہ رسول خدا سے علم پاتے ہیں اس لیے وہ بھی سچے ہوتے ہیں۔

﴿وَ صَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ﴾ (یٰسٓ:۵۲)

''اور پیغمبروں نے سچ کہا۔''

اسی سے ظاہر ہے کہ صدق اور سچائی پیغمبروں کا سب سے پہلا وصف ہے کیونکہ ان کی ساری باتیں، دعویٰ، دلیلیں اور حکم اگر نعوذ باللہ سچائی سے ذرا بھی خالی ہوں تو ان کی پیغمبری اور نبوت کی ساری عمارت دھم سے زمین پر گر جائے، اللہ تعالیٰ نے کئی پیغمبروں کو اس صفت سے خاص طور سے موصوف کیا ہے، سب سے پہلے تو خود ملتِ حنیف کے داعی حضرت ابراہیمؑ کو اس سے متصف فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

﴿وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا﴾ (مریم:۴۱)

''اور کتاب میں ابراہیم کا حال بیان کر کہ وہ بڑے سچے نبی تھے۔''

ایک اور پیغمبر حضرت ادریسؑ کو بھی اللہ نے اس سے نامزد کیا ہے۔

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا﴾ (مریم:۵۶)

''اور کتاب میں ادریس کا حال بیان کر کہ وہ بڑے سچے نبی تھے۔''

حضرت مریمؑ جنہوں نے اللہ کی باتوں کے سچ ماننے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا، اس وصف سے ممتاز ہوئیں، فرمایا گیا:

﴿وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ﴾ (مائدہ:۷۵)

''اور ان (عیسیٰ) کی ماں بڑی سچی تھیں۔''

حضرت یوسفؑ جو خواب کی تعبیر میں ایسے سچے نکلے، بندوں کی زبان سے صدیق کہلائے۔

﴿يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ﴾ (یوسف:۴۶)

''یوسف! اے بڑے سچے!''

حضرت اسماعیل نے اپنے باپ سے صبر و شکر کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا، تو خدا سے صادق الوعد (وعدہ کا سچا) خطاب پایا۔

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا﴾ (مریم:۵۴)

''اور کتاب میں اسماعیل کا ذکر کر، بے شبہ وہ وعدہ کا سچا اور بھیجا ہوا نبی تھا۔''

خدا کی خوشنودی والی جنت جن لوگوں کو ملے گی ان میں وہ بھی ہوں گے جو دنیا میں دوسری صفتوں کے ساتھ سچائی اور راست بازی سے ممتاز تھے۔

﴿اَلصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ (ال عمران:۱۷)

''صبر کرنے والے اور سچے۔''

خدا نے جن لوگوں کے لیے اپنی مغفرت اور اجرِ عظیم کے وعدے کیے ہیں، ان میں اسلام و ایمان اور خدا کی فرمان برداری کے بعد پہلا درجہ سچوں اور راست بازوں کا ہے، فرمایا:

﴿اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمَاتِ وَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنَاتِ وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْقٰنِتٰتِ وَ الصّٰدِقِيْنَ وَ الصّٰدِقٰتِ﴾ (الاحزاب:۳۵)

''بے شک وہ اسلام قبول کرنے والے مرد اور عورتیں ایمان لانے والے مرد اور عورتیں اور فرمان بردار مرد اور عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں۔۔۔۔۔۔''

﴿اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ (احزاب:۳۵)

''خدا نے ان کے لیے مغفرت اور بڑی مزدوری رکھی ہے۔''

اور سچائی کے کاروبار کا صلہ دوسری زندگی میں ملے گا' اور وہ ہماری کامیابی کا ذریعہ بنے گی۔ قیامت کی نسبت ہے:

﴿هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ﴾ (مائدہ:۱۱۹)

''یہ دن ہے کہ سچے بندوں کو ان کا سچ کام آئے گا۔''

اس امتحان میں جس سے جس قولی اور عملی سچائی کا ظہور ہوگا' اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ اس کو انعام اور عوض بھی عطا فرمائے گا' چنانچہ فرمایا:

﴿لِيَجْزِىَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِم﴾ (احزاب:۲۴)

''تاکہ اللہ سچے اترنے والوں کو ان کی سچائی کا عوض دے۔''

اسلام میں سچائی کی اہمیت اتنی بڑھائی گئی ہے کہ یہی نہیں کہ سچائی اختیار کرنے کا حکم پر حکم دیا گیا ہے بلکہ یہ بھی تاکید آئی ہے کہ ہمیشہ سچوں کا ساتھ دو' سچوں ہی کی جماعت سے علاقہ اور رابطہ رکھو' اور ان ہی کی صحبت میں رہو کہ ان کی سچائی کے اثر سے تم بھی سچے ہو' کعبؓ بن مالک اور ان کے دو ساتھیوں نے جو تبوک کے سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نہ جا سکے تھے ہر قسم کی تکلیفیں سہہ کر جس سچائی کا ثبوت دیا تھا' اس کی طرف اشارہ کر کے خدا فرماتا ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ (توبہ:۱۱۹)

''اے ایمان لانے والو خدا سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔''

اہلِ تفسیر کے نزدیک یہاں ان سچوں سے مراد آنحضرت ﷺ اور وہ بڑے بڑے صحابیؓ ہیں' جن کی سچائی کا بارہا امتحان ہو چکا تھا' مگر بہرحال آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ کے بعد بھی یہ آیت کریمہ اپنی لفظی وسعت کے سبب سے ہر دور کے مسلمانوں کو سچوں کی معیت اور صحبت کی دعوت دیتی ہے۔

سچائی کے معنی عام طور سے صرف سچ بولنے کے سمجھے جاتے ہیں مگر اسلام کی نگاہ میں اس کے بڑے وسیع معنی ہیں جس کے لحاظ سے اس کے اندر اکیلے قول ہی نہیں' بلکہ عمل کی بھی ہر سچائی داخل ہے' امام غزالی نے احیاء العلوم میں بڑی باریک بینی سے اس کی چھ قسمیں کی ہیں' اور قرآن و حدیث سے ہر ایک کے معنی بتائے ہیں' بات میں

سچائی، ارادہ اور نیت میں سچائی، عزم میں سچائی، عزم کو پورا کرنے میں سچائی، عمل میں سچائی اور دین داری کے مقامات اور مراتب میں سچائی، لیکن ذرا معنی میں وسعت دیجئے تو اس کی تین ہی قسموں میں ساری سچائیاں آ جاتی ہیں، یعنی زبان کی سچائی، دل کی سچائی، اور عمل کی سچائی۔

زبان کی سچائی

یعنی زبان سے جو بولا جائے وہ سچ بولا جائے، اور منہ سے کوئی حرف صداقت کے خلاف نہ نکلے، یہ سچائی کی عام اور مشہور قسم ہے جس کی پابندی ہر مسلمان پر فرض ہے، وعدہ کو پورا کرنا اور عہد اور قول وقرار کو نباہنا بھی اس قسم میں داخل ہے اور یہ ایمان اور اسلام کی بڑی نشانی ہے، اس کے برخلاف ہر قسم کا جھوٹ دل کے نفاق کے ہم معنی ہے، سورہ احزاب میں ایک آیت ہے۔

﴿لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ﴾ (الاحزاب :۲۴)

”تا کہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کا عوض دے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے۔“

اس آیت پاک میں صادق کا مقابل منافق کو قرار دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ صدق ایمان کا اور جھوٹ نفاق کا سرمایہ ہے، اسی حقیقت کو آنحضرت ﷺ نے بیان کے مختلف پیرایوں میں ظاہر فرمایا ہے، صفوان بن سلیم تابعی سے مرسلاً روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کیا مسلمان نامرد بھی ہوسکتا ہے؟ فرمایا ہوسکتا ہے پھر پوچھا کہ بخیل بھی ہوسکتا ہے جواب دیا ہوسکتا ہے، پھر دریافت کیا کیا جھوٹا بھی ہوسکتا ہے فرمایا نہیں (۱) کئی صحابیؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”مومن ہر خصلت پر پیدا ہوسکتا ہے لیکن خیانت کاری اور جھوٹ پر (نہیں)“ (۲) مطلب یہ کہ مومن میں ہر برائی ہوسکتی ہے، مگر خیانت کاری اور جھوٹ کی صفت نہیں ہوسکتی ہے کہ یہ ایمان کے جوہر کے سراسر خلاف ہے، اسی لیے ارشاد ہوا ”کسی بندہ کا ایمان پورا نہیں ہوگا جب تک وہ جھوٹ کو ہر طرح سے نہ چھوڑ دے یہاں تک کہ مذاق اور جھگڑے میں بھی اگرچہ وہ حق ہی پر کیوں نہ ہو۔“ (۳) ان روایتوں کی معنوی تائید اس مشہور حدیث سے ہوتی ہے جو صحاح کی اکثر کتابوں میں ہے، حضرت عبداللہ بن عمروؓ صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جس میں چار باتیں ہوں وہ پکا منافق ہے، اور جس میں ان میں سے ایک بات ہو تو اس میں نفاق کی ایک نشانی پائی جاتی ہے، جب تک وہ اس کو چھوڑ نہ دے، جب امانت اس کے سپرد کی جائے تو خیانت کرے، جب بات کرے جھوٹ بولے، جب کوئی قرار کرے تو پورا نہ کرے اور جب جھگڑے تو حق کے

(۱) موطا امام مالک باب ماجاء فی الصدق والکذب۔

(۲) عن ابی امامة عند احمد، عن سعد بن ابی وقاص عند البزاز وابی یعلی والطبرانی الکبیر والبیہقی من حدیث ابن عمر وقد روی مرفوعاً وموقوفاً۔

(۳) مسند احمد عن ابی ہریرہؓ وطبرانی نیز مسند ابی یعلی عن عمر بن الخطاب یہ حدیثیں حافظ منذری کی ترغیب وترہیب جلد دوم باب الترغیب فی الصدق سے لی گئی ہیں۔

خلاف کہے' (۱) یہی روایت اس طرح بھی ہے کہ منافق کی علامتیں تین ہیں' جب کہے تو جھوٹ بولے' جب وعدہ کرے تو پورا نہ کرے اور جب امین بنایا جائے تو بے ایمانی کرے' (۲) صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے' اگر چہ وہ نمازی اور روزہ دار ہی کیوں نہ ہو اور اپنے کو مسلمان ہی کیوں نہ کہتا ہو۔'' (۳)

ان روایتوں سے یہ پوری طرح معلوم ہوا کہ سچائی سے ایمان کی اور جھوٹ سے نفاق کی پرورش ہوتی ہے یعنی صدق کی راہ سے ایمان اور نیکی کا جذبہ ابھرتا ہے' اور جھوٹ کی راہ سے نفاق اور برائی کی خواہش پیدا ہوتی ہے' آنحضرت ﷺ نے فرمایا'' سچ بولنا نیکی کا راستہ بتاتا ہے اور نیکی جنت کو لے جاتی ہے اور آدمی سچ بولتا جاتا ہے اور سچ بولتے بولتے وہ صدیق ہو جاتا ہے اور جھوٹ بدکاری کا راستہ بتاتا ہے اور بدکاری دوزخ کو لے جاتی ہے اور آدمی جھوٹ بولتا جاتا ہے یہاں تک کہ جھوٹ بولتے بولتے وہ خدا کے ہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے۔'' (۴)

دل کی سچائی

صدق کی دوسری قسم دل سے تعلق رکھتی ہے اور اس حیثیت سے صدق اور اخلاص دونوں ایک ہی چیز بن جاتے ہیں' اور اس حالت میں بعض موقعوں پر زبان سے سچ کا اظہار بھی اس لیے جھوٹ ہو جاتا ہے کہ وہ دل کی تہ سے نہیں نکلا۔ منافق رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آ کر آپ ؐ کی رسالت کا زبانی اقرار کرتے تھے' اور آپ ؐ کی رسالت ایک بالکل سچی بات تھی' لیکن چونکہ یہ اقرار ان کے ضمیر کے خلاف تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ﴾ (منافقون:۱)

''اور اللہ جتائے دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔''

یعنی اپنی شہادت میں جھوٹے ہیں' زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ ؐ خدا کے رسول ہیں' لیکن ان کا یہ اقرار اور ان کی یہ گواہی ان دل کا اقرار اور گواہی نہیں' ان کے دل میں کچھ ہے اور زبان پر کچھ ہے' اس سے معلوم ہوا کہ سچائی اس کا نام ہے کہ زبان سے دل کی صحیح ترجمانی کی جائے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کا نام نفاق ہے' جن کی برائی سے قرآن بھرا ہوا ہے۔ اسی طرح اگر کسی عمل کی دلی غرض کچھ اور ہو اور ظاہر کچھ اور کیا جائے تو وہ بھی جھوٹ ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن خدا کے سامنے تین شخص یعنی ایک عالم' ایک شہید اور ایک دولت مند' پیش ہوں گے' اور ہر ایک اپنے علم و دولت اور جان بازی کے کارنامے بیان کرے گا' لیکن ان کارناموں کو سن کر خدا کہے گا کہ تم جھوٹ بکتے ہو اور فرشتے بھی یہی کہیں گے یہ کارنامے اگر چہ غلط طور پر بیان نہیں کیے گئے

(۱) صحیح بخاری کتاب الایمان و صحیح مسلم و ابوداؤد و ترمذی و نسائی۔

(۲) صحیح بخاری کتاب الایمان و کتاب الادب و صحیح مسلم۔

(۳) صحیح بخاری کتاب الادب۔

(۴) ترمذی کتاب الزہد باب الریاء والسمعہ۔

تھے تاہم چونکہ ان میں اخلاص نہ تھا اور وہ محض شہرت حاصل کرنے کی غرض سے کیے گئے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو جھوٹ کہا کہ ان کے کارناموں کی حقیقی غرض خدا کی خوشنودی نہ تھی بلکہ دنیا کی شہرت اور ناموری تھی جس کا خدا کے یہاں کوئی معاوضہ نہیں۔

عمل کی سچائی

عمل کی سچائی یہ ہے کہ جو نیک عمل ضمیر کے مطابق ہو یا یوں کہئے کہ ظاہری اعمال باطنی اوصاف کے مطابق ہوں، مثلاً ایک شخص نماز میں خشوع و خضوع کا اظہار کرتا ہے اور اس سے اس کا مقصود صرف نمائش ہے تو یہ شخص ظاہر ہے کہ کھلا ہوا ریاکار اور جھوٹا ہے لیکن ایک عملی جھوٹ اس سے بھی بڑھ کر باریک ہے، ایک شخص نمائش کے لیے ایسا نہیں کرتا، تاہم ظاہری طور پر اس کی نماز سے جو خشوع و خضوع ظاہر ہوتا ہے اس کے باطن میں وہ خشوع و خضوع نہیں ہے اس لیے اس کے ظاہری اعمال اس کے باطن کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے اس بنا پر وہ بھی اپنے ان اعمال میں صادق نہیں، اس لئے زبان کی سچائی اور دل کی سچائی کے ساتھ عمل کی سچائی بھی ضروری ہے، اسی لیے جن مسلمانوں نے غیر متزلزل ایمان کے بعد خدا کی راہ میں جان و مال سے جہاد کیا وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک سچے ٹھہرے، خدا نے فرمایا:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ﴾ (حجرات:۱۵)

’’مسلمان تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر (کسی طرح کا) شک (وشبہ) نہیں کیا اور اللہ کے راستے میں اپنی جان و مال سے جہاد کیا یہی سچے لوگ ہیں۔‘‘

یہ سچے اسی لئے ٹھہرے کہ ان کا یہ عمل ان کی دلی کیفیت کا سچا ترجمان ہوا، زبان اور دل سے جس ایمان کا اقرار کیا تھا عمل سے اس کی تصدیق کردی۔

اس صدقِ عملی کے کئی مرتبے ہیں، ایک یہ بھی ہے کہ جو ارادہ کیا جائے اس میں کسی قسم کا ضعف و تردد نہ پیدا ہو مثلاً ایک شخص احکامِ الٰہی کی تعمیل کا ارادہ ظاہر کرتا ہے، لیکن جب اس کی آزمائش کا وقت آتا ہے تو اس کے ارادہ کا ضعف ظاہر ہو جاتا ہے، اس لیے ایسے شخص کو صادق العزم یعنی ارادہ کا پکا نہیں کہہ سکتے، اس قسم کا صادق العزم وہی شخص ہوسکتا ہے جو مومن کامل ہو۔ منافق لوگ اس امتحان میں پورے نہیں اتر سکتے کیونکہ عدمِ یقین کی بنا پر وہ دل کے بودے ہوتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

﴿وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّ ذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَاَوْلٰى لَهُمْ ○ طَاعَةٌ وَّ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ○﴾ (محمد

:۲۰-۲۱)

''اور سچے مسلمان تو یہ تمنا ظاہر کرتے ہیں کہ (جہاد کے بارے میں) کوئی سورت نازل ہو پھر جب کوئی سورت اترتی ہے' اس میں لڑائی کا تذکرہ ہو تو (اے پیغمبر!) جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے تم ان کو دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف ایسے (خوف زدہ) دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت کی بے ہوشی طاری ہو۔ تو ان پر تف ہو (رسول کی) فرمان برداری چاہیے اور صاف و صحیح جواب دینا چاہیے اور جب بات ٹھن جائے پھر یہ لوگ خدا سے سچے رہیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے۔''

اس مرتبہ سے بڑھ کر صدق عملی کا مرتبہ یہ ہے کہ جو قول و قرار کیا جائے اور جس قول و قرار کے پورا کرنے کا سچا عزم کیا جائے اس کو وقت پڑنے پر پورا بھی کر دکھایا جائے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ انسان کسی موقع پر عزم صادق کر لے اور اس میں کسی قسم کا ضعف نہ ہو' لیکن جب اس کے پورے کرنے کا وقت آئے تو اس میں ضعف ظاہر ہو۔ اس لیے صحابہ کرامؓ میں جن لوگوں نے عزم صادق کے ساتھ عملاً اپنے عزم کو پورا کر دکھایا ہے' خدا نے ان کو سچا کہا ہے۔

چنانچہ حضرت انسؓ بن نضر کو غزوۂ بدر میں شرکت کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس کی تلافی کے لیے انہوں نے کہا کہ اب اگر مجھ کو کسی غزوہ میں شرکت کا موقع ملا تو اپنی جان بازی کے جوہر دکھاؤں گا' چنانچہ اس کے بعد غزوۂ احد میں شریک ہوئے اور نیزے' تلوار اور تیر کے تقریباً اسی زخم کھا کر شہادت حاصل کی' ایفائے عزم کی یہ بہترین مثال تھی اس لیے خداوند تعالیٰ نے ان کی شان میں یہ آیت نازل فرمائی۔ (۱)

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَ مَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ (احزاب:۲۳-۲۴)

''مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ خدا کے ساتھ انہوں نے (جانثاری کا) جو عہد کیا تھا اس میں سچے اترے سو (بعض تو) ان میں سے ایسے تھے جو اپنی نذر پوری کر گئے (یعنی شہید ہوئے) اور بعض ان میں سے ایسے ہیں جو (شہادت کے) منتظر ہیں اور انہوں نے (اپنی بات میں) ذرا بھی توڑ دو بدل نہیں کیا تا کہ اللہ تعالیٰ سچوں کو ان کی سچائی کا عوض دے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے یا ان کو معاف کر دے (۲) بے شک اللہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

صدقِ عملی کی سب سے اعلیٰ قسم یہ ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن یعنی اس کی زبان کا ہر حرف دل کا ہر ارادہ اور عمل کی ہر جنبش حق و صداقت کا پورا مظہر ہو جائے' قرآن نے ایسے ہی لوگوں کو صدیق کہا ہے۔ ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کچھ دل سے مانتے ہیں عمل سے اس کی تصدیق اور زبان سے اس کا برملا اقرار' اور یقین کی آنکھوں سے

---

(۱) بخاری تفسیر سورہ احزاب۔

(۲) یعنی ان منافقوں کو توبہ کی توفیق ہو اور وہ آگے چل کر سچے مومن بن جائیں تو خدا ان کو معاف فرما دے۔

اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ بعض بعض صحابیوں کے حالات میں اس کیفیت کا ذکر آتا ہے‘ ایک بار ایک صحابیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ ’’میں خدا پر سچائی کے ساتھ ایمان لایا ہوں‘‘ آپؐ نے کہا کہ سوچ سمجھ کر کہو کیونکہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے تو تمہارے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟ بولے ’’میرا دل دنیا سے پھر گیا ہے اس لیے رات کو جاگا کرتا ہوں۔ (نماز) اور دن کو بھوکا پیاسا رہتا ہوں (روزہ) گویا میں علانیہ عرشِ الٰہی کو دیکھ رہا ہوں‘ گویا مجھ کو نظر آتا ہے کہ اہلِ جنت باہم مل جل رہے ہیں‘ گویا میں دوزخیوں کو واویلا کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔‘‘ ارشاد ہوا کہ ’’تم نے جان لیا‘ اسی پر قائم رہو۔‘‘(۱)

صحابہ کرامؓ ایمان کی یہی حقیقت سمجھتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی خاص صحبتوں میں ان کو ایمان کا یہی درجہ حاصل ہوتا تھا۔ ایک بار حضرت حنظلہؓ اسیدی حضرت ابوبکرؓ کے پاس سے روتے ہوئے گزرے‘ انہوں نے پوچھا حنظلہؓ کیا بات ہے‘ بولے میں منافق ہو گیا ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت ہوتے ہیں اور آپؐ جنت و دوزخ کا ذکر کرتے ہیں تو گویا ہم ان کو علانیہ دیکھ لیتے ہیں لیکن جب پلٹ کر بال بچوں اور دنیوی کاروبار میں مشغول ہو جاتے ہیں تو سب بھول جاتے ہیں‘ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ ہماری بھی یہی حالت ہوتی ہے‘ اب دونوں بزرگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور یہ واقعہ بیان کیا‘ ارشاد ہوا کہ اگر یہ حالت ہمیشہ قائم رہتی تو فرشتے تم سے تمہاری مجلسوں میں مصافحہ کرتے یہ حالت تو کبھی کبھی پیش آ جاتی ہے۔ (۲)

قرآن پاک کی اس آیت میں گویا اسی قسم کی حقیقت کی طرف اشارہ ہے‘ فرمایا:

﴿كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ﴾ (تکاثر:۵)

’’ہرگز نہیں اگر تم کو یقینی علم ہوتا (تو تم سے یہ غفلت نہ ہوتی۔)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پختہ یقین سے اس کے نتائج الگ نہیں ہو سکتے۔

سچائی کی اسی اعلیٰ ترین قسم کا تذکرہ قرآن پاک کی ان آیتوں میں ہے۔

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِى الرِّقَابِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَ الصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ (بقرہ:۱۷۷)

’’نیکی یہی نہیں کہ (نماز میں) اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف کر لو بلکہ نیکی تو ان کی ہے جو اللہ اور روز آخرت اور فرشتوں اور (آسمانی) کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لائے اور مال اللہ کی محبت پر رشتہ داروں

(۱) اسد الغابہ تذکرہ حارث بن مالک۔

(۲) ترمذی ابواب الزہد۔

اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیا' اور (غلامی وغیرہ کی قید سے لوگوں کی) گردنوں (کے چھڑانے) میں دیا اور نماز پڑھتے رہے اور زکوۃ دیتے رہے' اور جب (کسی بات کا) اقرار کرلیا تو اپنے قول کے پورے اور تنگی اور تکلیف میں ہل چل کے وقت میں ثابت قدم رہے' یہی لوگ ہیں جو سچے نکلے اور یہی ہیں پرہیزگار۔''

ان آیتوں میں جن کو صادق کہا گیا ہے ان کے تین قسم کے اوصاف بتائے گئے' اول ان کے ایمان کا کمال' دوسرے ان کے نیک عمل اور تیسرے جانچ میں ان کا ہر طرح پورا اترنا' اور جو لوگ عمل اور عمل کے ان تمام فضائل کے درجہ کمال کو پہنچ جاتے ہیں ان کو شریعت کی زبان میں جیسا کہ پہلے بھی کہا جاچکا' صدیق کہتے ہیں (۱) جو نبوت کے بعد انسانیت کا سب سے پہلا مرتبہ کمال ہے' چنانچہ آیت ذیل میں نبی کے بعد ہی صدیق کا نام لیا گیا ہے' اور بتایا گیا ہے کہ اس جماعت کی رفاقت اور ہمسری کا ذریعہ اللہ اور رسول کی کامل اطاعت ہے۔

﴿وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا﴾ (نساء:۶۹)

''اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے تو وہ (جنت میں) ان (مقبول بندوں) کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیے یعنی نبی اور صدیق اور شہید اور (دوسرے) نیک بندے اور یہ لوگ (کیا ہی) اچھے ساتھی ہیں۔''

سورۂ حدید میں ایمان کامل اور جانی و مالی جہاد کی بار بار دعوت کے بعد ارشاد ہے:

﴿وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِکَ هُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ﴾ (حدید:۱۹)

''اور جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہی صدیق ہیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ صدیقیت اس کامل ایمان کے ذریعہ سے نصیب ہوتی ہے' جس سے عمل کبھی جدا نہیں ہوسکتا۔ یہ حدیث اوپر گزر چکی ہے کہ ''انسان سچ بولتے بولتے صدیق ہو جاتا ہے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ صرف ایک دو دفعہ سچ بول دینے سے یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا' بلکہ اس کے لیے صداقت پر مضبوطی سے قائم رہنے کی ضرورت ہے:

اس تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے سچائی کی تلقین کس وسعت اور گہرائی کے ساتھ کی ہے زبان کی سچائی دل کی سچائی اور عمل کی سچائی اور جب ان تینوں میں کوئی مسلمان کامل ہو تو وہ کامل راست باز اور صادق ہے۔

❀❀❀

(۱) الصدیق الذی یصدق قولہ بالعمل (مجمع البحار) صدیق وہ ہے جس کے قول کی تصدیق عمل سے ہو۔

سخاوت

سچائی کے بعد اسلام کی دوسری بنیادی اخلاقی تعلیم سخاوت ہے۔سخاوت کے حقیقی معنی اپنے کسی حق کو خوشی کے ساتھ دوسرے کے حوالہ کر دینے کے ہیں اور اس کی بہت سی صورتیں ہیں۔اپنا حق کسی کو معاف کرنا' اپنا بچا ہوا مال کسی دوسرے کو دینا' اپنی ضرورت کا خیال کیے بغیر دوسرے کو دینا' دوسرے کے لیے اپنے جسم کی قوت کو خرچ کرنا' اپنے دماغ کی قوت کو خرچ کرنا' اپنی آبرو کو خطرہ میں ڈال دینا' اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دینا' دوسروں کو بچانے کے لیے یا حق کی حمایت میں اپنی جان دے دینا۔یہ سب سخاوت کی ادنیٰ اور اعلیٰ قسمیں ہیں'جن کے امتیاز کے لیے الگ الگ نام رکھے گئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوگا کہ سخاوت اور فیاضی کی تعلیم کتنے وسیع معنوں کو گھیرے اور اخلاق کی کتنی ضمنی تعلیموں کو محیط ہے'اور ان سب کا منشا یہ ہے کہ اپنی ذات سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا جائے' اور ظاہر ہے کہ یہی خیال اکثر اخلاقی کاموں کی بنیاد ہے۔

سورۂ بقرہ کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے اپنے متقی بندوں کے کچھ اوصاف بتائے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے ﴿وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ (بقرہ:۱) ''اور ہم نے ان کو روزی دی اس میں سے کچھ (خدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔''

بعض اہلِ تفسیر نے اس خرچ کرنے سے مراد زکوٰۃ لی ہے مگر صحیح یہ ہے کہ یہ آیت زکوٰۃ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ یہاں جس طرح روزی کی تخصیص نہیں کی گئی' کہ کیا دی گئی' پھل کہ مویشی کہ سونا چاندی یا کوئی اور چیز' اسی طرح اس میں سے کچھ خدا کی راہ میں دینے کی صورت کی بھی تعیین نہیں کی گئی۔خدا نے جس بندہ کو جو کچھ اپنے فضل سے دیا ہے اس کو اس میں سے اس شخص کو دینا چاہیے جس کو یہ نہیں ملا یا ضرورت سے کم ملا۔اس سے یہ معلوم ہوا کہ جس کو جو ملا ہے اس میں سے کچھ ان کو دینا جو اس سے محروم رہے ہیں یا جو اس کے محتاج ہیں' متقیوں کی نشانی ہے اور اسی کا نام اخلاق کی اصطلاح میں سخاوت اور فیاضی ہے۔[۱]

ایمان کے بعد اسلام کے دو سب سے اہم رکن' نماز اور زکوٰۃ ہیں۔زکوٰۃ کی اصلی روح یہی سخاوت اور فیاضی ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر میں اس اخلاقی تعلیم کی حیثیت بالکل بنیادی ہے'یعنی جس طرح نماز

(۱) تفسیر ابن جریر طبری جلد اول تفسیر آیت مذکور۔

کی عبادت ہر قسم کے حقوقِ الٰہی کی بنیاد ہے اسی طرح سخاوت اور فیاضی بندوں کے ہر قسم کے حقوق کی اساس ہے‘ جب تک کسی میں یہ وصف پیدا نہ ہوگا اس میں اپنے ہم جنسوں کی ہمدردی اور محبت کا جذبہ نہ ہوگا۔اسی لیے اسلام نے زکوٰۃ کو فرض کر کے انسان کے اسی جذبہ کو ابھارا ہے۔سارا قرآن انفاق (خرچ کرنا) اور ایتاء (دینا) کے حکم اور تعریف سے بھرا ہوا ہے سورۂ بقرہ میں خصوصیت کے ساتھ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی تاکید پر تاکید آئی ہے۔ اور کہیں کہیں اس کو جہاد کی ایک کڑی بنادیا گیا ہے۔فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَ لَا خُلَّةٌ وَّ لَا شَفَاعَةٌ وَ الْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ (بقرہ:۲۵۴)

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو‘اس میں سے کچھ خرچ کرو جو ہم نے تم کو دیا ہے اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خریدنا ہے نہ دوستی ہے نہ سفارش ہے اور کافر ہی ہیں ظالم۔‘‘

اس آیت پاک کا آخری ٹکڑا (اور کافر ہی ہیں ظالم) غور کے قابل ہے‘اس ٹکڑے سے قیاس ہوتا ہے کہ جو شخص روزِ جزا کے فائدہ کا خیال نہ کر کے خدا کی راہ میں اپنی کوئی چیز خرچ نہیں کرتا وہ کفر کے قریب پہنچ جاتا ہے‘یا یہ کہ وہ کافرِ نعمت ہے‘جو خدا کی روزی کی نعمت پا کر اس کے شکرانہ میں اس میں سے کچھ خدا کی راہ میں نہیں دیتا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کیسے پُر تاثیر انداز میں بندوں کو اپنی دی ہوئی روزی میں سے خرچ کرنے پر ابھارا ہے کہ اے لوگو!اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں خدا کی رحمت اور عذاب سے چھٹکارا نہ خرید وفروخت سے حاصل ہوسکتا ہے‘نہ دوستی ومحبت سے اور نہ سعی وسفارش سے کچھ اپنی روزی میں سے جو خود تمہاری نہیں بلکہ میری ہی دی ہوئی ہے خرچ کر کے خدا کی رحمت اور دوستی کو خرید لو کہ اس دن یہی کام آنے والا ہے۔

خدا کی راہ میں جو سخاوت کی جائے ضرور ہے کہ اس میں خلوصِ نیت ہو۔اس سے مقصود نہ تو کسی کو ممنونِ احسان بنانا ہو‘اور نہ اس کا اولاہنا دینا ہو‘خود رسول کو فرمایا﴿وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ﴾ (مدثر) اور احسان نہ دھر کہ زیادہ بدلہ چاہے‘‘اس خلوص کے ساتھ جو خرچ کیا جائے گا اس کی مزدوری خدا دے گا۔اور قیامت کے غم وملال سے اس کو ہر طرح آزاد رکھے گا۔ارشاد ہے۔

﴿اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَآ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (بقرہ:۲۶۲)

’’جو اپنی دولت خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں‘پھر اس کے خرچ کے پیچھے نہ تو احسان دھرتے ہیں اور نہ الاہنا دیتے ہیں ان کی مزدوری ان کے پروردگار کے پاس دھری ہے اور نہ ان کو ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔‘‘

آگے چل کر ارشاد ہے کہ جو دیا جائے وہ کوئی نکمی چیز نہ ہو کہ اس کے دینے سے نفس کی بلندی کے بجائے نفس کی دناءت ظاہر ہوتی ہے‘فرمایا گیا:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبۡتُمۡ وَ مِمَّاۤ اَخۡرَجۡنَا لَکُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ وَ لَا تَیَمَّمُوا الۡخَبِیۡثَ مِنۡہُ تُنۡفِقُوۡنَ وَ لَسۡتُمۡ بِاٰخِذِیۡہِ اِلَّاۤ اَنۡ تُغۡمِضُوۡا فِیۡہِ﴾ (بقرہ:۲۶۷)

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اس میں سے جو تم نے کمایا اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا اچھی چیزیں خرچ کرو اس میں سے بری چیز کے دینے کا قصد نہ کرو کہ تم دیتے ہو حالانکہ تم اب اس کو لینے والے نہیں مگر یہ کہ آنکھ اس کے لینے میں میچ لو۔''

مطلب یہ ہے کہ جس کو تم خوشی سے لینا پسند کرو اس کا دینا بھی پسند کرو جب تک ایسا نہ کرو گے اخلاق کا وہ جوہر جس کا نام نیکی ہے اور فیاضی ہے تم کو ہاتھ نہیں آ سکتا' صاف فرمایا:

﴿لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ وَ مَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَیۡءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیۡمٌ﴾ (آل عمران:۹۲)

''ہرگز نیکی کو نہ پاؤ گے جب تک تم اس میں سے خرچ نہ کرو جو تم کو پسند ہے' اور جو بھی تم خرچ کرو خدا جانتا ہے۔''

یعنی خدا دل کے حال سے خبردار ہے کس قسم کا مال تم دے رہے ہو اس کی حقیقت اوروں سے چھپی رہے' مگر اس سب دلوں کے حال جاننے والے سے تو نہیں چھپ سکتی ہے' اور اسی لیے وہ پورا پورا بدلہ بھی دے سکتا ہے' اور اس طرح نیکی کے کام میں جو تم دیتے ہو اس کا نفع بھی لوٹ کر تم ہی کو ملے گا' دنیا میں تو اس طرح کہ جماعتی کاموں کی مضبوطی اور جہاد اور محتاجوں کی مدد میں جو کچھ دیتے ہو اس سے اس جماعت کا فائدہ بلکہ زندگی ہے' جس کے تم خود بھی ایک ممبر ہو' اور دین میں تو ظاہر ہے کہ ہر کام کا بدلہ اسی کو ملے گا جو کرے گا' فرمایا:

﴿وَ مَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَلِاَنۡفُسِکُمۡ وَ مَا تُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡہِ اللّٰہِ وَ مَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ یُّوَفَّ اِلَیۡکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ﴾ (بقرہ:۲۷۲)

''اور جو بھی تم نیکی میں خرچ کرو تو وہ تمہارے ہی لیے ہے اور تم نہیں خرچ کرتے مگر اللہ کے لیے' اور جو بھی تم خرچ کرو وہ تم کو پورا دے دیا جائے گا اور تمہارے ساتھ ذرا بے انصافی نہ کی جائے گی۔''

اور اسی لیے کہ دنیا میں جو کچھ دے گا وہ آخرت میں اس کو پورا پورا بلکہ بڑھا کر ادا کر دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ کو قرض سے تعبیر کیا ہے' اور دل بڑھانے والے انداز سے پکارا ہے۔

﴿مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗۤ اَضۡعَافًا کَثِیۡرَۃً﴾ (بقرہ:۲۴۵)

''کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض تو اس کے واسطے وہ اس کو بہت گنا کر لے۔''

﴿مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ وَ لَہٗۤ اَجۡرٌ کَرِیۡمٌ﴾ (حدید:۱۱)

''کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض' تو وہ اس کو اس کے واسطے دونا کرے' اور ہے' اس کے لیے عزت کی مزدوری۔''

آ گے چل کر پھر فرمایا۔

﴿اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَ الْمُصَّدِّقٰتِ وَ اَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَ لَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ﴾ (حدید:۱۸)

''بے شک خیرات کرنے والے اور خیرات کرنے والیاں اور قرض دیتے ہیں اللہ کو اچھا قرض ان کو دونا دیا جائے گا اور ان کے لیے عزت والی مزدوری ہے۔''

کہیں حکم کی صورت میں ہے۔

﴿وَ اَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ (مزمل:۲۰)

''اور اللہ کو اچھا قرض دو۔''

قرضِ حسنہ یعنی اچھا قرض اسی لیے فرمایا کہ وہ خلوص سے دیا جائے اور اس کے بدلہ میں لینے والے سے کسی دنیاوی غرض کا مطالبہ نہ ہو۔ نہ اس پر احسان دھرا جائے' نہ اس سے بدلہ مانگنے کی نیت ہو۔ بنی اسرائیل سے خدا نے جن باتوں کا عہد لیا تھا' اور ان کو قرآن میں مسلمانوں کے سامنے بھی دہرایا گیا ہے' ان میں نماز اور ایمان کے بعد زکوٰۃ کا ذکر ہے اور اس کے بعد آخری بات یہ ہے۔

﴿وَ اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ (مائدہ:۱۲)

''اور (اگر) تم اللہ کو اچھی طرح کا قرض دیتے رہے۔''

تو ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوگا:

﴿لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ لَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ (مائدہ:۱۲)

''تو میں تم سے تمہاری برائیاں اتاروں گا اور تم کو ان باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔''

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں جو بدوی ایمان لائے' اور خوش نیتی کے ساتھ کارِ خیر میں خرچ کرتے تھے خدا نے ان کی تعریف فرمائی۔

﴿وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَ صَلَوٰاتِ الرَّسُوْلِ﴾ (توبہ:۹۹)

''اور بعضے بدوی ایسے ہیں جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے ہیں اور ٹھہراتے ہیں جس کو خرچ کرتے ہیں' اللہ کے نزدیک ہونا اور رسول کی دعا لینا۔''

خدا نے ایسے سخی داتاؤں کو خوش خبری دی۔

﴿اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (توبہ:۹۹)

''ہاں! وہ ان کے حق میں نزدیکی کا سبب ہے' ان کو اللہ اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا' بے شک اللہ

بخشنے والا مہربان ہے۔“

متقی سخیوں کے لیے خدا نے اپنی بخشش اور وسیع جنت کا وعدہ فرمایا ہے اور اس کی طرف جھپٹ کر جانے کی منادی کی ہے۔

﴿وَ سَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ﴾ (آل عمران:۱۳۳۔۱۳۴)

”اور اپنے پروردگار کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کا پھیلاؤ ہے آسمان اور زمین، تیار ہوئی ہے پرہیز گاروں کے واسطے جو خوشی اور تکلیف (دونوں حالتوں) میں خرچ کرتے ہیں۔“

سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے اس خرچ کی جو خدا کی راہ میں کیا جائے، ایک مثال دی ہے جس سے یہ اچنبھا کہ ایک معمولی سے صدقہ کا ثواب دس گنا کیونکر ہوگا، دور ہو جاتا ہے، فرمایا:

﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَ اللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ﴾ (بقرہ:۲۶۱)

”ان کی مثال جو اپنے مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایک دانہ کی سی ہے جس سے سات بالیں اگتی ہیں۔ ہر بال میں سو دانے ہوتے ہیں اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے اور اللہ کشائش والا ہے، سب جانتا ہے۔“

جیسے یہ ایک دانہ سینکڑوں دانے بن جاتا ہے، ایسے ہی نیکی کا ایک بیج ثواب کے سینکڑوں دانے پیدا کر لیتا ہے، خدا گنجائش اور کشائش والا ہے، اس کے ہاں ایک کا سو بن جانا مشکل نہیں ہے اور وہ جانتا بھی ہے کہ کس نے کتنی اچھی نیت سے، یہ دیا ہے اسی رکوع کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے ان کی جو خدا کی خوشنودی کے لیے اچھی نیت سے اپنا مال دیتے ہیں، ایک اور مثال دی ہے۔

﴿وَ مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَ تَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَیْنِ فَاِنْ لَّمْ یُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ﴾ (بقرہ:۲۶۵)

”اور ان کی مثال جو اپنا مال خدا کی خوش نودی چاہنے کے لیے اور اپنے کو پکا کرنے کو دیتے ہیں، ایک باغ کی سی ہے جو کسی ٹیلہ پر ہو، اس پر مینہ پڑا تو اس نے اپنا پھل دونا دیا، اور اگر مینہ نہیں پڑا تو اوس ہی پڑی اور اللہ تمہارے کام دیکھتا ہے۔“

اس مثال میں ٹیلہ کی اونچی صالح زمین سے اچھی نیت، بارش سے زیادہ اور اوس سے تھوڑا بہت خرچ کرنا، اور پھل سے ثواب مراد ہے، تو جیسے باغ کسی اچھی زمین میں پانی سے اور وہ نہ ہو تو ذرا سی نمی سے بھی لہلہا اٹھتا ہے ایسے ہی اچھی نیت سے خدا کی راہ میں جو دیا جائے۔ وہ ایک کے بدلہ میں سو ہو جاتا ہے اور اللہ ہمارے ہر کام سے

باخبر ہے اس لیے ہماری نیتوں کے بھید سے بھی آگاہ ہے۔

اس دادودہش اور جودوسخا کی بلندی اور پاکیزگی کا بہت اونچا معیار سورہ والیل میں بیان کیا گیا ہے فرمایا:

(۱) ﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰیO وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰیO فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْیُسْرٰیO﴾ (لیل :۵۔۷)

''تو جس نے (راہ خدا میں) دیا' اور پرہیز کیا اور اچھی بات کو مانا تو ہم اس کے لیے (نیکی کی) سچ بات کا راستہ آسان کریں گے۔''

(۲) ﴿وَ سَیُجَنَّبُھَا الْاَتْقٰیO الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَہٗ یَتَزَکّٰیO وَ مَا لِاَحَدٍ عِنْدَہٗ مِنْ نِّعْمَۃٍ تُجْزٰیO اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْہِ رَبِّہِ الْاَعْلٰیO وَ لَسَوْفَ یَرْضٰیO﴾ (لیل:۱۷۔۲۱)

''اور اس (دوزخ کی آگ) سے وہ پرہیزگار بچایا جائے گا۔ جو اپنا مال پاکیزگی چاہ کر دیتا ہے اور اس پر کسی کا احسان نہیں جس کا بدلہ دیا جائے' بلکہ اپنے پروردگار برتر کی خوشی کے لیے اور وہ خوش ہو جائے گا۔''

پہلی آیت بتاتی ہے کہ راہِ خدا میں دینے کی عادت' اطاعت و عبادت یا نیک کاموں کے کرنے کی روح پیدا کر دیتی ہے جس سے ہر نیک کام کا کرنا اس پر آسان ہو جاتا ہے' یہ اس نیک عادت کا کتنا بڑا فائدہ ہے۔ دوسری آیت کہتی ہے کہ ایسے متقی پر جو دادودہش کا عادی ہے دوزخ کی آگ حرام ہے' مگر شرط یہ ہے کہ اس جودوسخا کا سبب دنیاوی ناموری یا کسی کے احسان کا بدلہ اتارنا یا کوئی اور غیر مخلصانہ غرض نہ ہو' بلکہ مقصود صرف خدا ہو اور یہ ہو کہ مال و دولت کے میل سے اس کا دامنِ دل پاک ہو جائے' تو خدا بھی اس کے اس عمل کا وہ بدلہ اس کو عنایت فرمائے گا کہ وہ بھی خوش ہو جائے گا۔ اس دوسری آیت میں یہ اشارہ ہے کہ اس نیک عادت کا اثر یہ بھی ہے کہ اس سے دل میں پاکیزگی آتی ہے۔

کفر اور نفاق کے بعد مال و دولت کی محبت ہی وہ کثیف غبار ہے جو دل کے آئینہ کو میلا کرتا اور حق کے قبول سے روکتا رہتا ہے' دنیا کی اصلاحات کی پوری تاریخ اس واقعہ پر گواہ ہے' اسی لیے اسلام نے جب اپنی دعوت اور اصلاح کا کام شروع کیا تو سب سے پہلے دلوں کے اسی میل کو دھونا چاہا' اور جودوسخا اور دادودہش کی برملا تعریف اور جمعِ مال' حرص و طمع اور بخل کی بہت مذمت کی' اور اس بات کی کوشش کی کہ اس کی تعلیم کا یہ اثر ہو کہ اس کے پیروؤں کے دلوں سے مال و دولت کی محبت ہمیشہ کے لیے جاتی رہے۔

﴿وَیْلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِ ۨO الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَہٗO یَحْسَبُ اَنَّ مَالَہٗٓ اَخْلَدَہٗO﴾ (ہمزہ:۱۔۳)

''پھٹکار ہو ہر غیبت کرنے والے عیب کرنے والے پر جس نے دولت اکٹھی کی' اور اس کو گن گن کر رکھا سمجھتا ہے کہ اس کی یہ دولت اس کو سدا رکھے گی۔''

ایک اور آیت میں مال کی محبت پر کافروں کو طعنہ دیا ہے۔

﴿وَ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا﴾ (الفجر:۲۰)

''اور تم مال و دولت سے بہت ہی محبت رکھتے ہو۔''

یہی محبت سچائی اور نیکی کے راستہ پر چلنے سے روکتی ہے' اور انسان سمجھتا ہے کہ اگر میں نے یہ راستہ اختیار کیا تو میری یہ دولت مجھ سے چھن جائے گی' اور میرا مال خرچ ہو جائے گا اسی وسوسۂ شیطانی کو خدا نے انفاق (خدا کی راہ میں دینا) کے سلسلہ میں ان لفظوں میں ادا کیا ہے۔

﴿اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَ یَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَ اللّٰہُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَۃً مِّنْہُ وَ فَضْلًا وَّ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ﴾ (بقرہ:۲۶۸)

''شیطان تم کو محتاجی کا خیال دلاتا ہے اور تمہیں بے حیائی کی بات (بخل) کو کہتا ہے' اور خدا تم سے اپنی طرف سے گناہوں کی بخشائش اور فضل و کرم کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ کشائش والا ہے' جاننے والا ہے۔''

قرآن کی اصطلاح میں دین و دنیا کی ایک بہت بڑی دولت کا نام حکمت ہے یہ دل کی وہ کنجی ہے جس سے عمل اور علم کا ہر بند خزانہ کھل جاتا ہے' حکمت کا یہ خزانہ اس وقت تک کسی کو نہیں ملتا جب تک اس کے دل سے دنیا کے مال و دولت کی محبت جاتی نہ رہے' اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اوپر والی آیت کے بعد ہی ارشاد فرمایا:

﴿یُؤْتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَآءُ وَ یُؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا﴾ (بقرہ:۲۶۹)

''وہ دیتا ہے سمجھ (حکمت) جس کو چاہے اور جس کو سمجھ (حکمت) دی گئی اس کو بڑی دولت ملی۔''

یعنی یہ سمجھ لینا کہ شیطان کا یہ وہم دلانا کہ ہم دینے سے محتاج ہو جائیں گے' اس کا سراسر دھوکا ہے اور خدا کا یہ وعدہ کر دینے سے اس کے فضل و کرم کا دروازہ کھلے گا درست ہے' بہت بڑی دانائی کی بات ہے۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے کہ مال و دولت کی محبت ایک آزمائش ہے اس آزمائش میں پورا اترنا کامیابی کی شرط ہے پھر فرمایا جو بخالت اور لالچ سے بچا' وہی مراد کو پہنچا کیونکہ ہر اونچے مقصد کے لیے پہلی شرط جان و مال کی بازی لگانا ہے جس کے پاؤں اس بازی میں ٹھہر گئے وہی بامراد ہوا۔ اور جس کے اکھڑ گئے وہ نامراد رہا۔

﴿اِنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَ اَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ وَ اللّٰہُ عِنْدَہٗٓ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ○ فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَ اسْمَعُوْا وَ اَطِیْعُوْا وَ اَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِکُمْ وَ مَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْہُ لَکُمْ وَیَغْفِرْلَکُمْ وَ اللّٰہُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ﴾ (تغابن:۱۵۔۱۷)

''تمہارا مال اور تمہاری اولاد تو جانچ ہے' اور اللہ کے پاس بڑی مزدوری ہے' تو اللہ سے ڈرو' جتنا ہو سکے' اور اس کی باتوں کو سنو اور مانو' اور (راہِ خدا میں) خرچ کرو اپنے لیے بھلائی کرو اور جو اپنی جان کی لالچ سے بچایا گیا وہی کامیاب ہیں اگر اللہ کو قرض دو اچھا قرض تو وہ اس کو تمہارے لیے دونا کرے گا اور

تمہارے گناہ معاف فرمائے گا اور اللہ (نیکی کی) قدر پہچانتا ہے' اور (برائی کا بدلہ لینے میں) بردبار ہے۔''

ان آیتوں میں انفاق اور کارِ خیر میں دینے کو کامیابی کی کنجی جو کہا گیا ہے' وہ انسانیت کی اصلاحی تاریخ کے حرف بحرف مطابق ہے' قوموں کی ترقی کا مدار بہت کچھ اس پر ہے کہ وہ اپنی دولت کو اچھے کاموں میں لگاتی اور افراد میں بانٹتی رہیں' یعنی جماعت کے کاموں اور کمائی کے ناقابل یا کمائی سے محروم افراد کی مدد میں اپنا سرمایہ خرچ کرتے رہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ دولت ایک شخص کے پاس اکٹھی نہ ہونے پائے گی۔ اور تمول کی برائیوں سے لوگ بچے رہیں گے' اور بخل اور لالچ کے سبب سے اچھے کاموں کے کرنے سے ہچکچایا نہ کریں گے اور سخاوت کی تعلیم سے اسلام کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے۔

سخاوت سے جو چیز انسان کو روکتی ہے وہ اس کے دو قسم کے بیہودہ خطرے ہیں۔

(۱) میری چیز ہے میں دوسروں کو کیونکر دوں۔

(۲) دوسروں کو دوں گا تو مال میں کمی ہو جائے گی' جس سے ضرورت کے وقت مجھے تکلیف ہوگی۔

اسلام نے اپنی تعلیم سے انسان کے ان دونوں وسوسوں کا خاتمہ کر دیا ہے' اس نے یہ بتایا اور اپنے پیرووں کو اچھی طرح یقین دلایا ہے کہ یہ مال حقیقت میں میرا تیرا کسی کا نہیں وہ صرف خدا کا ہے' وہی اس کا مالک ہے' اسی کی چیز ہے اور اسی کی راہ میں دی جانی چاہیے۔

﴿وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (حدید:۱۰)

''اور تم کو کیا ہوا ہے جو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے' اور آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے۔''

بخل کی برائی میں کہا:

﴿وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَیْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَ لِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (آل عمران: ۱۸۰)

''اور نہ سمجھیں وہ لوگ جو اس میں بخل کرتے ہیں' جس کو اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے کہ یہ ان کے حق میں بہتر ہے بلکہ یہ ان کے حق میں برا ہے' قیامت کے دن ان کے گلے میں اس کا طوق ڈالا جائے گا جس کا بخل کیا تھا اور آسمانوں کی اور زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے۔''

ذرا ذرا سے فرق سے قرآن پاک میں بیسیوں جگہ یہ آیت ہے۔

﴿وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾

''اور خدا ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔''

اسی طرح بیسیوں مقام پر تھوڑے تھوڑے فرق سے یہ آیت آتی ہے۔

﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ ”آسمانوں اور زمین کی ملکیت (یا بادشاہی) اسی کی ہے۔“

منافقوں نے سازش سے یہ طے کرنا چاہا کہ اب رسول اللہ ﷺ اور اسلام کی مالی امداد وہ نہ کریں، تا کہ جو مسلمان اکھٹے ہو گئے ہیں، وہ سرمایہ نہ ہونے پر بکھر جائیں اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی اس سازش کی خبر اپنے رسول کو دی اور ساتھ ہی منافقوں کے اس زعمِ باطل کی کہ اسلام کا سرمایہ ان کے دینے سے ہوگا، تردید کی فرمایا:

﴿هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا وَ لِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ﴾ (منافقون:۷)

”وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ خدا کے رسول کے پاس جو لوگ ہیں ان پر خرچ نہ کرو تا کہ وہ چھوڑ کر الگ ہو جائیں (۱) اور اللہ ہی کے ہیں خزانے آسمانوں کے اور زمین کے اور لیکن منافقین سمجھتے نہیں ہیں۔“

منافق یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کا یہ سارا سرمایہ جس سے تبلیغِ نبوی کی کل (مشین) چل رہی ہے ان کے بل بوتے سے ہے خدا نے فرمایا یہ سارا خیال غلط ہے، آسمان اور زمین کے خزانہ میں جو کچھ ہے وہ اسی کا ہے وہ جہاں سے جس کو چاہے جو چاہے دے دے، دوسرے خیال کو طرح طرح سے باطل کیا، فرمایا:

﴿لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ (شوریٰ:۱۲)

”اسی کے پاس ہیں آسمانوں کی اور زمین کی کنجیاں، پھیلا دیتا ہے روزی جس کے لیے چاہے اور ناپ دیتا ہے وہ ہر ایک چیز کی خبر رکھتا ہے۔“

یہ حقیقت ظاہر ہے کہ روزی کی فراوانی اور تنگی دونوں انسان کی جانچ کے دو برابر کے راستے ہیں اگر ایک میں انسان کی فیاضی، مال کے عدم محبت، ایثار اور جذبۂ شکر کا امتحان ہے تو دوسرے میں انسان کی قناعت پسندی، بے طمعی اور جذبۂ صبر کی آزمائش ہے فرمایا:

﴿فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَ نَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ○ وَ اَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ○ كَلَّا﴾ (فجر:۱۵۔۱۷)

”سو آدمی جو ہے جب اس کا مالک اس کو جانچے پھر اس کو عزت دے اور نعمت دے تو وہ کہتا ہے کہ میرے مالک نے مجھے عزت دی اور جب اس کو جانچے تو اس کی روزی اس پر تنگ کرے تو کہتا ہے کہ میرے مالک نے مجھے ذلیل کیا یہ کوئی بات نہیں۔“(۲)

(۱) یہاں تک کہ وہ چھوڑ کر الگ ہو جائیں۔

(۲) اس کا ایک مطلب تو اہلِ تفسیر نے یہ لیا ہے کہ مجھے یہ پہلے سے معلوم تھا اور دوسرا یہ کہ دولت کے حصول کے طریقوں کا مجھے ہنر معلوم تھا اس دوسرے مطلب کی تائید سورۂ قصص میں قارون کے قصہ والی آیت سے ہوتی ہے (دیکھو روح المعانی جلد ۲۴ صفحہ ۱۱ مصر ۱۲)

غرض روزی کی کشایش اور تنگی دونوں خدا کے کام ہیں اور مصلحت سے ہیں دولت مند انسان یہ سمجھتا ہے کہ مجھی میں کوئی بات ہے جس سے مجھے یہ دولت ملی یا مجھی کو کوئی ایسا ہنر یا طریقہ معلوم ہے جس سے یہ ساری دولت میرے چاروں طرف سمٹی آ رہی ہے۔ مذہبی تعلیم کے علاوہ دنیا کے واقعات پر گہری نظر اس یقین کے مٹانے کے لیے کافی ہے، مگر کم نگاہ لوگ ادھر دیکھتے نہیں قرآن نے اس انسانی جبلت کا نقشہ ان لفظوں میں کھینچ کر اس کی غلطی بتائی ہے:

﴿فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ بَلْ هِیَ فِتْنَةٌ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ○ قَدْ قَالَهَا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَآ اَغْنٰی عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ○ فَاَصَابَهُمْ سَیِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰۤؤُلَآءِ سَیُصِیْبُهُمْ سَیِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَ مَا هُمْ بِمُعْجِزِیْنَ ○ اَوَلَمْ یَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ○﴾ (زمر: ۴۹-۵۲)

''سو جب آدمی کو کوئی تکلیف آ لگے تو ہم کو پکارے پھر جب ہم اپنی طرف سے اس کو کوئی نعمت دیں تو کہے کہ یہ تو مجھے علم [1] پر ملا ہے (خدا فرماتا ہے) بلکہ یہ تو جانچ ہے، مگر بہتیرے اس کو نہیں سمجھتے۔ یہی بات ان کے پہلوں نے کہی تھی تو ان کو ان کی یہ کمائی کام نہ آئی، اور جو کمایا تھا اس کی برائیاں ان پر پڑیں اور جو ان میں سے گنہگار ہیں ان پر بھی ان کی کمائی کی برائیاں پڑنے والی ہیں، وہ تھکا نہیں سکتے کیا ان کو یہ خبر نہیں کہ اللہ ہی روزی جس کے لیے چاہتا ہے، پھیلاتا ہے اور (جس کو چاہتا ہے) ناپ کر دیتا ہے، اس میں ایمان والوں کے لیے البتہ نشانیاں ہیں۔''

ہر جاندار کی روزی خدا کے ذمہ ہے، اس کا یقین انسان کو آ جائے تو سخاوت اور فیاضی کا ہر راستہ اس کے لیے آسان ہو جائے اسلام نے انسانوں کو یہی یقین دلایا ہے، خدا نے فرمایا:

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا وَ یَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ﴾ (ہود: ۶)

''اور کوئی چلنے والا نہیں زمین میں مگر یہ کہ اس کی روزی خدا پر ہے وہ جانتا ہے جہاں اس کو ٹھہرنا ہے (یعنی دوزخ یا بہشت) اور جہاں اس کو سونپا جاتا ہے (یعنی قبر) سب (علمِ الٰہی کی) کھلی کتاب میں موجود ہے۔''

دوسرا یقین یہ آئے کہ ہماری روزی میں سے جو کچھ دوسرے کو مل جاتا ہے وہ تقدیر میں اسی کا تھا، اس لیے درحقیقت وہ ہمارا تھا ہی نہیں، اسلام نے اپنے پیرووں کے اندر سخاوت اور فیاضی کا جوہر پیدا کرنے کے لیے ان

(۱) چنانچہ قارون کو جب راہِ خدا میں خرچ کرنے کی نصیحت کی گئی ہے تو اس نے بھی یہی کہا تھا ﴿قَالَ انما اوتیته علی علم عندی﴾ (قصص: ۴) ''قارون نے کہا یہ دولت تو مجھے ایک ہنر سے ملی ہے جو میرے پاس ہے۔''

یقینیات کو مسلمانوں کے ریشہ ریشہ میں رچا دینا چاہا ہے، وہی سب کو روزی پہنچاتا ہے خدا تعالیٰ پوچھتا ہے:

﴿وَ مَنْ یَّرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ﴾ (نمل:۶۴)

''اور تم کو کون روزی دیتا ہے' آسمان سے اور زمین سے اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہے۔''

روزی دینا اسی کا کام ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِیْنُ﴾ (ذاریات:۵۸)

''بے شبہ اللہ جو ہے وہی روزی دینے والا ہے' زور آور' مضبوط۔''

احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے طرح طرح کے پراثر انداز سے اس تعلیم کی تشریح اور تاکید کی ہے' فرمایا ''تم باندھو نہیں' ورنہ تم پر باندھا جائے گا۔'' یعنی اگر تم اپنی تھیلی کا منہ بند کرو گے اور دوسروں کو نہ دو گے' تو خدا بھی اپنی تھیلی کا منہ تم سے بند کرے گا اور تم کو نہیں دے گا' ایک دفعہ صحابہؓ سے پوچھا ''تم میں سے کس کو اپنے مال سے اپنے وارثوں کا مال زیادہ پیارا ہے؟ لوگوں نے کہا ہم میں کوئی ایسا نہیں جس کو اپنے مال سے اپنے وارثوں کا مال زیادہ پیارا ہے۔ فرمایا تو اس کا مال تو وہی ہے جس کو اس نے آگے بھیجا' اور جو پیچھے چھوڑا وہ تو اس کے وارث کا مال ہے۔'' ایک دفعہ آپؐ نے قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی ﴿اَلْهٰکُمُ التَّکَاثُرُ﴾ (تم کو مال و دولت اور ناز و نعمت کی بڑھوتری نے غفلت میں ڈال دیا) پھر فرمایا آدم کے بیٹے کا یہ حال ہے کہ کہتا ہے کہ میرا مال' میرا مال! اور تیرا مال تو وہی ہے جو تو نے صدقہ کیا اور آگے چلایا' یا کھالیا تو اس کو فنا کر چکا اور پہن لیا تو اس کو پرانا کر چکا۔

فرمایا ''اے ابوذرؓ! مجھے یہ پسند نہیں کہ میرے پاس احد پہاڑ کے برابر سونا ہو اور تیسرے دن تک اس میں سے ایک اشرفی بھی میرے پاس رہ جائے' مگر یہ کہ کسی قرض کے ادا کرنے کو رکھ چھوڑوں' میں کہوں گا کہ اس کو خدا کے بندوں میں ایسے ایسے داہنے بائیں' پیچھے بانٹ دو'' پھر فرمایا ''ہاں جن کے پاس یہاں زیادہ ہے' ان کے ہی پاس وہاں قیامت میں کم ہوگا' لیکن یہ کہ وہ کہے کہ ایسے ایسے دائیں بائیں آگے پیچھے بانٹ دو۔''[1]

فرمایا رشک دو ہی پر روا ہے' ایک اس پر جس کو اللہ نے دولت دی ہے تو وہ ہاتھوں سے اس کو صحیح مصرف (راہِ حق) میں لٹا رہا ہے دوسرے اس پر جس کو اللہ نے علم دیا ہے تو وہ اس کے مطابق بتا رہا ہے اور سکھا رہا ہے۔[2]

اس حدیث کے پہلے ٹکڑے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سخاوت اس دینے کا نام ہے جو صحیح مصرف (حق) میں ہے اور اس میں جس کا مصرف صحیح نہ ہو' یا جو اپنی حد سے زیادہ ہو' اسراف اور فضول خرچی ہے جس کی برائی قرآن پاک میں آئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسلمان کا قدم میانہ روی اور اعتدال سے باہر نہ پڑے اس کی تفصیل اسراف اور بخل کے بیان میں آئے گی۔

یہ بھی سخاوت نہیں کہ کوئی عمر بھر اپنی دولت کو اپنے کلیجے سے لگائے رکھے' اور جب موت سامنے آ کر کھڑی

(۱) صحیح بخاری کتاب الرقاق باب قول النبی ﷺ ما احب ان لی مثل احد ذہبا۔

(۲) صحیح بخاری کتاب العلم۔

ہو جائے اور یقین ہو جائے کہ اب یہ عمر بھر کی ساتھی ساتھ چھوڑ رہی ہے تو ہتھیلی مل کر افسوس کرے کہ اب ذرا سا بھی موقع مل جائے تو اس کو نیک کاموں میں لٹا جاؤں' قرآن پاک نے آدمی کی اس بے بسی کا نقشہ کس پُر اثر انداز میں کھینچا ہے اور مسلمانوں کو اپنی زندگی ہی میں کچھ کر جانے کی نصیحت کی ہے۔

﴿وَ اَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَیَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنِیْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَ اَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ﴾ (منافقون:۱۰)

''اور ہم نے تم کو جو روزی دی اس میں سے خرچ کرو' اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی ایک کو موت آنے لگے تو کہے کہ اے میرے مالک تو نے مجھے تھوڑی مہلت اور نہ دی کہ میں خیرات کرتا اور نیکوں میں ہو جاتا۔''

خدا نے اس کے جواب میں فرمایا:

﴿وَ لَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا وَ اللّٰهُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ (منافقون:۱۱)

''اور خدا ہرگز کسی کو مہلت اور نہ دے گا جب اس کا وقت آ جائے' اور اللہ کو خبر ہے جو کرتے ہو۔''

اس لیے جو کچھ کرنا ہے وقت پر کرنا' ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کونسا صدقہ سب سے بڑا ہے' فرمایا یہ کہ تم تندرست ہو' مال کی خواہش ہو' اور جینے کی بھی امید ہو۔ اور تم اس پر ڈھیل نہ دو کہ جب جان حلق تک آ جائے تو تم کہو کہ فلاں کو اتنا دو حالانکہ وہ اب (تمہارے بعد) فلاں کا ہو ہی چکا۔ (۱)

فرمایا ''اے آدم کے بیٹے! تیرا دینا تیرے لیے بہتر اور تیرا رکھ چھوڑنا تیرے لیے برا ہے۔

❀❀❀

(۱) صحیح مسلم ج اص ۳۰۱ مصر باب بیان افضل الصدقہ۔

عفت و پاک بازی

عفت و پاک بازی ان ساری اخلاقی خوبیوں کی جان ہے، جن کا لگاؤ عزت اور آبرو سے ہے، اسی لیے اسلام نے اس کو ان اخلاقی محاسن میں گنایا ہے، جو مسلمانوں کے چہرہ کا نور ہیں، چنانچہ سورۂ مومنون میں مسلمانوں کے جو امتیازی اوصاف بتائے گئے ہیں، ان میں اس اخلاقی وصف کا بھی خاص طور پر ذکر ہے۔

﴿وَ الَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ○ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ○ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ○﴾ (مومنون: ۵۔۷)

''اور (وہ مسلمان) جو اپنی شرم گاہوں کی پاس بانی کرتے ہیں۔ مگر اپنی بیویوں یا اپنے ہاتھ کی مملوکہ (باندیوں) سے تو ان پر کچھ الزام نہیں، لیکن جو اس کے علاوہ کے طلبگار ہوں تو وہی لوگ حد سے باہر نکلے ہوئے ہیں۔''

سورۂ معارج میں مسلمانوں کے جن اخلاقی اوصاف کی تعریف کی گئی ہے ان میں ایک عفت اور پاک بازی بھی ہے، فرمایا۔

﴿وَ الَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ﴾ (معارج: ۲۹)

''اور جو اپنی شہوت کی جگہ کی حفاظت کرتے ہیں۔''

جن مسلمانوں کے لیے خدا نے اپنی بخشش اور بڑی مزدوری کا وعدہ کیا ہے ان میں وہ بھی ہیں جو عفیف اور پاک دامن ہیں۔

﴿وَ الْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ﴾ (احزاب: ۳۵)

''اور اپنی شرم گاہوں کی پاسبانی کرنے والے مرد اور پاسبانی کرنے والی عورتیں۔''

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوگا کہ عفت اور پاک دامنی کے لیے قرآن کی اصطلاح ''حفظِ فروج'' ہے حفظ کے معنی حفاظت اور پاسبانی کے ہیں، اور فروج اپنے معنی میں ایک مجازی استعمال ہے، کتنے لفظ ہیں جو شرم کے قابل لفظوں سے بچاؤ کے لیے پہلے پہل مجاز کے طور پر بولے گئے، مگر بعد کو استعمال کی کثرت سے وہ اپنے مفہوم میں بالکل ہی بے پردہ ہو گئے فروج کے اصلی معنی دو چیزوں کے درمیان خلا کے ہیں اور اس لیے اس سرحدی مقام کو بھی کہتے ہیں جدھر سے دشمنوں کے حملہ کا ڈر ہو۔ اس بنا پر یہ انسانوں کے اعضا میں سے اس خلا کا نام ہے جو ان

کے دونوں پاؤں کے بیچ میں ہے' اور جدھر سے دشمنوں کی آمد کا خطرہ ہر وقت لگا ہو' اور جس پر پہرہ چوکی بٹھا کر ہر دم پاس بانی اور نگرانی کی ضرورت ہو۔ اس طریقۂ تعبیر سے اندازہ ہو گا کہ عفت و پاک بازی کا جو تخیل ان لفظوں کے اندر پیوست ہے وہ کتنا گہرا اور کتنا بلند ہے۔

عفت و پاک بازی کے لیے قرآن کا دوسرا لفظ ﴿اِحْصَان﴾ ہے جو ﴿حِصْن﴾ سے بنا ہے' جس کے معنی قلعہ یا محفوظ مقام کے ہیں اس سے ﴿حَصَانٌ ' اِحْصَانٌ مُحْصِنٌ﴾ اور ﴿مُحْصَنٌ﴾ الفاظ بنائے گئے ہیں' پہلا لفظ قرآن میں نہیں آیا مگر عربوں کے اشعار میں آیا ہے' اس کے معنی پاک دامن عورت کے ہیں' دوسرے کے معنی حفاظت میں لینے یا حفاظت میں رکھنے کے ہیں' یہ قرآن میں تین موقعوں پر آیا ہے' دو دفعہ حضرت مریمؑ کی حفاظت و پاک دامنی کے بیان میں' ماضی معروف کے صیغہ میں۔

﴿وَ مَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِيْ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا﴾ (تحریم:۱۲)

''اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا۔''

﴿وَ الَّتِيْ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا﴾ (انبیاء:۹۱)

''اور وہ بی بی جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی۔''

تیسری جگہ ماضی مجہول کا صیغہ آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ شوہر نے اس کو اپنے نکاح میں لا کر اپنی حفاظت میں لے لیا' لونڈیوں کے بیان میں ہے کہ اگر وہ کسی کے نکاح میں آ کر بدکاری کریں تو ان کی سزا کیا ہے' فرمایا:

﴿فَاِذَا اُحْصِنَّ﴾ (نساء:۲۵)

''تو جب وہ نکاح کی قید میں آ چکیں۔''

اسی سے اس کا اسم فاعل ﴿مُحْصِنٌ﴾ (حفاظت میں لانے والا) اور اسم مفعول ﴿مُحْصِنَةٌ﴾ (حفاظت میں لائی گئی) نکاح کے سلسلہ میں قرآن میں آیا ہے:

﴿مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ﴾ (نساء:۲۴)

''حفاظت میں لانے والے نہ مستی نکالنے والے۔''

﴿مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ﴾

''حفاظت میں آنے والیاں نہ مستی نکالنے والیاں۔''

یعنی نکاح کی غرض یہ ہے کہ عورت کو عصمت اور حفاظت کی قید میں لایا جائے' حیوانی خواہش رفع کرنا نکاح کا مقصد نہیں' اسی لیے قرآن پاک میں اس کے علاوہ ﴿مُحْصَنٰتٌ﴾ (حفاظت میں رکھی ہوئی بیبیاں) دو معنوں میں آیا ہے ایک بیاہی عورتوں کے معنی میں جیسے

﴿وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ﴾ (نساء:۲۴)

''اور بیاہی عورتیں (یعنی جو عورتیں کسی کے نکاح میں ہیں وہ دوسرے مرد پر حرام ہیں)۔''

دوسرے شریف' آزاد بیبیوں کے معنی میں جیسے

﴿وَ مَنۡ لَّمۡ یَسۡتَطِعۡ مِنۡکُمۡ طَوۡلًا اَنۡ یَّنۡکِحَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ﴾ (نساء:۲۴)

''اور جس کو تم میں سے مسلمان شریف و آزاد بیویوں کے نکاح کا مقدور نہ ہو'' (تو مسلمان باندی سے نکاح کرے۔)

عورتوں کی عصمت کے بیان میں قرآن پاک نے ایک اور محاورہ بھی استعمال کیا ہے۔

﴿حٰفِظٰتٌ لِّلۡغَیۡبِ﴾ (نساء:۳۴)

''پیٹھ پیچھے حفاظت کرنے والیاں۔''

یعنی اپنے شوہروں کی غیر حاضری میں اپنی عزت و آبرو کی پوری حفاظت کرتی ہیں۔

اسلام میں عفت اور پاک بازی کا وہ رتبہ ہے کہ وہ نبوت و رسالت کا لازمی جز ہے نبی' نبی کے سلسلۂ نسب اور نبی کے اہل بیت کا دامن اس داغ سے ہمیشہ پاک رہتا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں حضرت مریمؑ کی نسبت یہود نے جو بہتان باندھا تھا' قرآن نے اس کی تردید کی اور ان کی عصمت اور پاک دامنی کی شہادت دی اور دو موقعوں پر اس شہادت کی تصریح کی۔

﴿وَ مَرۡیَمَ ابۡنَتَ عِمۡرٰنَ الَّتِیۡۤ اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَہَا﴾ (تحریم:۱۲)

''اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا۔''

﴿وَ الَّتِیۡۤ اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَہَا فَنَفَخۡنَا فِیۡہَا مِنۡ رُّوۡحِنَا﴾ (انبیاء:۹۱)

''اور وہ بی بی جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی۔''

حضرت یوسفؑ نے جس پاک بازی کا ثبوت دیا' اس کی گواہی خود عزیز مصر کی بیوی نے دی۔

﴿وَ لَقَدۡ رَاوَدۡتُّہٗ عَنۡ نَّفۡسِہٖ فَاسۡتَعۡصَمَ﴾ (یوسف:۳۲)

''اور میں نے اس کو اس سے چاہا تو وہ بچا رہا۔''

خدا نے فرمایا میں نے ایسا اس لیے کیا۔

﴿لِنَصۡرِفَ عَنۡہُ السُّوۡٓءَ وَ الۡفَحۡشَآءَ اِنَّہٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُخۡلَصِیۡنَ﴾ (یوسف:۲۴)

''تا کہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو دور کریں' وہ بے شبہ ہمارے چنے بندوں میں تھا۔''

معلوم ہوا کہ خدا کے چنے ہوئے اور برگزیدہ بندے ایسی بے حیائی کی باتوں سے پاک رکھے جاتے ہیں۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی تعریف میں فرمایا گیا:

﴿وَ سَیِّدًا وَّ حَصُوۡرًا وَّ نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ﴾ (آل عمران:۳۹)

''اور سردار ہوگا' اور اپنی قوتِ شہوانی پر ضبط رکھتا ہوگا اور نبی ہوگا صالحوں میں سے۔''

اسلام میں اہلِ بیتِ نبوی کی زندگی' جس عفت' عصمت اور پاک بازی کی تصویر تھی' غیب کے دانائے راز

نے اس کی گواہی ان لفظوں میں دی:

﴿اُولٰٓئِکَ مُبَرَّءُ وْنَ مِمَّا یَقُوْلُوْنَ لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّ رِزْقٌ کَرِیْمٌ﴾ (نور:۲۶)

''یہ لوگ تہمت سے پاک ہیں' ان کے لیے بخشائش ہے اور عزت والی روزی۔''

عفت و پاک دامنی کے خلاف کا نام قرآن پاک کی زبان میں ﴿فَاحِشَۃٌ﴾ آیا ہے' جس کے معنی بہت بڑی برائی کے ہیں' جیسے۔ (۱)

﴿اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ﴾ (نساء:۱۹)

''مگر یہ کہ وہ عورتیں کھلی برائی کریں۔''

﴿وَ الّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ مِنْ نِّسَآءِ کُمْ﴾ (نساء:۱۵)

''اور تمہاری عورتوں میں سے جو کھلی برائی کریں۔''

اس برائی کا مشہور عربی نام زنا ہے قرآن پاک کی ذیل کی آیت میں مسلمانوں کو اس برائی سے روکا گیا ہے۔

﴿وَ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً وَّ سَآءَ سَبِیْلًا﴾ (بنی اسرائیل:۳۲)

''اور زنا کے قریب نہ جاؤ' بے شک یہ بڑی برائی اور برا چلن ہے۔''

یہ نصیحت جس طرز سے کی گئی ہے وہ بلاغت کی جان ہے' یہ نہیں فرمایا کہ ''تم زنا نہ کرنا'' بلکہ یہ کہا کہ ''تم زنا کے قریب نہ جانا۔'' اس طرزِ ادا نے نہ صرف یہ کہ اس فعلِ بد ہی سے بچنے کی تاکید کی بلکہ اس سے قریب ہو کر گزرنے کی بھی ممانعت کی' اس سے یہ نکتہ پیدا ہوا کہ جس طرح اس بدکاری سے بچنا شرافت ہے' اس کی تقریب اور تمہید کے کاموں سے بھی بچنا شرافت کا اقتضا ہے کسی غیر محرم کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے یا بے حیائی کے ارادہ سے دیکھنا' تنہائی میں ملنا جلنا' بے وجہ اس کے بدن کو چھونا یا اور کسی طرح سے اس کی بات چیت اور آمد و رفت سے ناجائز لطف اٹھانا' یا دوسرے غیر شریفانہ حرکات کرنا' ایمانی عزت اور اخلاقی شرافت کے سراسر منافی ہے۔

اسی لیے اسلام نے ان ساری باتوں کو جو بے حیائی اور بدکاری کی تقریب اور تمہید ہیں حرام قرار دیا' مرد و عورت کے ناجائز تعلق و محبت کا پہلا قاصد نظر ہے' مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں دونوں کو حکم دیا کہ جب وہ ایک دوسرے کے سامنے ہوں تو اپنی نظریں نیچی رکھیں۔

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ وَ یَحْفَظُوْا فُرُوْجَھُمْ ذٰلِکَ اَزْکٰی لَھُمْ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا یَصْنَعُوْنَ﴾ (نور:۳۰)

''اے پیغمبر! ایمان والوں سے کہہ دے کہ وہ ذرا اپنی آنکھیں نیچی رکھیں' اور اپنے ستر کی حفاظت کریں'

---

(۱) اس کا یہ منشا نہیں کہ قرآن میں ہر جگہ یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے بلکہ وہ لغت کی رو سے قول اور عمل کی ہر برائی کو شامل ہے۔

یہ ان کے لیے بڑی ستھری بات ہے اللہ جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔''

عورتوں کی ذرا سی بے باکی بھی مردوں کو آگے بڑھنے کی جرأت دلاتی ہے اس لیے ان پر شرافت کی چند پابندیاں عائد کی گئیں، مثلاً یہ کہ وہ بھی نگاہیں نیچی رکھیں، غیروں کو اپنے اندر کا بناؤ سنگار نہ دکھائیں، اپنے زیوروں کی جھنکار کسی کو نہ سنائیں، اسی لیے زمین پر ہولے چلیں یا جھنکار کے زیور نہ پہنیں، سینہ کا پردہ رکھیں، باہر نکلیں تو سارے جسم پر چادر ڈال کر نکلیں، باہر نکلنے میں خوشبو نہ ملیں، بیچ راستہ سے کترا کر کنارہ کنارہ چلیں، مرد اور عورت راستہ میں باتیں نہ کریں، مرد و عورت مل جل کر نہ بیٹھیں، کسی عورت سے کوئی تنہائی میں نہ ملے، اجازت کے بغیر گھر کے اندر کوئی اور قدم نہ رکھے، یہ تمام باتیں درحقیقت ﴿لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی﴾ (زنا کے قریب بھی نہ ہو) کی شرح ہیں فرمایا:

﴿وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ یَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَ لَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ لْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُیُوْبِهِنَّ وَ لَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِیْۤ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِیْۤ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِیْنَ غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِیْنَ لَمْ یَظْهَرُوْا عَلٰی عَوْرٰتِ النِّسَآءِ وَ لَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِیُعْلَمَ مَا یُخْفِیْنَ مِنْ زِیْنَتِهِنَّ وَ تُوْبُوْۤا اِلَی اللّٰهِ جَمِیْعًا اَیُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (نور:۳۱)

''اور اے پیغمبر! ایمان والی بیبیوں سے کہہ دے کہ اپنی آنکھیں ذرا نیچی رکھیں اور اپنے ستر کی جگہ کی حفاظت کریں اور بناؤ سنگار کھول کر نہ دکھائیں مگر جو طبعاً کھلا رہتا ہے[۱] اور اپنی اوڑھنی اپنے گریبانوں (یعنی سینوں کے مقام) پر ڈال لیں۔ اور اپنا سنگار نہ کھولیں مگر اپنے شوہر یا اپنے شوہر کے بیٹوں یا اپنے بھائیوں، یا اپنے بھتیجوں، یا اپنے بھانجوں یا اپنی عورتوں[۲] یا اپنے غلاموں یا اپنے ان مرد نوکروں کے آگے جن کو غرض نہیں یا ان لڑکوں کے آگے جو عورتوں کے رمز سے ابھی آگاہ نہیں اور نہ مسلمان عورتیں اپنے پاؤں سے دھمک دیں کہ جس سنگار کو وہ چھپاتی ہیں ان کا پتہ لگ جائے اور تم سب مل کر اے مسلمانو! خدا کے آگے توبہ کرو شاید تم بھلائی پاؤ۔''

اور حسب ذیل ادب گو پیغمبر کی بیویوں کو خطاب کر کے سکھایا گیا ہے مگر عام کے لیے اس میں پیروی کا نمونہ ہے۔

﴿یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا○ وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ وَ لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی﴾ (احزاب:۳۲۔۳۳)

---

۱) جیسے آنکھوں کا سرمہ، ہاتھوں کی مہندی (یا) انگلیوں کی انگوٹھی، اس لیے چہرہ، ہتھیلیاں اور قدم ستر میں داخل نہیں۔

۲) یعنی سہیلیاں اور خادمائیں اور اکثر جن کا ساتھ رہا کرتا ہے (روح المعانی) ۱۲۔

''اے پیغمبر کی بیویو! تم نہیں ہو جیسی ہر کوئی عورت' اگر تم (اللہ کا) ڈر رکھو' سو تم دب کر (مرد سے) بات نہ کرو کہ جس کے دل میں روگ ہے' وہ خواہش کرے[1] اور نیک بات کہو' اور اپنے گھروں میں وقار سے رہو اور جیسے نادانی کا پہلے زمانہ میں دستور تھا ویسے اپنے کو بناؤ سنگار کر کے دکھاتی نہ پھرو۔''

کسی غیر کے گھر کے اندر اجازت کے بغیر قدم نہ رکھا جائے۔

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّآ اَنْ یُّؤْذَنَ لَکُمْ﴾ (احزاب:۵۳)

''اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں اس کے بدوں کہ تم کو اجازت دی جائے (کھانے کی دعوت کے لیے) داخل نہ ہو۔''

گو یہ حکم یہاں خاص واقعہ سے متعلق ہے' مگر حکم کا منشا نبی ﷺ کے گھروں کے ساتھ خاص نہیں' چنانچہ عفت و پاک دامنی ہی کے سلسلہ میں سورۂ نور میں اسی قسم کا حکم عام مسلمان گھروں کی نسبت بھی ہے۔

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَھْلِھَا ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ﴾ (نور:۲۷)

''اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں نہ جایا کرو' جب تک خبر نہ کر لو اور ان کے گھر والوں کو سلام نہ دے لو یہ بہتر ہے تمہارے حق میں شاید تم یاد رکھو۔''

کوئی غیر مرد اگر کسی غیر کے زنانہ مکان سے کوئی چیز مانگے تو چاہیے کہ پردہ کے اوٹ سے مانگے' یہ نہیں کہ دھڑ دھڑا کر اندر گھس جائے چنانچہ کاشانۂ نبوی کے تعلق سے حکم ہوتا ہے۔

﴿وَاِذَا سَاَلْتُمُوْھُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْھُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِکُمْ اَطْھَرُ لِقُلُوْبِکُمْ وَ قُلُوْبِھِنَّ﴾ (احزاب:۵۳)

''اور جب تم مانگنے جاؤ ان بیویوں سے کچھ چیز کام کی تو مانگ لو پردہ کے اوٹ سے' اس میں تمہارے اور ان کے دلوں کی بڑی ستھرائی ہے۔''

یہ حکم گو شانِ نزول کے لحاظ سے ازواجِ مطہرات کے سلسلہ سے ہے' مگر اس میں عام مسلمان گھروں کے لیے بھی حسنِ ادب کا ایک نمونہ ہے۔

مسلمان عورتیں جب گھر سے باہر نکلیں تو اپنے کو ایک چادر سے ڈھانپ لیں' تا کہ ان کی زیبائش و آرائش کا ہر نقش راہ چلتوں کی آنکھوں سے اوجھل رہے اور یہ پہچان ہو کہ یہ عزت والی شریف بیبیاں ہیں ان کو چھیڑنا تو کجا ان کی طرف نظر بھر کر دیکھنا بھی شریعت کا جرم ہے' فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ وَ بَنٰتِکَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَا بِیْبِھِنَّ

(۱) یعنی تم سے جرأت کر کے تمہارا خواہاں ہو۔

ذٰلِکَ اَدۡنٰۤی اَنۡ یُّعۡرَفۡنَ فَلَا یُؤۡذَیۡنَ وَ کَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ۝ لَئِنۡ لَّمۡ یَنۡتَہِ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ وَّ الۡمُرۡجِفُوۡنَ فِی الۡمَدِیۡنَۃِ لَنُغۡرِیَنَّکَ بِہِمۡ ثُمَّ لَا یُجَاوِرُوۡنَکَ فِیۡہَاۤ اِلَّا قَلِیۡلًا ۝ ﴾ (احزاب:۵۹۔۶۰)

''اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دے کہ اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں نیچی لٹکا لیں اس سے یہ ہوگا کہ وہ پہچان پڑیں گی (کہ یہ شریف ہیں) تو ان کو ستایا نہ جائے اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اگر اس پر بھی منافق اور جن کے دلوں میں (بے حیائی کا) روگ ہے اور مدینہ میں جھوٹ اڑانے والے نہ رکیں تو ہم تجھے ان پر بھڑکائیں گے پھر وہ نہ رہنے پائیں گے اس شہر میں تیرے ساتھ مگر تھوڑے دن۔''

ان آیتوں میں اشارہ مدینہ کے بعض شریروں اور منافقوں کی طرف ہے جو مسلمان بیبیوں کو جو خاص ضرورتوں کے لیے اپنے گھروں سے نکلتی تھیں چھیڑتے تھے' اور جب انہیں اس پر ڈانٹا جاتا تھا تو کہتے تھے کہ ہم ان کو لونڈی سمجھتے تھے اس معاشرتی برائی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے دونوں کو دو حکم دیئے' شریروں کی نسبت فرمایا کہ اگر وہ اب اس حرکت سے باز نہ آئیں تو انہیں کافی سزا دی جائے بلکہ ان کو شہر بدر کیا جا سکتا ہے اور مسلمان بیبیوں کے لیے فرمایا کہ جب وہ کسی ضرورت سے اپنے گھر سے باہر نکلیں تو وہ اپنی ظاہری وضع قطع سے بھی شریف معلوم ہوں اور سوسائٹی کی کم درجہ عورتوں سے اپنی پوشاک و وضع الگ رکھیں' اس کے لیے صورت یہ بتائی کہ جب گھر سے نکلنے لگیں تو ایک بڑی چادر سر کے اوپر سے اوڑھ لیں' جس سے اندر کا بھڑکیلا لباس زیور اور دوسرے بناؤ سنگار سب چھپ جائیں اور دیکھنے والوں کو معلوم ہو کہ یہ شریف گھرانوں کی بیبیاں ہیں' جن کی عزت کا احترام ہر شریف کا فرض ہے۔

عرب میں اسلام سے پہلے لونڈیوں سے عصمت فروشی کا کام لیا جاتا تھا[1] اور لوگ اس کی کمائی کھاتے تھے اور اس کو عیب نہیں سمجھتے تھے' مدینہ کا ایک ممتاز منافق عبداللہ بن ابی بن سلول اپنی لونڈیوں کو اس پیشہ پر مجبور کرتا تھا' مگر اس کے باوجود اسلام سے پہلے مدینہ میں وہ اس عزت کا مستحق سمجھا جاتا تھا کہ اس کے سر پر مدینہ کا تاج رکھا جائے۔ عورتیں بناؤ سنگار کر کے گھر سے نکلا کرتی تھیں' سینوں کی پوشش کا لحاظ نہیں کرتی تھیں' بدکار عورتیں شراب کی محفلوں میں ساقی گری کرتی تھیں اور گریبان کھلا رکھتی تھیں کہ جو چاہے دست درازی کر سکے[2] اور نشان کے لیے اپنے گھروں پر جھنڈیاں لگاتی تھیں' اسلام نے آ کر ان مراسم کی اصلاح کی' بدکاری کے انسداد اور عفت و پاک بازی کے خیالات پھیلانے کے لیے ضرورت تھی کہ اس بدترین پیشہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا جائے چنانچہ اس پر

(۱) تفسیر طبری تفسیر سورۂ نور ص ۹۳ مصر و صحیح مسلم و سنن ابی داؤد۔

(۲) سبعہ معلقہ میں طرفہ کے قصیدے کا یہ شعر پڑھیے۔

رحیب قطاب الجیب منہا رفیقۃ بجس الندامی بضۃ المتج

یہ آیت اتری:

﴿وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاۤءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ مَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (النور:۳۳)

''اور تمہاری لونڈیاں کسی ایک کی ہو کر رہنا چاہیں تو ان سے دنیا کی زندگی کے عارضی فائدہ کے لیے زبردستی بدکاری نہ کرایا کرو اور جو ان کو اس پر مجبور کرے گا تو ان کی بے بسی کے پیچھے اللہ بخشنے والا' رحم فرمانے والا ہے۔''

اس لیے اسلام نے اس کو حرام کمائیوں میں سے قرار دیا ہے[۱] اسی کے ساتھ یہ بھی کیا کہ کسی مسلمان مرد کے لیے یہ اچھا نہیں سمجھا ہے کہ ایسی پیشہ ور عورتوں کو توبہ سے پہلے اپنے نکاح میں لے' کیونکہ اس سے اسلامی معاشرت کی ساری آب و ہوا زہر آلود ہو جاتی ہے' سنن ابی داؤد (کتاب النکاح) میں ہے کہ ایک صحابیؓ نے اسی قسم کی ایک پیشہ ور عورت سے نکاح کرنا چاہا' اور رسول اللہ ﷺ سے اس کی اجازت چاہی' وحی الٰہی نے ان کی اس درخواست کا یہ جواب دیا۔

﴿اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَّ حُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (نور:۳)

''بدکار مرد' بدکار ہی عورت یا مشرکہ عورت سے نکاح کرے گا' اور بدکار عورت سے بدکار ہی مرد یا مشرک نکاح کرے گا۔ ایمان والوں پر یہ حرام ٹھہرایا گیا ہے۔''

اس آیت میں انسانی فطرت کی تصویر ہے کہ بدکار عورتوں کو اپنے قبضہ میں لانے کے لیے نکاح کا خیال بدکار ہی مردوں کے دل میں آ سکتا ہے' اسی لیے اس کے بعد آگے چل کر فرمایا گیا:

﴿اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَ الْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ وَ الطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَ الطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ﴾ (نور:۲۶)

''گندی عورتیں' گندے مردوں کے لیے ہوتی ہیں' اور گندے مرد گندی عورتوں کے لیے' اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے۔''

اسی لیے کسی بدکار مرد کا کسی عفیفہ سے اور کسی پاک باز کا بدکار عورت سے نکاح شریعت میں پسندیدہ نہیں' بلکہ بعض علما کے نزدیک سرے سے جائز نہیں'[۲] اور ان کی دلیل سورۂ نور کی اوپر والی آیت کے علاوہ اس حدیث

(۱) صحیح مسلم باب تحریم مطل الغنی وغیرہ ۱۲۔

(۲) جمہور کے نزدیک زانی کا غیر زانیہ سے' یا زانیہ کا غیر زانی سے قانوناً نکاح درست ہے لیکن اخلاقاً پرہیز کے قابل ہے' اور اس آیت سے اس کی جو حرمت بظاہر سمجھی جاتی ہے' اس سے مراد اس کی برائی ہے' یا یہ کہ اہل ایمان کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ ایسوں سے نکاح ←

سے ہے جس کو ابوداؤد اور احمد نے ثقات سے روایت کیا ہے ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس پر زنا ثابت ہو اس کی سزا اس کو دی گئی ہو اس کا نکاح ایسے ہی سے کیا جائے۔ (۱)

غرض اہل ایمان جن کی شان ستھرائی اور پاک بازی ہے ان کے ذہن میں بھی ایسا گندہ تصور نہیں آنا چاہیے چنانچہ سورۂ فرقان میں خدا نے جن کو اپنا خاص بندہ کہا ہے ان کی تین صفتیں آخر میں یہ بتائی ہیں! جو خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کرتے، جو کسی کا خون ناحق نہیں بہاتے، اور بدکاری نہیں کرتے فرمایا:

﴿وَ الَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَ لَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لَا يَزْنُوْنَ﴾ (فرقان:۶۸)

''اور جو خدائے برحق کے ساتھ کسی اور خدا کو نہیں پکارتے، اور کسی ایسی جان کا جس کو خدا نے منع کیا ہے خون نہیں بہاتے اور بدکاری نہیں کرتے۔''

اس آیت میں یہ نکتہ لحاظ کے قابل ہے کہ ان تین ممنوعہ باتوں میں سے پہلی اس سب سے بڑی سچائی سے متعلق ہے، جس کا انکار سراسر کفر ہے اس کے بعد جو دو باتیں ہیں ان میں سے ایک جان سے تعلق رکھتی ہے، اور دوسری عزت و آبرو سے۔

قرآن پاک میں عفت و عصمت کی حفاظت اور بدکاری کے اسباب اور ذریعوں کے انسداد کی جو تدبیریں اختیار کی ہیں، جن کا بیان اوپر آیا ہے، اور جو حقیقت میں ﴿لا تقربوا الزنی﴾ (بدکاری کے قریب بھی نہ جاؤ) کی تشریحیں ہیں، ان کی مزید تشریح رسول اللہ ﷺ نے اپنے عام احکام اور مواعظ میں بھی فرمائی ہے۔

چنانچہ آپؐ نے ایک صحابیؓ کو فرمایا کسی غیر محرم پر اتفاقاً نظر پڑ جائے تو پہلی نظر تو بلا ارادہ ہونے کے سبب معاف ہے، مگر دوسری دفعہ پھر اس پر نظر ڈالنا روا نہیں۔ (۲) حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ ایک دفعہ باریک کپڑوں میں سامنے آئیں تو فرمایا کہ اے اسماء، جب عورت بالغ ہو جائے تو چہرہ اور ہتھیلیوں کے سوا اس کے

← کریں یا ﴿انکحوا الایامی منکم فانکحوا ما طاب لکم من النساء﴾ سے منسوخ ہے یا مخصوص ہے لیکن بعض صحابہ اور علما کا مسلک یہ ہے کہ زانی مرد کا عفیف عورت سے اور عفیف مرد کا بدکار عورت سے نکاح واقعی حرام ہے بلکہ اگر زن و شوہر میں سے کوئی اس برائی کا مرتکب ہو تو قاضی نکاح کو فسخ کر دے گا، چنانچہ روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ میں یہی فیصلہ کیا، ابوداود کی حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، بعض فقہا نے یہ بھی کہا ہے کہ زن و شوہر میں کفو ہونا شرط ہے، اور چونکہ عفیف بدکار کا کفو نہیں ہو سکتا، اس لیے یہ نکاح فریقین میں سے جو عفیف ہے اس کے اعتراض کے بعد قائم نہیں رہ سکتا، ایک اور مسلک یہ ہے کہ یہ حرمت اس وقت ہے جب زانی یا زانیہ نے توبہ نہ کی، توبہ کرنے کے بعد جائز ہے (دیکھو احکام القرآن جصاص، رازی و تفسیرات احمدیہ ملا جیون و تفسیر کبیر رازی اور روح المعانی تفسیر آیت مذکورہ)

(۱) ابوداؤد کتاب النکاح۔

(۲) ابوداؤد کتاب النکاح۔ ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی نظرۃ الفجاء۔

جسم کا کوئی اور حصہ دیکھنا جائز نہیں (۱) حکم دیا کہ مخنث زنان خانوں میں نہ جانے پائیں (۲) فرمایا کسی کے گھر جاؤ تو اجازت سے پہلے پردہ اٹھا کر اس کے اندر نہ جھانکو کہ اس کے اہلِ خانہ کی بے ستری ہو۔ (۳) فرمایا کہ ''عورت تیز خوشبو لگا کر باہر نہ نکلے۔''(۴) سبب ظاہر ہے کہ اس کی خوش بو پاس سے گزرنے والوں میں تحریک پیدا کرے گی' یہ بھی ارشاد ہوا کہ عورت بیچ راہ سے الگ ہو کر کنارہ کنارہ چلے (۵) تا کہ مردوں کی بھیڑ بھاڑ اور دھکوں سے بچے' یہ بھی تاکید فرمائی کہ کوئی مرد کسی غیر عورت کے گھر اس کے شوہر کی غیر موجودگی میں اکیلا نہ جائے کہ اس سے شیطان کو موقع ہاتھ آتا ہے۔ (۶) یہ بھی نصیحت کی گئی کہ گھر کے دروازہ پر پردہ پڑا رہے' اگر کسی گھر کے دروازے بند نہ ہوں یا ان پر پردہ پڑا نہ ہو' اور کوئی اندر گھس گیا تو اس کی ذمہ داری خود گھر والوں پر ہے۔ (۷)

یہ ساری ہدایتیں اسی لیے دی گئی ہیں کہ مسلمان گھروں کی معاشرت عفت اور پاک دامنی کی تصویر ہو۔

لیکن صرف انہی اخلاقی ہدایتوں پر بس نہیں کی بلکہ ان کے لیے جو سوسائٹی کی عزت و حرمت کو خطرہ میں ڈالیں' شرعی ثبوت کے بعد دنیا میں قانونی سزا بھی مقرر کی' تا کہ اس کا خوف لوگوں کو پاک زندگی بسر کرنے پر مجبور کرے۔

﴿اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِىْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ﴾ (نور:۲)

''بدکاری کرنے والی عورت اور بدکاری کرنے والے مرد ان سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔''

احادیث میں بیاہے مردوں اور عورتوں (۸) میں سے جو بدکاری میں پکڑ آئیں ان کو سنگسار کرنے کا بھی حکم ہے' اس جرم میں عورتوں کی حیثیت سب سے نازک ہوتی ہے اس لیے قرآن پاک میں ایک طرف یہ آیا کہ مسلمان عورتوں سے جن باتوں پر بیعت لی جائے ان میں ایک یہ بھی ہو کہ وہ اپنی عزت و آبرو کی پوری حفاظت کریں گی' فرمایا:

﴿وَ لَا يَزْنِيْنَ وَ لَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَ لَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ﴾ (ممتحنہ:۱۲)

---

(۱) ابوداؤد کتاب اللباس باب فیما تبتدی المراۃ زینتھا۔

(۲) ابوداؤد کتاب الادب باب فی الحکم فی المخنثین۔

(۳) ترمذی کتاب الاستیذان قبالۃ البیت۔

(۴) ابوداؤد کتاب الرجل باب فی المراۃ تطیب الخروج۔

(۵) ابوداؤد کتاب الادب باب فی مشی النساء فی الطریق۔

(۶) مسلم کتاب السلام باب تحریم الخلوۃ بالاجنبیۃ والدخول علیھا۔

(۷) ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالۃ البیت۔

(۸) یعنی بیوی والے شوہر اور شوہر والی بیوی۔

''اور وہ بدکاری نہ کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو مار ڈالا کریں گی اور نہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے بیچ میں بہتان باندھ کر لایا کریں گی۔''

بدکاری نہ کرنے کا مطلب تو ظاہر ہے لیکن اولاد کے نہ مار ڈالنے کی جو بیعت خاص طور سے عورتوں سے لی گئی حالانکہ یہ کام مردوں کا تھا۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ عجب نہیں کہ اس سے حمل گرانے کی ممانعت کی طرف اشارہ ہو یا یہ بھی عدمِ قتل کے عموم میں داخل ہو[۱] اور ہاتھ پاؤں کے بیچ میں تہمت باندھ کر لانے سے اشارہ جاہلیت کے ایک رواج کی طرف ہے۔ جاہلیت میں ایک عورت کئی کئی مردوں سے ملتی تھی جب لڑکا ہوتا تو وہی عورت بتاتی کہ یہ ان میں سے کس کا لڑکا ہے' بعض عورتیں دوسرے کے بچہ کو اپنا بنا کر اپنے شوہروں کے سر تھوپتی تھیں' یہ ساری باتیں عفت اور پاک دامنی کے خلاف تھیں۔ اس لیے ان سے باز رکھا گیا اور خاص طور سے ان سے عہد لیا گیا کہ وہ اس پر مضبوطی سے قائم رہیں' فتح مکہ کے وقت آپؐ نے قریشی بیویوں سے اور مدینہ میں انصاری خاتونوں سے بھی اس پر عہد لیا[۲] بلکہ مسلمان مردوں سے ان باتوں کا عہد لیا گیا۔ اور صحابہؓ نے آنحضرت ﷺ سے ان پر بیعت کی۔[۳] دوسری طرف عورتوں کو مردوں کے بہتان اور تہمت سے بچانے کے لیے یہ قاعدہ مقرر ہوا کہ جب کوئی شخص کسی عورت پر اس طرح کا الزام لگائے تو ضروری ہے کہ وہ اس کے ثبوت میں چار چشم دید گواہ پیش کرے' اگر پیش نہ کر سکے تو اس کو ایک شریف خاتون کے جھوٹ بدنام کرنے کے جرم میں اسی کوڑے مارے جائیں گے' اور اس کی گواہی پھر کبھی معتبر نہ ہوگی' اور اگر یہ الزام خود شوہر لگائے اور گواہ نہ ہوں تو مرد قسم کھائے ورنہ عورت قسم کھائے کہ یہ الزام غلط ہے' اور اگر دونوں اپنے دعووں پر قائم رہیں تو اسلام میں دستور یہ رہا ہے کہ اپنے دعویٰ کی سچائی پر قائم رہنے کی بنا پر خود ہی نکاح کو توڑ ڈالا ہے۔[۴]

اسلام کی نظر میں حقوق اللہ میں تقصیر کا سب سے بڑا گناہ شرک ہے اور حقوقِ عباد میں تقصیر کا سب سے بڑا گناہ کسی کی ناحق جان لینا ہے' اور اس کے بعد ہی جس برائی کا نمبر ہے وہ کسی کی عفت و پاک بازی کے پردہ کو چاک کرنا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ اے خدا کے رسول! کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا کہ تم کسی کو خدا کا شریک بناؤ حالانکہ اس نے تم کو پیدا کیا۔ بولے اس کے بعد! فرمایا یہ کہ اپنے لڑکے کو اس خوف سے قتل کر ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گا۔ بولے اس کے بعد' فرمایا یہ کہ اپنے پڑوسی

(۱) مفسرین میں صاحب روح المعانی کا بھی ادھر خیال گزرا ہے۔
(۲) صحیح بخاری فتح مکہ۔
(۳) بخاری کتاب الایمان باب حلاوۃ الایمان۔
(۴) اس کی تفصیل سورۂ نور میں ہے اس کے بعد نکاح توڑنے یا ٹوٹ جانے کا حکم نہیں مگر شروع سے عمل درآمد اسی پر رہا ہے بخاری باب اللعان۔

کی بی بی کے ساتھ زنا کرو چنانچہ خداوند تعالیٰ نے اس کی تصدیق کے لیے یہ آیت نازل فرمائی۔ (۱)

﴿وَ الَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَ لَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لَا یَزْنُوْنَ﴾ (فرقان:۶۸)

''اور جو خدا کے ساتھ (کسی) دوسرے معبود کو نہ پکاریں، اور ناحق (ناروا) کسی شخص کو جان سے نہ ماریں کہ اس کو خدا نے حرام کر رکھا ہے، اور نہ زنا کے مرتکب ہوں۔''

حدیث میں اپنے لڑکے کے مار ڈالنے اور پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کی خصوصیت اس لیے کی گئی ہیں کہ یہ دونوں جرم اپنی نوعیت میں بھی حد درجہ شرم کے قابل اور افسوس ناک ہیں کہ جن سے یہ امید نہیں ہو سکتی ان سے یہ فعل ظہور میں آیا، اور انسانی اعتماد و اعتبار کو صدمہ پہنچا۔

ایک حدیث میں ہے کہ ''زانی جس وقت زنا کرتا ہے، شرابی جس وقت شراب پیتا ہے، چور جس وقت چوری کرتا ہے، اور لوٹنے والا جس وقت سب کی آنکھوں کے سامنے لوٹتا ہے، تو مسلمان نہیں رہتا'' (۲) کیونکہ ایمان نام یقین کا ہے، اور خدا پر اور خدا کے احکام پر یقین رکھ کر کوئی اس کے حکم سے سرتابی نہیں کرتا، اس حالت میں ہوتا یہ ہے کہ مجرم کے ایمان کا چراغ جذبات کی آندھی میں گل ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لیے وہ سب کچھ بھول جاتا ہے اور پھر جب اس کا نشہ ہرن ہوتا ہے تو سب کچھ جاننے اور سمجھنے لگتا ہے۔

اسلام میں زانیوں کی سزا بعض حالتوں میں سو کوڑے مارنا اور بعض حالتوں میں سنگ سار کرنا ہے لیکن ان کو آخرت میں جو عذاب دیا جائے گا وہ اس سے بہت زیادہ سخت اور بہت زیادہ عبرت انگیز ہے، ایک روحانی خواب میں رسول اللہ ﷺ کو بہت سے لوگوں کے اخروی عذاب کی دردناک صورتیں دکھائی دیں، ان میں بدکاروں کے عذاب کی صورت ان کے فعلِ قبیح کے مشابہ یہ تھی کہ تنور کے مانند ایک سوراخ تھا۔ جس کے اوپر کا حصہ تنگ اور نیچے کا حصہ کشادہ تھا اور اس کے نیچے آگ بھڑک رہی تھی اور اس میں بہت سے برہنہ مرد اور برہنہ عورتیں تھیں جب اس کے شعلے بلند ہوتے تھے، تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ ان کے اندر سے نکل آئیں گے، لیکن جب آگ بجھ جاتی تھی تو یہ لوگ پھر اس کے اندر چلے جاتے تھے۔ (۳) یہ عالمِ برزخ کا عذاب تھا جو قیامت تک جاری رہے گا۔

اس کے بخلاف پاک باز اور پاک دامن لوگوں کے فضائل بھی نہایت مؤثر انداز میں بیان کیے گئے ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن جب کہ خدا کے سایہ کے سوا سایہ نہ ہوگا۔ خداوند تعالیٰ سات آدمیوں کو اپنے سایہ میں لے گا جن میں ایک شخص وہ ہوگا جس کو ایک معزز اور حسین عورت نے اپنی طرف مائل کرنا چاہا لیکن

(۱) بخاری کتاب باب قتل الولد خشیۃ ان یاکل۔

(۲) بخاری کتاب الحدود باب الزنا و شراب الخمر۔

(۳) بخاری کتاب الجنائز۔

اس نے یہ کہہ کرانکار کر دیا کہ میں خدا سے ڈرتا ہوں۔ [1]

یہ تو وہ شرف ہے جو پاک بازوں کو آخرت میں حاصل ہوگا لیکن پاک بازی کی دنیوی برکتیں بھی کچھ کم نہیں' ایک حدیث میں آپ نے زمانۂ قدیم کے تین آدمیوں کا قصہ بیان کیا ہے' جو ایک ساتھ سفر کر رہے تھے کہ دفعتاً پانی برسنے لگا' تینوں نے پانی سے بچنے کے لیے پہاڑ کے غار میں پناہ لی' سوءِ اتفاق سے پہاڑ کے اوپر سے ایک پتھر لڑھک آیا جس سے غار کا منہ بند ہو گیا' اب نجات کی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ اپنے اپنے اعمالِ صالحہ کے واسطے سے خدا سے دعا کریں' چنانچہ اس طرح ہر ایک نے دعا کی اور ان اعمال کی برکت سے پتھر رفتہ رفتہ ہٹ گیا۔ ان میں پاک باز آدمی کی دعا یہ تھی ''خداوند! میری ایک چچا زاد بہن تھی جس سے میں بڑی محبت رکھتا تھا میں نے اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ لیکن جب تک میں اس کو سو دینار نہ دے دوں وہ راضی نہ ہوئی میں نے سو دینار کما کر جمع کیے اور اس کو دے کر اپنی خواہش نفسانی پوری کرنی چاہی' لیکن اس نے کہا کہ خدا سے ڈرو میں فوراً رک گیا۔ خداوندا! اگر تو جانتا ہے کہ میں نے صرف تیری مرضی کے لیے ایسا کیا ہے تو اس پتھر کو ہٹا لے'' چنانچہ وہ سرک گیا۔ [2] یہ روایت عفت و پاک بازی کو ان اعمال میں شامل کرتی ہے' جن سے خدا کا قرب ملتا اور دعا کو مقبولیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

❀❀❀

---

(۱) بخاری کتاب الحدود باب فضل من ترک الفواحش۔

(۲) بخاری کتاب الادب باب اجابۃ دعا من بر بوالدیہ۔

دیانت داری اور امانت

آپس کے لین دین کے معاملوں میں جو اخلاقی جوہر مرکزی حیثیت رکھتا ہے وہ دیانت داری اور امانت ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے کاروبار میں ایمان دار رہو اور جس کا جس کسی پہ جتنا ہو اس کو پوری دیانت سے رتی رتی دے دے اسی کو عربی میں امانت کہتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے خود اپنی شرعی تکلیف کو جسے اس نے نوع انسانی کے سپرد کیا ہے' امانت کے لفظ سے ادا کیا ہے۔

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا﴾ (احزاب:۷۲)

''ہم نے (اپنی) امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی' تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا بے شبہ وہ ظالم اور نادان ہے۔''

اس سے ظاہر ہوا کہ یہ پوری شریعت ایک خدائی امانت ہے جو ہم انسانوں کے سپرد ہوئی ہے' اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کے مطابق اپنے مالک کا پورا پورا حق ادا کریں' اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو خائن ٹھہریں گے۔

خدا کا فرشتہ جو خدا کا پیغام لے کر اس کے خاص بندوں پر اترتا تھا' امانت سے متصف ہوتا تھا' تاکہ بندوں کے لیے جو حکم خدا کی جانب سے آئے وہ کمی وبیشی کے بغیر خدا کا اصلی حکم سمجھا جائے' اسی لیے قرآن میں اس فرشتہ کا نام ''الامین'' رکھا گیا ہے۔

﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ﴾ (شعراء:۱۹۳)

''اس پیغام کو لے کر امانت والی روح اتری۔''

﴿مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ﴾ (التکویر)

''اس کا کہا مانا جاتا ہے وہاں امانت والا ہے۔''

اکثر پیغمبروں کی صفت میں بھی یہ لفظ قرآن میں آیا ہے کہ انہوں نے اپنی اپنی امت سے یہ کہا۔

﴿اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ﴾ (شعراء:۱۰۷)

''میں تمہارے لیے امانت دار قاصد ہوں۔''

یعنی خدا سے جو پیغام مجھے ملا ہے وہ بے کم و کاست تم کو پہنچاتا ہوں اس میں اپنی طرف سے ملاوٹ کچھ نہیں،

ہے۔

ہمارے رسولِ اکرم ﷺ کو نبوت سے پہلے مکہ والوں کی طرف سے ''امین'' کا خطاب ملا تھا' کیونکہ آپؐ اپنے کاروبار میں دیانت دار تھے' اور جو لوگ جو کچھ آپ کے پاس رکھواتے تھے وہ آپؐ جوں کا توں ان کو واپس کرتے تھے۔

نیک عمل مسلمانوں کی صفت یہ بتائی گئی۔

﴿وَ الَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ﴾ (مومنون:۸)

''اور جو اپنی امانتوں اور وعدہ کا پاس رکھتے ہیں۔''

بعض روایتوں میں ہے کہ خانۂ کعبہ کی کنجی عثمان بن طلحہ بن عبدالدار شیبی کے پاس رہتی تھی فتح مکہ کے وقت وہ ان کے ہاتھ سے زبردستی لے لی گئی۔ اس پر یہ آیت اتری:

﴿اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا﴾ (نساء:۵۸)

''بے شبہ تم کو اللہ حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے مالکوں کے حوالہ کر دیا کرو۔''

اس حکم کے مطابق یہ امانت ان کو واپس کی گئی' انہوں نے جب پوچھا تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ خدا نے یہی حکم دیا ہے وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اسلام کے اس انصاف اور امانت داری کے حکم کا ان پر یہ اثر ہوا کہ وہ مسلمان ہو گئے۔ (۱) بہرحال یہ واقعہ صرف شانِ نزول کا حکم رکھتا ہے' اور معنی کے لحاظ سے امانت کے ہر جزئیہ پر اس کا اطلاق یکساں ہوگا۔ اسی لیے اہلِ تفسیر کی تصریحات کے مطابق اس کی وسعت میں وہ امانتِ الٰہی بھی داخل ہے جس کا نام عموم کے ساتھ تکلیفِ شرعی ہے (۲) اور وہ امانت بھی داخل ہے جس کا نام عدل وانصاف ہے اور جو حاکموں کو اپنی رعایا کے حقوق کو ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے اور وہ تمام امانتیں بھی اس میں داخل ہیں' جن کو ان کے مالکوں کے سپرد کرنا ضروری ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ امانت کا دائرہ صرف روپے پیسے' جائداد اور مالی اشیا تک محدود نہیں جیسا کہ عام لوگ سمجھتے ہیں' بلکہ ہر مالی' قانونی اور اخلاقی امانت تک وسیع ہے۔ اگر کسی کی کوئی چیز آپ کے پاس رکھی ہے تو اس کے مانگنے پر یا یوں بھی اس کو جوں کا توں دے دینا امانت ہے' اگر کسی کا کوئی حق آپ پر باقی ہے تو اس کو ادا کرنا بھی امانت ہے' کسی کا کوئی بھید آپ کو معلوم ہے تو اس کو چھپانا بھی امانت ہے' کسی مجلس میں آپ ہوں اور کچھ باتیں دوسروں کے متعلق وہاں سن لیں تو ان کو اسی مجلس تک محدود رکھنا اور دوسروں تک پہنچا کر فتنہ اور ہنگامہ کا باعث نہ بننا بھی امانت ہے' کسی نے آپ سے اپنے کسی نج کے کام میں مشورہ مانگا تو اس کو سن کر اپنے تک محدود رکھنا اور اس کو

(۱) تفسیر کشاف زمخشری۔

(۲) ایضاً۔

اپنے جانتے صحیح مشورہ دینا بھی امانت ہے' اگر کوئی کسی کام پر نوکر ہے تو اس کو اس نوکری کے شرائط کے مطابق اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے وہ انجام دے تو یہ بھی امانت ہے' اگر کوئی کسی کا آٹھ گھنٹے کا نوکر ہے اور وہ اس کی اجازت کے بغیر کچھ وقت چرا لیتا ہے' یا بے سبب سستی کرتا ہے' یا دیر سے آتا ہے اور وقت سے پہلے چلا جاتا ہے تو یہ بھی امانت کے خلاف ہے۔

قرآن پاک اور حدیثوں میں ان جزئیات کی تفصیل پوری طرح مذکور ہے۔

ان مسلمانوں میں جن کو خدا نے فلاح پانے کی خوش خبری سنائی ہے' وہ بھی ہیں۔

﴿وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ لِاَمٰنٰتِہِمۡ وَ عَہۡدِہِمۡ رٰعُوۡنَ﴾ (مؤمنون:۸)

''اور جو اپنی امانتوں اور اپنے قول و قرار کی پاس بانی کرتے ہیں۔''

پھر جن مسلمانوں کو جنت میں عزت کی جگہ دی جانے والی ہے ان میں بھی وہ داخل ہیں۔

﴿وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ لِاَمٰنٰتِہِمۡ وَ عَہۡدِہِمۡ رٰعُوۡنَ﴾ (معارج:۳۲)

''اور جو اپنی امانتوں اور اپنے قول و قرار کی پاس بانی کرتے ہیں۔''

اگر کسی نے کسی کو کوئی چیز دھرنے کو دی یا سفر میں گواہ و شاہد اور کاتب نہ ملنے کے سبب سے قرض لے کر گرو رکھی۔

﴿فَلۡیُؤَدِّ الَّذِی اؤۡتُمِنَ اَمَانَتَہٗ وَ لۡیَتَّقِ اللّٰہَ رَبَّہٗ﴾ (بقرہ:۲۸۳)

''تو جو امین بنایا گیا اس کو چاہیے کہ اپنی امانت ادا کر دے اور چاہیے کہ اپنے پروردگار اللہ سے ڈرے۔''

یعنی لے کر مکر نہ جائے' یا دینے میں حیلے حوالے نہ کرے' یا اس میں بلا اجازت کوئی تصرف نہ کرے' یا کسی نے ہم پر بھروسہ کر کے ہم سے کوئی بات کہی تو ہم اس کے اس بھروسہ سے غلط فائدہ اٹھا کر اس کے خلاف کوئی حرکت نہ کر بیٹھیں کہ انہی چیزوں کا نام خیانت ہے جس کی ممانعت اسلام نے برملا کی ہے۔

﴿وَ تَخُوۡنُوۡۤا اَمٰنٰتِکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ﴾ (انفال:۲۷)

''اور اپنی امانتوں میں جان بوجھ کر خیانت نہ کرو۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مدین کے سفر میں دو لڑکیوں کی بکریوں کے پینے کے لیے پانی بھر دیا' اور اس کی کوئی مزدوری ان سے نہیں مانگی' اور ان لڑکیوں میں سے ایک نے واپس جا کر اپنے بزرگ باپ سے ان کی تعریف کی اور سفارش کی کہ ان کو نوکر رکھ لیجیے' تو اس موقع پر قرآن پاک کی یہ آیت ہے:

﴿یٰۤاَبَتِ اسۡتَاۡجِرۡہُ اِنَّ خَیۡرَ مَنِ اسۡتَاۡجَرۡتَ الۡقَوِیُّ الۡاَمِیۡنُ﴾ (قصص:۲۶)

''اے میرے باپ' اس کو نوکر رکھ لیجیے' سب سے اچھا نوکر جس کو آپ رکھنا چاہیں وہ ہے جو طاقتور اور امانت دار ہو۔''

اس آیت میں سب سے بہتر نوکر کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ جس کام کے لیے اس کو رکھا جائے اس میں اس

کی پوری اہلیت اور طاقت ہو اور اس کام کو وہ پوری امانت سے ادا کرے' اس سے یہ اصول بنا کہ جس کو جس کام کا اہل سمجھ کر رکھا جائے وہ اس کی اہلیت کا ثبوت دے' اور اس کو پوری دیانت داری کے ساتھ انجام دے' اب ایک شخص جو چھ گھنٹے کا نوکر ہو' وہ ایک دو گھنٹہ سستی سے چھپے چوری بیکار بیٹھا رہے' تو گو عام لوگ اس کو خیانت کا مرتکب نہیں سمجھتے' لیکن اسلام کی دوررس نگاہوں میں وہ امین نہیں ٹھہر سکتا' یا کوئی شخص اپنے کو کسی کام کا اہل بنا کر کوئی نوکری حاصل کرے مگر حقیقت میں وہ اس کا اہل نہیں تو یہ بھی ایک طرح سے امانت کے خلاف ہے۔

حدیثوں میں امانت کے بہت سے جزئیوں کو ایک ایک کر کے گنایا گیا ہے اور بہت سی ایسی باریک باتوں کو جن کو لوگ امانت کے خلاف نہیں سمجھتے امانت کے خلاف بتایا گیا ہے اور کوئی غور سے دیکھے تو اخلاق کی رو سے وہ یقینی طور سے امانت کے خلاف ہیں۔

جس طرح قرآن پاک کی آیت نے یہ بتایا ہے کہ خدا کی امانت کا بوجھ انسان نے اٹھایا ہے' اسی طرح ایک حدیث بھی ادھر اشارہ کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے راز دار حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے دو باتیں سنی تھیں۔ ایک کو تو آنکھوں سے دیکھ چکا' دوسری یہ ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ امانت داری لوگوں کے دلوں کی جڑ میں اتری ہے' (یعنی ان کی فطرت ہوتی ہے) پھر انہوں نے کچھ قرآن جانا' کچھ سنت سے سیکھا (یعنی فطری امانت کے جوہر میں کسب اور اچھی تعلیم سے ترقی ہوتی ہے) حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ پھر آپؐ نے اس امانت کے مٹ جانے کا حال بھی بتایا' فرمایا'' پھر یہ حال ہوگا کہ آدمی سوئے گا اور امانت اس کے دل سے نکال لی جائے گی' اور اس کا ایک ہلکا سا نشان رہ جائے گا اور پھر سوئے گا تو امانت چلی جائے گی اور ایک آبلہ کی طرح کا داغ رہ جائے گا' جو اٹھ تو جاتا ہے مگر اس کے اندر کچھ نہیں ہوتا' لوگ ایسے ہو جائیں گے کہ لین دین کریں گے۔ لیکن کوئی امانت داری نہیں کرے گا' اس وقت امانت داری کی مثال ایسی کمیاب ہو جائے گی کہ لوگ مثال کے طور پر کہیں گے کہ فلاں قوم میں ایک امانت دار شخص ہے' آدمی کی تعریف ہوگی کہ کیسا عقل مند' کیسا خوش مزاج اور کیسا بہادر ہے حالانکہ اس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان داری نہ ہوگی۔''(۱)

حدیث کے پہلے ٹکڑے میں انسانوں میں ایمان داری کا جوہر فطری طور سے موجود ہونے کا اور پھر دین داری کی تعلیم سے اس کے بڑھنے کا ذکر ہے' اس کے بعد بری صحبت کے اثر سے اس فطری جوہر کے دب جانے اور مٹ جانے کا تذکرہ ہے اور بتایا گیا ہے آخر زمانہ میں وہ ایسا ہی رہ جائے گا' جیسا آبلہ کا داغ رہ جائے۔

طبرانی کبیر میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا' جس میں امانت نہیں' اس میں ایمان نہیں' جس کو عہد کا پاس نہ ہو اس میں دین نہیں' اس ہستی کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے' کسی بندہ کا اس وقت تک دین درست نہ ہوگا جب تک اس کی زبان درست نہ ہو' اور اس کی زبان درست نہ ہوگی جب تک اس کا دل درست نہ ہوگا اور جو کوئی کسی

---

(۱) صحیح بخاری باب رفع الامانۃ (کتاب الفتن والرقاق) صحیح مسلم و مسند احمد و ترمذی و ابن ماجہ۔

ناجائز کمائی سے کوئی مال پائے گا اور اس میں سے خرچ کرے گا تو اس کو اس میں برکت نہیں دی جائے گی اور اگر اس میں سے خیرات کرے گا تو قبول نہیں ہوگی اور جو اس میں سے بچ رہے گا وہ اس کے دوزخ کی طرف سفر کا توشہ ہوگا۔ بری چیز بری چیز کا کفارہ نہیں بن سکتی ہے، البتہ اچھی چیز اچھی چیز کا کفارہ ہوتی ہے۔ (۱)

حدیث کی کئی کتابوں میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''جس میں امانت نہیں، اس میں ایمان نہیں۔'' (۲) اور یہ ظاہر ہے کیونکہ جب دل نے ایک جگہ دھوکا دیا تو ہر جگہ دے سکتا ہے۔

جب کسی سے کوئی مشورہ لیا جائے تو اس کو چاہیے کہ اپنی رائے ایمان داری سے دے، ایک دفعہ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ سے مشورہ کیا تو آپؐ نے فرمایا ''جس سے مشورہ چاہا جائے اس کو امانت سپرد کی جاتی ہے''(۳) اسی لیے آپؐ نے فرمایا کہ مجلس میں جو باتیں ہوں، وہ امانت ہیں، یعنی ایک جگہ کی بات دوسری جگہ پہنچا کر فتنہ کا سبب نہ بنا چاہیے، الا یہ کہ اس سے کسی فتنہ کے روکنے کا کام لیا جائے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا ﴿المجالس بالامانة﴾ یعنی نشستیں امانت کے ساتھ ہوں، مگر تین موقعوں پر کہیں کسی کے ناحق قتل کی۔ (۴) یا کسی کی آبرو ریزی کی، یا کسی کا مال ناجائز طور سے لے لینے کی سازش ہو، تو متعلقہ لوگوں کو اس سے آگاہ کر دینا چاہیے۔

کسی کا راز افشا کرنا بھی امانت کے خلاف ہے۔ بلکہ میاں بیوی کے درمیان پردہ کی جو باتیں ہوتی ہیں وہ بھی ایسے راز ہیں جن کا عام طور سے افشا کرنا بے شرمی کے علاوہ امانت کے خلاف بھی ہے۔ (۵) راز کے یہی معنی نہیں ہیں، کہ جس کو کہنے والا راز کہہ کر ہم سے کہے، بلکہ وہ بھی راز ہے جس سے وہ ہمارے سوا دوسرے کو آگاہ کرنا نہیں چاہتا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جب کوئی شخص کسی سے بات کرے اور وہ احتیاطاً ادھر ادھر اس غرض سے دیکھے کہ کوئی سنتا نہ ہو تو وہ بات بھی امانت ہو جاتی ہے۔ (۶) امانت میں خیانت کرنا آنحضرت ﷺ نے نفاق کی ایک نشانی بتائی ہے۔ (۷)

مرد جب کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لیتا ہے تو خدا کی مقرر کی ہوئی شرطوں کے مطابق لیتا ہے، لیکن اگر کوئی مرد کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لے کر اس کے حقوق ادا کرنے میں کمی کرتا ہے، یا اس کے حقوق کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت میں خیانت کرتا ہے۔ حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے مشہور

(۱) کنز العمال ج ۲ ص ۵ حیدر آباد از طبرانی کبیر عن ابن مسعودؓ۔

(۲) کنز العمال ج ۲ ص ۱۵، از طبرانی اوسط و طبرانی کبیر و ابن عدی فی الکامل و بیہقی فی شعب الایمان۔

(۳) ادب المفرد بخاری باب المستشار موتمن۔

(۴) ابوداؤد باب فی نقل الحدیث۔

(۵) ابوداؤد کتاب الادب۔

(۶) ایضاً۔

(۷) صحیح بخاری کتاب الایمان باب علامات المنافق۔

خطبہ میں فرمایا کہ ''عورتوں کے باب میں خدا سے ڈرو'' فرمایا ''کیونکہ تم نے ان کو اللہ کی امانت اور عہد کے ساتھ اپنی زوجیت میں لیا ہے۔''(۱)

قیامت کی نشانیوں میں آیا ہے کہ ''سب سے پہلے اس امت سے امانت کا جوہر جاتا رہے گا اور سب سے آخر میں جو چیز رہ جائے گی وہ نماز ہوگی اور کتنے نمازی ہیں جن کی نمازوں کا کوئی حصہ خدا کے ہاں نہیں'' (۲) فرمایا میری امت اس وقت تک فطری صلاحیت پر قائم رہے گی، جب تک وہ امانت کو غنیمت کا مال اور زکوٰۃ کو جرمانہ نہیں سمجھے گی۔ (۳) یعنی جو امانت سپرد کی جائے گی اس کو آمدنی اور کارِ خیر میں دینے کو جرمانہ، جب تک مسلمان نہیں سمجھیں گے ان کی فطری صلاحیت باقی رہے گی۔

❀❀❀

(۱) صحیح مسلم حجۃ الوداع۔

(۲) کنز العمال ج ص۱۱۵ از طبرانی و ابن مبارک و حکیم ترمذی و ابن عباسؓ۔

(۳) کنز العمال ج ۲ ص ۱۱۵ از سنن سعید بن منصور۔

شرم وحیا

انسان کا یہ فطری وصف ہے جس سے اس کی بہت سی اخلاقی خوبیوں کی پرورش ہوتی ہے' عفت اور پاک بازی کا دامن اسی کے بدولت ہر داغ سے پاک رہتا ہے' درخواست کرنے والوں کو محروم نہ پھیرنا اسی وصف کا خاصا ہے' آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مروت اور چشم پوشی اسی کا اثر ہے اور بہت سے گناہوں سے پرہیز اسی وصف کی برکت ہے۔

اس وصف سے متصف سب سے پہلے خود خداوند تعالیٰ ہے لیکن اس کے معنی یہاں وہی ہوں گے جو اس کی ذاتِ اقدس کے لائق ہیں مثلاً یہ کہ وہ اپنے بدکار بندوں کو برائی کرتے دیکھتا ہے' لیکن ان کو پکڑتا نہیں اور اس کے آگے جو بھی ہاتھ پھیلاتا ہے' اس کو نامراد نہیں لوٹاتا' حدیث میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''عزت اور جلال والے خدا کے آگے جب کوئی بندہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر کچھ بھلائی مانگتا ہے تو وہ اس کو نامراد لوٹاتے ہوئے شرماتا ہے۔''(۱) ایک دفعہ تین صاحب مسجد نبوی میں آئے آپ ﷺ کے اردگرد صحابہؓ کا حلقہ تھا ایک صاحب کو وہاں ذرا سی جگہ ملی اس میں بیٹھ گئے' دوسرے صاحب شرما کر پیچھے بیٹھ گئے تیسرے صاحب چلے گئے' آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں ان صاحبوں کی خبر نہ دوں؟ جو حلقہ کی ذرا سی جگہ میں آ کر بیٹھا' وہ خدا کی پناہ میں آیا تو خدا نے پناہ کی جگہ دی' اور جو پیچھے جا کر بیٹھا' وہ شرمایا خدا نے بھی اس سے شرم کی (یعنی معاف کیا) اور جو چلا گیا اس نے خدا سے منہ پھیرا تو خدا نے بھی اس سے منہ پھیرا۔ (۲)

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْىٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا﴾ (بقرہ:۲۶)

''خدا کوئی مثال بیان کرنے سے شرماتا نہیں۔''

یعنی کسی حق بات کو ظاہر کرنے میں وہ شرماتا نہیں' جیسا کہ قرآن پاک میں دوسری جگہ ہے۔

﴿وَ اللّٰهُ لَا يَسْتَحْىٖ مِنَ الْحَقِّ﴾ (احزاب:۷)

''خدا حق بات کہنے سے نہیں شرماتا۔''

---

(۱) بیہقی کتاب الاسماء والصفات ۱۲۔

(۲) بخاری کتاب العلم وصحیح مسلم باب السلام۔

(۳) بخاری کتاب الادب باب مالا یستحی من الحق۔

حدیث میں بھی ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِ مِنَ الْحَقِّ﴾

''اللہ تعالیٰ حق کے اظہار سے شرماتا نہیں۔''

قرآن اور حدیث کے اس طرزِ ادا سے ظاہر ہے کہ جو بات حق کے خلاف ہے اس کی نسبت خدا کی طرف خدا کی غیرت وحیا کے خلاف ہے' حدیث میں آتا ہے کہ خدا سب سے زیادہ غیرت مند ہے اور اسی لیے اس نے بدکاریوں کو حرام کیا ہے۔ (۱)

موسیٰ علیہ السلام کو مدین کے سفر میں دو لڑکیوں سے سابقہ پڑا تھا' وہ اگرچہ بدویانہ زندگی بسر کرنے کی عادی تھیں تاہم یہ وصف ان میں ایسا نمایاں تھا کہ خدا نے بھی اس کا ذکر کیا' ان کی عادت یہ تھی کہ جب تک تمام لوگ اپنے اپنے مویشیوں کو پانی پلا کر پلٹ نہ جاتے وہ اپنے مویشیوں کو پانی نہیں پلاتی تھیں' تاکہ مردوں کی کشمکش سے الگ رہیں' اور جب ان کے باپ نے ان میں سے ایک کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بلانے کے لیے بھیجا۔

﴿فَجَآءَتْهُ اِحْدٰهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ﴾ (قصص:۲۵)

''تو ان دو لڑکیوں میں سے ایک شرماتی ان کے پاس آئی۔''

اس آیت میں واقعہ کے اظہار کے ساتھ اس حیا والی لڑکی کی مدح وستائش بھی مقصود ہے۔

یہ وصف انسان میں بچپن ہی سے فطری ہوتا ہے اور اگر اس کی مناسب تربیت کی جائے تو وہ قائم رہتا ہے بلکہ بڑھتا جاتا ہے' اور اگر بری صحبت لگ جائے اور اچھے لوگوں کا ساتھ نہ رہے تو جاتا بھی رہتا ہے' اسی لیے اسلام نے اس کی مناسب نگہداشت کا حکم دیا' سترعورت کا خیال' نگاہیں نیچی رکھنا' بے حیائی کی باتوں کو بولنے اور دیکھنے سے روکنا' برہنگی کو منع کرنا۔ یہاں تک کہ غسل خانہ اور خلوت میں بھی اس کی اجازت نہ دینا' اسی لیے ہے کہ آنکھیں شرم کے منظر سے جھینپتی رہیں' اگر تھوڑی تھوڑی بے حیائی کی جرأت بڑھتی جائے گی تو رفتہ رفتہ پکا بے حیا بن جائے گا۔

آنحضرت ﷺ جب بچہ تھے تو خانہ کعبہ کی تعمیر کا کام ہو رہا تھا' آپ ﷺ اینٹیں اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے۔ آپ ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا تم تہبند کھول کر کندھے پر رکھ لو کہ اینٹ کی رگڑ نہ لگے' آپ ﷺ نے ایسا کیا تو آپ ﷺ پر بے ہوشی طاری ہوگئی ہوش آیا تو زبان مبارک پر تھا میرا تہبند' حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے تہبند باندھ دیا نبوت کے بعد بھی آپ ﷺ کا یہ حال تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں۔ (۲)

((كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَشَدَّ حَيَاءً مِنَ الْعَذْرَاءِ فِي خُدْرِهَا))

---

(۱) صحیح مسلم التوبہ عربی میں غیرت کا لفظ حیاء سے خاص ہے مگر اس موقع پر خدا کے تعلق سے اس کے معنی کچھ حیا کے قریب قریب سے ہو جاتے ہیں غیرت کے اصلی معنی رقابت سے ملتے جلتے ہیں' جو محبت میں شرکت کو نہیں چاہتی۔

(۲) بخاری کتاب الحج باب فضل مکہ وبنیانہا۔

''رسول اللہ ﷺ پردہ نشین کنواری لڑکی سے بھی زیادہ شرمیلے تھے۔''

بعض موقعوں پر آپؐ کو بڑی تکلیف ہوتی تھی' مگر شرم کے مارے زبان سے نہیں کہتے تھے' جیسا کہ سورۂ احزاب میں مذکور ہے۔

﴿اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنْكُمْ﴾ (احزاب:۵۳)

''تمہاری اس بات سے رسول اللہ ﷺ کو ایذا پہنچی تھی تو تم سے وہ شرماتا تھا۔''

حیا کا فطری وصف اگرچہ اپنی جگہ پر تعریف کے قابل ہے' تاہم وہ کبھی کبھی انسان کے لیے اس وقت مضر بھی ہو جاتا ہے' جب اس میں بزدلی اور خوف کا عنصر شامل ہو جاتا ہے' اور وہ بہت سے اجتماعی کام محض شرم وحیا کی وجہ سے نہیں کر سکتا۔ بلکہ بعض حالتوں میں اس سے اس کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے' اس لیے حیا کی حقیقت میں بزدلی کا جو جزو شامل ہے' شریعت مطہرہ نے اس کی اصلاح کی ہے اور وہ یہ ہے کہ امرِ حق کے اظہار میں شرم وحیا دامن گیر نہ ہو' لیکن دوسروں کی مروت سے چپ رہ جانا ایک قسم کی شرافت ہے جو ایک معنی میں تعریف کے قابل ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص نہایت شرمیلا اور حیادار تھا' اس وجہ سے نقصان اٹھاتا تھا' اس کا بھائی اس پر ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا' رسول اللہ ﷺ نے دیکھا تو فرمایا کہ اس پر غصہ نہ کرو کیونکہ حیا ایمان سے ہے۔ (۱)

یہی حیا جو ایمان کا ایک جز ہے' شرعی حیا ہے' یعنی جس طرح ایمان کا اقتضا یہ ہے کہ تمام فواحش ومنکرات سے اجتناب کیا جائے اسی طرح حیا بھی انسان کو ان چیزوں سے روکتی ہے' اس لیے وہ دونوں ایک ہی ہیں لیکن جن لوگوں میں فطرۃً حیا کا مادہ موجود ہوتا ہے' ان کو اس شرعی حیا کے حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے' اس لیے بذاتِ خود یہ فطری مادہ ملامت کے قابل نہیں بلکہ اصلاح کے قابل ہے' اور اصلاح کی صورت یہ ہے کہ جہاں تک اظہارِ حق' وعظ وپند' تبلیغ ودعوت' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ کا تعلق ہے' حیا کے طبعی ضعف کو دور کر دیا جائے' اور شریعت نے ان موقعوں پر اسی ضعف کو دور کیا ہے۔ مثلاً خدا نے قرآن مجید میں جا بجا بہت سی چھوٹی چھوٹی باتوں کو ذکر کیا ہے' جس کو کفار اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان کے منافی سمجھ کر اعتراض کرتے تھے۔ خدا نے فرمایا کیسی ہی حقیر بات ہو لیکن اگر وہ بندوں کے فائدہ کی ہے تو اس کے کہنے سے خدا نہیں شرماتا یعنی شرم کی وجہ سے وہ اس کو نہیں چھوڑ دیتا فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِي اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا﴾ (بقرہ:۲۶)

''اللہ کسی مثال کے بیان کرنے میں (ذرا بھی) نہیں جھینپتا (چاہے وہ مثال) مچھر کی ہو یا اس سے بھی بڑھ کر (کسی اور حقیر چیز کی)۔''

حضرت زینبؓ کی دعوتِ ولیمہ میں صحابہ کرامؓ کھانے کے بعد دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے جس سے

---

(۱) بخاری کتاب الادب باب الحیاء۔

رسول اللہ ﷺ کو تکلیف تو ہو رہی تھی، لیکن فطری حیا کی بنا پر اس کا اظہار نہیں کرتے تھے، تاہم چونکہ لوگوں کا اس طرح جم کر بیٹھنا عام اخلاق بالخصوص آدابِ نبوت کے خلاف تھا۔ اس لیے خداوند تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّ ذٰلِکُمۡ کَانَ یُؤۡذِی النَّبِیَّ فَیَسۡتَحۡیٖ مِنۡکُمۡ وَ اللّٰہُ لَا یَسۡتَحۡیٖ مِنَ الۡحَقِّ﴾ (احزاب: ۵۳)

''اس سے پیغمبر کو ایذا ہوتی تھی، اور وہ تمہارا لحاظ کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ (بات کے کہنے میں) کسی کا کچھ لحاظ نہیں کرتا۔''

اپنی ذاتی تکلیف کے لیے لوگوں کو اپنے پاس سے اٹھا دینا رسول اللہ ﷺ کی خوش خلقی اور مروت کے خلاف تھا۔ اس لیے آپؐ کو اس سے شرم آتی تھی۔ تاہم اس طرح بیٹھ جانا آدابِ مجلس کے خلاف تھا۔ اس لیے خداوند تعالیٰ نے لوگوں کو ٹوکا کہ اخلاق و آداب کی تعلیم دینے میں شرم و حیا کا موقع نہیں۔

یہی حیا تھی جس نے ان مواقع پر صحابۂ کرام کو نہایت دلیر، بے جھجک اور آزاد بنا دیا تھا۔ ایک صحابیہ آپؐ سے ایک مسئلہ دریافت کرنے آتی ہیں اور یہ سمجھتی ہیں کہ یہ سوال عورت کی فطری شرم و حیا کے خلاف ہے تاہم اسی شرعی حیا کی بنا پر سوال سے پہلے کہہ دیتی ہیں کہ یا رسول اللہ! خدا حق بات سے نہیں شرماتا، کیا عورت پر جنابت کا غسل فرض ہے؟۔

ایک بار رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کی مثال ایک ایسے سرسبز درخت کی ہے جس پر کبھی خزاں نہیں آتی، اکابر صحابہ اس درخت کا نام بتانے سے قاصر رہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سمجھ گئے کہ یہ کھجور کا درخت ہے تاہم چونکہ کمسن تھے اس لیے شرم سے چپ رہے، لیکن چونکہ یہ شرم و حیا کا موقع نہ تھا اور علمی مجالس میں آزادی کی ضرورت تھی اس لیے جب حضرت عمرؓ سے انہوں نے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا کہ اگر تم اس درخت کا نام بتا دیتے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی۔ (۱)

انصاریہ عورتیں رسول اللہ ﷺ سے عورتوں کے مسئلے پوچھتی تھیں، اور یہ ان کا خاص اخلاقی وصف سمجھا جاتا تھا، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

نعم النساء نساء الانصار لم یکن یمنعھن الحیاء ان یتفقھن فی الدین. (۲)

''انصار کی عورتیں کس قدر اچھی تھیں کہ دین کا علم حاصل کرنے سے ان کو حیا نہیں روکتی تھی۔''

ان موقعوں یعنی تبلیغ و دعوت، پند و نصیحت، ارشاد و ہدایت، تعلیم و تعلم اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے علاوہ اور ہر جگہ حیا انسان کا ایک ایسا اخلاقی جوہر ہے جس سے اس کو فائدہ پہنچتا ہے اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

(۱) بخاری کتاب الادب باب ﴿ما لا یستحی من الحق للتفقہ فی الدین﴾

(۲) مسلم کتاب الطہارۃ باب استحباب استعمال ﴿المغتسلۃ من الحیض فرصۃ من مسک فی موضع الدم﴾

((الحیاء لایاتی الا بخیر)) (۱)

''حیا سے صرف بھلائی پہنچتی ہے۔''

اور جس شخص کو کسی برے کام کے کرنے میں باک نہیں ہوتا' اس کا نام آزادی اور دلیری نہیں ہے بلکہ بے حیائی اور بے شرمی ہے کیونکہ یہی جذبۂ حیا ہے' جو انسان کو برائیوں سے باز رکھتا ہے اگر یہ نہ ہو تو پھر بے حیا ہو کر انسان جو چاہے کر سکتا ہے کوئی روک نہیں سکتا اس لیے فرمایا کہ

((ان مما ادرک الناس من کلام النبوۃ الاولی اذا لم تستحی فاصنع ماشئت)) (۲)

''لوگوں نے پرانے پیغمبروں کی جو باتیں پائی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ اگر تم میں شرم و حیا نہیں تو جو چاہو کرو۔''

امام نووی (۳) نے اس حدیث کا دوسرا مطلب بھی بیان کیا ہے۔ کہ اگر تم کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو شرم کے قابل ہو تو پوری آزادی سے کر سکتے ہو۔

قرآنِ پاک و حدیث میں جہاں جہاں فحش' منکر اور سوء وغیرہ کے لفظ آئے ہیں ان سے بے حیائی کے یہی سب کام مراد ہیں' اور اسلام نے اس شدت اور جامعیت کے ساتھ ان تمام کاموں سے روکا ہے کہ حیا اسلام کا ایک مخصوص اخلاقی وصف بن گیا ہے۔ اسی بنا پر حدیث میں آیا ہے کہ ہر ایک دین کا ایک خاص خلق ہوتا ہے اور اسلام کا خاص خلق حیاء ہے' (۴) یہ بھی فرمایا کہ ایمان کی کچھ اوپر ساٹھ شاخیں ہیں' اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے (۵) فطری مواقع کے علاوہ ایک مسلمان کو کبھی بھی یہاں تک کہ تنہائی کی حالت میں بھی شرم و حیا کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہیے' یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ برہنگی سے بچو' کیونکہ تمہارے ساتھ ایسے فرشتے رہتے ہیں جو صرف بول و براز اور مباشرت کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہیں تو ان سے شرماؤ اور ان کا خیال رکھو۔ (۶) مقصد یہ ہے کہ شرم کا پانی آنکھوں سے گرنے نہ پائے۔

❀❀❀

---

(۱) بخاری کتاب الادب باب الحیا۔

(۲) فتح الباری ج ۱۰ ص ۴۳۴۔

(۳) بخاری کتاب الادب باب اذلم تستحی فاصنع ماشئت

(۴) موطا امام مالک کتاب الجامع باب ماجاء فی الحیاء۔

(۵) صحیح بخاری کتاب الایمان۔

(۶) ترمذی کتاب الاستیذان والآداب باب ماجاء فی الاستتار عند الجماع۔

رحم

رحم بھی انسان کے بنیادی اخلاق میں سے ہے دنیا میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ کسی معاوضہ کا خیال کیے بغیر جو کچھ نیکی کے کام کرتے ہیں ان کو کرید کر دیکھیے تو سب کی تہ میں رحم کا جذبہ کام کرتا نظر آئے گا۔ جس کے دل میں اس جذبہ کا کوئی ذرہ نہ ہوگا اس سے دوسروں کے ساتھ بے رحمی، ظلم، سنگ دلی اور شقاوت جو کچھ نہ ظاہر ہو وہ کم ہے۔ اسی لیے اسلام کی اخلاقی تعلیم میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے اللہ تعالیٰ کے خاص ناموں میں سے اللہ کے بعد جو نام سب سے زیادہ اور اہم اور عام ہے وہ رحمان یعنی ''بڑا رحم والا'' ہے اس کے ساتھ دوسرا نام ''رحیم'' آتا ہے۔ یعنی رحم سے بھرا ہوا۔ قرآن پاک میں پہلا نام ایک طرح سے خدا کے علم کی حیثیت سے لیا گیا ہے اور دوسرا نام صفت کے طور پر بار بار آتا ہے۔ مسلمان کو حکم ہے جب وہ کوئی اچھا کام شروع کرے تو پہلے رحمان و رحیم خدا کا نام لے۔ ہر سورہ کا آغاز اسی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہے دنیا میں جو کچھ ہے وہ خدا کی رحمت کے جلووں کے سوا کچھ اور نہیں ہے خدا کے فرشتے اپنی دعاؤں میں کہتے ہیں:

﴿رَبَّنَا وَسِعۡتَ كُلَّ شَیۡءٍ رَّحۡمَةً وَّ عِلۡمًا﴾ (مومن: ۷)

''اے ہمارے پروردگار تو نے اپنی رحمت اور علم میں ہر چیز کو سما لیا ہے۔''

اس رحمتِ الٰہی کی تفصیل سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے بلکہ

﴿هُوَ الرَّحۡمٰنُ الرَّحِیۡمُ﴾ (حشر: ۲۲)

''وہی رحم والا، مہربان ہے۔''

مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ وہ دعاؤں میں کہیں:

﴿وَ اَنۡتَ خَیۡرُ الرّٰحِمِیۡنَ﴾ (المومنون: ۱۱۸)

''اور تو سب رحم کرنے والوں میں سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے۔''

دنیا میں رحم و کرم کے جو آثار پائے جاتے ہیں وہ اسی کی رحمت کے آثار اور پرتو ہیں چنانچہ حدیث میں ہے کہ ''خدا نے رحمت کے سو ٹکڑے کیے جن میں سے ننانوے ٹکڑے اپنے پاس رکھ لیے اور زمین پر صرف ایک ٹکڑے کو اتارا اور اسی ایک ٹکڑے کی بنا پر لوگ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں یہاں تک کہ گھوڑا اس خوف سے اپنے بچے پر پاؤں نہیں رکھتا کہ کہیں اس کو صدمہ نہ پہنچ جائے۔''(۱)

(۱) بخاری کتاب الادب۔

بنی نوعِ انسان میں محاسنِ اخلاق کا سب سے بڑا مظہر پیغمبروں کی ذات ہے اور پیغمبروں میں سب سے اعلیٰ واشرف ہستی رسول اللہ ﷺ کی ہے اور خدا تعالیٰ نے آپ کو اسی وصف کے ساتھ متصف کیا ہے۔

﴿لَقَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (توبہ:۱۲۸)

''(لوگو!) تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول آئے ہیں تمہاری تکلیف ان پر شاق گزرتی ہے (اور) ان کو تمہاری بہبود کا ہوکا ہے اور مسلمانوں پر بہت شفیق اور رحیم ہیں۔''

پیغمبروں کے بعد اگلے پیغمبروں کی امتیں ہیں اور ان امتوں میں سے خداوند تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کا یہ خاص اخلاقی وصف بتایا ہے۔

﴿وَ جَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً﴾ (حدید:۲۷)

''اور جو لوگ ان کے پیرو ہوئے ان کے دلوں میں ہم نے ترس اور رحم ڈال دیا۔''

اور اس وصف میں امتِ محمدیہ بھی ان کی شریک و سہیم ہے۔

﴿وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ (فتح:۲۹)

''اور جو لوگ محمد کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر زور آور ہیں آپس میں رحم دل ہیں۔''

آپس کے تعلقات میں ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کا جو برتاؤ کیا جاتا ہے اس کو صلۂ رحم کہتے ہیں کیونکہ قرابتوں کے سارے رشتے رحمِ مادری سے پیدا ہوتے ہیں اور رحم اور رحمان جو خدا کا نام ہے ایک ہی اصل سے مشتق ہیں اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رحم کا جذبہ رحمت والے (رحمان) خدا کی رحمت کا پرتو ہے اور اسی سے صلۂ رحم کا جذبہ دنیا میں پھیلا ہوا ہے حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((الرحم شجنة من الرحمن)) (۱)

''رحم رحمان کی جڑ سے نکلی ہوئی ایک شاخ ہے۔''

یعنی قرابت کی رحم دلی اور شفقت کے جذبہ کی جڑ خود رحمان کی ذات ہے اور ساری رحم دلیوں کے جذبے اس کی شاخیں ہیں، بچوں کی محبت اسی جذبہ سے پیدا ہوتی ہے۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک زانو پر مجھ کو دوسرے زانو پر امام حسن رضی اللہ عنہ کو بٹھا لیتے تھے پھر دونوں کو ملا کر کہتے تھے کہ خداوندا ان دونوں پر رحم کر کیونکہ میں ان دونوں پر رحم کرتا ہوں۔'' (۲)

ایک بار ایک شخص اپنے بچے کو ساتھ لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور لپٹانے لگا۔ آپ ﷺ نے یہ حالت دیکھ کر فرمایا کہ ''تم اس پر رحم کرتے ہو؟ اس نے کہا ''ہاں۔'' ارشاد ہوا کہ خداوند تعالیٰ تم پر اس سے زیادہ رحم کرنے

(۱) بخاری کتاب الادب باب من وصل وصلہ اللہ۔

(۲) بخاری کتاب الادب باب وضع الصبی علی الساق۔

والا ہے، جس قدر تم اس بچے پر رحم کرتے ہو اور وہ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔[1]

ایک بار رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا بوسہ لیا، اقرع بن حابس جو ایک درشت خو بدو تھے، پاس بیٹھے ہوئے تھے، بولے کہ میرے دس بچے ہیں۔ میں نے ان میں سے کسی کا بوسہ نہیں لیا۔ آپ نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ ''جو شخص رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔''

ایک اور بدو نے آپ سے کہا کہ آپ لوگ بچوں کو چومتے ہیں، لیکن ہم لوگ نہیں چومتے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ ''خدا نے جب تمہارے دل سے رحم کو نکال لیا تو میرا کیا زور ہے۔''[2]

رحم کی یہ خاص قسم یعنی چھوٹوں پر ترس کھانا امت محمدیہ کا ایک عنصر ہے، اس لیے فرمایا کہ ''جو شخص ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔''[3] اور اگر اس نظر سے دیکھا جائے کہ رحم ہمیشہ چھوٹوں اور زیردستوں پر کھایا جاتا ہے۔ تو اس حدیث کی وسعت صرف عمر کے چھوٹوں تک نہیں، بلکہ ہر حیثیت کے چھوٹوں تک وسیع ہے۔

خود اپنی قوم کی ہمدردی، محبت اور امانت کا جذبہ اسی اخلاقی وصف سے پیدا ہوتا ہے، اسی لیے قرآن مجید نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا اخلاقی وصف یہ قرار دیا ہے۔ ﴿رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ﴾ (یعنی وہ لوگ آپس میں رحم دل ہیں)

اور حدیث میں اس وصف کو ایک نہایت عمدہ مثال میں بیان کیا گیا ہے، یعنی یہ کہ مسلمانوں کی باہمی رحم دلی و باہمی دوستی اور باہمی مہربانی کی مثال انسان کے جسم کی ہے کہ جب کسی عضو کو درد دکھ پہنچتا ہے تو تمام بدن متاثر ہو جاتا ہے۔[4] جس کے معنی یہ ہیں کہ جذبۂ رحم نے اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے مسلمانوں کو اس قدر متحد کر دیا ہے کہ مجموعی طور پر وہ ایک جسم ہو گئے ہیں، اور انفرادی طور پر مسلمانوں کے تمام افراد اس جسم کے اعضا اور جوارح ہیں۔ اس لیے جس طرح ایک عضو کے درد دکھ میں تمام جسم شریک ہو جاتا ہے، اسی طرح ایک مسلمان کے درد دکھ میں تمام مسلمانوں کو شریک ہونا چاہیے۔

اسلام نے جس رحم دلی کی تعلیم دی ہے وہ مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ نہایت وسیع ہے اور اس میں تمام بنی نوعِ انسان شامل ہیں چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے متعدد حدیثوں میں عام رحم کی تعلیم دی ہے، اور فرمایا کہ جو شخص انسانوں پر رحم نہیں کرتا خدا بھی اس پر رحم نہیں کرے گا یہ بھی فرمایا کہ رحم کرنے والوں پر رحم کرنے والا خدا رحم کرے گا۔ زمین والوں پر تم رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔[5]

---

(۱) ادب المفرد باب رحمۃ العیال۔

(۲) بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الولد وتقبیلہ ومعانقتہ۔

(۳) ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجآئی رحمۃ الصبیان۔

(۴) بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم۔

(۵) بخاری ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی رحمۃ الناس۔

رحم دلی کی یہ تعلیم صرف بنی نوع انسان ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس میں بے زبان جانور بھی شامل ہیں چنانچہ آپؐ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص ذبیحہ جانور پر رحم کرے گا تو خدا قیامت کے دن اس پر رحم کرے گا۔ ایک شخص نے آپؐ کی خدمت میں عرض کی کہ میں بکری کو ذبح کرتا ہوں تو مجھے اس پر ترس آتا ہے، یا یہ کہ مجھے اس پر ترس آتا ہے کہ بکری کو ذبح کروں آپؐ نے دوبارہ فرمایا کہ اگر تم بکری پر رحم کرتے ہو تو خدا بھی تم پر رحم کرے گا۔ (۱)

جانوروں کے لڑانے کا جو بے رحمانہ طریقہ جاری ہو گیا تھا اور اب بھی جاری ہے وہ اس رحم دلی کے بالکل مخالف تھا اس لیے اسلام نے اس تفریحی مشغلہ کو ناجائز کیا اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی ممانعت فرمائی۔

اس عام رحم دلی کی تعلیم رسول اللہ ﷺ نے دو ایسے مختصر اور جامع لفظوں میں دی ہے جو بلاغت کی جان ہیں فرمایا:

﴿مَنْ لَّا يَرْحَمُ لَا يُرْحَمُ﴾

’’جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔‘‘

ان دو لفظوں کی تشریح دفتروں میں نہیں سما سکتی، رحم دلی کا ہر منظر، اور شفقت و کرم کا ہر جذبہ ان ہی دو لفظوں سے ابھارا جا سکتا ہے، اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا اس پر خدا بھی رحم نہیں فرمائے گا، اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو دوسروں پر رحم نہیں کھاتا تو دوسرے بھی اس پر رحم نہیں کھائیں گے۔ محدث ابن بطال نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ ’’اس میں تمام مخلوق پر رحم کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اس لیے اس میں مسلمان، کافر، مملوکہ اور غیر مملوکہ جانور سبھی داخل ہیں، اور ان کے کھانے پینے کی نگرانی کرنا ان پر ہلکا بوجھ لادنا اور ان کو بہت نہ مارنا یہ سب چیزیں اسی رحم میں شامل ہیں۔‘‘ (۲) غرض یہی وہ چیز ہے جس سے ہم یتیموں کی غم خواری، بے کسوں کی تسکین، بیماروں کی تسلی، غریبوں کی امداد، مظلوموں کی حمایت اور زیر دستوں کی اعانت کرتے ہیں اور اس حدیث کے حکم کا وسیع دائرہ ان سب کو گھیرے ہے، اس لیے مبارک ہیں وہ جو رحم کرتے ہیں کہ ان پر رحم کیا جائے گا۔

❀❀❀

(۱) ادب المفرد باب ارحم من فی الارض۔

(۲) صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم۔

عدل وانصاف

کسی بوجھ کو دو[1] برابر حصوں میں اس طرح بانٹ دیا جائے کہ ان دو میں سے کسی میں ذرا بھی کمی یا بیشی نہ ہو تو اس کو عربی میں ''عدل'' کہتے ہیں'[2] اور اس سے وہ معنی پیدا ہوتے ہیں جن میں ہم اس لفظ کو اپنی زبان میں بولتے ہیں جو بات ہم کہیں یا جو کام کریں اس میں سچائی کی میزان کسی طرف جھکنے نہ پائے اور وہی بات کہی اور وہی کام کیا جائے جو سچائی کی کسوٹی پر پورا اترے اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ اخلاق کی ترازو میں عدل وانصاف کا پلہ بھی کچھ کم بھاری نہیں۔

عدل سب سے پہلے خود اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جن روایتوں میں اللہ تعالیٰ کے ۹۹ نام گنائے گئے ہیں ان میں ایک عادل' (عدل والا) بھی ہے' علمانے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ اس کا فیصلہ حق ہوتا ہے' وہ حق بات کہتا ہے' اور وہی کرتا ہے جو حق ہے[3] قرآن پاک میں کئی دفعہ یہ حقیقت مختلف لفظوں میں دہرائی ہے' فرمایا:

﴿وَ اللّٰهُ يَقۡضِىۡ بِالۡحَقِّ﴾ (مومن:۲۰)

''اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے۔''

یہ عدلِ عملی کی طرف اشارہ ہے دوسری آیت میں ہے:

﴿وَ اللّٰهُ يَقُوۡلُ الۡحَقَّ﴾ (احزاب:۴)

''اور اللہ حق بات کہتا ہے۔''

یہ اللہ تعالیٰ کے عدلِ قولی کو ظاہر کرتا ہے' اور یہ دونوں باتیں قرآن پاک کی ذیل کی آیت میں یکجا ہیں:

﴿وَ تَمَّتۡ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدۡقًا وَّ عَدۡلًا﴾ (انعام:۱۱۵)

''اور تیرے رب کی بات سچائی اور انصاف کے ساتھ پوری ہوگئی ہے۔''

دنیا کا یہ سارا کارخانہ جو آسمان سے لے کر زمین تک پھیلا ہے' صرف اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف کے بل بوتے پر قائم ہے' وہ اپنی تمام مخلوقات پر اپنی شہنشاہی پورے انصاف کے ساتھ قائم کیے ہوئے ہے' اور یہی اس کی

---

(۱) فتح الباری جلد ۱۰ صفحہ ۳۶۸ مصر۔

(۲) مفردات راغب اصفہانی۔

(۳) کتاب الاسماء والصفات بیہقی صفحہ ۶۱ الہ آباد۔

وحدانیت کی دلیل ہے ارشاد ہوتا ہے:

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ﴾ (آل عمران:۱۸)

''خدا نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی اور خدا نہیں' اور فرشتوں نے اور علم والوں نے' وہی خدا انصاف کو لے کر کھڑا ہے۔''

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ عدل وانصاف صرف نظم وسلطنت ہی کے لیے مخصوص نہیں ہے' بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں عدل کی ضرورت ہے اور نظامِ عالم محض عدل کی وجہ سے قائم ہے' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت ہی جامع آیت میں جن اچھی باتوں کا حکم دیا ہے' ان میں سب سے پہلے عدل وانصاف ہی کرنے کا حکم فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ﴾ (نحل:۹۰)

''بے شبہ اللہ انصاف اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے۔''

عدل قانون کا اقتضا ہے اور احسان کرنا اور درگزر کرنا اخلاق کا مطالبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نظمِ عالم کو قائم رکھنے کے لیے سب سے پہلے عدل کا حکم دیا ہے' اور اس کے بعد احسان کی تاکید کی ہے جس سے اشخاص کی روحانی تکمیل ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ سارے عالم کی نگہداشت کا فرض کسی شخص کی ذاتی تکمیل کے فرض سے زیادہ اہم ہے پھر اسی مجمل تعلیم پر بس نہیں کیا ہے بلکہ زندگی کے اہم شعبوں کو لے کر ان میں عدل وانصاف کا حکم دیا ہے' مثلاً معاشرتی زندگی میں عدل وانصاف کی سب سے زیادہ ضرورت ان لوگوں کو ہوتی ہے جو ایک سے زائد عورتوں سے نکاح کرتے ہیں' اس لیے ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔

﴿فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ (نساء:۳)

''پھر اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ (کئی بیبیوں میں) انصاف نہ کرسکو گے تو ایک ہی (بی بی کرنا) یا جو (لونڈی) تمہارے قبضہ میں ہو۔''

عورتوں کی طرح یتیموں کے حقوق کی حفاظت کے لیے بھی عدل وانصاف کی ضرورت ہے' اس لیے فرمایا:

﴿وَ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ﴾ (انعام:۱۲۷)

''اور (خاص کر) یہ کہ یتیموں کے حق میں انصاف کو ملحوظ رکھو۔''

عام معاملات میں عدل وانصاف کی سب سے زیادہ ضرورت روزانہ کی خرید وفروخت میں وزن وپیمانہ میں ہے اس لیے فرمایا۔

﴿وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ﴾ (انعام:۱۵۲)

''اور انصاف کے ساتھ (پوری پوری) ناپ کرو' اور (پوری پوری) تول۔''

قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں بار بار اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ ناپ اور تول میں بے انصافی نہ کی جائے کیونکہ خرید وفروخت کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کی ہر انسان کو ضرورت ہوتی ہے اس لیے وزن وپیمانہ میں کمی

کرنے سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ نہایت عام و وسیع ہے اس کے ساتھ نہایت حقیر مقدار میں کمی کرنے سے انسان کی سخت دناءت ثابت ہوتی ہے اور اس سے روح میں سخت اخلاقی گندگی پیدا ہوتی ہے۔

عدل و انصاف کی ضرورت خاص طور سے عدالتی معاملات میں ہوتی ہے اور اسلام نے عدالتی کاروبار کے ہر پہلو میں عدل و انصاف کا لحاظ رکھا ہے تحریر دستاویز کے متعلق حکم ہے کہ:

﴿وَ لْيَكْتُبْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ﴾ (بقرہ:۲۸۲)

''اور (تمہارے باہمی اقرار داد کو) لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھ دے۔''

﴿فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْلَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّه بِالْعَدْلِ﴾ (بقرہ:۲۸۲)

''پھر جس کے ذمہ قرض عائد ہوگا۔ اگر وہ کم عقل ہو یا معذور یا خود ادائے مطلب نہ کر سکتا ہو تو (جو) اس کا مختار کار (ہو وہ) انصاف کے ساتھ (دستاویز کا) مطلب بولتا جائے۔''

شہادت یا فیصلہ کے وقت دو حالتوں میں اکثر لوگوں کا ایمان ڈگمگا جاتا ہے ایک تو یہ کہ فریقِ مقدمہ اپنا قرابت دار ہو یا اس سے گواہ یا حاکم کو عداوت ہو لیکن اسلام کی اخلاقی تعلیم اس حالت میں بھی عدل و انصاف سے تجاوز کرنے کو جائز نہیں رکھتی۔

﴿وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى﴾ (انعام:۱۵۲)

''اور (گواہی دینی ہو یا فیصلہ کرنا پڑے) جب بات کہو تو گو (فریقِ مقدمہ اپنا) قرابت مند ہی (کیوں نہ) ہو انصاف کا پاس کرو۔''

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ (مائدہ:۸)

''مسلمانو! خدا واسطے انصاف کے ساتھ گواہی دینے کو آمادہ ہو اور لوگوں کی عداوت تم کو اس جرم (کے ارتکاب) کی باعث نہ ہو کہ (معاملات میں) انصاف نہ کرو (نہیں) ہر حال میں انصاف کرو کہ (شیوۂ انصاف) پرہیزگاری سے قریب تر ہے۔''

پہلی آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ تمہاری باہمی دوستی و محبت تم کو بے انصاف نہ بنائے اور دوسری آیت میں یہ ارشاد ہے کہ کسی کی دشمنی تم کو انصاف سے باز نہ رکھے' اور یہ کہ ہر حال میں عدل و انصاف کرنا تقویٰ کی نشانی ہے۔

یہود اور نصاریٰ اسلام کے کھلے ہوئے دشمن تھے' اس پر بھی رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے وحیِ الٰہی یہ کہلواتی ہے۔

﴿وَ قُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَّ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمُ اللّٰهُ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمُ اللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ﴾ (شوریٰ

:۱۵)

”اور کہہ دے کہ میں ہر اس کتاب کو مانتا ہوں جو اللہ نے اتاری اور مجھے (خدا سے) یہ حکم ملا ہے کہ میں تمہارے بیچ میں انصاف کروں اللہ رب ہے ہمارا اور تمہارا ہم کو ہمارے کاموں کا بدلہ ملنا ہے اور تم کو تمہارے کاموں کا۔ ہم میں تم میں کچھ جھگڑا نہیں اللہ ہی ہم سب کو جمع کرے گا۔ اسی کی طرف (سب کو) پھر جانا ہے۔“

جس عدل اور برابری کا حکم اس آیت پاک میں ہے اس کے کئی پہلو ہیں' ایک یہ کہ جو سچائی مجھ تک پہنچی ہے اس کو میں برابر برابر تم سب کو پہنچا دوں' دوسرا یہ کہ محض دینی مخالفت کی وجہ سے تمہارے ساتھ بے انصافی نہ کی جائے' بلکہ وہ کیا جائے جس کا تقاضا عدل وانصاف کرتا ہے' اور تیسرا یہ کہ اب تک تم میں مقدمات کے فیصلہ کی جو یہ صورت جاری ہے کہ دولت مندوں اور عزت والوں کے ساتھ رعایت کا اور عام لوگوں کے ساتھ سختی کا قانون برتا جائے میرے خدا نے ایسا کرنے سے مجھے منع کیا ہے' اور یہ حکم دیا ہے کہ عام وخاص' اور امیر وغریب' سب کے ساتھ یکساں اور برابری کا سلوک کیا جائے کیونکہ ہمارا تمہارا سب کا رب ایک ہی ہے' ہم سب اس کے غلام ہیں' اس لیے اس کے سب غلاموں کے لیے ایک ہی قانون ہونا چاہیے ہم کو ہمارے اعمال' اور تم کو تمہارے اعمال کا بدلہ ملے گا۔ اس میں جھگڑنے کی کوئی بات نہیں سب کو قیامت میں اس مالک کے سامنے پیش ہونا ہے' جس کا کام اس کو پسند آئے گا اس کو ویسا انعام ملے گا اور اگر برا کام کیا ہوا تو ویسی ہی سزا ملے گی۔

عدل وانصاف کی راہ میں ان دونوں سے بھی زیادہ ایک کٹھن منزل ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے نفس کے مقابلہ میں بھی عدل وانصاف کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے محمد رسول اللہ ﷺ کی پاک تعلیم کی روشنی میں اہل ایمان کو اس کٹھن منزل کی راہنمائی بھی پوری طرح کی گئی ہے' ارشاد خداوندی ہوا:

﴿يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا وَ اِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا﴾ (نساء:۱۳۵)

”اے ایمان والو! انصاف کی حمایت میں کھڑے ہو۔ اللہ کے لیے گواہ بنو! اگرچہ تمہارا اپنا اس میں نقصان ہی ہو یا ماں باپ کا یا رشتہ داروں کا اگر وہ دولت مند ہے یا محتاج ہے' تو اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے' تو تم انصاف کرنے میں اپنے نفس کی خواہش کی پیروی نہ کرو اگر تم زبان ملو گے یا کچھ بچا جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے کام سے واقف ہے۔“

ان آیتوں میں عدل کے خلاف ایک ایک ریشہ کو جڑ سے نکال کر پھینک دیا گیا ہے' کہا گیا کہ معاملات میں عدل وانصاف کی حمایت تمہارا مقصد ہو' جو کچھ کہو یا کرو خدا لگتی کہو' اور خدا واسطے کہو عدل وانصاف کے فیصلہ اور گواہی میں نہ تو اپنے نفس کا خیال بیچ میں آئے' نہ عزیزوں اور قرابت داروں کا' نہ دولت مند کی طرف داری کا' نہ محتاج پر رحم

کا، پھر اس فیصلہ اور گواہی میں کوئی بات لگی لپٹی نہ رکھی جائے، نہ حق کا کوئی پہلو جان بوجھ کر بچا لیا جائے، مطلب یہ ہوا کہ فیصلہ اور گواہی میں دولت مند کی خاطر نہ کرو اور نہ محتاج پر ترس کھاؤ، اور قرابت کو بھی نہ دیکھو جو حق ہو وہ کر دیا کہو پھر سچ کہنے میں کوئی توڑ مروڑ نہ کرو کہ سننے والا شبہ میں پڑ جائے یا پوری بات نہ کہو کچھ چھپا لو تو یہ سب باتیں عدل اور انصاف کے خلاف ہیں کسی غریب کی غربت پر ترس کھا کر فیصلہ میں رد و بدل کر دینا بظاہر نیکی کا کام دکھائی دیتا ہے، مگر درحقیقت یہ ایک مقدس فریب ہے فیصلہ میں ترس کھا کر بے ایمانی کرنا بھی ویسا ہی ہے جیسا کسی کی خاطر رکھ کر یا کسی کی بزرگی کو مان کر یا کسی کی بڑائی سے مرعوب ہو کر بے ایمانی کرنا ہے، غرض یہ ہے کہ عدل و انصاف کی راہ میں کوئی اچھا یا برا جذبہ حاکم کے لیے ٹھوکر کا پتھر نہ بنے۔

اسی طرح اس آیت کا اشارہ ادھر بھی ہوا کہ جو گواہ کسی فریق کو نفع پہنچانے کی غرض سے طرف دارانہ گواہی دیتا ہے۔ وہ غلطی میں مبتلا ہے، اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی اس کا نگران نہیں ہو سکتا اس لیے نہ گواہوں کی اس لیے طرف داری کرنی چاہیے اور نہ خود کسی فریق کو گواہ کی طرف داری کے ذریعہ سے اپنی منفعت کا خیال دل میں لانا چاہیے، بلکہ دونوں کو اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دینا چاہیے کہ وہی ان کا سب سے بہتر اور سب سے بڑھ کر ولی ہے۔

لوگ عدل و انصاف کے فیصلہ یا گواہی میں اسی لیے غلط بیانی کرتے ہیں کہ جس فریق کی طرف داری مقصود ہے اس کو فائدہ پہنچ جائے، تو ارشاد ہوا کہ اللہ اپنے امیر و غریب دونوں بندوں کے حق میں تم سے زیادہ خیر خواہ ہے۔ تمہاری کم بین نظر تو آس پاس تک جا کر رہ جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں سب کچھ ہے، وہ سب کچھ دیکھ کر، اور سب کچھ جان کر اپنے بندوں کے ساتھ وہ کرتا ہے جس میں ان کی بھلائی ہے، غور کیجیے کہ ان لفظوں میں عدل و انصاف کا فلسفہ کس خوبی سے ادا کیا گیا ہے کہ کم حوصلہ انسان اپنے فیصلہ اور گواہی میں کسی خاص انسان کی بھلائی کے لیے جھوٹ بولتا یا غلط فیصلہ دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس سے اس کو فائدہ پہنچے گا، حالانکہ عالم الغیب کے سوا یہ کس کو معلوم ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر اس کے لیے کیا چیز مفید ٹھہرے گی، پھر ایک اور حیثیت سے دیکھئے کہ بالفرض ایک خاص آدمی کو اپنی طرف داری سے فائدہ پہنچا بھی دیا تو کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اس نے اس طرح حقیقت میں سچائی کا خون کر کے نظمِ عالم کو ابتر کرنے کی کوشش کی اور ظلم کی بنیاد رکھی، جس سے عالم کے امن و امان کے درہم برہم ہو جانے کا خطرہ ہے۔ غلط گو انسان کی محدود نگاہ میں صرف ایک جزئی واقعہ کے نفع و نقصان کا خیال ہے، اور اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کے حکم میں سارے عالم کی خیر خواہی کا بھید چھپا ہے، جس کا ایک فرد وہ خاص انسان بھی ہے۔

اسی لیے رشوت دے کر حاکموں کی رائے کو متاثر کرنا محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں گناہ ہے، اور بعض مفسروں کے خیال کے مطابق قرآن پاک کی اس آیت میں

﴿وَ تُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ (بقرہ:۱۸۸)

''اور نہ مال حاکموں تک پہنچاؤ تا کہ لوگوں کے مال میں سے گناہ کما کر کچھ کھا جاؤ اور تم جان رہے ہو۔''

اس رشوت کی ممانعت کی طرف بھی اشارہ ہے۔[1] دو شخصوں یا دو گروہوں میں مصالحت کرانا بھی ایک عدالتی معاملہ ہے، اس لیے اس میں بھی عدل و انصاف کا حکم دیا گیا ہے جب دونوں طرف سے تلواریں میان سے نکل چکی ہوں، اور ایک دوسرے کے سر و سینہ پر تڑپ تڑپ کر گر رہی ہوں، یعنی اس وقت جب عقل کی قوت اور نیکی کی استعداد کا چراغ جذبات کی آندھیوں میں بجھ رہا ہو اس عالم میں بھی مسلمانوں سے یہی کہا گیا کہ عدل و انصاف کا دامن ہاتھوں سے نہ چھوٹے فرمایا:

﴿وَ اِنۡ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اقۡتَتَلُوۡا فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَہُمَا فَاِنۡۢ بَغَتۡ اِحۡدٰہُمَا عَلَی الۡاُخۡرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیۡ تَبۡغِیۡ حَتّٰی تَفِیۡٓءَ اِلٰۤی اَمۡرِ اللّٰہِ فَاِنۡ فَآءَتۡ فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَہُمَا بِالۡعَدۡلِ وَ اَقۡسِطُوۡا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ﴾ (الحجرات:۹)

''اور اگر (تم) مسلمانوں کے دو فرقے آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو پھر اگر ان میں کا ایک (فرقہ) دوسرے پر زیادتی کرے تو جو زیادتی کرتا ہے اس سے تم (بھی) لڑو یہاں تک کہ وہ حکمِ خدا کی طرف رجوع کرے پھر جب رجوع لائے تو دونوں میں برابری کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کو ملحوظ رکھو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔''

عدل و انصاف حکومت و سلطنت کی عمارت کا ستون ہے، اسی لیے اسلام نے ہر قسم کے مذہبی اور عدالتی فیصلے کے لیے عدل کو ضروری قرار دیا ہے کہ یہ اگر نہ ہو تو کسی مظلوم کی دادرسی ممکن ہی نہیں، اسی لیے ایک حاکم کا پہلا فرض یہ ہے کہ عدل ہو ارشاد ہوا۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَہۡلِہَا ۙ وَ اِذَا حَکَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡکُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ﴾ (نساء:۵۸)

''بے شک اللہ تم کو یہ حکم فرماتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو پہنچاؤ، اور یہ کہ جب لوگوں کے درمیان جھگڑے فیصل کرنے لگو، تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔''

اہلِ تفسیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس آیت پاک میں ''امانت'' سے مراد منصفانہ فیصلہ اور وہ حق ہے، جو ایک کا دوسرے پر چاہیے، خدا نے اس آیت میں اسی منصفانہ فیصلہ اور حق کی امانت کو حقدار تک پہنچانے کا حکم دیا ہے، اور منصفانہ فیصلہ کی تاکید کی ہے اور یہ فیصلہ دوست و دشمن، کافر و مسلم سب کے ساتھ یکساں عدل و انصاف کے ساتھ ہونا چاہیے، چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ کو یہودیوں کے معاملات میں حکم ہوا:

﴿وَ اِنۡ حَکَمۡتَ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِالۡقِسۡطِ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ﴾ (مائدہ:۴۲)

''اور اگر فیصلہ کرو تو ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

(۱) تفسیر روح المعانی۔

عدل وانصاف کی برتری کی یہ اہمیت لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ عدل وانصاف کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ دو دفعہ اپنی دوستی اور محبت سے نوازنے کی بشارت سناتا ہے۔

اخلاق کے ساتھ یہ مسئلہ سیاست سے بھی تعلق رکھتا ہے یعنی جو شخص فیصلہ کرتا ہے اس کے لیے کن کن اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے قرآن مجید میں اگرچہ اس کی کوئی تصریح نہیں کی گئی ہے تاہم اشاراتِ قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص فیصلہ کرتا ہے اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ آزاد ہو' اپنے فیصلہ کے نفاذ کی قدرت رکھتا ہو' قوتِ نطق سے محروم نہ ہو صاحبِ علم ہو چنانچہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّ هُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰهُ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَايَاْتِ بِخَيْرٍ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ وَ مَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ هُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (النحل:۷۶)

''اور خدا (ایک دوسری مثال دیتا ہے کہ) دو آدمی (ہیں) ان میں کا ایک گونگا اور گونگے کے علاوہ پرایا غلام کہ (خود) کچھ نہیں کر سکتا اور (گونگے ہونے کی وجہ سے) وہ اپنے آقا کا بارِ خاطر بھی ہے کہ جہاں کہیں اس کو بھیجے اس سے کچھ بھی ٹھیک نہیں بن آیا کیا ایسا غلام اور وہ شخص (دونوں) برابر ہو سکتے ہیں جو (لوگوں کو) عدل وانصاف کی تاکید کرتا ہے اور وہ خود بھی سیدھے راستے پر ہے۔''

اور امام رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ جو شخص عدل کا حکم دیتا ہے اس کو صفتِ نطق سے متصف ہونا چاہیے ورنہ وہ حکم نہ دے سکے گا' اور قادر ہونا چاہیے کیونکہ حکم سے علوئے مرتبت کا اظہار ہوتا ہے' اور جب تک وہ قادر نہ ہو علوئے مرتبت حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور عالم ہونا چاہیے تاکہ ظلم وانصاف میں تمیز کر سکے' اس سے ثابت ہوا کہ عدل وانصاف کی صفت' قدرت اور علم دونوں کو شامل ہے' پہلا شخص گونگا ہے تو دوسرے کو گویا ہونا چاہیے' پہلے شخص سے کوئی کام ٹھیک بن نہیں آتا' اس لیے دوسرے شخص کو عالم ہونا چاہیے تاکہ وہ ہر کام سلیقہ سے کر سکے۔

ان تمام تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے عدل وانصاف کا جو حکم دیا ہے وہ اخلاق' معاشرت اور سیاست کے ہر ایک گوشہ کو محیط ہے' یعنی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر اسلام کی یہ اخلاقی تعلیم حاوی نہ ہو۔

ان آیات کی رو سے اگرچہ ہر مسلمان کو عادل ہونا چاہیے تاہم امام وحاکمِ وقت کے لیے عادل ہونا اور بھی زیادہ ضروری ہے' اس لیے حدیث میں امامِ عادل کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن جب کہ خدا کے سایہ کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا۔ سات شخصوں کو خدا اپنے سایہ میں لے گا جن میں ایک شخص امامِ عادل ہوگا۔ (۱)

❀❀❀

(۱) بخاری کتاب المحاربین باب فضل من ترک الفواحش۔

عہد کی پابندی

کسی سے جو وعدہ یا کسی قسم کا قول وقرار کر لیا جائے اس کو پورا کرنا ایک راست باز کا شعار ہے خود اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت یہ بار بار فرمایا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ﴾ (آل عمران:۹' رعد:۳۱)

''بے شبہ خدا وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔''

﴿لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ﴾ (زمر:۲۰)

''اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔''

﴿اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ﴾ (آل عمران:۱۹۴)

(''اے ہمارے پروردگار) تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔''

﴿وَعْدَ اللّٰهِ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ﴾ (روم:۶)

''اللہ کا وعدہ ہوا ہے' اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔''

﴿وَ لَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ﴾ (حج:۴۸)

''اور اللہ ہرگز نہ ٹالے گا اپنا وعدہ۔''

﴿فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ﴾ (بقرہ:۱۱۱)

''تو البتہ اللہ اپنے قول وقرار کے خلاف نہ کرے گا۔''

﴿وَ مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ﴾ (توبہ:۱۴)

''اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے۔''

جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کا سچا اور اپنے عہد کا پکا ہے' اسی طرح اس کے بندوں کی خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی سے جو وعدہ کریں وہ پورا کریں' وہ جو قول وقرار کریں اس کے پابند رہیں' سمندر اپنا رخ پھیر دے تو پھیر دے اور پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو ٹل جائے مگر کسی مسلمان کی یہ شان نہ ہو کہ منہ سے جو کہے وہ اس کو پورا نہ کرے' اور کسی سے جو قول وقرار کرے اس کا پابند نہ رہے۔

عام طور پر لوگ عہد کے معنی صرف قول وقرار کے سمجھتے ہیں' لیکن اسلام کی نگاہ میں اس کی حقیقت بہت وسیع

ہے۔ وہ اخلاق‘ معاشرت‘ مذہب اور معاملات کی ان تمام صورتوں پر مشتمل ہے جن کی پابندی انسان پر عقلاً‘ شرعاً‘ قانوناً اور اخلاقاً فرض ہے اور اس لحاظ سے یہ مختصر سا لفظ انسان کے بہت سے عقلی‘ شرعی‘ قانونی اخلاقی اور معاشرتی فضائل کا مجموعہ ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں بار بار اس کا ذکر آیا ہے اور مختلف حیثیتوں سے آیا ہے ایک جگہ اصلی نیکی کے اوصاف کے تذکرہ میں ہے۔

﴿وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا﴾ (بقرہ:۱۷۷)

”اور اپنے قرار کو جب قول دیں پورا کرنے والے۔“

بعض آیتوں میں اس کو کامل الایمان مسلمانوں کے مخصوص اوصاف میں شمار کیا گیا ہے۔

﴿وَ الَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ﴾ (معارج:۳۲)

”اور وہ جو اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا پاس ملحوظ رکھتے ہیں۔“

ایک دوسرے سورہ میں جنتی مسلمانوں کے اوصاف کا نقشہ کھینچا گیا ہے‘ اس تصویر کا ایک رخ یہ ہے۔

﴿وَ الَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ﴾ (مومنون:۸)

”اور وہ جو اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں۔“

کسی کا امانت کو رکھ کر بلا کم و کاست ٹھیک وقت پر ادا کر دینا‘ معاملاتی حیثیت سے ایک قسم کے عہد کی پابندی ہے جو عہد کے وسیع معنی میں داخل ہے۔ اس لیے پہلے عہد کی اس خاص قسم کا ذکر کیا‘ اور اس کے بعد عہد کا عام ذکر کیا یعنی تاکیداً پہلے ایک خاص عہد کی پابندی کو مسلمانوں کا مخصوص وصف قرار دیا‘ اس کے بعد عہد کی ایک خاص قسم کی پابندی کا حکم دیا۔

﴿وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ○ وَ اَوْفُوا الْكَیْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ○﴾ (بنی اسرائیل:۳۴-۳۵)

”اور عہد کو پورا کیا کرو‘ کیونکہ (قیامت میں) عہد کی باز پرس ہوگی‘ اور جب ناپ کرو تو پیمانہ کو پورا بھر دیا کرو‘ اور (تول کر دینا ہو تو) ڈنڈی سیدھی رکھ کر تولا کرو (معاملہ کا) یہ بہتر (طریق ہے) اور (اس کا) انجام بھی اچھا ہے۔“

قانون یا رسم و رواج سے جو وزن یا پیمانہ مقرر ہو جاتا ہے‘ وہ درحقیقت ایک معاہدہ ہوتا ہے جس کی پابندی بائع اور خریدار پر فرض ہے اس لئے تاکیداً پابندیِ عہد کے عام حکم کے بعد اس خاص عہد کی پابندی کا ذکر کیا اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد کے لیے زبانی قول و قرار کی ضرورت نہیں۔ بلکہ عرف عام کے سارے مسلمات سوسائٹی کے قول و قرار ہیں۔

تمام عہدوں میں سے سب سے پہلے انسان پر اس عہد کو پورا کرنا واجب ہے جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے‘ یہ عہد ایک تو وہ فطری معاہدہ ہے‘ جو روزِ الست کو بندوں نے اپنے خدا سے باندھا اور جس کا پورا کرنا

ان کی زندگی کا پہلا فرض ہے اور دوسرا وہ عہد ہے جو خدا کا نام لے کر کسی بیعت اور اقرار کی صورت میں کیا گیا ہے تیسرا عہد وہ ہے جو عام طور سے قول وقرار کی شکل میں بندوں میں آپس میں ہوا کرتا ہے' اور چوتھا عہد وہ ہے جو اہلِ حقوق کے درمیان فطرۃً قائم ہے اور جن کے ادا کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے' ارشاد ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ یُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ لَا یَنْقُضُوْنَ الْمِیْثَاقَ وَ الَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ﴾ (رعد:۲۰)

''جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں' اور اپنے اقرار کو نہیں توڑتے اور خدا نے جن تعلقات کے جوڑنے کا حکم دیا ہے' ان کو جوڑے رکھتے ہیں۔''

اس آیت میں پہلے اس فطری عہد کے ایفا کا ذکر ہے جو خدا اور بندہ کے درمیان ہے' پھر اس قول وقرار کا جو باہم انسانوں میں ہوا کرتا ہے' اس کے بعد اس فطری عہد کا ہے' جو خاص کر اہلِ قرابت کے درمیان قائم ہے۔

سورۂ نحل میں اللہ کے عہد کا مقدس نام اس معاہدہ کو بھی دیا گیا ہے' جو خدا کو حاضر وناظر بتا کر یا خدا کی قسمیں کھا کھا کر بندے آپس میں کرتے ہیں۔ فرمایا:

﴿وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَ لَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْكِیْدِهَا وَ قَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَیْكُمْ كَفِیْلًا﴾ (نحل:۹۱)

''اور اللہ کا نام لے کر جب تم آپس میں ایک دوسرے سے قرار کرو تو اس کو پورا کرو۔ اور قسموں کو پکی کر کے توڑا نہ کرو۔ اور اللہ کو تم نے اپنے پر ضامن ٹھہرایا ہے۔''

اس معاہدہ کے عموم میں صحابہ کرام کے وہ عہد بھی داخل ہیں جو اسلام لاتے وقت انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے کیے اور نیک معاہدے بھی اس کے اندر شامل ہیں' جو جاہلیت میں کسی اچھی غرض سے کیے گئے تھے' ساتھ ہی وہ سب معاہدے بھی اس میں آ جاتے ہیں جو خدا کا واسطہ دے کر اور خدا کی قسمیں کھا کر بھی مسلمان ایک دوسرے سے کریں۔

سورۂ انعام میں ایک اور عہدِ الٰہی کے ایفا کی نصیحت کی گئی ہے' فرمایا:

﴿وَ بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ (انعام:۱۵۲)

''اور اللہ کا قرار پورا کرو' یہ اس نے تم کو نصیحت کر دی ہے' تا کہ تم دھیان رکھو۔''

اس عہدِ الٰہی میں خدا کے فطری احکام بھی داخل ہیں' جن کے بجا لانے کا اقرار تم نے خدا سے کیا ہے' یا خدا نے تم سے لیا ہے' اسی طرح اس نذر اور منت پر مشتمل ہے جس کو خدا کے مقدس نام سے تم نے مانا ہے اور انسانوں کے اس باہمی قول وقرار کو بھی شامل ہے جو خدا کی قسمیں کھا کھا کر لوگ کیا کرتے تھے۔

صلح حدیبیہ میں مسلمانوں نے کفار سے جو معاہدہ کیا تھا اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی کارسازی نے یہ موقع بہم پہنچایا کہ فریقِ مخالف کی قوت روز بروز گھٹتی' اور اسلام کی قوت بڑھتی گئی۔ اس حالت میں اس معاہدہ کو توڑ دینا کیا

مشکل تھا مگر یہی وہ وقت تھا جس میں مسلمانوں کے مذہبی اخلاق کی آزمائش کی جاسکتی تھی کہ اپنی قوت اور دشمنوں کی کمزوری کے باوجود وہ کہاں تک اپنے معاہدہ پر قائم رہتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بار بار اس معاہدہ کی استواری اور پابندی کی یاد دلائی' اور فرمایا کہ تم اپنی طرف سے کسی حال میں اس معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرو' جن مشرکوں نے اس معاہدہ کو توڑا تھا' ان سے لڑنے کی گو اجازت دے دی گئی تھی' اور مکہ فتح بھی ہو چکا تھا' پھر بھی یہ حکم ہوا کہ ان کو چار مہینوں کی مہلت دو۔

﴿بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ﴾ (توبہ:۱)

''اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکوں کو پورا جواب ہے جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا' تو پھر لو (تم اے مشرکو!) ملک میں چار مہینے اور یقین جانو کہ تم اللہ کو تھکا نہیں سکتے۔''

آگے چل کر جب یہ اعلان ہوتا ہے کہ اب ان مشرکوں اور مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کے معاہدہ کی ذمہ داری نہیں رہی تو ساتھ ہی ان مشرکوں کے ساتھ ایفائے عہد کی تاکید کی گئی جنہوں نے حدیبیہ کے معاہدہ کی حرمت کو قائم رکھا تھا فرمایا:

﴿اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّ لَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (توبہ:۴)

''مگر جن مشرکوں سے تم نے عہد کیا تھا' پھر انہوں نے تم سے کچھ کمی نہیں کی' اور نہ تمہارے خلاف کسی کو مدد دی تو ان سے ان کے عہد کو ان کی مقررہ مدت تک پورا کرو' بے شک اللہ کو خوش آتے ہیں تقویٰ والے۔''

اور ان مشرکوں کے ساتھ اس ایفائے عہد کو اللہ تعالیٰ تقویٰ بتاتا ہے اور جو اس عہد کو پورا کریں ان کو متقی فرمایا اور ان سے اپنی محبت اور خوشی کا اظہار فرمایا آگے بڑھ کر ان مشرکوں سے اپنی برأت کا اعلان کرتے وقت جنہوں نے اس معاہدہ کو توڑا تھا' اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو پھر تاکید فرماتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ جوش میں ان عہد شکن مشرکوں کے ساتھ ان مشرکوں کے ساتھ بھی خلاف ورزی کی جائے جنہوں نے اس معاہدہ کو قائم رکھا ہے۔

﴿كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (توبہ:۷)

''مشرکوں کو کیسے اللہ کے پاس اور اس کے رسول کے پاس کوئی عہد ہو' مگر وہ جن سے تم نے مسجد حرام کے نزدیک معاہدہ کیا جب تک وہ تم سے سیدھے رہیں تم ان سے سیدھے رہو بے شک اللہ کو تقویٰ والے خوش آتے ہیں۔''

سیدھے رہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہیں تم بھی اس عہد کو پورا کرتے رہو' اور جو

لوگ اپنے عہد کو اس احتیاط سے پورا کریں ان کا شمار تقویٰ والوں میں ہے جو قرآن پاک کے محاورہ میں تعریف کا نہایت اہم لفظ ہے اور تقویٰ والے اللہ تعالیٰ کی محبت اور رضامندی کی دولت سے سرفراز ہوتے ہیں نتیجہ یہ نکلا کہ معاہدہ کا ایفاء اللہ تعالیٰ کی خوشی اور پیار کا موجب ہے اور یہ وہ آخری انعام ہے جو کسی نیک کام پر بارگاہِ الٰہی سے کسی کو مل سکتا ہے، قرآن مجید میں قریب قریب اسی عہد کے معنی میں ایک اور لفظ عقد کا استعمال کیا گیا ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ﴾ (مائدہ:۱)

''مسلمانو! (اپنے) قراروں کو پورا کرو۔''

عقد کے لفظی معنی گرہ اور گرہ لگانے کے ہیں اور اس سے مقصود لین دین اور معاملات کی باہمی پابندیوں کی گرہ ہے اور اصطلاح شرعی میں یہ لفظ معاملات کی ہر قسم کو شامل ہے، چنانچہ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں۔

اَوْفُوْا بِالْعَھْدِ۔ خداوند تعالیٰ کے اس قول کے مشابہ ہے ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ﴾ اور اس قول میں تمام عقد مثلاً عقدِ بیع، عقدِ شرکت، عقدِ یمین، عقدِ نذر، عقدِ صلح اور عقدِ نکاح داخل ہیں، خلاصہ یہ کہ اس آیت کا اقتضاء یہ ہے کہ دو انسانوں کے درمیان جو عقد اور عہد قرار پا جائے اس کے مطابق دونوں پر اس کا پورا کرنا واجب ہے۔ (۱)

لیکن عقد کا لفظ جیسا کہ کہا گیا صرف معاملات سے تعلق رکھتا ہے، اور عہد کا لفظ اس سے بہت زیادہ عام ہے، یہاں تک کہ تعلقات کو اس ہمواری کے ساتھ قائم رکھنا بھی جس کی توقع ایک دوسرے سے ایک دو دفعہ ملنے جلنے سے ہو جاتی ہے، حسنِ عہد میں داخل ہے، صحیح بخاری میں (۲) حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ مجھ کو حضرت خدیجہؓ سے زیادہ کسی عورت پر رشک نہیں آیا، میرے نکاح سے تین سال پیشتر ان کا انتقال ہو چکا تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ ان کا ذکر کیا کرتے تھے اور بکری ذبح کرتے تھے تو اس کا گوشت ان کی سہیلیوں کے پاس ہدیتًا بھیجا کرتے تھے۔ یعنی حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد بھی ان کی سہیلیوں کے ساتھ وہی سلوک قائم رکھا جو ان کی زندگی میں جاری تھا امام بخاری نے کتاب الادب میں ایک باب باندھا ہے جس کی سرخی یہ ہے **حسن العھد من الایمان**۔ اور اس باب کے تحت میں اسی حدیث کا ذکر کیا ہے۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں حاکم اور بیہقی کے حوالہ سے یہ روایت کی ہے کہ ایک بڑھیا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آپؐ نے اس سے کہا کہ تم کیسی رہیں، تمہارا کیا حال ہے، ہمارے بعد تمہارا کیا حال رہا؟ اس نے کہا کہ اچھا حال رہا، جب وہ چلی گئی تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ آپؐ نے اس بڑھیا کی طرف اس قدر توجہ فرمائی۔ فرمایا عائشہؓ یہ خدیجہؓ کے زمانہ میں ہمارے یہاں آیا کرتی تھی اور حسنِ عہد ایمان سے ہے، یعنی اپنے ملنے جلنے والوں سے حسبِ توقع یکساں سلوک قائم رکھنا ایمان کی نشانی ہے۔

---

(۱) تفسیر کبیر جلد ۵ صفحہ ۵۰۵۔

(۲) بخاری کتاب الادب باب حسن العہد من الایمان۔

آنحضرت ﷺ نے اپنی ایک مشہور حدیث میں فرمایا ہے اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آپ ہر خطبہ میں اس کو ضرور فرمایا کرتے تھے۔

((لَا دِيْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ)) (احمد طبرانی وابن حبان)

''جس میں عہد نہیں اس میں دین نہیں۔''

یعنی اس قول وقرار کو جو بندہ خدا سے کرتا ہے یا بندہ سے کرتا ہے پورا کرنا حق اللہ اور حق العباد کو ادا کرنا ہے جس کے مجموعہ کا نام دین ہے اب جو اس عہد کو پورا نہیں کرتا وہ دین کی روح سے محروم ہے۔

❀❀❀

احسان یعنی بھلائی کرنا

بھلائی کرنا ایک ایسی صفت ہے جو ہر نیکی کے کام کو محیط ہے اور اس لیے اس کی صورتیں اتنی بے شمار ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا' البتہ ان تمام صورتوں کی ایک عام شکل یہ نکلتی ہے کہ دوسرے کے ساتھ ایسا نیک سلوک کرنا جس سے اس کا دل خوش ہو اور اس کو آرام پہنچے۔

اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر محسن کون ہوگا' جس کے احسانات کی حدود پایاں نہیں' عرش سے فرش تک جو کچھ ہے۔ وہ اسی کے احسانوں کی جلوہ نمائی ہے۔

﴿وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ﴾ (ابراہیم:۳۴)

''اور اگر اللہ کے احسان گنو تو ان کو پورا نہ گن سکو گے بے شک انسان بے انصاف ناشکرا ہے۔''

حضرت یوسف علیہ السلام خدائے تعالیٰ کے اس (۱) احسان کا شکر کہ اس نے کسی سعی و سفارش کے بغیر ان کو قید خانہ سے نجات دی اور وہ ان کے ماں باپ اور بھائیوں کو مصر لے آیا ان لفظوں میں ادا کرتے ہیں۔

﴿وَ قَدْ اَحْسَنَ بِیْۤ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ وَ جَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ﴾ (یوسف:۱۰۰)

''اور خدا نے مجھ پر احسان کیا کہ مجھے قید خانہ سے باہر لایا اور آپ لوگوں کو گاؤں سے یہاں لے آیا۔''

---

(۱) اس موقع پر ایک اور بات خیال میں رہے عربی میں احسان کے معنی اچھا کام کرنے اور کسی کام کو اچھے طریقہ سے کرنے کے ہیں' اردو میں جن معنوں میں ہم احسان کا لفظ بولتے ہیں عربی میں جب خاص وہ معنی مراد ہوں گے تو عموماً اس کا استعمال مشتقات میں الیٰ' یا ب' کے صلہ کے ساتھ ہوگا قرآن پاک میں جہاں جہاں ﴿مُحْسِنٌ یَا مُحْسِنِیْنَ یَا مُحْسِنُوْنَ﴾ کے لفظ بلا صلہ آئے ہیں' ان سے حسب موقع احسان کرنے' اچھے کام کرنے یا کام کو اچھائی سے کرنے کے معنی لیے جائیں گے اس اچھے کام کرنے یا اچھائی سے کام کرنے کی وسعت میں احسان و کرم بھی داخل ہو سکتا ہے لیکن وہ اسی پر محدود نہیں ہے جیسے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ (توبہ:۱۲۰)

''بے شبہ خدا اچھے کام کرنے والوں کی مزدوری برباد نہیں کرتا۔''

﴿لَوْ اَنَّ لِیْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ (زمر:۵۸)

''کاش اگر میرے لیے لوٹ کر جینا ہوتا تو میں اچھا کام کرنے والوں میں سے ہوتا۔''

﴿وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ (آل عمران:۱۳۴)

''اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

اسی طرح قارون کے قصہ میں اللہ تعالیٰ کے صفتِ محسن سے متصف ہونے کا اشارہ موجود ہے فرمایا:

﴿اَحۡسِنۡ کَمَاۤ اَحۡسَنَ اللّٰہُ اِلَیۡکَ﴾ (قصص: ۷۷)

''تو احسان کر جس طرح خدا نے تجھ پر احسان کیا۔''

اس دنیا میں جہاں قدم قدم پر ادلاً بدلاً اور داد وستد کا جذبہ ہر راہ رو کو دامنگیر ہے احسان، حسن سلوک اور اچھے برتاؤ کرنے کی تعلیم اور تنبیہ کتنی ضروری چیز ہے محمد رسول اللہ ﷺ کی اخلاقی تعلیم نے اس ضرورت کو پورا کیا ہے اور قرآن مجید میں جابجا اس کی اہمیت کی تاکید آئی ہے چنانچہ سورۂ نحل میں حکم کی صورت میں ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَ الۡاِحۡسَانِ وَ اِیۡتَآیِٔ ذِی الۡقُرۡبٰی﴾ (نحل: ۹۰)

''اللہ انصاف اور (لوگوں کے ساتھ) احسان کرنے کا اور قرابت والوں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔''

انصاف تو کسی کی تکلیف و آرام اور راحت و رنج کی پروا نہیں کرتا' وہ ہر ایک کو اس کا واجبی حق دے دیتا ہے لیکن احسان میں اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے اس لیے خداوند تعالیٰ نے عدل کے ساتھ اس کا ذکر کیا۔ پھر احسان کی ایک خاص اور متداول صورت یعنی قرابت داروں کی مالی امداد کا ذکر کیا' لیکن احسان مالی امداد ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ احسان کے اور بھی مختلف طریقے ہیں' اور عام لوگوں کے علاوہ باپ' ماں' قرابت داروں' یتیم محتاج' قرابت دار' پڑوسی' اجنبی پڑوسی' آس پاس کے بیٹھنے والے مسافر اور لونڈی غلام اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں' اس لیے خدا تعالیٰ نے سورۂ نساء کی ایک آیت میں (رکوع: ۵) ان لوگوں کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا ہے اور باپ ماں کے ساتھ احسان کرنے کی متعدد آیتوں میں تاکید کی ہے (بقرہ: ۹ زخرف: ۲' انعام: ۱۶' اسرائیل: ۳)

بہر حال یہ احسان تو ہر شخص کے فرائض میں داخل ہے لیکن جن کی مالی وسعت کا دائرہ جتنا بڑا ہے' اسی کے مطابق اس پر فرض ہے کہ وہ اپنے احسان کے دائرہ کو وسیع کرے اور ہر شخص کو اپنے جاہ و مال سے فائدہ پہنچائے یہی وجہ ہے کہ قارون کی قوم نے اس سے یہ اخلاقی مطالبہ کیا۔

﴿وَ اَحۡسِنۡ کَمَاۤ اَحۡسَنَ اللّٰہُ اِلَیۡکَ﴾ (قصص: ۷۷)

''اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی (اوروں کے ساتھ) احسان کر۔''

احسان کی اہم صورت یہ ہے کہ کسی کو مصیبت سے نجات دلائی جائے۔ خداوند تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانہ سے نجات دلائی تھی' اس کو وہ اس کا بڑا احسان سمجھتے ہیں۔

﴿وَ قَدۡ اَحۡسَنَ بِیۡۤ اِذۡ اَخۡرَجَنِیۡ مِنَ السِّجۡنِ﴾ (یوسف: ۱۰۰)

''اور (اس کے سوا) اس نے مجھ پر (اور بھی بڑے بڑے) احسان کیے ہیں کہ (بے کسی کی سفارش کے) مجھ کو قید سے نکالا۔''

غرض مالی امداد دینا یا کسی کو مصیبت سے نجات دلانا احسان کی اہم صورتیں ہیں' ان کے علاوہ اور بھی

سینکڑوں شریفانہ اور فیاضانہ افعال ہیں جن کو خدا نے احسان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے' مثلاً عورتوں کو قانونی حیلے نکال نکال کر دق کرنا برا کام تھا جس سے روکا گیا اور فرمایا گیا کہ اگر کسی عورت کو اپنی زوجیت میں رکھنا پسند نہ ہو تو خوبی کے ساتھ اس کو الگ کر دو۔ فرمایا:

﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ﴾ (بقرہ:۲۲۹)

''طلاق (جس کے بعد رجوع بھی ہو سکتا وہ تو دو ہی طلاقیں ہیں جو) دو دفعہ (کر کے دی جائیں) پھر (دو طلاقوں کے بعد یا تو) دستور کے مطابق (زوجیت میں) رکھنا ہے یا سلوک کے ساتھ رخصت کر دینا۔''

اسی طرح اگر تم پر کسی کا کچھ واجب ہو تو اس کو بھی خوبی کے ساتھ ادا کر دو' اور اس کی ادائی میں لیت ولعل اور حیل وحجت نہ کیا کرو۔ فرمایا:

﴿فَمَنۡ عُفِىَ لَهٗ مِنۡ اَخِيۡهِ شَىۡءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَاَدَآءٌ اِلَيۡهِ بِاِحۡسَانٍ﴾ (بقرہ:۱۷۸)

''پھر جس (قاتل) کو اس کے بھائی (طالبِ قصاص) سے کوئی جز (قصاص) معاف کر دیا جائے' تو (جان کے بدلے خون بہا اور وارث مقتول کی طرف سے اس کا) مطالبہ دستور (شرع) کے مطابق اور قاتل کی (طرف سے) وارث مقتول کی خوش معاملگی کے ساتھ (خون بہا کا) ادا کر دینا۔''

قصور واروں کے قصور کو معاف کرنا اور ان کے مقابلہ میں غصہ کو پی جانا بھی احسان ہے اللہ تعالیٰ نے اس احسان کو یہ درجہ دیا ہے کہ جو اس صفت سے متصف ہوں وہ بھی خدا کے محبوب بندوں میں سے ہوں گے۔

﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ﴾ (آل عمران:۱۳۴)

''اور اللہ ان محسنوں (یا نیکی کرنے والوں) کو پیار کرتا ہے۔''

احسان کے لیے قرآن کا ایک اور لفظ فضل ہے' اگر کوئی منکوحہ سے خلوت کیے بغیر اس کو طلاق دے دے تو شوہر پر نصف مہر واجب ہوتا ہے'[1] یہ تو قانون ہوا مگر اخلاقی حکم یہ ہے کہ یا تو عورت اس نصف کو بھی معاف کر دے اور کچھ نہ لے تو یہ عورت کا حسنِ خلق ہے اور یا شوہر پورا ادا کر دے اور آدھا کاٹے نہیں تو یہ مرد کا حسنِ خلق ہے' اس کے بعد ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَنۡسَوُا الۡفَضۡلَ بَيۡنَكُمۡ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ﴾ (بقرہ:۲۳۷)

''اور آپس میں فضل کو مت بھولو[2] بے شک اللہ تمہارے کاموں کو دیکھ رہا ہے۔''

کسی غریب یا کسی عزیز وقریب سے کوئی ایسی حرکت ہو جائے جس سے ناراضی پیدا ہو جائے تو احسان

(۱) یعنی جس حالت میں کہ مہر مقرر ہو چکا ہو ورنہ صرف چند کپڑے لازم آتے ہیں۔

(۲) سعید سے روایت ہے' آپس میں فضل کو مت بھولو یعنی احسان کو مت بھولو ابن جریر طبری ج ۲ ص ۳۲۱ مصر۔

والوں کا فرض یہی ہے کہ وہ معاف کریں اور اپنے احسان سے باز نہ آئیں فرمایا:(۱)

﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَ السَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوٓا اُولِى الْقُرْبٰى وَ الْمَسَاكِيْنَ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا﴾ (نور:۲۲)

''اور تم میں جو احسان اور کشائش والے ہیں وہ قرابت داروں غریبوں اور خدا کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو نہ دینے کی قسم نہ کھالیں ان کو چاہیے کہ معاف کریں اور درگزر کریں۔''

احسان کے اسی وسیع معنی میں اسلام نے ایک اور جامع لفظ ''معروف'' کا استعمال کیا ہے یعنی ہر وہ چیز جس کی خوبی عقلاً وشرعاً معلوم ہو معروف میں شامل ہے' قرآن پاک کا حکم ہے۔

﴿وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ﴾ (اعراف:۱۹۹)

''اور نیکی کو کہہ۔''

اور اس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ

﴿كُلُّ مَعْرُوْفٍ صَدَقَةٌ﴾

''ہر نیکی ثواب کا کام ہے۔''

اور یہ ایک ایسا صدقہ ہے جس کے لیے غریب اور امیر کی تخصیص نہیں' بلکہ ہر مسلمان پر فرض ہے' اسی لیے آپؐ نے فرمایا کہ ''ہر مسلمان پر صدقہ فرض ہے۔'' صحابہؓ نے عرض کیا کہ اگر اس کے پاس مال نہ ہو تو کیا کرے' فرمایا کمائے اور خود فائدہ اٹھائے اور صدقہ کرے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ اگر اس کو کمانے کی قدرت نہ ہو یا وہ نہ کمائے' فرمایا غریب حاجت مند کی اعانت کرے۔ صحابہؓ نے کہا کہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو؟ فرمایا کہ نیکی کے کرنے کا حکم دے۔ صحابہؓ نے کہا کہ اگر وہ ایسا نہ کرے' ارشاد ہوا کہ برائی سے باز رہے' کیونکہ یہ اس کے لیے صدقہ ہے۔''(۲) اسی معنی کے لحاظ سے حدیث میں آیا ہے کہ آدمی اپنے اہل وعیال پر جو کچھ صرف کرتا ہے وہ صدقہ ہے کسی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا بھی اسی میں داخل ہے۔

اسی معنی میں قرآن نے ایک اور لفظ ''بِرّ'' کا استعمال کیا ہے اور اس وسیع دائرے میں کافر ومسلم سب کو شامل کرلیا ہے۔

﴿لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ﴾ (ممتحنہ:۸)

''جو لوگ تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور انہوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ان کے ساتھ احسان کرنے اور منصفانہ برتاؤ کے کرنے سے تو خدا تم کو منع کرتا نہیں (کیونکہ) اللہ منصفانہ

---

(۱) کشاف زمخشری تفسیر آیت مذکور بعضوں نے یہاں ''فضل'' سے فضیلت دینی اور کسی نے فضلِ مالی مراد لیا۔

(۲) صحیح بخاری کتاب الادب باب کل معروف صدقۃ مع فتح الباری۔

برتاؤ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

صحابہ میں کچھ ایسے لوگ تھے جو نامسلموں پر صدقہ کرنا ثواب کا کام نہیں سمجھتے تھے اس پر یہ حکم آیا کہ ہدایت بخشنا تمہارا نہیں میرا کام ہے تم کو بلا امتیاز ہر ایک مسلم اور غیر مسلم کے ساتھ نیکی کرنی اور اپنی نیت ٹھیک رکھنی چاہیے تم کو اپنی نیت کا ثواب ملے گا ارشاد ہوا:[1]

﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰاهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ وَ مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ﴾ (بقرہ:۲۷۲)

''تیرا ذمہ نہیں ان کو راہ پر لے آنا' لیکن اللہ راہ پر لے آتا ہے جس کو چاہے' اور تم جو دو گے خیرات سو اپنے واسطے اور تم نہیں دیا کرتے لیکن اللہ کی خوشی چاہ کر' اور جو دو گے خیرات وہ تم کو پوری مل جائے گی اور تمہارا حق مارا نہ جائے گا۔''

گو یہ احسان کی ایک خاص صورت ہے مگر اس کی وسعت میں ساری دنیا سمائی ہے۔

نیکی کا بدلہ نیکی سے دینا اسلام کا وہ اصول ہے جس پر ثواب وعذاب کا دارو مدار ہے' جو نیک کام کریں گے ان کو خدا کے ہاں سے نیک ہی جزا ملے گی' ارشاد ہوا:

﴿هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ﴾ (رحمٰن:۶۰)

''بھلائی کا بدلہ کیا ہے' مگر بھلائی۔''

گو یہ آیت پاک اپنے سیاق کے لحاظ سے آخرت میں نیک کاموں کے نیک بدلہ ملنے سے متعلق ہے مگر لفظوں کے لحاظ سے اس اصول کی وسعت دنیا اور آخرت دونوں کو شامل ہے۔

دنیا کی سب سے بڑی ضرورت قرض کے بوجھ کو ہلکا کرنا ہے' دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے اس بوجھ کو ہلکا کیا ہے' قرض داروں پر احسان کرنا' ضرورت مندوں کو قرض دینا اور تنگ دست مقروضوں کو مہلت دینا جو قرض ادا کرنے سے بالکل مجبور ہوں' ان کا قرض معاف کر دینا ثواب کا کام بتایا ہے۔

عرب میں سود خواری نے لوگوں کو اس قدر بے رحم اور سنگ دل بنا دیا تھا کہ جو لوگ قرض نہیں ادا کر سکتے تھے وہ غلاموں کی طرح فروخت کر دیے جاتے تھے اور جو قیمت ملتی تھی اس سے ان کا قرض ادا کیا جاتا تھا' آج اس تمدن کے زمانہ میں قرض کی زنجیر مقروضوں کے لیے اتنی ہی بھاری ہے' بلکہ سرمایہ داری کے موجودہ نظام نے اس کو اور زیادہ بھاری بنا دیا ہے' قرآن پاک کی ایک ہی آیت سارے نظام کو تہ وبالا کرتی ہے۔

﴿وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ (بقرہ:۲۸۰)

---

(۱) ابن جریر وابن کثیر بحوالہ نسائی۔

''اور اگر (کوئی) تنگ دست (تمہارا مقروض) ہو تو فراخی تک کی مہلت (دو) اور اگر سمجھو تو تمہارے حق میں یہ زیادہ بہتر ہے کہ اس کو (اصل قرضہ بھی) بخش دو۔''

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں خود خداوند تعالیٰ کی زبان سے یہ بیان فرما کر کہ ''قیامت کے دن بس خود تین آدمیوں کا فریق ہوں گا۔ جن میں ایک وہ شخص ہے جس نے آزاد شخص کو فروخت کیا اور اس کی قیمت کھائی۔[1] اس کو اور بھی مؤکد کر دیا اور قرض کے معاملہ میں تنگ دستوں پر احسان کرنے کی متعدد صورتیں بتائیں، یعنی مہلت دینا، قرض کا معاف کرنا اور انسانیت کے ساتھ تقاضا کرنا اور اس کو ایک ایسا ثواب کا کام بتایا کہ اگر ایک شخص اس کے سوا نیکی کا اور کوئی کام نہ کرے تب بھی صرف یہی ایک کام اس کی مغفرت کا ذریعہ ہو سکتا ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص جو نیکی کا کوئی کام نہیں کرتا تھا لوگوں کو قرض دیتا تھا اور جب اس کو کوئی مقروض تنگ دست نظر آتا تھا تو اپنے ملازموں سے کہتا تھا کہ اس سے درگزر کرو شاید خدا ہم سے بھی درگزر کرے، چنانچہ خدا نے اس کے صلہ میں اس سے درگزر کیا۔ دوسری حدیث میں ہے کہ تم سے پہلے ایک شخص تھا۔ جس سے موت کے بعد فرشتوں نے سوال کیا کہ تم نے نیکی کا کوئی کام کیا ہے؟ اس نے کہا کوئی نہیں، فرشتوں نے کہا ذرا یاد کرو، اس نے کہا کہ میں لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا۔ اگر مقروض فراخ دست ہوتا تھا تو قرض کے لینے میں میں آسانی کرتا اور اگر تنگ دست ہوتا تھا تو اس کو مہلت دیتا تھا، یا یہ کہ فراخ دست کو مہلت دیتا تھا اور تنگ دست کا قرض چھوڑ دیتا تھا۔[2] اس قسم کی بہت سی روایتیں ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جس شخص کو یہ پسند ہو کہ خدا قیامت کی تکلیف سے اس کو نجات دے وہ تنگ دست کو مہلت دے یا اس کا قرض معاف کر دے۔[3] یہی روایت مسند ابن حنبل میں ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے کہ جو شخص اپنے قرض دار کو مہلت دے گا، یا اس کا قرض معاف کر دے گا تو قیامت کے دن خدا کے عرش کے سایہ میں ہوگا۔[4]

غرض یہ ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ساتھ بھلائی اور احسان کرنے کو کسی خاص حد میں محدود نہیں کیا ہے، بلکہ اس کو نیکی کی ہر راہ میں وسیع کر دیا ہے زندگی تو زندگی موت میں بھی اس اصول کے دائرہ کو تنگ نہیں کیا ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے ہر شے پر احسان کرنا فرض کیا ہے تو اگر تمہیں کسی کو (کسی شرعی حکم کے سبب سے) جان سے مارنا بھی پڑے تو اس کو بھی اچھائی کے ساتھ کرو، کسی جانور کو ذبح کرنا چاہو تو بھی خوبی کے ساتھ کرو، چھرے کو خوب تیز کر لیا کرو، اور ذبیحہ کو راحت دو۔''[5]

---

۱) بخاری کتاب البیوع باب اثم من باع حُرًّا مع فتح الباری۔
۲) مسلم کتاب البیوع باب فضل انظار العسر۔
۳) مسلم کتاب البیوع باب فضل انظار العسر۔
۴) مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۳۰۸۔
۵) صحیح مسلم کتاب الصید والذبائح۔

پھر یہ اصول کہ جو میرے ساتھ احسان کرے اسی کے ساتھ احسان کرنا چاہیے، محمد رسول اللہ ﷺ کی اخلاقی تعلیم کے خلاف ہے، ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے آ کر پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ میں کسی شخص کے پاس سے گزرتا تو وہ میری مہمانی نہیں کرتا، تو کیا جب اس کا گزر مجھ پر ہو تو میں بھی اس کی کج خلقی کا بدلہ یہی دوں فرمایا ''نہیں تم اس کی مہمانی کرو۔''(۱)

ایک موقع پر ارشاد ہوا ''ایسے نہ بنو کہ خود تمہاری گرہ کی عقل نہ ہو، صرف دوسروں کی دیکھا دیکھی کام کرو کہنے ہو کہ اگر لوگ احسان کریں گے تو ہم بھی احسان کریں گے اور اگر وہ ظلم کریں تو ہم بھی کریں گے، بلکہ اپنے آپ کو اس پر مطمئن کر لو کہ اگر دوسرے احسان کریں تو تم احسان کرو ہی گے، اور اگر وہ برائی بھی کریں تو تم ظلم نہ کرو۔''(۲)

لوگ احسان کو غلطی سے دولت و تمول یا اور دوسری بڑی بڑی باتوں کے ساتھ خاص کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ غریب کیا احسان کا کام کر سکتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ احسان و نیکی کا کام کرنے کے لیے دولت کی نہیں دل کی ضرورت ہے اور اس کی وسعت بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے، حضرت براء بن عازبؓ صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک بدوی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت مبارک میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھے کوئی ایسی بات بتائیے جس کے کرنے سے بہشت نصیب ہو۔ ارشاد ہوا تمہاری تقریر گو مختصر ہے لیکن تمہارا سوال بہت بڑا ہے تم جانوں کو آزاد کرو اور گردنوں کو چھڑاؤ۔'' اس نے کہا یا رسول اللہ ﷺ کیا یہ دونوں باتیں ایک ہی نہیں؟ فرمایا نہیں اکیلے اگر کسی کو آزاد کرتے ہو تو یہ جان کا آزاد کرنا ہے، اور دوسرے کے ساتھ شریک ہو کر کسی کی آزادی کی قیمت میں مالی مدد دینا گردن چھڑانا ہے اور لگاتار دیتے رہو، اور ظالم رشتہ دار کے ساتھ نیکی کرو اگر تم یہ بھی نہ کر سکو تو بھوکے کو کھلاؤ، اور پیاسے کو پلاؤ۔ اور نیکی کے کام کرنے کو کہو اور برائی کے کام سے باز رکھو، اور اگر یہ بھی نہ کر سکو تو اپنے آپ کو بھلائی کے سوا اور باتوں سے روکو۔ (۳)

ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ ایمان کے ساتھ کوئی عمل بتائیے فرمایا ''جو روزی خدا نے دی اس میں سے دوسروں کو دے۔'' عرض کی اے خدا کے رسول اگر وہ خود مفلس ہو فرمایا اپنی زبان سے نیک کام کرے عرض کی اگر اس کی زبان معذور ہو فرمایا مغلوب کی مدد کرے عرض کی اگر وہ ضعیف ہو مدد کی قوت نہ ہو۔ فرمایا جس کو کوئی کام کرنا نہ آتا ہو اس کا کام کر دے۔ عرض کی اگر وہ خود ایسا ہی ناکارہ ہو فرمایا اپنی ایذارسانی سے لوگوں کو بچائے رکھے۔ (۴)

❀❀❀

(۱) جامع ترمذی باب ماجاء فی الاحسان والعفو۔

(۲) جامع ترمذی انظار المعسر۔

(۳) مستدرک حاکم ج ۲ کتاب المکاتب۔

(۴) مستدرک حاکم ج ۲ کتاب الایمان ج ا ص ۶۳۔

عفوودرگزر

عفوودرگزر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی صفت ہے اگر یہ نہ ہوتو دنیا ایک لمحہ کے لیے بھی آباد نہ رہے اوردم کے دم میں یہ گناہوں سے بھری ہوئی کائنات کی بستی سونی پڑ جائے اللہ تعالیٰ کے خاص ناموں میں سے ﴿عَفُوٌّ﴾ (درگزر کرنے والا) ﴿غافر، غَفُوْرٌ﴾ اور ﴿غَفَّارٌ﴾ (معاف کرنے والا) ہے۔اس کی شان یہ ہے:

﴿وَ هُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَ یَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ﴾ (شوریٰ:۲۵)

''اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور برائیوں کو معاف کرتا ہے۔''

وہ چاہے تو انسانوں کے گناہوں کے سبب سے ان کو ایک دم ہلاک کردے یا ان کو معاف کردے فرمایا:

﴿اَوْ یُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَ یَعْفُ عَنْ كَثِیْرٍ﴾ (شوریٰ:۳۰)

(''اگر خدا چاہے تو) گناہ گاروں کو ان کے کرتوت کے سبب تباہ کردے اور بہتوں کو معاف کردے۔''

وہ اپنے شرمندہ بندوں کو اپنی غفاری کی شان کا یقین تاکید پر تاکید کر کے یوں دلاتا ہے:

﴿وَ اِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی﴾ (طٰہٰ:۸۲)

''اور اس میں شبہ نہیں کہ میں البتہ اس کی بڑی بخشائش کرتا ہوں جو توبہ کرے اور یقین لائے اور نیک کام کرے پھر راہ پر رہے۔''

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے دوجگہ اپنے کو ﴿غَافِرٌ﴾ (بخشنے والا) پانچ دفعہ ﴿غَفُوْرٌ﴾ (بخشنے والا) کہا ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ اس کے عفوودرگزر کا سمندر کس زوروشور سے جوش ماررہا ہے۔خدا نے اپنی ساری صفتوں میں سے اپنی اسی صفت کی تجلی کا پرتو اپنے بندوں میں پیدا کرنے کی بے پردہ دعوت دی ہے فرماتا ہے:

﴿اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِیْرًا﴾ (نساء:۱۴۹)

''یا کسی برائی کو معاف کرو تو بے شک اللہ معاف کرنے والا قدرت والا ہے۔''

انسان اگر اپنے کسی قصوروار کو معاف کرتا ہے تو اس کی قدرت بہرحال کامل نہیں لیکن اللہ تعالیٰ جس کی قدرت کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں وہ معاف فرماتا ہے تو لاچار انسان کو اپنے قصورواروں کو معاف کرنا کتنا زیبا اور سزاوار ہے تو جس طرح قدرت والا ہمارے قصوروں کو معاف فرماتا ہے اسی طرح ہم کو چاہیے کہ ہم بھی اپنے قصورواروں کو معاف کریں۔ (۱)

(۱) تفسیر ابن جریر طبری و بحر محیط ابن حبان۔

اس آیت سے یہ اشارہ بھی نکل سکتا ہے کہ اگر ہم اپنے قصورواروں کو معاف کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہمارے قصوروں کو بھی معاف کرے گا' ایک دوسری آیت میں اس اشارہ کی پوری تصریح ہے' فرمایا:

﴿وَ لْیَعْفُوْا وَ لْیَصْفَحُوْا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ (نور:۲۲)

''اور چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر کریں کیا تم نہیں چاہتے کہ خدا تم کو معاف کرے اور اللہ معاف کرنے والا اور مہروالا ہے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو عفوودرگزر کی تعلیم اس ترغیب کے ساتھ دی ہے کہ تم دوسروں کو معاف کرو تو خدا تمہیں معاف کرے گا اور جب اللہ غفور و رحیم ہے تو تم پر بھی اس کے اس ابرِ کرم کی کچھ چھینٹیں پڑنا چاہییں۔ چنانچہ جن مومنوں کے لیے خدا نے جزائے خیر کا وعدہ فرمایا ہے' ان کی ایک صفت یہ بتائی ہے:

﴿وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ یَغْفِرُوْنَ﴾ (شوریٰ:۳۷)

''اور جب غصہ آئے تو وہ معاف کرتے ہیں۔''

سکون کی حالت میں معاف کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا غصہ کی حالت میں' جب انسان کو اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا' لیکن اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمانِ کامل کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ جن میں یہ جوہر ہوتا ہے وہ اس حالت میں بھی اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہیں' اور قصوروالوں کو معاف کر دیتے ہیں۔

یہ تو کسی ذاتی غیظ و غضب کی حالت ہوئی' لیکن اس سے بڑھ کر وہ موقع ہے جہاں مذہبی اختلاف درمیان میں ہے کہ ان احمقوں کو اچھی بات بتائی جاتی ہے اور وہ نہیں مانتے' ان کے دعویٰ کی کمزوری ثابت کی جاتی ہے۔ مگر وہ اپنی بات پر اڑے ہیں اور حق کا جواب لایعنی گفتگو سے اور برا بھلا کہہ کر دیتے ہیں ایسے موقع پر ارشاد ہوتا ہے۔

﴿وَ اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا یَسْمَعُوْا وَ تَرٰىهُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ وَ هُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ ۝ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ ۝﴾ (الاعراف:۱۹۹۔۲۰۰)

''اور اگر تم ان کو راہِ راست کی طرف بلاؤ تو (تمہاری ایک) نہ سنیں اور (بظاہر) وہ تم کو ایسے دکھائی دیتے ہیں کہ (گویا) وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں' حالانکہ وہ دیکھتے نہیں (اے پیغمبر!) درگزر (کا شیوہ) اختیار کرو اور (لوگوں سے) نیک کام (کرنے) کو کہو اور جاہلوں سے کنارہ کش رہو۔''

کیونکہ ایسے موقع پر دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں' یا تو تبلیغ و دعوت کا کام بند کر دیا جائے۔ یا تبلیغ و دعوت کے سلسلہ میں ان ناگواریوں کو برداشت کیا جائے' خدا نے اسی صورت کے اختیار کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ان ناگواریوں کو برداشت کرو اور نیکی کا حکم دیتے رہو۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس سلسلہ میں برائی کا جواب بھلائی کے ساتھ دو۔

﴿اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَصِفُوْنَ﴾ (مومنون:۹۶)

''(اگر کوئی تمہارے ساتھ بدی کرے تو) بدی کا دفعیہ ایسے برتاؤ سے کرو جو بہت ہی اچھا ہو' جو کچھ وہ

تمہاری نسبت کہا کرتا ہے وہ ہم کو خوب معلوم ہے۔''

مذہبی جماعت کے لیے اس سے بھی زیادہ اشتعال انگیز موقع وہ ہوتا ہے جب کچھ لوگ ان لوگوں کو بھی ان سے الگ کرنا چاہتے ہیں جو ان کی جماعت میں شامل ہو چکے ہیں' لیکن خدا نے اس موقع پر بھی مسلمانوں کو عفو و درگزر کا حکم دیا ہے۔

﴿وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ' بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْ' بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوْا وَ اصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ﴾ (بقرہ: ۱۰۹)

(''مسلمانو)! اکثر اہلِ کتاب باوجود یکہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے (پھر بھی) اپنے دلی حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر تم کو کو کافر بنا دیں' تو معاف کرو اور درگزر کرو یہاں تک کہ خدا اپنا حکم صادر فرمائے۔''

اسی طرح مشرک بھی جو قیامت پر یقین نہیں رکھتے تھے' اگر غصہ دلانے والی کوئی بات کریں تو ان نادانوں کو معاف کر دینا چاہیے کیونکہ وہ اگر نہیں تو تم تو قیامت کی جزاء و سزا کے قائل ہو اس لیے سمجھنا چاہیے کہ اگر وہ تمہارے ساتھ برائی کرتے ہیں تو آج نہیں تو کل اس کا بدلہ ان کو مل جائے گا' فرمایا:

﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا' بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَ مَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ○﴾ (جاثیہ: ۱۴۔۱۵)

''ایمان والوں سے کہہ دے کہ ان کو جو اللہ کے جزاء و سزا کے واقعات پر یقین نہیں رکھتے معاف کر دیا کریں' تا کہ لوگوں کو ان کے کاموں کا بدلہ ملے جس نے اچھا کیا اس نے اپنے لیے کیا اور جس نے برا کیا اس نے اپنا برا کیا۔ پھر تم اپنے پروردگار کے پاس لوٹائے جاؤ گے۔''

اس آیت کے شانِ نزول میں لکھا ہے کہ کسی منافق یا کافر نے کسی مسلمان سے کوئی بدتمیزی کی بات کہی تھی اس پر بعض مسلمانوں کو طیش آیا' تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری اور مسلمانوں کو عفو و درگزر [1] کی نصیحت فرمائی۔

(۱) اس قسم کی آیتوں کے متعلق جن میں کفار سے عفو و درگزر کی نصیحت ہے عام مفسروں کا نظریہ یہ ہے کہ وہ جہاد سے پہلے کی بات ہے۔ جہاد نے کفار کے حق میں عفو و درگزر کے ہر حکم کو منسوخ کر دیا ہے لیکن مفسروں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو جہاد کے حکم اور عفو و درگزر کی نصیحت کے درمیان کوئی منافات نہیں سمجھتے اور اس لیے ایک سے دوسرے کو منسوخ نہیں جانتے' امام رازی نے اپنی تفسیر میں کئی موقعوں پر اس کی تصریح کی ہے لکھتے ہیں۔ ''اس آیت ﴿وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ﴾ میں رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ جاہلوں کی بداخلاقی پر صبر کریں' اور ان کی بیہودہ باتوں اور کمینہ حرکتوں کا جواب اسی قسم کی باتوں اور حرکتوں سے نہ دیا جائے اور اس میں قتال سے باز رہنے کی کوئی ہدایت نہیں کیونکہ جاہلوں سے اعراض برتنے اور مشرکوں سے قتال میں کوئی تضاد نہیں۔ ←

(تفسیر کبیر امام رازی زیر آیت بالا)

غم وغصہ کے اظہار کا اصلی وقت وہ آتا ہے۔ جب انسان کی عزت و آبرو پر حملہ کیا جائے لیکن اس حالت میں بھی اسلام نے عفو و درگذر سے کام لینے کا حکم دیا ہے چنانچہ مسطحؓ حضرت ابوبکرؓ کے رشتہ دار تھے اور وہ ان کی کفالت کرتے تھے لیکن جب انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تہمت میں حصہ لیا تو ابوبکرؓ نے ان کی مالی امداد بند کر دی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَ السَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوْا أُولِي الْقُرْبٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ الْمُهَاجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لْيَعْفُوْا وَ لْيَصْفَحُوْا أَلَا تُحِبُّوْنَ أَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (نور:۲۲)

''اور تم میں سے جو لوگ صاحبِ احسان اور کشائش والے ہیں قرابت والوں اور محتاجوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (مدد خرچ) نہ دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں؛ بلکہ (چاہیے کہ ان کے قصور) بخش

← اور جب دونوں باتیں ایک ساتھ ہو سکتی ہیں تو نسخ ماننے کی ضرورت نہیں' مگر ظاہر پرست مفسرین بے ضرورت ناسخ و منسوخ آیتوں کی تعداد بڑھانے کے عاشق ہیں (جلد ۴ صفحہ ۴۹۶)

ایک اور آیت ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ﴾ کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ منسوخ نہیں کیونکہ نرمی برتنے پر ہر حال میں آمادہ کیا گیا ہے جب تک اس سے دین اور اخلاق میں کوئی نقصان پیدا نہ ہو۔'' (ج ۶ ص ۳۰۰)

آیت ﴿وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''کلبی اور ابوالعالیہ نے کہا ہے کہ اس آیت کو قتال کے حکم نے منسوخ کر دیا' لیکن اس نسخ کے ماننے کی ضرورت نہیں کیونکہ احمقوں سے چشم پوشی کرنا۔ اور ان کا مقابلہ نہ کرنا عقل اور شرع دونوں میں مستحسن ہے اور عزت اور آبرو اور پرہیز گاری کی سلامتی کا باعث ہے۔ ج ۱ ص ۴۹۷ طبع دار الطباعة العامرة مصر۔

آیت ﴿يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (جاثیہ) کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

اکثر مفسروں نے کہا ہے کہ جب خدا نے ان سے قتال کا حکم دیا تو عفو و کرم کے عموم میں یہ بھی داخل ہو جاتا ہے کہ ان سے قتال نہ کیا جائے لیکن جب خدا نے ان سے قتال کا حکم دیا تو عفو و کرم کے حکم کا نسخ ہو گیا' لیکن قریب بہ صحت یہ ہے کہ اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر کافروں سے جھگڑا نہ کیا جائے' اور ان کی تکلیف دہ باتوں اور وحشیانہ حرکتوں سے درگذر کیا جائے (جلد ۷ صفحہ ۴۸۴ طبع مذکور) میرے نزدیک اوپر کی آیت سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو کافروں اور مشرکوں اور دوسرے قصورواروں کے ان ہی قصوروں کے معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے جن کے معاف کرنے کا حق بندوں کو ہے اور وہ حقوقِ عباد میں ہیں یعنی وہ مسلمانوں کا ذاتی قصور کریں تو مسلمان معاف کر دیں۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس سے کفر و شرک اور عصیانِ الٰہی کے قصوروں کی معافی لازم آتی ہے جن کے معاف کرنے کا حق بندوں کو سرے سے حاصل نہیں اور قتال و جہاد حقوقِ الٰہی کے مقابلہ میں مشروع ہوا ہے اس لیے جہاد کی آیتیں اس مغفرت اور عفو و درگذر کے اخلاقی احکام میں خلل انداز نہیں درمنثور میں ابن عساکر سے حضرت ابومسلم خولانی صحابیؓ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنی ایک کافرہ لونڈی کا قصور یہی آیت پڑھ کر معاف کیا تھا۔ اس سے میرے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ (ج ۶ ص ۳۹ مصر)

دیں اور درگزر کریں (مسلمانو!) کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہارے قصور معاف کر دے اور اللہ بخشنے والا' مہربان ہے۔''

اس آیت کے آخری ٹکڑے سے بھی ظاہر ہے کہ جو دوسروں کے قصور کو معاف کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے قصور سے درگزر فرمائے گا۔

یہ اخلاقی وصف انتہا درجہ کی کشادہ دلی سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کا صلہ بھی ایسا عطا فرمایا جو انتہا درجہ کی وسعت رکھتا ہے۔

﴿وَ سَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ○ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ○﴾ (آل عمران: ۱۳۳۔۱۳۴)

''اور اپنے پروردگار کی بخشائش اور اس جنت کی طرف لپکو جس کا پھیلاؤ (اتنا بڑا ہے) جیسے زمین و آسمان (کا پھیلاؤ۔ سجی سجائی) ان پرہیز گاروں کے لیے تیار ہے جو خوش حالی اور تنگدستی (دونوں حالتوں) میں خدا کے نام پر خرچ کرتے اور غصہ کو روکتے اور لوگوں سے درگزر کرتے اور لوگوں کے ساتھ نیکی کرنے والوں کو اللہ دوست رکھتا ہے۔''

اوپر کی آیت میں متقیوں کے دو وصف ایک ہر حال میں راہِ خدا میں دینا' اور دوسرا لوگوں کو معاف کرنا اور درگزر کرنا اور ان کے لیے دو جزائیں' ایک خدا کی مغفرت اور دوسری وسیع جنت بیان کی ہیں۔ اس سے ادھر خیال جاتا ہے کہ ہر حال میں خدا کی راہ میں دینے کا معاوضہ تو وہ جنت ہے جس کی حدو پایاں آسمان و زمین ہے اور غصہ روکنا اور لوگوں کو معاف کرنے کی جزا یہ ہوگی کہ خدا کی مغفرت ہمارے شاملِ حال ہوگی۔ اور وہ احکم الحاکمین ہم کو بھی معاف کرے گا۔

عفو و درگزر کی اس اخلاقی تعلیم میں اگر قوت کا جز شامل نہ ہو تو وہ سراسر کمزوری اور دناءت پسندی کے مترادف ہو جائے' اسی لئے اسلام نے اس اخلاقی تعلیم کے درس میں اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے اور موجودہ انجیل کی اس اخلاقی تعلیم سے کہ اگر ایک شخص کسی کے ایک گال پر طمانچہ مارے تو اس کے سامنے دوسرا گال کر دو جو ذلت اور پست طبعی پیدا ہوتی ہے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے کیونکہ اسلام نے عفو و درگزر کی ایسی معتدل تعلیم دی ہے جس کے ساتھ خودداری کی شان بھی قائم رہتی ہے۔

﴿وَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ○ وَ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (شوریٰ: ۳۹۔۴۰)

''اور جو ایسے (غیرت مند) ہیں کہ جب ان پر (کسی طرف سے) بے جا زیادتی ہوتی ہے تو وہ (واجبی) بدلہ لے لیتے ہیں۔ اور برائی کا بدلہ ہے ویسی ہی برائی اس پر (بھی) جو معاف کر دے اور صلح کرے تو

اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے' بے شک وہ ظلم کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔"

برائی کا بدلہ برائی' جماعت کا قانون ہے' اور عفوودرگزر افراد کا اخلاقی کمال ہے' جماعتی قانون کی قوت موجود ہوتے ہوئے افراد کا آپس میں عفوودرگزر سے کام لینا ایک بلند اخلاقی مثال ہے' جس کی مزدوری کی ذمہ داری احکم الحاکمین نے اپنے ذمے لی ہے اور بتادیا ہے کہ ظلم کرنے والے خواہ وہ ہوں جو بے سبب ظلم کر بیٹھیں' یا وہ انتقام کے جوش میں آگے بڑھ جائیں' خدا کی محبت سے محروم ہیں۔

اس حق کے حاصل ہو جانے کے بعد عفوودرگزر خودداری کے منافی نہیں ہوتا بلکہ بڑی ہمت کا کام ہو جاتا ہے کہ قدرت کے باوجود اور اشتعال ہونے پر بھی اپنے نفس کو قابو میں رکھ کر عفوودرگزر کرتا ہے' اسی لیے فرمایا:

﴿وَ لَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ (شوریٰ:۴۳)

"اور البتہ جو شخص صبر کرے اور (دوسرے کی خطا) بخش دے تو بے شک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔"

ایک اور آیت میں اس خصلت کو بڑی خوش قسمتی سے تعبیر فرمایا ہے اور اس کی تاثیر دکھائی ہے کہ اس سے کیونکر دشمنی دوستی کی صورت میں بدل جاتی ہے:

﴿وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَ بَیْنَه عَدَاوَةٌ کَاَنَّه وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ○ وَ مَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَ مَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ○ وَ اِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّه هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ﴾ (حم السجدۃ: ۳۴۔۳۶)

"اور بھلائی اور برائی برابر نہیں (اگر کوئی برائی کرے تو اس کا) جواب اچھائی سے دو' پھر تو تیرے اور جس کے درمیان دشمنی ہے وہ ایسا ہی ہو جائے گا گویا دوست ہے ناتے والا' اور یہ بات ملتی ہے انہیں کہ جنہیں صبر ہے اور یہ بات ملتی ہے اس کو جس کی بڑی قسمت ہے اور اگر (اس میں) شیطان کے کونچنے سے کوئی کونچ تجھ کو لگ جائے تو اللہ کی پناہ ڈھونڈ' بے شک وہی ہے سنتا' جانتا۔"

آیت کے اخیر ٹکڑے سے واضح ہوتا ہے کہ غصہ اور اشتعال کے سبب سے عفوودرگزر کے خلاف انسان سے جو حرکت ہو جاتی ہے وہ شیطانی کام ہے اس سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔ حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ انہوں نے کہا۔

"خدا نے اس آیت میں ایمان والوں کو غیظ و غضب میں صبر کا' اور نادانی و جہالت کے وقت حلم و بردباری کا اور برائی کے مقابلہ میں عفوودرگزر کا حکم دیا ہے جب وہ ایسا کریں گے تو خدا ان کو شیطان کے اثر سے محفوظ رکھے گا۔" (۱)

(۱) ابن کثیر تفسیر آیت مذکور۔

ابو مسعودؓ صحابی کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اپنے غلام کو مار رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی جان لو جان لو مڑ کر دیکھا تو آنحضرت ﷺ تھے فرما رہے تھے کہ اے ابو مسعود! جتنا قابو تم کو اس غلام پر ہے اس سے زیادہ خدا کو تم پر ہے ابو مسعودؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی اس نصیحت کا یہ اثر مجھ پر ہوا کہ میں نے پھر کسی غلام کو نہیں مارا۔

ایک شخص نے حضورِ انور ﷺ سے آ کر پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں اپنے خادم کا قصور کتنا معاف کروں۔ آپؐ پہلے تھوڑی دیر چپ رہے اس نے پھر یہی پوچھا تب آپؐ نے فرمایا ''ہر روز ستر دفعہ۔''[۱] اس سے مقصودِ نبوی تعداد کی تحدید نہیں بلکہ عفوو درگزر کی کثرت ہے۔

بعض لوگوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ عفوو درگزر سے ان کے رعب و داب اور وقار میں فرق آ جائے گا لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ انتقام سے گو فوری جذبہ کی تسکین ہو جاتی ہے اور کمزوروں پر دھاک بیٹھ جاتی ہے مگر اس سے کسی پائدار شریفانہ عزت کا خیال نہیں پیدا ہوتا یہ چیز عفوو درگزر ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اس کا شریفانہ وقار بالآخر سب پر چھا جاتا ہے۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے۔[۲]

﴿وَمَا زَادَ اللّٰهُ رَجُلًا بِعَفْوٍ اِلَّا عِزًّا﴾

''اور اللہ اس شخص کو جو عفوو درگزر کرتا ہے' نہیں بڑھاتا مگر عزت میں۔''

❀❀❀

(۱) ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی ادب الخادم میں یہ دونوں حدیثیں ہیں۔

(۲) ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی التواضع۔

حلم و بردباری

حلم و بردباری کے معنی یہ ہیں کہ انتقام کی قدرت کے باوجود کسی ناگوار یا اشتعال انگیز بات کو برداشت کر لیا جائے اور قصوروار سے اس کے لیے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ یہ قدرت سب سے زیادہ خدائے تعالیٰ کو حاصل ہے لیکن اس قدرت کے باوجود وہ اکثر اپنے بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرتا ہے اور انتقام نہیں لیتا اور اسی لیے اس نے اپنے آپ کو حلم کے ساتھ متصف کیا ہے' اور جہاں جہاں اپنی اس صفت کا اظہار کیا ہے ساتھ ہی اپنے علم اور اپنی بخشش کا بھی ذکر کر دیا ہے تا کہ یہ معلوم ہو کہ اس کا یہ حلم اس کے علم کے باوجود صرف اس کی بخشش کا نتیجہ ہے' فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ﴾ (بقرہ:۲۲۵' مائدہ:۱۰۱)

''اور اللہ ہے بخشنے والا بردبار۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ﴾ (آل عمران:۱۵۵)

''بے شک اللہ ہے بخشنے والا بردبار۔''

﴿اِنَّه كَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا﴾ (بنی اسرائیل:۴۴ و فاطر:۴۱)

''بے شک وہ (اللہ) ہے بخشنے والا بردبار۔''

ان سب آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت حلم کے ساتھ اپنی صفت مغفرت کا ذکر کر دیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ اس کی یہ بردباری نعوذ باللہ کسی ضعف یا عدمِ قدرت کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کی شانِ غفاری کا نتیجہ ہے۔

دوسری جگہ حلم کے ساتھ اپنی صفت علم کو شامل کیا ہے ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَلِیْمٌ﴾ (نساء:۱۲)

''اور اللہ ہے جاننے والا' بردبار۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَعَلِیْمٌ حَلِیْمٌ﴾ (حج:۵۹)

''بے شک ہے اللہ جاننے والا' بردبار۔''

﴿وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَلِیْمًا﴾ (احزاب:۵۱)

''اور ہے اللہ جاننے والا' بردبار۔''

ان آیتوں سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ انسانوں کی طرح بے جانے بوجھے یا محدود علم کے سبب سے

بردباری نہیں کرتا بلکہ پورے علم اور ہر چیز اور ہر نتیجہ سے باخبر ہو کر بردباری فرماتا ہے۔ ایک جگہ اپنی بردباری کے ساتھ اپنی صفت استغنا کا بھی ذکر فرماتا ہے۔

﴿وَاللّٰهُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ﴾ (بقرہ:۲۶۳)

''اور اللہ مستغنی اور تحمل والا ہے۔''

یہ صدقہ کے موقع کی آیت ہے اس لیے یہ ظاہر فرمادیا کہ وہ مستغنی ہے اور بردبار ہے۔

انسانوں میں بردباری اکثر کسی نہ کسی قسم کی کمزوری کا نتیجہ ہوتی ہے مثلاً انتقام کے مقابلہ میں حلم اگر اس برائی کرنے والے کو رام کرنے کے لیے کسی کو زیادہ قرین مصلحت معلوم ہوتا ہے تو یہ بھی ایک قسم کی کمزوری ہے کہ اس کو انتقام سے زیادہ حلم نفع بخش معلوم ہوتا ہے لیکن خدا کی ذات ہر حیثیت سے غنی ہے اس کا حلم کامل استغنا کے ساتھ ہے۔

حلم گو اخلاقی حیثیت سے ہر حالت میں تعریف کے قابل ہے لیکن اس کی ایک حیثیت ایسی ہے کہ اس سے بعض کم فہموں کے نزدیک حلیم اور بردبار آدمی کی کمزوری کا راز فاش ہوتا ہے اور اسی لیے اس کے مقابلہ میں ان میں سرکشی اور بے اعتنائی پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی اس کمزوری سے واقف تھا اس لیے اس نے اپنے حلم اور دارو گیر دونوں کو پہلو بہ پہلو جگہ دی ہے تاکہ اس سخت گیری کے سبب سے بندوں میں مایوسی اور بردباری کے سبب سے سرکشی نہ پیدا ہو فرمایا:

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ فَاحْذَرُوْهُ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ﴾ (بقرہ: ۲۳۵)

''اور جان رکھو کہ اللہ کو معلوم ہے جو تمہارے دلوں میں ہے تو اس سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ بخشش والا ہے تحمل والا۔''

یہ آیت عورت کے نکاحِ ثانی کے سلسلہ میں ہے یعنی جب تک اس کی عدت کے دن پورے نہ ہوں کوئی چھپے چوری بھی اس سے نکاح کا وعدہ نہ لے اور نکاح نہ کرے دل میں رہے تو کوئی حرج نہیں۔ اس کے بعد ارشاد ہے کہ اللہ کو تمہارے دل کا ہر بھید معلوم ہے ایسے عالم الغیب سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی اس لیے ایک طرف تو اس کی گرفت سے ہمیشہ ڈرتے رہو دوسری طرف اس کی بخشش اور بردباری بھی عام ہے اس لیے اس سے پرامید بھی رہنا چاہیے۔

نیکی کے کاموں میں مخلصانہ خرچ کرنے کی اللہ تعالیٰ قدر فرماتا ہے اور ایسے لوگوں کے گناہ معاف کرتا ہے۔ اس موقع پر اس کا ارشاد ہے:

﴿اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْهُ لَکُمْ وَ یَغْفِرْلَکُمْ وَ اللّٰهُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ﴾ (تغابن: ۱۷)

''اگر تم اللہ کو قرض دو اچھی طرح قرض دینا تو وہ اس کو دونا کر دے گا اور تمہیں معاف کرے گا' اور اللہ ہے قدر دان اور تحمل والا۔''

اس کی قدر دانی تو یہ ہے کہ وہ ایک کے بدلے دو دے گا' اور تحمل یہ ہے کہ دینے والے کے گناہ کو معاف کرے گا۔

اس میں تحمل اور بردباری کا ایک فلسفیانہ نکتہ بھی چھپا ہے' کسی قصوروار کے کسی قصور پر جب ہم کو غصہ آتا ہے تو اس وقت اس عیب کے سوا اس کے سارے ہنر ہماری آنکھوں سے چھپ جاتے ہیں' اور اس کی خوبیاں نظر انداز ہو جاتی ہیں۔ اس لیے ہمارا غصہ پوری طرح تیز ہو جاتا ہے' لیکن اگر یہ سامنے رہے کہ اس سے ایک غلطی ہوئی یا اس میں ایک عیب ہے مگر اس میں کچھ خوبیاں بھی ہیں تو اس کی ان خوبیوں کی قدر کر کے اس کی غلطی سے درگزر کرنا آسان ہو جاتا ہے' چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اس کی مخلصانہ خیرات کی خوبی کی قدر فرما کر وہ اس کی غلطی سے درگزر کرتا ہے۔

صفتِ حلم سے انبیائے کرام بھی متصف فرمائے گئے ہیں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ جن کی بنیادوں پر محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں اسلام کی عمارت تعمیر ہوئی ہے' خاص طور سے اس وصف سے سرفراز ہوئے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بت پرست باپ کو ہر طرح سے سمجھایا اور چاہا کہ وہ کسی طرح عذابِ الٰہی سے بچ جائے۔ انہوں نے اس کافر باپ کے ہاتھوں طرح طرح کے ظلم سہے اور آخر مجبور ہو کر اس سے علیحدگی پر مجبور ہوئے' پھر بھی ان کی بردباری اور تحمل کا سررشتہ ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا اور اس وقت تک اس کے حق میں دعائے خیر کرتے رہے' جب تک ان کو پوری مایوسی نہیں ہوگئی۔ اور ان کو قطعی طور سے معلوم نہیں ہو گیا کہ وہ خدا کا دشمن ہے۔ اس واقعہ کے سلسلہ میں ہے:

﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرَاهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ۝﴾ (توبہ:۱۱۴)

''اور (نہ تھا) ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعا مانگنا مگر ایک وعدہ (کی وجہ) سے جو ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے کر لیا تھا' پھر ان کو (بھی) جب معلوم ہو گیا کہ یہ خدا کا دشمن ہے تو باپ سے (مطلقاً) دست بردار ہو گئے۔ بے شک ابراہیم البتہ بڑے نرم دل (اور) بردبار تھے'' (کہ باپ کے کافر ہونے کے باوجود خدا سے اس کی مغفرت مانگنے کا وعدہ کر لیا تھا۔)

دوسری آیت میں اس موقع پر جہاں قومِ لوط کی بربادی کی خبر پا کر وہ اللہ تعالیٰ سے عرض معروض کرتے ہیں۔ ان کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ﴾ (ھود:۷۵)

''بے شک ابراہیم بردبار' نرم دل اور رجوع کرنے والے تھے۔''

قرآن مجید کی آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حلم' عفوودرگزر رفق وملاطفت اور صبر واستقلال کے مجموعہ کا نام ہے۔ چنانچہ خداوند تعالیٰ نے اپنی توصیف میں حلیم کے ساتھ اکثر غفور کا اور حضرت ابراہیمؑ کے وصف میں اواہ کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حلم کے لیے عفوودرگزر اور رفق وملاطفت لازمی ہیں لیکن ایک اور آیت میں حضرت اسماعیلؑ کی نسبت فرمایا ہے۔

﴿فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ﴾ (والصّٰفّٰت:۱۰۱)

''تو ہم نے ان کو (ابراہیم کو) ایک بڑے بردبار لڑکے (اسماعیل کے پیدا ہونے) کی خوش خبری دی۔''

اس کے بعد جب ان کی قربانی کا حکم ہوا ہے تو انہوں نے کہا ہے۔

﴿يٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (والصّٰفّٰت:۱۰۲)

''اے باپ آپ کو جو حکم ہوا ہے (بے تامل) اس کی تعمیل کیجیے۔ ان شاء اللہ آپ مجھ کو بھی صابر ہی پائیں گے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ صبر حلم کا ایک ضروری جز ہے حلم کی صفت خدا کو نہایت محبوب ہے چنانچہ ایک شخص کی نسبت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جن کو خدا پسند کرتا ہے یعنی حلم اور جلد بازی نہ کرنا (۱) یعنی کوئی بات پیش آئے تو بے سوچے سمجھے غصہ میں کوئی حرکت نہ کر بیٹھنا چاہیے۔

ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے بار بار یہ درخواست کی کہ مجھے کوئی نصیحت فرمایئے' آپ نے ہر بار یہ جواب دیا کہ ''غصہ آ بھی جائے تو اس کو ضبط کیا جائے'' یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ پہلوان وہ نہیں ہے جو لوگوں کو کشتی میں پچھاڑ دے بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے' (۲) ایک اور حدیث میں ہے کہ ''جو شخص باوجود قدرت کے غصہ کو ضبط کرے گا' اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلا کر انعامِ خاص کا مستحق ٹھہرائے گا۔'' (۳)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص نے آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! میرے کچھ رشتہ دار ہیں' میں ان کے ساتھ ملتا ہوں وہ کاٹتے ہیں' میں بھلائی کرتا ہوں وہ بدی کرتے ہیں' وہ میرے ساتھ جہالت کرتے ہیں' میں تحمل کو راہ دیتا ہوں۔ آنحضرت ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ ''اگر یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ تم کہتے ہو' تو تم ان کے منہ میں گرم راکھ بھرتے ہو' اور جب تک اس حالت پر قائم رہو گے خدا کی طرف سے تمہاری مدد ہوتی رہے گی۔ (۴)

---

(۱) ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی التانی والعجلۃ۔

(۲) بخاری کتاب الادب الحذر من الغضب۔

(۳) ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی کثرۃ الغضب۔

(۴) صحیح مسلم باب الرحم وادب المفرد امام بخاری باب فضل صلۃ الرحم۔

رفق ولطف

رفق ولطف کے معنی یہ ہیں کہ معاملات میں سختی اور سخت گیری کے بجائے نرمی اور سہولت اختیار کی جائے جو بات کی جائے نرمی سے، جو سمجھایا جائے وہ سہولت سے اور جو مطالبہ کیا جائے وہ میٹھے طریقہ سے کہ دلوں کو موہ لے اور پتھر کو بھی موم کردے۔ اللہ تعالیٰ نے کئی آیتوں میں اپنے کو ﴿لَطِیْفٌ﴾ فرمایا ہے[1] اور حدیثوں میں اس کا نام رفیق آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے ہر قسم کے بندوں کے ساتھ ان کی خبر گیری اور رزق کا سامان پہنچانے میں رفق ولطف فرماتا ہے، اور اپنے اس تلطف میں وہ ان کی اطاعت اور عدمِ اطاعت کی پروا نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کو بے سان وگمان جس طرح امارت کے رتبہ تک پہنچایا، اور ان کے خاندان کو جن غیر متوقع ذریعوں سے مصر لے آیا: اور دشمن بھائیوں کو جس طرح ان کے سامنے نادم وشرمندہ کر کے ان کے آگے سرنگوں کر دیا، اس کو یاد کر کے وہ فرماتے ہیں۔

﴿اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ﴾ (یوسف:۱۰۰)

''بے شک میرا رب لطف کرنے والا ہے جس بات کا چاہے بے شک وہی علم والا، حکمت والا ہے۔''

حضرت یوسفؑ کو جو مشکلیں پیش آئیں اور پھر وہی مشکلیں جس طرح ان کی کامیابی کا ذریعہ بنیں۔ ان کی

---

(۱) راغب اصفہانی ''لطیف'' کے مختلف معنوں میں سے ایک معنی یہ بتاتے ہیں ''وہ اپنے بندوں کی راہنمائی میں نرمی (رفق) فرماتا ہے۔'' (لفظ لطف)

امام بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں نقل کرتے ہیں ''خدا کا نام لطیف اس لیے ہے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی اور آسانی چاہتا ہے اور ان کے لیے صلاح اور نیکی کے اسباب کا فیضان کرتا ہے، لطیف اس لیے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی فرماتا اور آسانی چاہتا ہے، اور ان کے لیے صلاح اور نیکی کے اسباب کا فیضان کرتا ہے لطیف اس لیے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی فرماتا ہے ان کے ساتھ اس طرح لطف کرتا ہے جس کا علم بھی ان کو نہیں ہوتا اور اس طرح ان کی مصلحتوں کا سامان فراہم کرتا ہے جس کا گمان بھی ان کو نہیں ہوتا۔ ابن الاعرابی کا قول ہے، لطیف وہ ہے جو تمہاری ضرورت کو تم تک ملائمت (رفق) سے پہنچا دیتا ہے۔ ص ۴۷ الہ آباد۔

امام غزالی کہتے ہیں۔ ''اس صفت کا مستحق وہی ہے جو نازک اور باریک مصلحتوں کو جانتا ہے پھر ان کو نرمی کے طریق سے سختی سے نہیں، اس تک پہنچاتا ہے جس کے حق میں وہ مفید ہیں، جب عمل میں نرمی اور ادراک میں لطافت ہو تو لطیف کے معنی پورے ہوتے ہیں اور اس کمال کا تصور خدا ہی کے لیے ہے (روح المعانی، تفسیر شوریٰ)

حکمت کو خدا ہی جانتا تھا' اور اسی کو اس کی خبر تھی۔

ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ اپنے رفق و تلطف کا اظہار اس طرح فرماتا ہے:

﴿اَللّٰهُ لَطِيْفٌ ۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ﴾ (شوریٰ:۱۹)

''اللہ اپنے بندوں پر لطف فرماتا ہے' جس کو چاہتا ہے روزی دیتا ہے اور وہی قوت والا' غالب ہے۔''

اس آیت کے اوپر قیامت کے تعلق سے مومنوں اور کافروں کا ذکر ہے' اور نیچے بھی ان دونوں قسموں کا تذکرہ ہے بیچ میں یہ آیت ہے' اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لطفِ الٰہی کافر و مومن دونوں کے ساتھ ہے کہ دونوں کو یکساں وہ رزق پہنچاتا ہے' (۱) اور اسی لیے قیامت کو راز رکھنا بھی اس کے الطافِ بے کراں کا ایک نتیجہ ہے۔

ملتِ حنیف کے پیشوا حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام اپنے کافر باپ کے حق میں دعائے مغفرت کے طالب ہوئے تو بارگاہِ الٰہی میں گو یہ دعا مستجاب نہ ہوئی (۲) مگر ابراہیمؑ خلیل کی نرم دلی اور دردمندی کی مدح فرمائی گئی' ارشاد ہوا:

﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ﴾ (توبہ:۱۱۴)

''بے شک ابراہیم نرم دل بردبار تھے۔''

اسی طرح جب وہ قومِ لوط کی گناہ گار قوم کی سفارش کے لیے کھڑے ہوئے تو یہ درخواست بھی گو قبول نہ ہوئی مگر حضرت ابراہیمؑ کی مدح و توصیف فرمائی گئی کہ

﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ﴾ (ھود:۷۵)

''بے شک ابراہیم بردبار' نرم دل' حق کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔''

اواہ کے معنی میں مفسروں کا اختلاف ہے' کوئی کہتا ہے کہ جو بہت دعائیں مانگتا ہے' دوسرا اس کے معنی نرم دل بتاتا ہے اور تیسرا دردمند کہتا ہے' لیکن ہوسکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ پر یہ تینوں باتیں پوری اترتی ہوں۔ وہ ہر شخص کی دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتے تھے' وہ دردمند تھے اور دردمندی کی راہ سے ایسا کرتے تھے' یا دل کے نرم تھے اس لیے جلد پسیج جاتے تھے' اور یہ اس لیے ایسا تھا کہ ملت حنیف کا داعی ہر ایک کو اپنے رب سے ملانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارونؑ فرعون جیسے سنگ دل اور ظالم بادشاہ کے دربار میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب حق کی تبلیغ کے لیے بھیجے جاتے ہیں تو ان کو تبلیغ کے یہ آداب سکھائے جاتے ہیں۔

﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى﴾ (طٰہٰ:۴۴)

''سو تم دونوں اس سے نرم بات کہنا شاید وہ نصیحت پائے یا خدا سے ڈرے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نرمی اور نرم خوئی تبلیغ کی کامیابی کی پہلی شرط ہے' اور اس لیے دین حنیف کے مبلغ

---

(۱) صحیح مسلم کتاب البر و الصلہ باب فضل الرفق۔

(۲) تفسیر روح المعانی میں مقاتل کا یہی قول ہے صاحب روح المعانی اور امام فخر رازی بھی عموم کو واضح جانتے ہیں۔

اعظم اور توحید کے داعیِ اکبر محمد رسول اللہ ﷺ کو رحمتِ الٰہی نے خاص طور سے اس کا حصہ وافر عنایت فرمایا تھا خود حضور ﷺ کو خطاب کر کے ارشاد ہوتا ہے۔

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (آل عمران:۱۵۹)

”تو اللہ کی رحمت کے سبب سے تم ان کے لیے نرم دل ہوئے اور اگر تم مزاج کے اکھڑ اور دل کے سخت ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس سے تتر بتر ہو گئے ہوتے۔“

اس لیے ایک پیغمبر کے لیے یہ وصف نہایت اہم ہے‘ تاکہ لوگوں کو اس کی تعلیم و دعوت کی طرف میلان ہو۔ اور وہ اس کے حلقۂ اطاعت سے باہر نہ ہونے پائیں اور اسی لیے رحمتِ عالم ﷺ کی ذاتِ پاک میں یہ وصف سب سے نمایاں طور پر ودیعت کیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو خاص اپنی رحمت کا نتیجہ قرار دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حلم و بردباری‘ عفو و درگزر‘ چشم پوشی اور خوش خلقی غرض ان تمام اخلاق کے عطر کا نام جن میں شانِ جمالی پائی جاتی ہے‘ یہی رفق و تلطف اور نرم دلی و نرم خوئی ہے جس طرح حسنِ فطرت زینت و آرائش سے دوبالا ہو جاتا ہے‘ اسی طرح رفق و نرمی کی خو سے انسان کا اخلاقی حسن دو چند ہو جاتا ہے آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کو یہ حقیقت ان لفظوں میں سمجھائی‘ فرمایا:

((اِنَّ الرِّفْقَ لَا يَكُوْنُ فِيْ شَيْءٍ اِلَّا زَانَهُ وَ لَا يُنْزَعُ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا شَانَهُ)) (۱)

”نرمی جس چیز میں ہو اس کو زینت دیتی ہے اور جس چیز سے الگ کر لی جاتی ہے اس کو بدنما بنا دیتی ہے۔“

”جس چیز“ کا لفظ کتنا عام ہے اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز میں نرمی کام کو بناتی اور سختی بگاڑتی ہے‘ الا یہ کہ شریعت اور قانون یا جماعت کی مصلحت سختی کا تقاضا کرتی ہو۔

حضرت عائشہؓ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ خدا نرم خو (رفیق) ہے اور نرم خوئی کو پسند کرتا ہے اور نرم خوئی پر جو کچھ دیتا ہے وہ سختی پر اس کے علاوہ کسی اور چیز پر نہیں دیتا‘ (۲) جریرؓ بن عبداللہ صحابی کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”جو نرمی سے محروم رہا وہ بھلائی سے محروم رہا“ (۳) اور فرمایا کہ تین خصلتیں جس چیز میں ہوں گی خدا اپنے سایہ کو اس پر پھیلائے گا اور اس کو جنت میں داخل کرے گا۔ یعنی کمزور کے ساتھ نرمی کرنا۔ باپ ماں پر مہربانی کرنا اور غلام پر احسان کرنا۔ (۴)

اس اخلاقی وصف کی تعلیم آپؐ نے دوسرے الفاظ میں یوں دی:

((اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِمَنْ يَحْرُمُ عَلَى النَّارِ وَ تَحْرُمُ عَلَيْهِ النَّارُ عَلٰى كُلِّ قَرِيْبٍ هَيِّنٍ

(۱)(۲)(۳) صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب فی فضل الرفق۔

(۴) ترمذی ابواب الزہد۔

سَهْلٍ))(۱)

''کیا میں تم لوگوں کو بتاؤں کہ کون شخص آگ پر حرام ہے اور کس پر آگ حرام ہے، ہر اس شخص پر جو لوگوں سے قریب ہو نرم اور آسان ہو۔''

ایک بار یہودیوں کی ایک جماعت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا کہ السام علیکم یعنی تم کو موت آئے حضرت عائشہؓ سمجھ گئیں، اور انہوں نے جواب میں کہا ''وعلیکم السام واللعنۃ'' یعنی تم کو موت آئے اور تم پر لعنت ہو، رسول اللہ ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ ''عائشہ ٹھہر جاؤ خدا تمام کاموں میں نرمی کو پسند کرتا ہے، بولیں یا رسول اللہ! انہوں نے جو کچھ کہا کیا آپؐ نے نہیں سنا فرمایا میں نے بھی تو کہہ دیا کہ وعلیکم یعنی تم پر۔(۲)

آنحضرت ﷺ کے جواب میں یہ خوبی ہے کہ بات وہی ہوئی مگر اس میں سختی کا نشان نہیں، اور پھر اس طرح سے ہے کہ مخاطب ذرا سوچے تو خود بخود اس کا دل شرمندہ ہو۔

شریعت کا قانون اور جماعت کی مصلحت جس سختی کا مطالبہ کرتی ہے اس کا موقع وہ ہے جب کوئی شخص حدود الٰہی میں سے کسی حد کو توڑ ڈالے، اور جماعت کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو، چنانچہ کفار اور منافقین جب سمجھانے سے نہ سمجھیں اور اپنی ضد پر اڑے رہیں، بلکہ مسلمانوں کو آزار پہنچانے کے درپے ہوں تو ان کے شر کو روکنے اور ان کی سازشوں کے قلع قمع کرنے کے لیے ان پر پوری سختی کی جاسکتی ہے، فرمایا:

﴿يٰاَيُّهَا النَّبِىُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾ (تحریم:۹)

''اے پیغمبر! اپنے نزدیک کے کافروں اور دغابازوں سے جہاد کرو اور ان پر سختی رکھو۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً﴾ (التوبۃ)

''اے مسلمانو! اپنے نزدیک کے کافروں سے لڑتے جاؤ اور چاہیے وہ تم میں کڑا پن پائیں۔''

اسی طرح شریعت کے گناہ گاروں کو جب سزا دی جائے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ اس کے اجرا میں نرمی نہ برتیں مسلمان بدکار مردوں اور بدکار عورتوں کی سزا کے متعلق فرمایا:(۳)

﴿وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ (نور:۲)

''اور اللہ کے حکم چلانے میں تم کو ان دونوں پر ترس نہ آئے اگر تم اللہ اور پچھلے دن پر یقین رکھتے ہو۔''

آنحضرت ﷺ کے مکارمِ اخلاق کا جو بیان حضرت عائشہ سے مروی ہے اس میں بھی نرمی اور سختی کے مواقع میں یہی امتیاز کی حد قائم کی گئی ہے ام المومنینؓ فرماتی ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ نے اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی

(۱) ایضاً:

(۲) بخاری کتاب الادب باب الرفق فی الامر کلہ۔

(۳) بخاری کتاب الادب باب قول النبی ﷺ یسروا ولا تعسروا۔

کسی سے بدلہ نہیں لیا' البتہ جب احکام الٰہی کے خلاف ورزی کی جاتی تو آپؐ اس کو سزا دیتے تھے[۱] امام بخاری نے ایک خاص باب میں اس قسم کی متعدد حدیثیں نقل کی ہیں، جن میں آپؐ نے مسلمانوں بلکہ ازواجِ مطہرات تک پر کسی کسی بات میں سختی برتی ہے۔[۲] حافظ ابن حجر اس باب کی شرح میں لکھتے ہیں۔

''گو امام بخاری اس باب میں یہ اشارہ کرتے ہیں کہ جس حدیث میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ تکلیفوں پر صبر کرتے تھے وہ آپؐ کے ذاتی حق سے متعلق ہے لیکن خدا کے حق میں آپ اس سختی سے کام لیتے تھے جس کا خدا نے حکم دیا تھا۔'' (فتح الباری جلد ۱۰ص ۴۲۹ مصر)

آنحضرت ﷺ صحابہؓ سے فرمایا کرتے تھے کہ ''آسانی کرو' سختی نہ کرو۔ شارحینِ حدیث نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ نوافل و مباحات میں سختی نہ برتی جائے اور شریعت نے جس حد تک گنجائش اور وسعت رکھی ہو اس میں تنگی نہ کی جائے' ایک صحابیؓ سے ایک دفعہ روزہ میں ایک شرعی غلطی ہوگئی' انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ مجھے حضور ﷺ کی خدمت میں لے چلو' ان سب نے معاملہ کی اہمیت کے ڈر سے ساتھ چلنے سے انکار کیا تو انہوں نے اکیلے ہی خدمتِ نبوی میں حاضر ہو کر حقیقتِ حال عرض کی۔ ارشاد ہوا کہ ایک غلام کی گردن آزاد کرو۔ وہ اپنی گردن پر ہاتھ رکھ کر بولے کہ ''یارسول اللہ ﷺ! اس گردن کے سوا میری کوئی ملکیت نہیں' فرمایا لگاتار دو مہینے روزے رکھو' گزارش کی کہ یارسول اللہ! روزہ ہی میں تو یہ حرکت ہوئی پھر روزہ رکھوں' فرمایا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ' عرض پرداز ہوئے کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپؐ کو حق دے کر بھیجا ہے کہ ہم نے بھوک میں رات گزاری ہے' فرمایا کہ صدقہ کے فلاں محصل کے پاس جاؤ اور اس سے اتنے چھوہارے لے لو اس سے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا کر جو بچ رہے وہ خود کھاؤ' وہ صحابی ہنسی خوشی اپنی قوم میں آئے اور اپنی روداد بیان کر کے بولے کہ ''میں نے تمہارے پاس تنگی اور بری رائے اور نبی ﷺ کے پاس کشادگی اور اچھی رائے پائی۔''[۳]

❀❀❀

---

(۱) باب مایجوز من الغضب والشدۃ لامر اللہ تعالیٰ۔

(۲) صحیح بخاری کتاب الادب باب یسروا ولاتعسروا۔

(۳) سنن ابی داؤد باب فی الظہار۔

تواضع وخاکساری

کبریائی اللہ تعالیٰ کی صفتِ خاص ہے جس میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ (جاثیہ:۳۷)

''اور اسی کو بڑائی ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور وہی زبردست ہے، حکمت والا۔''

اس لیے بندوں کی شان نہیں کہ وہ کبریائی کریں، ان کی بندگی کی شان اس میں ہے کہ وہ تواضع وخاکساری اختیار کریں، اور عاجزی وفروتنی برتیں۔

تواضع، خاکساری کے بہت سے مظہر ہیں۔ قرآن مجید نے ان میں سے نمایاں مظاہر کو لے کر بعض موقعوں پر ان کا حکم دیا ہے اور دوسرے موقعوں پر ان کو اپنے خاص بندوں کا وصف بتایا ہے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے کفار سے درگزر کا، پھر مومنوں کے ساتھ پُر محبت تواضع کا حکم دیا ہے۔

﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (حجر:۸۸)

''اور اپنا بازو مومنوں کے لیے جھکا دے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (شعراء:۲۱۵)

''اور اپنا بازو جھکا رکھ ان کے واسطے جو تیرے ساتھ ہوتے ہیں ایمان والے۔''

اولاد کو ماں باپ کے سامنے اسی پُر محبت عاجزی اور فروتنی کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔

﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ﴾ (بنی اسرائیل:۲۴)

''اور ماں باپ کے لیے عاجزی کا بازو مہر و محبت سے جھکا دے۔''

﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَ﴾ یعنی بازو جھکا دینا، تواضع وخاکساری سے استعارہ ہے، جناح پرندہ کے بازو کو کہتے ہیں پرندہ جب زمین پر اترنے لگتا ہے یا تھک کر بیٹھنا چاہتا ہے تو اپنے بازوؤں کو جھکا دیتا ہے اس سے یہ استعارہ کیا گیا ہے کہ انسان بھی خاکساری اور فروتنی سے اپنے بازوؤں کو نیچے کر لیتا ہے، اور تکبر اور ترفع کی بلندی کے بجائے تواضع کی پستی کی طرف اترتا ہے۔

﴿وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝﴾ (الفرقان:۶۳)

''اور رحمت والے (خدا کے خاص) بندے تو وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلیں، اور جب جاہل ان سے (جہالت کی) باتیں کرنے لگیں تو (ان کو) اسلام کریں (اور الگ ہو جائیں۔)

قرآن کی بلاغت یہ ہے کہ بندوں کو خاکساری کی تعلیم دینی تھی تو ان کو رحمت والے خدا کے بندے کہہ کر نصیحت فرمائی گئی کہ خدا جب رحمت اور مہر و کرم والا ہے تو اس کے بندوں میں خلقِ خدا کے ساتھ تواضع اور ملنساری ظاہر ہو۔

حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو یہ اخلاقی نصیحت کی:

﴿وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّکَ لِلنَّاسِ وَ لَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ○ وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِکَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِکَ اِنَّ اَنْکَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ○﴾ (لقمان:۱۸۔۱۹)

''اور لوگوں سے بے رخی نہ کر اور زمین پر اترا کر نہ چل (کیونکہ) اللہ کسی (اترانے والے) شیخی خورے کو پسند نہیں کرتا، اور اپنی رفتار میں میانہ روی (اختیار) کر اور (کسی سے بات کرے) تو ہولے سے بول (کیونکہ) بری سے بری آواز گدھوں کی آواز ہے۔''

اس آیت میں خاکساری اور تواضع کے مختلف مظاہر بتائے ہیں بات کرنے میں لوگوں سے بے رخی نہ کی جائے زمین پر اکڑ کر نہ چلا جائے، چال ڈھال میں غرور کا شائبہ نہ ہو اور نہ آواز میں غرور کے مارے سختی اور کرختگی ہو۔ (۱)

لیکن یہ خیال میں رہے کہ تواضع و خاکساری اور دنائت و پستی میں بڑا فرق ہے تواضع و خاکساری کا منشا یہ ہے کہ انسان میں کبر و غرور پیدا نہ ہو اور ہر شخص دوسرے کی عزت کرے اور دنائت و پستی کا مطلب یہ ہے کہ بعض ذلیل اغراض کے لیے انسان اپنی خود داری کو کھو دے، چنانچہ ایسے موقع پر جہاں خاکسارانہ روش سے انسان کا ضعف ظاہر ہو وہاں اسلام نے عارضی اور نمائشی طور پر خود دارانہ کبر و غرور کا حکم دیا ہے، صحابہ جب عمرہ کے لیے آئے تو چونکہ مدینہ کے وبائی بخار نے ان کو کمزور کر رکھا تھا، اس لیے کفار نے طنز کیا کہ محمد اور ان کے اصحابؓ ضعف کی وجہ سے خانہ کعبہ کا طواف نہیں کر سکتے اس پر آپؐ نے صحابہ کو حکم دیا کہ طواف کے تین چکر اکڑ کر کریں، تا کہ مشرکوں پر ان کی طاقت کا اظہار ہو۔ (۲)

قوت کے اظہار کا اصلی موقع جہاد میں پیش آتا ہے اور اس موقع پر اسلام نے خاکساری کے بجائے کبر و غرور کو پسند کیا ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ بعض غرور کو خدا ناپسند اور بعض کو پسند کرتا ہے، جنگ و صدقہ کے موقع پر

(۱) المثل السائر باب نوع و تفسیر کبیر آیت جناح الذل ج ۵ ص ۴۷ دار الطباعۃ العامرۃ۔

(۲) مسلم کتاب الحج باب استحباب الرمل فی الطواف و صحیح بخاری عمرۃ النبی ﷺ۔

اترانا خدا کو پسند ہے اور ظلم وفخر پر اترانا ناپسند۔ (۱)

بہر حال اسلام میں خاکساری ایک شریفانہ خلق ہے اور ضعف ذلت بیچارگی اور بے سروسامانی سے مختلف ہے ضعف وذلت سے انسان پست رتبہ ہو جاتا ہے لیکن خاکساری اس کو بلند رتبہ بنا دیتی ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جو شخص خدا کے لیے خاکساری کرتا ہے خدا اس کو بلند کر دیتا ہے۔ (۲) ایک اور حدیث میں فرمایا کہ ''جو شخص عمدہ کپڑے پہننے کی استطاعت رکھتا ہے لیکن وہ خاکساری سے اس کو نہیں پہنتا تو خدا اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلائے گا اور اس کو اختیار دے گا کہ ایمان کا جو حلہ پسند کرے اس کو پہن لے۔'' (۳)

غرض یہ ہے کہ تواضع کا حکم صرف اس لیے ہے کہ کوئی شخص اپنی قوت اور دولت کا بے جا استعمال نہ کرنے پائے جس سے غریبوں اور کم استطاعت لوگوں کا دل دکھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ وحی بھیجی ہے کہ خاکساری اختیار کرو تاکہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے اور کوئی کسی کے مقابل میں فخر نہ کرے۔ (۴) اس سے معلوم ہوا کہ تواضع کا مقصد معاشرتی زندگی میں خوش گوار لطافت پیدا کرنا ہے اور یہی لطافت ہے جو ایک خاکسار شخص کی چال ڈھال اور بات چیت تک سے ظاہر ہونی چاہیے۔

خوش کلامی

خوش کلامی سے مقصد یہ ہے کہ باہم ایک انسان دوسرے انسان سے باتیں کرنے میں ایک دوسرے کے ادب واحترام اور لطف ومحبت کا پہلو ملحوظ رکھے۔ تاکہ آپس میں خوش گوار تعلقات پیدا ہوں اور باہم مروت اور محبت بڑھے۔ سلام کرنا شکریہ ادا کرنا حال پوچھنا ایک دوسرے کو نیک دعائیں دینا اچھی باتیں کرنا اچھی باتیں سمجھانا اسی ایک صفت کے مختلف جزئیات ہیں خدا تعالیٰ نے توراۃ میں نبی اسرائیل کو لوگوں کے ساتھ خوش کلامی کا جو حکم دیا تھا اس کو قرآن پاک میں بھی دہرایا ہے۔

﴿وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ (بقرہ:۸۳)

''اور کہیو لوگوں سے اچھی بات۔''

اس اچھی بات کہنے میں لوگوں کے فائدہ اور کام کی باتوں کا کہنا نصیحت کرنا اچھی باتوں کی تعلیم اور تلقین کرنا بھی داخل ہے ایک اور آیت میں یہی حکم دوسرے لفظوں میں اس طرح دیا گیا ہے کہ یہ وصف اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی پہچان بن جاتا ہے ارشاد ہے:

---

(۱) ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الخیلاء فی الحرب۔

(۲) ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی التواضع۔

(۳) ترمذی ابواب الزہد۔

(۴) ابوداؤد کتاب الادب باب فی المواخاۃ۔

﴿وَ قُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ اِنَّ الشَّیْطٰنَ کَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا﴾ (بنی اسرائیل:۵۳)

''اور (اے پیغمبر!) میرے بندوں سے کہہ دے کہ وہ بات کہیں جو سب سے اچھی ہو' بے شک شیطان جھگڑ پواتا ہے آپس میں۔ بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔''

آیت کے پچھلے حصہ میں دعویٰ کی دلیل بھی دے دی گئی ہے کہ خوش گوئی' اور خوش کلامی آپس میں میل ملاپ پیدا کرتی ہے' اور بدگوئی و بدکلامی پھوٹ پیدا کرتی ہے' جو شیطان کا کام ہے وہ اس کے ذریعہ سے لوگوں میں غصہ' نفرت' حسد اور نفاق کے بیج بوتا ہے' اس لیے اللہ کے بندوں کو چاہیے کہ نیک بات بولیں' نیک بات کہیں' اچھے لہجہ میں کہیں اور نرمی سے کہیں کہ آپس میں میل ملاپ اور مہر ومحبت پیدا ہو۔ اسی لیے تنابز بالالقاب یعنی ایک دوسرے کو برے لفظوں اور نفرت اور تحقیر کے خطابوں سے پکارنے کی ممانعت آئی ہے' کسی کو یا کافر یا منافق اور تحقیر و کراہت کے دوسرے القاب سے مخاطب کرنا گویا اس میں اس اچھی بات کے خلاف جو آپ اس کو سمجھانا چاہتے ہیں پہلے ہی سے نفرت اور ضد کا جذبہ پیدا کر دینا ہے' فرمایا:

﴿وَ لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ﴾ (حجرات:۱۱)

''اور نہ تم آپس میں ایک دوسرے کو طعن دو اور نہ چڑھ کا نام لے کر پکارو' ایمان کے بعد گناہ گاری برا نام ہے۔''

اسی لیے برائیوں کے تذکروں اور بدگوئیوں کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے' ارشاد ہے۔

﴿لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ﴾ (نساء:۱۴۸)

''اللہ کو بری بات کا پکارنا خوش نہیں آتا' مگر جس پر ظلم ہوا ہو (اس کو حق ہے کہ ظالم کے ظلموں کو بیان کرے)۔''

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''مسلمان نہ طعنہ دیتا ہے' نہ لعنت بھیجتا ہے۔ نہ بدزبانی اور فحش کلامی کرتا ہے۔''[1] اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی شان اس قسم کی غیر مہذبانہ باتوں سے بہت اونچی ہونی چاہیے' اس کی زبان سے حق وصداقت' بہبودی وخیر خواہی اور نیکی وبھلائی کے سوا کوئی اور بات نہ نکلے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ اور روزِ جزا پر یقین رکھنے کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ کلمۂ خیر کے سوا کچھ اور زبان سے نہ نکلے' کیونکہ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھنا یہ بتاتا ہے کہ جو کرے گا وہ بھرے گا' اگر تمہیں بھی کوئی برا کہے تو ہو سکے تو چپ رہو کہ اس کی جزا آج نہیں تو کل اس کو مل کر رہے گی۔'' ایک دفعہ آپؐ نے بار بار دوزخ کا ذکر فرمایا' اور روئے انور پر اس کی تکلیفوں کے تصور سے اثر ظاہر ہوا' پھر ارشاد فرمایا' دوزخ سے بچو۔ اگرچہ چھوہارے کے ایک ٹکڑے کی خیرات

(۱) صحیح بخاری باب طیب الکلام۔

سے ہو اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کوئی اچھی بات سے۔ (۱)

ایک دفعہ آپؐ نے جنت کا ذکر فرمایا اور اس کی خوبی اور وسعت کو بیان کیا۔ ایک بدوی صحابی مجلس میں حاضر تھے۔ بے تابانہ بولے کہ یا رسول اللہ! یہ جنت کس کو ملے گی؟ فرمایا جس نے خوش کلامی کی، بھوکوں کو کھلایا، اکثر روزے رکھے اور اس وقت نماز پڑھے جب دنیا سوتی ہو۔ (۲)

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا اچھی بات صدقہ ہے۔ (۳) یعنی جس طرح صدقہ دے کر کسی غریب کی حاجت روائی اور دل جوئی کی جاتی ہے اسی طرح زبان کی مٹھاس سے اس کے زخموں پر پھاہا رکھا جا سکتا ہے اور سچی سعی و سفارش سے اس کو مدد پہنچائی جا سکتی ہے۔ (۴)

ایک صحابی نے پوچھا، کہ "یا رسول اللہ نجات کیونکر ملے۔" "فرمایا اپنی زبان پر قابو رکھو، اور تمہارے گھر میں تمہاری گنجائش ہو، اور اپنے گناہوں پر رویا کرو۔" (۵) ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ آپؐ کو مجھ پر سب سے زیادہ کس چیز کا ڈر ہے آنحضرت ﷺ نے اپنی زبان مبارک کو پکڑ کر فرمایا، اس کا ڈر ہے۔ (۶)

ایثار

یہ درحقیقت فیاضی کا سب سے بڑا اور سب سے آخری درجہ ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ذاتی ضرورت پر مقدم رکھا جائے خود بھوکا رہے اور دوسروں کو کھلائے، خود تکلیف اٹھائے، اور دوسروں کو آرام پہنچائے۔ (۷)

صحابۂ کرامؓ میں انصار کا سب سے بڑا اخلاقی وصف یہ تھا کہ مکہ کے مہاجر جب بے خانماں ہو کر اور اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ کر مدینہ آئے تو انصار نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کو اپنے گھر دیئے، باغ دیئے، کھیت دیئے، اپنی محنتوں میں ان کو شریک کیا۔ (۸) اور خود ہر طرح کی تکلیفیں اٹھا کر ان کو آرام پہنچایا۔ پھر جب بنی نضیر کی زمین مسلمانوں کے ہاتھ آئی اور آنحضرت ﷺ نے دو انصاریوں کے سوا باقی ساری زمین مہاجروں کو دے دی تو

---

(۱) صحیح مسلم کتاب الایمان۔

(۲) ترمذی کتاب البر والصلہ باب ماجاء فی اللغتہ۔

(۳) ترمذی ماجاء فی قول المعروف۔

(۴) صحیح بخاری کتاب الصلح۔

(۵) ترمذی باب حفظ اللسان۔

(۶) ترمذی ایضاً۔

(۷) صحیح بخاری اول مناقب انصار۔

(۸) تفسیر آیت ذیل ابن جریر طبری۔

انصار نے ہنسی خوشی اس فیصلہ کو تسلیم کر لیا، اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی اور ان کی مدح وستائش کی۔ (۱)

﴿وَ الَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (حشر:۹)

''اور ان کے واسطے جنہوں نے ان (مہاجروں) کی آمد سے پہلے اس مقام (مدینہ) میں اور ایمان میں جگہ پکڑی اور محبت رکھتے ہیں ان سے جو اپنا گھر چھوڑ کر ان کے پاس چلا آیا اور ان (مہاجروں) کو دیے جانے سے دل میں کوئی مطلب نہیں رکھتے اور اپنے اوپر تنگی ہی کیوں نہ ہو (ان مہاجر بھائیوں کو) اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جائے تو ایسے ہی لوگ فلاح پائیں گے۔''

بحرین جب فتح ہوا تو آنحضرت ﷺ نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ میں اس کو انصار کی جاگیروں میں تقسیم کر دینا چاہتا ہوں۔ ان ایثار کے پیکروں نے عرض کی جب تک ہمارے مہاجر بھائیوں کو بھی اتنا ہی نہ ملے، ہم کو یہ منظور نہیں، فرمایا اگر یہ منظور نہیں تو صبر کرو، میرے بعد تم کو یہ تکلیف پہنچے گی کہ لوگ لے لیں گے، اور تم کو نہیں پوچھیں گے۔ (۲)

ایک دفعہ ایک مسلمان خاتون نے اپنے ہاتھ سے ایک چادر بن کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کی۔ آپؐ نے ضرورت مند ہو کر اس کے اس تحفہ کو قبول کر لیا۔ اسی وقت ایک غریب مسلمان نے عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! یہ مجھے عنایت ہو۔ آپؐ نے اسی وقت اتار کر ان کے حوالہ کر دی۔ صحابہؓ نے ان کو ملامت کی تم جانتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کو اس کی حاجت تھی، اور آپؐ کسی کا سوال رد نہیں فرماتے تم نے کیوں مانگ لی۔ بولے ہاں میں نے تو برکت کے لیے لی ہے کہ یہی چادر میرا کفن بنے۔ (۳)

ایک دفعہ ایک بھوکا آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا کاشانۂ نبوی میں اس وقت پانی کے سوا کچھ نہ تھا، اس لیے آپؐ نے فرمایا جو شخص آج کی رات اس کو اپنا مہمان بنائے گا خدائے تعالیٰ اس پر رحم فرمائے گا۔ یہ سعادت ایک انصاری کو حاصل ہوئی، اور وہ اس کو اپنے گھر لے گئے اور بیوی سے پوچھا کہ گھر میں کچھ ہے؟ بولیں صرف بچوں کا کھانا ہے، بولے بچوں کو سلا دو اور چراغ کو بجھا دو ہم دونوں رات بھر بھوکے رہیں گے البتہ مہمان پر ظاہر کریں گے کہ کھا رہے ہیں چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، صبح کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو

(۱) صحیح بخاری اول باب مناقب انصار۔

(۲) صحیح بخاری باب حسن الخلق وباب من استعد الکفن۔

(۳) صحیح بخاری باب حسن الخلق وباب من استعد الکفن۔

آپ نے فرمایا ''خدا تعالیٰ تمہارے اس حسن سلوک سے بہت خوش ہوا۔'' (۱)

بعض روایتوں میں ہے کہ اوپر کی آیت میں انصار کے جس ایثار کی تعریف کی گئی ہے اس کا اشارہ اسی واقعہ کی طرف ہے۔ (۲) لیکن قرآن پاک کا سیاق وسباق عموم کو چاہتا ہے جس میں یہ واقعہ اور اسی قسم کے دوسرے واقعے بھی شامل ہوں گے۔

اعتدال اور میانہ روی

یہ اسلامی اخلاق کا وہ باب ہے جس میں وہ منفرد ہے' اسلام کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس کا راستہ اکثر مسئلوں میں افراط وتفریط کے بیچ سے نکلا ہے' قرآن پاک نے مسلمانوں کو ﴿اُمَّةً وَّسَطًا﴾ (بیچ کی امت) کا خطاب جن وجوہ سے دیا ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ان کا مذہب افراط وتفریط کے درمیان ہے۔ (۳) اس لیے اس نے اکثر معاملوں میں اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دی ہے' انتہا یہ ہے کہ عبادات میں بھی اس اصول کو وہ نہیں بھولا ہے۔

دعا یا نماز میں ہماری آواز کتنی ہو' ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِکَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِکَ سَبِيْلًا﴾ (بنی اسرائیل:۱۱۰)

''اور نہ پکار اپنی دعا (یا نماز) میں اور نہ چپکے پڑھ اور ڈھونڈ لے اس کے بیچ میں راہ۔''

یعنی نہ چلا کر دعا کی جائے یا نماز پڑھی جائے کہ نمائش ہو جائے' یا مخالف اس کو سن کر برا بھلا کہے اور نہ بالکل چپکے چپکے کہ ساتھ والے بھی نہ سن سکیں' بلکہ دونوں کے بیچ کی راہ اختیار کی جائے۔

ہماری چال ڈھال کیسی ہو' اس کی نسبت حضرت لقمانؑ کے نصائح میں ہے:

﴿وَاقْصِدْ فِیْ مَشْيِکَ﴾ (لقمان:۱۹)

''اور چل بیچ کی چال۔''

یعنی اتنی تیز نہ ہو کہ چال میں متانت اور وقار نہ باقی رہے' اور نہ اتنی دھیرے ہو کہ ریاکار زاہدوں کی نمائشی چال بن جائے۔ (۴)

سخاوت اور فیاضی سے بہتر کوئی چیز نہیں سارے مذہبوں نے اس کی تاکید پر تاکید کی ہے اور جو جس قدر زیادہ لٹا سکے اسی قدر وہ تعریف کے قابل سمجھا گیا ہے لیکن اسلام نے اس راہ میں بھی بے اعتدالی سے پرہیز کیا ہے اور اس کو اچھا نہیں سمجھا ہے کہ دوسروں کو دے کر تم خود اتنے محتاج بن جاؤ کہ بھیک مانگنے کی نوبت آ جائے اور

(۱) صحیح مسلم الاشربہ باب اکرام الضیف وفضل ایثارہ وصحیح بخاری تفسیر سورۂ حشر۔

(۲) ایضاً۔

(۳) تفسیر کبیر رازی آیت مذکور (بقرہ)

(۴) ابن جریر طبری (روح المعانی)

محتاجوں میں ایک نئے محتاج کا اور اضافہ ہو جائے فرمایا:

﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا﴾ (بنی اسرائیل:۲۹)

''اور نہ تو اپنا ہاتھ اپنی گردن میں باندھ لے اور نہ اس کو بالکل کھول دے کہ تو بیٹھ جائے ملامت کا نشانہ بن کر تھکا ہارا۔''

مسلمانوں کی اخلاقی خصوصیتوں کے سلسلہ میں کہا:

﴿وَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَ لَمْ يَقْتُرُوْا وَ كَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا﴾ (فرقان:۶۷)

''اور جو خرچ کریں تو فضول خرچی نہ کریں اور نہ بہت تنگی کریں اور ہو اس کے درمیان اعتدال سے۔''

یعنی نہ اسراف ہو نہ بخل ہو درمیان کی چال ہو۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اكلفوا من الاعمال ما تطيقون))

''اتنا ہی عمل کا التزام کرو جتنا تم کرسکو۔''

''عمل'' کا لفظ گو یہاں عام ہے مگر شارحین کے نزدیک اس سے مراد نماز و روزہ وغیرہ عبادتیں ہیں[1] مقصود یہ ہے کہ فرائض کے بعد نوافل کا اتنا ہی بوجھ اٹھاؤ جس کو تم آسانی سے اٹھا سکو اور آخر دم تک نباہ سکو دوسری اور حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم صرف عبادات تک محدود نہیں بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ تک وسیع ہے مسند بزاز میں حضرت حذیفہ صحابیؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:[2]

((مَا اَحْسَنَ الْقَصْدُ فِي الْغِنٰى مَا اَحْسَنَ الْقَصْدُ فِي الْفَقْرِ مَا اَحْسَنَ الْقَصْدُ فِي الْعِبَادَةِ))

''دولت مندی میں درمیانگی کتنی اچھی ہے محتاجی میں درمیانگی کتنی اچھی ہے عبادت میں درمیانگی کتنی اچھی ہے۔''

غرض یہ ہے کہ نہ اتنا دولت مند ہو کہ انسان قارونِ وقت بن کر حق سے غافل ہو جائے نہ اتنا محتاج ہو کہ پریشان خاطر ہو کر حق سے محروم رہ جائے۔ بعض لوگ دولت مند ہو کر اس قدر شان و شکوہ عز و جاہ اور عیش و تنعم کی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں کہ اعتدال سے خارج ہو جاتے ہیں اور بعض لوگ محتاج ہو کر اس قدر دنی اور متبذل ہو جاتے ہیں کہ صبر اور خودداری اور تمام شریفانہ اوصاف کھو دیتے ہیں اور یہ بھی بے اعتدالی ہے ان دونوں حالتوں

(۱) فتح الباری جلد ۱۱ ص ۲۵۶۔

(۲) بروایت کنز العمال جلد ثانی ص ۷ حیدر آباد دکن۔

میں اسلام کی معتدل تعلیم یہ ہے کہ دولت مندی کی حالت میں نہ حد سے زیادہ بلند ہونا چاہیے نہ محتاجی کی حالت میں اپنی حیثیت سے گر جانا چاہیے۔

عبادت سے بڑھ کر اسلام میں کوئی نیکی کا کام نہیں۔ اسلام نے اس میں بھی اعتدال کو ملحوظ رکھا ہے، نہ اتنی زیادہ ہو کہ آدمی دوسرے دھندوں کے لائق نہ رہے اور نہ اتنی کم ہو کہ حق سے غفلت ہو جائے۔ حضرت عثمانؓ بن مظعون کا واقعہ سیرت میں کئی دفعہ گزر چکا ہے کہ انہوں نے جب راتیں نمازوں اور دن روزوں میں بسر کرنا شروع کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منع کیا اور اعتدال کی تاکید کی اور فرمایا کہ تمہارے ذمہ اور بھی حق ہیں۔

❀❀❀

خودداری یا عزت نفس

یہ وہ اخلاقی وصف ہے جس سے انسان اپنی عزت، اپنی شان، اپنے مرتبہ اور اپنی حیثیت کی حفاظت کرتا ہے زندگی میں اس کے موقعے کثرت سے پیش آتے ہیں، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، ملنے جلنے، کھانے پینے اور اوڑھنے پہننے غرض معاشرتی زندگی کے تمام حالات میں انسان کو اپنی حیثیت اور عزت کے محفوظ رکھنے کے لیے اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس میں یہ وصف نہ ہوگا، اس میں نہ نظر کی بلندی ہوگی، نہ خیال کی رفعت، نہ اخلاق کی اونچائی، نہ لوگوں کی نگاہوں میں اس کی عزت ہوگی، نہ اس کی باتوں کا لحاظ کیا جائے گا، اور نہ اس کی طرف لوگ متوجہ ہوں گے، اور نہ اس کو کسی مجلس میں وقار حاصل ہوگا۔

یہ عزت و وقار سب سے پہلے اس بلند و برتر ذاتِ الٰہی میں ہے جو ساری عزتوں کا مرکز ہے چنانچہ قرآن پاک میں بہتر (۷۲) موقعوں پر اللہ تعالیٰ کا نام ''عزیز'' لیا گیا ہے عزیز کے معنی ہیں عزت والا [1] اور غالب، کہیں کہیں ﴿قَوِیٌّ﴾ کے ساتھ (قوی قوت والا) یا مقتدر (اقتدار والا) بھی کہا گیا ہے۔

اس لیے اصلی عزت اسی کی ہے اور وہی سچی عزت ہے جو اس کے وسیلہ سے حاصل ہو اسلام جب کمزور تھا منافق لوگ ادھر مسلمانوں کی دوستی کا دم بھرتے تھے اور ادھر کافروں کی ظاہری شان و شوکت اور جاہ و عزت کے سبب سے ان کی دوستی کے بھی طلب گار تھے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے خیال کے دھوکے کو اس حقیقت کی روشنی میں کھول دیا۔

﴿اَیَبْتَغُوْنَ عِنْدَھُمُ الْعِزَّۃَ فَاِنَّ الْعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا﴾ (نساء:۱۳۹)

''کیا یہ ان کے پاس عزت چاہتے ہیں تو قطعی بات تو یہ ہے کہ عزت ساری خدا کے واسطے ہے۔''

فرمایا اگر عزت کی تلاش ہے تو وہ خدا کے پاس ہے۔

﴿مَنْ کَانَ یُرِیْدُ الْعِزَّۃَ فَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ جَمِیْعًا﴾ (فاطر:۱۰)

---

(۱) ﴿عِزَّۃٌ﴾ کا لفظ قرآن میں شدت، غلبہ، عز و شرف اور نخوت (حمیت) کئی معنوں میں آیا ہے اس لیے ہر جگہ اس کے وہ معنی لیے جائیں گے جو سیاق و سباق کے مناسب ہو اس کا اصل مفہوم جو اس کے بعد سب معنوں میں مشترک ہے، یہ ہے۔ کسی کا ایسی حالت و منزلت میں ہونا کہ اس کو کوئی دبا نہ سکے۔ (دیکھو لسان العرب و مفردات راغب اصفہانی و ابن جریر طبری آیات عزت و سورہ بقرہ و نساء و صٓ و منافقون۔

’’جو عزت چاہے تو عزت تو ساری اللہ کی ہے۔‘‘

﴿تعز من تشاء و تذل من تشاء﴾ (آل عمران:۲۶)

’’(اے خدا!) تو جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے۔‘‘

ایک دفعہ ایک غزوہ میں منافقوں کے سردار نے یہ کہا کہ مدینہ لوٹ کر مدینہ کے معزز ان ذلیل لوگوں یعنی مسلمانوں کو یا (نعوذ باللہ) محمد (رسول اللہ ﷺ) کو نکال دیں گے، اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا:

﴿و للہ العزۃ و لرسولہ و للمؤمنین و لکن المنفقین لا یعلمون﴾ (منافقون:۸)

’’اور عزت تو اللہ کے لیے ہے اور اس کے رسول کے لیے اور ایمان والوں کے لیے لیکن منافق نہیں جانتے۔‘‘

اس آیت پاک نے مسلمانوں کو ایمان کی وہ عزت بخشی ہے جو کبھی چھینی نہ جائے گی اس لیے ہر مسلمان کا سر ہر باطل کے سامنے اونچا رہنا چاہیے، اور اس کو اپنی دینی خودداری کو ہر وقت محسوس کرنا چاہیے، اور اسی لیے اس کو بہترین اخلاق کا نمونہ بن کر دنیا کے سامنے آنا چاہیے۔ تعلیم محمدی کے اثر سے صحابہؓ کے دل اس صحیح خودداری کے احساس سے ہمیشہ معمور رہتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عمرؓ نے جب کفار کے ساتھ صلح کے شرائط پر جن کو آنحضرت ﷺ نے منظور فرمایا تھا، اعتراض کرنے کی جرأت کی تو یہی جذبہ ان کے اندر کام کر رہا تھا۔ حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ کیا ہم حق پر اور یہ کافر باطل پر نہیں ہیں، ارشاد ہوا، بے شک ایسا ہی ہے عرض کی ’’تو پھر ہم یہ مذہبی ذلت کیوں برداشت کریں۔‘‘(۱) ارشاد ہوا میں خدا کا رسول ہوں۔ اور اس کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا حضرت عمرؓ کی محدود نظر جہاں تک کام کر رہی تھی، رسول اللہ ﷺ کی نظر اس کے بہت آگے تھی، اور واقعہ نے فیصلہ کیا کہ خدا کا حکم بڑی مصلحت پر مبنی تھا۔

غزوۂ خندق میں آنحضرت ﷺ نے انصار کے سر سے جنگ کو ٹالنے کے لیے قبیلۂ غطفان کو اس شرط پر واپس کرنا چاہا کہ ان کو مدینہ کی پیداوار (کھجور) کا تہائی حصہ ہر سال دیا جایا کرے گا، لیکن جب انصارؓ کے سرداروں کو بلا کر آپؐ نے مشورہ کیا تو انہوں نے عرض کی۔

’’یا رسول اللہ! جب ہم بتوں کو پوجا کرتے تھے اور خدا سے بے خبر تھے، تب تو ان کو ہم سے لینے کی ہمت نہیں ہوئی اور اب جب کہ خدا نے ہم کو اسلام کی عزت بخشی ہے اور اس کے اور حضور کے بدولت ہم عزت پا چکے ہیں، ہم ان کو یوں اپنا مال دینا منظور کریں گے! خدا کی قسم ہمیں اس معاہدہ کی ضرورت نہیں۔‘‘(۲)

صحابۂ کرامؓ جب خلافت کے زمانہ میں قیصر و کسریٰ کے مقابلہ میں صف آرا تھے، ان کی اسلامی خودداری کا یہ عالم تھا کہ معمولی سے معمولی مسلمان قیصر و کسریٰ کے درباروں میں بے دھڑک چلا جاتا تھا اور دلیری و آزادی سے

(۱) صحیح بخاری باب الشروط فی الجہاد۔

(۲) سیرۃ ابن ہشام و تاریخ طبری ذکر واقعۂ احزاب۔

سوال و جواب کرتا تھا مسلمان جب تک مسلمان رہے یہی خیال ان کی ہر قسم کی حوصلہ مندیوں اور اولوالعزمیوں کا باعث تھا' اور ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد آج بھی ہر مسلمان بحیثیتِ مسلمان کے اپنی مذہبی عزت اور خودداری کا احساس رکھتا ہے اور یقین رکھتا ہے بحیثیت مسلمان کے اس کا پایہ بہت بلند ہے اور ہر وقت اس کے کان میں یہ آواز رہتی ہے۔

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ (آل عمران:۱۱۰)

''تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی سربراہی) کے لیے ظہور میں لائی گئی۔''

ایک شخص نے حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے عرض کی کہ کہتے ہیں کہ آپ میں غرور ہے' فرمایا غرور نہیں' خودداری (عزت) ہے۔ یہ (اسلام) وہ عزت ہے جس کے ساتھ ذلت نہیں اور وہ دولت ہے جس کے ساتھ مفلسی نہیں' پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ (المنافقون:۸) اور عزت اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور مومنین کے لیے ہے۔

ایک مسلمان صالحہ بی بی کے کپڑے پرانے تھے تو بولیں کیا میں مسلمان نہیں' یہ وہ عزت ہے جس کے ہوتے ذلت نہیں' اور وہ دولت ہے جس کے ساتھ افلاس نہیں۔

شیخ ابو حفص سہروردی کہتے ہیں کہ ''خودداری (عزت) غرور سے الگ چیز ہے کیونکہ خودداری اپنی ذات کی حیثیت کو جاننے اور اس کی عزت کرنے کا نام ہے کہ وہ فانی باتوں کی پستی میں نہ پڑ جائے' اور غرور اپنی ذات کی اصلی حیثیت کو فراموش کر جانے اور اس کو اس کی جگہ سے اوپر لے جانے کو کہتے ہیں۔ (۱)

یہ خودداری عین شرافت ہے' جس میں یہ خودداری نہیں' لوگوں کی آنکھوں میں اس کا وقار نہیں اس وقار اور خودداری کے لیے اگر ہاتھ میں قدرت نہ ہو' یا مصلحت نہ ہو تو بہت سی باتوں سے اعراض اور درگزر کرنا پڑتا ہے قرآن میں سچے مسلمانوں کے وصف کے سلسلہ میں ہے۔

﴿وَ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا﴾ (فرقان:۷۲)

''اور جب وہ نکلیں بیہودہ باتوں کی طرف سے تو گزر جائیں شریفانہ۔''

یعنی اس شریفانہ انداز' رکھ رکھاؤ اور خودداری کی شان سے گزر جائیں کہ نہ وہ آپ ادھر متوجہ ہوں اور نہ ان شریروں کو انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی ہمت پڑے۔

اس اخلاقی خودداری' اور شریفانہ رکھ رکھاؤ کی حفاظت کی خاطر قدم قدم پر اپنی ایک ایک بات پر نظر رکھنی پڑتی ہے چال ڈھال' بول چال' لباس ہر چیز سے شرافت کا اظہار ہو لیکن اس احتیاط کے ساتھ ہو کہ اوچھاپن یا تنگ ظرفی یا غرور و نمائش کی بو تک نہ آئے' یعنی اس میں اپنی بڑائی اور دوسروں کی تحقیر کا جز شامل نہ ہو۔ یہی چیز ہے جس

(۱) یہ اقوال امام رازی اور صاحب روح المعانی نے سورۂ منافقون کی آیت کی تفسیر میں لکھے ہیں۔

(۲) ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی الکبر۔

سے خودداری، غرور اور نمائش میں فرق و امتیاز کیا جا سکتا ہے، چنانچہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس شخص کے دل میں ذرہ بھر بھی غرور ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ اس پر ایک شخص نے کہا کہ مجھے اچھا کپڑا اور اچھا جوتا بہت پسند ہے مطلب یہ کہ یہ تو غرور میں داخل نہیں۔ ارشاد ہوا کہ خدا تو خود ہی جمال کو پسند کرتا ہے۔ غرور یہ ہے کہ حق کا انکار کیا جائے اور لوگوں کی تحقیر کی جائے۔

اسلام میں صاف ستھرے رہنے کا جو حکم ہے طہارت اور پاکیزگی کے علاوہ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمان دوسروں کی نظر سے گرنے نہ پائے۔ کیونکہ گندے آدمی سے ہر ایک کو نفرت ہوتی ہے ایک بار رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ کپڑے میلے تھے تو فرمایا ''کیا کپڑے دھونے کے لیے اس کو پانی میسر نہ تھا ایک شخص نہایت کم حیثیت کپڑے پہن کر آیا، فرمایا تمہارے پاس کچھ مال ہے؟ اس نے کہا اونٹ، بکری گھوڑے تمام سب کچھ ہیں۔ ارشاد ہوا کہ ''جب خدا نے تم کو مال دیا ہے تو خدا کے فضل اور احسان کا اثر تمہارے جسم سے بھی ظاہر ہونا چاہیے۔''(۱)

خودداری کا سب سے بڑا مظہر وقار یعنی سنجیدگی اور متانت ہے۔ اسی لیے اسلام نے ہر حالت میں وقار کے قائم رکھنے کی ہدایت کی ہے، نماز سے زیادہ اور کون سی عبادت ضروری ہو سکتی ہے لیکن اس کے متعلق بھی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

اِذَا سمعتم الاقامۃ فامشوا الی الصلوۃ و علیکم بالسکینۃ و الوقار و لا تسرعوا (۲)

''جب تم اقامت سنو تو نماز کے لیے سکون اور وقار کے ساتھ چلو، جلدی نہ کرو۔''

لوگوں کا یہ حال ہے کہ جب تکبیر سنتے یا رکوع میں جاتے ہوئے امام کو دیکھتے ہیں تو بے تحاشا بھاگتے ہیں کہ رکعت نہ چلی جائے، مگر یہ چیز متانت کے خلاف ہے، اور اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا آہستہ چلنا نگاہ کا جھکائے رکھنا، آواز کا پست کرنا اور ادھر ادھر نہ دیکھنا اس وقار میں داخل ہے۔

وقار ایک نہایت جامع لفظ ہے اور اس میں بہت سی چیزیں شامل ہیں۔ ابوداؤد نے کتاب الادب باب الوقار میں یہ حدیث نقل کی ہے۔

((اَلْهَدْیَ الصَّالِحُ وَ السَّمْتُ الصَّالِحُ وَ الْاِقْتِصَادَ جُزْءٌ مِنْ خَمْسَةَ وَ عِشْرِیْنَ جُزْءً مِنَ النُّبُوَّةِ))

''نیک طور طریق، نیک انداز، اور میانہ روی نبوت کے پچیس اجزا میں سے ایک جز ہے۔''

کیونکہ ان تین اخلاقی خوبیوں کے ذریعہ سے کسی شخص کو وقار حاصل ہوتا ہے، اور وہ خود بھی ان خوبیوں کی بدولت اپنے اندر اخلاقی احساس کو بیدار کر کے خوددار بنتا ہے۔

---

(۱) ابوداؤد کتاب اللباس باب فی غسل الثوب والخلقان۔

(۲) بخاری کتاب الصلوۃ باب الی الصلوۃ ولیاتہا بالسکینۃ والوقار۔

صحیح بخاری میں ایک اور لفظ دَلَّ کا ہے اور ان تمام الفاظ کے معنی یہ ہیں کہ انسان رفتار، گفتار، شکل و صورت وضع ولباس اور اپنی عام روش میں باوقار رہے اور نیک مسلمانوں کا طور وطریقہ اختیار کرے، اسلام نے خصالِ فطرت یعنی ناخن اور مونچھ کے ترشوانے اور ختنہ کرانے کا جو حکم دیا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس سے انسان باوقار شکل میں نظر آتا ہے، سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ روش اختیار کی تو خدا سے پوچھا کہ یہ کیا ہے، ارشاد ہوا ''وقار'' بولے ''خداوند میرے وقار کو اور بڑھا۔''(۱)

فقر وفاقہ کی حالت یا حرص وطمع کے موقع پر انسان سے جو خودداری ظاہر ہوتی ہے اس کا نام شریعت کی اصطلاح میں تعفف اور استعفاف ہے اور شریعت میں وہ ایک قابلِ ستائش اخلاقی وصف ہے اور اسی وصف کے ساتھ متصف ہونے کی بنا پر خداوند تعالیٰ نے اصحابِ صفہ کی خاص طور پر تعریف کی ہے۔

﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا﴾ (بقرہ:۲۷۳)

(''خیرات تو) ان حاجت مندوں کا حق ہے، جو اللہ کی راہ میں گھرے بیٹھے ہیں، ملک میں کسی طرف کو جا نہیں سکتے، بے خبر ان کی خودداری (کی وجہ) سے ان کو غنی سمجھتا ہے، تو (ان کو دیکھے تو) ان کی صورت سے ان کو (صاف) پہچان جائے (کہ محتاج ہیں) وہ لپٹ کر لوگوں سے نہیں مانگتے۔''

اس آیت میں فقر وفاقہ کی حالت میں خودداری کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا گیا ہے اس کا اندازہ اس آیت کے بعض فقروں کی تفسیر سے ہوسکتا ہے صاحب کشاف نے ﴿لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا﴾ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ''وہ سوال تو کرتے ہیں لیکن لجاجت واصرار کے ساتھ نہیں کرتے بلکہ نرمی کے ساتھ کرتے ہیں۔'' لیکن امام رازی نے لکھا ہے کہ یہ صحیح نہیں کیونکہ جب خدا نے خود ہی بیان کر دیا ہے کہ ان کی خودداری کی وجہ سے جو لوگ ان کے حال سے ناواقف ہیں ان کو دولت مند سمجھتے ہیں تو پھر سوال کرنے کے کیا معنی، اصحابِ صفہ صاحب احتیاج ہونے کے باوجود اس لیے سوال نہ کرتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو سخت تکلیفوں میں مبتلا کر کے سوال سے باز رہنے کی طاقت رکھتے تھے جو شخص زبان سے خاموش رہتا ہے لیکن اپنی حاجت سے فقر وفاقہ کا اظہار کرتا ہے تو اس کی یہی خاموشی لجاجت واصرار کا سوال ہے کیونکہ حاجت کی علامتوں کا ظہور حاجت پر دلالت کرتا ہے اور خاموشی اسی بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کے پاس حاجت کے پورا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں اس لیے جب انسان کسی کی یہ حالت دیکھتا ہے تو ان کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کو کچھ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے اس لیے یہ حالت خود لجاجت و اصرار کا سوال ہے، پس جب خدا یہ کہتا ہے کہ اصحابِ صفہ لوگوں سے لجاجت واصرار کے ساتھ سوال نہیں کرتے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ زبان سے تو سوال ہی نہیں کرتے لیکن اس کے ساتھ اپنے پھٹے حال کا بھی اظہار نہیں

(۱) ادب المفرد باب الختان للکبیر۔

ہونے دیتے جو لجاجت کے ساتھ سوال کرنے کا قائم مقام ہے بلکہ لوگوں کے سامنے نہایت اچھی حالت میں نمایاں ہوتے ہیں اور اپنے فقر و فاقہ سے خدا کے سوا کسی کو واقف نہیں ہونے دیتے۔[1]

سوال کی سب سے مبتذل صورت گداگری ہے اور اسلام نے گداگری کی نہایت شدت سے ممانعت کی ایک حدیث میں ہے کہ ''جو شخص ہمیشہ بھیک مانگتا رہتا ہے وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہوگا'' یہ اس کی اس حالت کی تمثیل ہوگی کہ دنیا میں اس نے اپنی خودداری کو قائم نہیں رکھا اور اپنی عزت و آبرو گنوادی ہے، چند انصار نے جو بہت ہی غریب تھے، رسول اللہ ﷺ سے کچھ مانگا، آپ نے دے دیا، پھر سوال کیا اور آپ نے پھر دیا لیکن جب سب مال ختم ہو چکا، تو فرمایا کہ ''میرے پاس جو کچھ ہوگا میں تم سے بچا کر اس کو جمع نہ کروں گا، جو شخص خدا سے خودداری کی خواہش کرتا ہے، خدا اس کو خوددار بناتا ہے اور جو شخص خدا سے بے نیازی کی آرزو کرتا ہے، خدا اس کو بے نیاز کرتا ہے اور جو شخص صبر کرنا چاہتا ہے خدا اس کو صبر دیتا ہے خدا نے صبر سے بڑا عطیہ کسی کو نہیں دیا۔

فقر و فاقہ کی حالت میں عام آدمیوں سے اعانت کی درخواست کرتے پھرنا بھی خودداری کے منافی ہے۔ اسلام نے اس کی بھی ممانعت کی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص محتاج ہو کر اپنی احتیاج کو انسانوں کے سامنے پیش کرتا ہے اس کی احتیاج دور نہیں ہوتی، لیکن جو شخص اس کو خدا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ خدا اس کو بے نیاز کر دے خواہ مرگِ ناگہانی کے ذریعہ سے خواہ فوری مال کے ذریعہ سے۔

روزمرہ کے معمولی کاموں میں لوگ ایک دوسرے سے اعانت کی درخواست کرنا برا نہیں جانتے لیکن کمالِ خودداری یہ ہے کہ اس قسم کی باتوں میں بھی احتیاط قائم رہے، مثلاً اگر ایک شخص کسی سے کہے کہ ٹوپی اٹھا دو میز پر کتاب رکھ دو تو گو بظاہر یہ سوال خودداری کے منافی نہیں معلوم ہوتا، لیکن اگر وہ ناگواری یا سختی سے اس کا انکار کر دے تو یقیناً اس شخص کی خودداری کو صدمہ پہنچے گا، اسی لیے کمال خودداری یہ ہے کہ اس قسم کی درخواستوں سے بھی احتراز کیا جائے۔ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے کچھ لوگوں سے چند باتوں پر بیعت لی جن میں ایک بات یہ تھی۔

((لَا تَسْأَلُوا النَّاسَ شَيْئًا))

''تم کسی سے کوئی چیز نہ مانگنا۔''

ان میں سے بعض صحابہؓ نے اس شدت سے اس کی پابندی کی کہ زمین پر ان کا کوڑا گر جاتا ہے تو بھی کسی سے اس کے اٹھانے کی درخواست نہیں کرتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک محتاج آدمی نے آنحضرت ﷺ سے سوال کرنے کی اجازت طلب کی، آپ نے پہلے تو اس کو اجازت نہیں دی، پھر فرمایا کہ ''اگر تم کو سوال ہی کرنا ہے تو صالحین سے سوال کرو۔''[2] صالحین کی تخصیص غالباً اسی

(۱) تفسیر کبیر جلد ثانی ص ۵۲۶، ۵۲۷۔

(۲) ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب کراہیۃ المسئلۃ و باب فی الاستعفاف میں یہ کل حدیثیں ہیں۔

لیے کی گئی ہے کہ یہ لوگ باعزت طریقہ پر سوال پورا کریں گے ورنہ رفق و ملاطفت کے ساتھ اس کو رد کر دیں گے۔

ان تمام تصریحات سے واضح ہے کہ ایک مسلمان کے لیے اسلام اور ایمان کی نعمت وہ عزت اور وہ دولت ہے جس کے مقابلہ میں ساری نعمتیں اور دولتیں ہیچ ہیں' جو مسلمان ہے وہ خدا کے سوا کسی کی پروانہیں کرتا' وہ کسی کے سامنے نہیں جھکتا' وہ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا' اور بحیثیت مسلمان کے وہ اپنا پایہ ساری دنیا سے بلند سمجھتا ہے' اور یقین رکھتا ہے کہ عزت صرف خدا کے لیے ہے اور ان کی عطا سے رسول کے لیے ہے اور اس کے واسطے سے مسلمانوں کے لیے ہے' اس خودداری کو قائم رکھنا اسلام کی عزت کو قائم رکھنا ہے اور اس فیضِ تعلیم کا یہ اثر ہے کہ آج بھی ہماری زبان پر یہ فقرہ چڑھا ہے کہ جب ہم کسی مسلمان کو عار دلانا چاہتے ہیں تو یہ کہہ کر اس کی اسلامی خودداری کو بیدار کرتے ہیں کہ ''مسلمان ہو کر ایسا کرتے ہو۔'' گویا مسلمان ہونا ایک ایسی عزت ہے جس کے برقرار رکھنے کے لیے اس کو ہر قسم کی برائی سے پاک اور ہر دناءت اور پستی کے کام سے بلند ہونا چاہیے۔

اس باب کا خاتمہ ہم ایک خاص واقعہ پر کرنا چاہتے ہیں جس سے اسلامی خودداری کی حقیقت ظاہر ہوگی کہ وہ تزک و احتشام' تکلف و تصنع اور جاہ و حشم کی نمائش کا نام نہیں' بلکہ یہ ہے کہ نفس کے تواضع اور دل کی خاکساری کے ساتھ اسلام کی عزت اور حق کا فخر اس کو اونچا کر دے کہ اگر وہ غریب و مفلس اور کمزور بھی ہو تو وہ ہر ظاہری قوت کے سامنے بے نیاز اور باطل طاقت کے مقابلہ میں سر بلند رہے' اور اگر وہ صاحبِ امارت و حکومت ہو تو اپنے رعب و دبدبہ کے لیے ظاہری نمائشی چیزوں کے بجائے حق کی طاقت کو کافی سمجھے۔ بیت المقدس کی فتح کے موقع پر حضرت عمرؓ رومیوں سے بیت المقدس کی کنجی لینے کو شام جا رہے تھے جب شہر کے قریب پہنچے تو سپہ سالارِ اسلام حضرت ابو عبیدہؓ کچھ مسلمانوں کو لے کر استقبال کو نکلے۔ جب یہ جلوس ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں کچھ پانی تھا تو حضرت عمرؓ ناقہ سے اتر آئے' پاؤں سے چرمی موزے نکال کر اپنے کندھے پر ڈال لیے اور ناقہ کی مہار پکڑ کر پانی میں گھسے اور اسی شان سے اسلام کا فرمانروا رومیوں کے مقدس شہر میں داخل ہونے کے لیے بڑھا' حضرت ابو عبیدہؓ نے عرض کی یا امیر المومنین آپ یہ کیا کر رہے ہیں کہ موزے اتار کر آپ نے کندھے پر ڈال لیے ہیں۔ اونٹنی کی نکیل آپ کے ہاتھ میں ہے اور آپؓ اپنے ہاتھ سے پکڑ کر اس کو پانی میں لیے چل رہے ہیں' یہ وہ موقع ہے کہ سارا شہر آپ کے دیکھنے کو امنڈ آیا ہے' حضرت عمرؓ نے کہا اے ابو عبیدہؓ اگر تمہارے سوا کوئی اور یہ بات کہتا تو میں اس کو سزا دے کر امتِ محمد ﷺ کے لیے عبرت بناتا۔ ہم سب سے ذلیل قوم تھے تو اللہ تعالیٰ نے اسلام سے ہماری عزت بڑھائی تو جو عزت خدا نے ہم کو دی ہے اس کو چھوڑ کر کسی اور چیز کے ذریعہ سے ہم عزت چاہیں گے تو خدا ہمیں ذلیل کرے گا۔ (۱)

---

(۱) مستدرک حاکم جلد اول ص ۶۲ کتاب الایمان علی شرط صحیحین۔

شجاعت اور بہادری

﴿قَدِیْرٌ﴾ (قدرت والا) ﴿قادر، مقتدر، قوی، جبار﴾ (جس کو کوئی پچھاڑ نہ سکے) ﴿قَاھِرٌ﴾ (جو ہر کسی کو دبا دے) ﴿غَالِبٌ﴾ اور ﴿عَزِیْزٌ﴾ اللہ تعالیٰ کے کمالی اوصاف ہیں جب کسی بندہ میں ان اوصاف کا کچھ پرتو پڑتا ہے تو اس میں اخلاقی وجسمانی شجاعت پیدا ہو جاتی ہے۔

تمام مذاہب میں اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے اپنے پیروؤں میں شجاعت و بہادری کے جوہر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اسلام سے پہلے دنیا کی عام حالت پر نظر کر کے لوگوں میں یہ خیال پیدا تھا کہ چونکہ ہر قسم کا ظلم وستم اور خون ریزی اسی قوت کا نتیجہ ہے، اس لیے یہ مٹانے کے قابل ہے، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے یہ نکتہ سوجھایا کہ قوت بذاتہ کوئی بری چیز نہیں، بلکہ اس کے استعمال کا موقع برا ہوتا ہے اس لیے تعلیم محمدی نے بہادری و شجاعت کو سراہا، اور اس کے موقعوں کی تعیین کی کہ اس کو حق کی مدد اور باطل کو مٹانے کے لیے کام میں لانا چاہیے، کیونکہ اگر نیکوں میں یہ قوت نہ ہو تو وہ ظلم وستم کی روک تھام اور باطل قوتوں کا بہادرانہ مقابلہ نہ کر سکیں گے اور نہ اسلام کا مقدس فریضہ جہاد کامیاب ہو سکے۔

ان مسلمانوں کی جو سختیوں اور مصیبتوں کا بہادرانہ مقابلہ کریں اور لڑائیوں میں دادِ مردانگی دیں، اللہ تعالیٰ تعریف فرماتا ہے۔

﴿وَ الصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِیْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ (بقرہ:۱۷۷)

''اور جو سختی اور تکلیف اور لڑائی کے وقت ثابت قدم رہیں وہی لوگ ہیں جو سچے ہوئے اور وہی متقی ہیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ جنگ آپڑے تو اس میں ثابت قدمی اور بہادری وہ صفت ہے جو اپنے موصوف کو راست باز اور متقی بننے میں مدد دیتی ہے، کیونکہ ہر وہ شخص جو کسی جماعت اور ملت کا فرد ہو وہ زبان سے کہے یا نہ کہے، اس کا یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس کی حفاظت میں اپنی جان تک کی بازی لگا دے، اور جب وہ ایسا کر گزرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ اور ملت کی نظر میں راست باز اور سچا ٹھہرتا ہے اور جو جذبہ اس کو اس فرض پر آمادہ کرتا ہے وہی اتقا کا منشا ہے ایک اور موقع پر مسلمانوں کو اس بہادری کی کھلی تعلیم ملتی ہے۔

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ﴾ (الانفال:۱۵)

''اے ایمان والو! جب تم کافروں سے میدان جنگ میں مقابل ہو تو ان کو پیٹھ مت دو۔''

یعنی جب غنیم سے مقابلہ آن پڑے تو ایمان والوں کا فرض ہے کہ وہ اس مقابلہ میں پیٹھ پھیر کر بزدلی نہ دکھائیں، بلکہ شجاعت اور بہادری کے ساتھ میدان میں قدم جمائے ڈٹے رہیں۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے

مسلمانوں کو ''ایمان والے'' کہہ کر خطاب کیا ہے اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ یہی ''ایمان'' مسلمانوں کی شجاعت اور بہادری کی روح ہے کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ جو مسلمان نامرد اس دن بزدلی سے دشمن کو پیٹھ دکھائے گا وہ خدا تعالیٰ کے غضب کا مستحق ہوگا۔

﴿وَ مَنْ یُّوَلِّهِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ﴾ (انفال:۱۶)

''اور جو ان کو اس دن پیٹھ دے گا مگر یہ کہ لڑائی کا کوئی پیچ کرتا ہو یا کسی (مسلمان) دستہ سے جاملنا ہو تو وہ اللہ کا غضب لے پھرا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ کتنا برا ٹھکانا ہے۔''

یہ تو سلبی تعلیم تھی، یعنی یہ کہ کسی مسلمان کو میدانِ جنگ میں پیٹھ نہیں دکھانی چاہیے اس کے بعد ہی اللہ تعالیٰ ان کو اس کے لیے ایجابی حکم دیتا ہے۔

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا﴾ (انفال:۴۵)

''اے ایمان والو! جب تم کسی دستہ سے مقابل ہو تو ثابت قدم رہو۔''

یعنی اپنی جگہ پر جم کر مقابلہ کرو، کوئی تم میں سے سوائے اس کے کہ لڑائی کی مصلحت ہو اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ مسلمانوں کی تعریف میں فرمایا کہ وہ کافروں کی قوت کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے۔

﴿اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ﴾ (فتح:۲۹)

''وہ کافروں پر زور آور ہیں۔''

﴿اَشِدَّآءُ﴾ کا ترجمہ اس آیت میں زور آور، زورمند اور قوی دست کیا جا سکتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کو حق کے اور خصوصاً اپنے دین کے مخالفوں کے مقابلہ میں طاقتور اور قوی دست ہونا ضروری ہے ایک اور آیت میں ارشاد ہے۔

﴿وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِیْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ یَعْلَمُهُمْ﴾ (انفال:۶۰)

''اور ان کے لیے تم سے جو ہو سکے یعنی زور و قوت اور گھوڑے باندھنا تیار رکھو کہ اس سے اللہ تعالیٰ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اور دوسروں کو جنہیں تم نہیں جانتے اللہ جانتا ہے مرعوب کرو۔''

اس ''قوت'' کے لفظ کی تفسیر اس زمانہ کے سامانِ جنگ وقتال سے کی گئی ہے مثلاً قلعوں کی تعمیر اور تیر اندازی مگر یہ تخصیص صرف زمانہ کے اعتبار سے ہے ورنہ معنی میں مفسرین نے اس کو عام رکھا ہے اور ہر قسم کے اسلحہ اور سامان کو اس میں داخل کیا ہے۔[1] غرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سپاہیانہ جوہر پیدا کرنے اور جنگی

(۱) تفسیر طبری آیت مذکورہ۔

سامان و اسلحہ تیار رکھنے اور اس کے استعمال کے طریقوں کو جاننے کی ہدایت فرمائی ہے، تاکہ حق کے دشمن ان کی تیاری سے مرعوب اور خوف زدہ رہیں، اور ان سے معاہدہ کر کے توڑنے کی ہمت نہ کر سکیں۔

برخلاف اس کے بزدلی اور کمزوری کی برائی کی گئی ہے، بدر کے موقع پر کچھ مسلمان جنگ کے نام سے جو اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلی دفعہ کی جا رہی تھی، متوحش ہو رہے تھے، اس پر وحی الٰہی نے ان کا ذکر مذمت کے ساتھ کیا:

﴿كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَ هُمْ يَنْظُرُوْنَ﴾ (انفال:٦)

''گویا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں، اور وہ دیکھ رہے ہیں۔''

سورۂ احزاب میں منافقوں کی دلی کمزوری کا یہ نقشہ کھینچا ہے:

﴿فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِىْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ﴾ (الاحزاب:١٩)

''جب ڈر کا وقت آئے تو ان کو تو دیکھے کہ تیری طرف ٹکر ٹکر دیکھتے ہیں، ان کی آنکھیں گردش کھاتی ہیں، جیسے کسی پر موت کی غشی آ جائے۔''

سورۂ محمد میں ان کی دل کی کمزوری کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہے۔

﴿فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّ ذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِىِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَاَوْلٰى لَهُمْ﴾ (محمد:٢٠)

''جب اتری کوئی ثابت سورت اور مذکور ہو اس میں لڑائی تو تو ان کو جن کے دلوں میں روگ ہے دیکھے گا کہ تکتے ہیں تیری طرف جیسے ٹک ٹکی لگائے وہ جس پر موت کی بے ہوشی ہے سو خرابی ہو ان کی۔''

ایک اور آیت میں یہ نقشہ اس طرح کھینچا گیا:

﴿وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ وَ اِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ﴾ (منافقون:٤)

''اور جب تو انہیں دیکھے تو ان کے بدن اچھے معلوم ہوں اور اگر بولیں تو ان کی بات تو سنے، جیسے ٹیک سے کھڑی کی ہوئی لکڑیاں ہیں جو کوئی چیخے سمجھیں ہم ہی پر کوئی آفت آئی۔''

اس آیت نے یہ بتایا کہ بہادری اور شجاعت بدن کی فربہی اور موٹائی سے نہیں بلکہ دل کی طاقت سے ہے جس سے منافق محروم ہیں، دیکھنے میں تو ان کے بدن بڑے سجیلے اور گٹھے ہوئے خوب صورت معلوم ہوتے ہیں، مگر دل کی کمزوری کا یہ حال ہے کہ اگر ذرا کوئی چیخ دے تو گھبرا اٹھیں، ان کی حالت ایسی ہے جیسے کوئی لٹھوں کو ٹیک لگا کر کھڑا کر دے دیکھنے میں تو یہ بڑے لمبے تڑنگے اور موٹے تازے ہیں مگر چونکہ ان کی جڑیں مضبوط نہیں اس لیے ذرا ٹھیلنے سے دھڑ سے زمین پر آ رہتے ہیں۔

اسلام اپنے پیرووں میں شجاعت و بہادری کا جو جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے اگرچہ اس میں مادی و جسمانی شجاعت سے یکسر اعراض و تغافل نہیں ہے لیکن اس نے اپنی شجاعت و بہادری کی بنیاد اس پر کھڑی نہیں کی ہے' اسی لیے اوپر کی آیت میں دیکھیے کہ منافقین کے جسمانی طول و عرض اور موٹائی کا مضحکہ اڑایا ہے اس لیے کہ ان میں شجاعت اور بہادری نہیں' اسی بنا پر وہ اپنے پیرووں میں شجاعت اور بہادری کا جو جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے اس کی بنیاد چند مضبوط عقائد پر رکھی ہے جو صحیح ایمان اور غیر متزلزل یقین کے لازمی نتیجے ہیں۔

(۱) جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کے حکم سے ہوتا ہے' اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا اس لیے تعداد کی قلت و کثرت کوئی چیز نہیں' صرف فضلِ الٰہی اور نصرتِ خداوندی چاہیے۔

(۲) ہر آدمی کی موت کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے' جب وہ آ جائے تو وہ کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتی' اور جب تک نہ آئے اس کو کوئی مار نہیں سکتا۔

(۳) خدا کی راہ میں مارا جانا' زندگی کا بہترین مصرف ہے' اس خون کے پانی سے گناہ کا سارا دفتر دھل جاتا ہے اور جو اس غزا میں مارا نہیں گیا وہ بھی بڑے بڑے ثوابوں کا مستحق ہے۔

تعداد کی قلت و کثرت

تعداد کی قلت و کثرت پر جدوجہد کی کامیابی و ناکامی کا انحصار سراسر فریب ہے۔ کامیابی و ناکامی تعداد کی کمیت پر نہیں' بلکہ جدوجہد کرنے والوں کی ایمانی و اخلاقی کیفیت پر منحصر ہے' تعداد گو کتنی ہی چھوٹی ہو اگر اس میں ایمان و یقین کی قوت موجود ہے تو بفضل خدا وہ بڑی سے بڑی تعداد پر غلبہ پا سکتی ہے اس فلسفہ کو حضرت طالوت کے چھوٹے سے لشکر کے سلسلہ میں قرآن نے ان مختصر لفظوں میں سمجھا دیا ہے۔

﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (بقرہ:۲۴۹)

''کتنی بار چھوٹا دستہ خدا کے حکم سے بڑی فوج پر غالب گیا ہے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو آمادۂ جہاد کرتے ہیں تو دل کے کمزور کہتے ہیں کہ ہم تو ان سے نہیں لڑیں گے۔

﴿اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ﴾ (مائدہ:۲۲)

''اس میں تو ایک زبردست قوم بستی ہے۔''

اس وقت ان کی امت کے دو مسلمان ان کو سمجھاتے ہیں۔

﴿فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ وَ عَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (مائدہ:۲۳)

''تو جب تم شہر کے پھاٹک میں گھس جاؤ گے تو تم ہی غالب ہو اور اللہ پر بھروسہ کرو' اگر تم ایمان رکھتے ہو۔''

بدر اور احد کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے اس راز کو بار بار ظاہر فرمایا ہے ارشاد ہوا:

﴿وَ لَنْ تُغْنِیَ عَنْکُمْ فِئَتُکُمْ شَیْئًا وَّلَوْ کَثُرَتْ وَ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (انفال:۱۹)

''اور تم کو تمہارا جتھا کچھ کام نہ آئے گا اگرچہ تعداد میں بہت ہو اور اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔''

﴿فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ ○ اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ وَ اِنْ یَّخْذُلْکُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُکُمْ مِّنْ بَعْدِہٖ وَ عَلَی اللّٰهِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○﴾ (آل عمران:۱۵۹۔۱۶۰)

''تو جب ارادہ پکا ہو چکا تو اللہ پر بھروسہ کر بے شک اللہ توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے اگر اللہ تعالیٰ مدد کرے گا تو کوئی تم پر غالب نہ ہوگا اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے گا تو اس کے بعد کون تمہاری مدد کرے گا اور مومنوں کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔''

فتح و شکست حکم الٰہی پر موقوف ہے اور مدد اسی طرف سے آتی ہے۔

﴿وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ﴾ (انفال:۱۰)

''اور مدد نہیں ہے مگر اللہ ہی کی طرف سے بے شک اللہ غالب حکمت والا ہے۔''

تعداد کی قلت کی تلافی ایمان کی قوت سے ہوتی ہے یہ راز اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو صرف ایک نظریہ کی حیثیت سے نہیں بتایا بلکہ اس کو قاعدہ بنا کر ہمیشہ کے لیے خوش خبری سنا دی فرمایا کہ ایک پکا مسلمان اپنے دس گنے کے مقابل ہے ثابت قدم دس مسلمان سو پر اور بیس ایسے مسلمان دو سو کی فوج پر بھاری ہوں گے۔

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ وَ اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَةٌ یَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ﴾ (انفال:۶۵)

''اے پیغمبر! مومنوں کو لڑائی کا شوق دلا اگر تم مسلمانوں میں سے بیس صابر (ثابت قدم) ہوں تو وہ دو سو پر غالب ہوں اگر تم میں سے سو ہوں تو ہزار کافروں پر غالب ہوں کیونکہ وہ سمجھ نہیں رکھتے۔''

ثابت قدم مسلمانوں کے غالب آنے اور کافروں کی شکست کھا جانے کی وجہ بھی بتا دی کہ مسلمانوں کے دل میں خدا پر صبر و توکل کی قوت ہے اور کافروں کے دل ایمان کے اس فہم و بصیرت سے محروم ہیں۔

اس کے بعد اس آزمائش کی سختی میں تھوڑی نرمی کر دی گئی پھر بھی یہ نرمی وہ ہوئی جو آج بھی مردانگی و بہادری کی کسوٹی ہے یعنی یہ کہ ایک مسلمان اپنے سے دو چند کا مقابلہ کرے اور اس کے قدم نہ ڈگمگائیں۔

﴿فَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ یَّغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ وَ اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ اَلْفٌ یَّغْلِبُوْۤا اَلْفَیْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ﴾ (انفال:۶۶)

''اور اگر تم سے سو صابر (ثابت) رہیں تو دو سو پر غالب ہوں اور اگر تم سے ہزار ہوں تو دو ہزار پر بحکم خدا

غالب ہوں۔ اور اللہ صابروں کے ساتھ ہے۔"

اس تعلیم کے نشہ کی تیزی اور تندی دیکھو کہ آج بھی یہ یقین بحمداللہ مسلمانوں میں پیدا ہے کہ ایک مسلمان لڑائی میں دو کافروں پر بھاری ہے' اور وہ اپنے اس یقین وایمان کی بدولت اپنے سے دونی تعداد کی پروانہیں کرتا اور خدا کی مدد پر ہمیشہ بھروسہ رکھتا ہے اس کا اثر یہ ہے کہ کافروں کے دلوں میں ان کا وہ رعب بیٹھا ہے جس کا وعدہ ساڑھے تیرہ سو سال پہلے سے ہے کہ

﴿سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ﴾ (آل عمران:۱۵۱)

"ہم کافروں کے دلوں میں (تمہارا) رعب ڈال دیں گے۔"

﴿سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُو الرُّعْبَ﴾ (انفال:۱۲)

"میں کافروں کے دلوں میں (تمہارا) رعب ڈال دوں گا۔"

خدا نے یہ وعدہ پورا بھی کیا' چنانچہ یہود جن کو اپنے قلعوں اور لڑائی کے سامانوں پر بڑا گھمنڈ تھا' مسلمانوں سے ایسے مرعوب ہوئے کہ بے لڑے بھڑے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہوئے۔

﴿وَ قَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ﴾ (احزاب:۲۶)

"اور ان کے دلوں میں اللہ نے رعب ڈال دیا۔"

﴿وَ قَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ﴾ (حشر:۲)

"اور ان کے دلوں میں اللہ نے رعب ڈال دیا۔"

اور جب تک مسلمانوں میں ایمان کی یہ قوت باقی ہے خدا کا وعدہ پورا ہوتا رہے گا۔

موت کا وقت مقرر ہے

انسان کی کمزوری کی اصل وجہ موت کا ڈر ہے' اس زہر کا تریاق اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر آدمی کی موت کا ایک وقت مقرر ہے جو نہ ٹالے ٹل سکتا ہے' اور نہ بلائے آسکتا ہے اس لیے کسی خطرہ کے مقام سے بھاگنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

وحیِ محمدی نے مسلمانوں کو اس عقیدہ کی بار بار تلقین کی ہے' یہاں تک کہ یہ چیز مسلمانوں کی رگ رگ میں سرایت کر گئی ہے' غزوۂ احد میں مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے' اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی' اور اس عقیدہ کو یاد دلایا

﴿وَمَا کَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ کِتٰبًا مُّؤَجَّلًا﴾ (آل عمران:۱۴۵)

"اور کسی جان کے بس میں نہیں کہ اللہ کے حکم کے سوا وہ مر سکے لکھا ہوا وقت مقرر ہے۔"

جب اللہ کا حکم ہوگا تب ہی کوئی مر سکتا ہے' پھر موت سے خوف کیوں ہو۔ اور اس سے بزدلی کیوں چھائے۔

جنگِ احزاب میں جب منافقوں کو گھبراہٹ ہوئی تو خدا نے فرمایا:

﴿قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ﴾ (احزاب:۱۶)

(''اے پیغمبر! ان سے) کہہ دے کہ اگر تم موت سے یا مارے جانے سے بھاگے بھی تو یہ بھاگنا تم کو کام نہ آئے گا۔''

یہ خیال کرنا کہ اگر ہم اس لڑائی میں شریک نہ ہوتے تو مارے نہ جاتے سراپا غلط ہے جن کی قسمت میں یہاں موت لکھی تھی وہ خود آ کر اپنے اپنا مقام پر مارے جاتے، فرمایا:

﴿قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ﴾ (آل عمران: ۱۵۴)

''(اے پیغمبر! ان سے) کہہ دے کہ اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تو بھی جن کا مارا جانا لکھا جا چکا تھا، وہ آپ نکل کے اپنے پڑاؤ پر آ جاتے۔''

یہ سمجھنا کہ چونکہ لڑائی میں شریک ہوئے اس لیے مارے گئے، یوں بھی غلط ہے کہ مارنا اور جلانا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہے موت دے اور جس کو چاہے جیتا رکھے، مسلمانوں سے کہا گیا کہ تم کافروں جیسا عقیدہ نہ رکھو جو یہ کہتے ہیں۔

﴿لَوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ وَ اللّٰهُ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ﴾ (آل عمران:۱۵۶)

''اگر یہ (مرنے یا مارے جانے والے) ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے اور یہ خیال اس لیے ان کے دل میں آتا ہے تا کہ اللہ ان کے اس خیال کو ان کی دلی حسرت بنائے اور (واقعہ تو یہ ہے کہ) اللہ جلاتا اور مارتا ہے۔''

کچھ کمزور لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ مقتول لڑائی میں نہ جاتا تو مارا نہ جاتا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر ان کی یہ بات سچ ہے تو وہ اپنی موت ٹال سکتے ہیں تو ٹال لیں۔

﴿قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ (آل عمران:۱۶۸)

''اگر تم سچے ہو تو اپنی جانوں سے موت ہٹا تو لو۔''

جو مسلمان ذرا دل کے کمزور تھے، ان کے خطرہ کا ذکر کر کے ان کی تشفی کی گئی۔

﴿فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً وَ قَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَّالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ﴾ (نساء:۷۷،۷۸)

''پھر جب ان کو لڑائی کا حکم ہوا تو ناگہاں ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے ایسے ڈرنے لگا جیسے خدا سے ڈرہو یا اس سے بھی بڑھ کر' اور کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار تو نے کیوں فرض کی ہم پر لڑائی کیوں نہ ہم کو تھوڑے دن اور مہلت دی (اے پیغمبر!) جواب دے کہ دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے' اور آخرت پرہیزگار کے لیے بہتر ہے' اور تمہارا حق ذرا بھی دبایا نہ جائے گا جہاں تم ہو گے موت تم کو پالے گی اگرچہ تم مضبوط قلعوں میں ہو۔''

غرض کہیں بھی تم جا کر رہو موت سے چھٹکارا نہیں' پھر میدانِ جنگ سے تم کیوں گھبراؤ' بلکہ ان مجاہدوں کی طرح بنو جن کا ایمان جہاد کا نام سن کر اور تازہ ہو جاتا ہے۔

﴿اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِیْلُ﴾ (آل عمران:۱۷۳)

''وہ جن سے لوگوں نے کہا کہ تم سے لڑنے کے لیے لوگوں نے بڑا سامان کیا ہے سو تم ان سے خوف کرو تو اس نے ان کے ایمان کو اور بڑھا دیا' اور بول اٹھے کہ ہم کو خدا کافی ہے اور وہ کیسا اچھا کارساز ہے۔''

شہادت اور غزا کا رتبہ

میدانِ جہاد میں شرکت سے جو دوسری چیز باز رکھ سکتی تھی وہ دنیا کے عیش و آرام کا خیال ہے۔ اسلام کی تعلیم نے اس خیال کا بھی قلع قمع کر دیا ہے' اس کی تعلیم ہے کہ مجاہدوں کا جان و مال اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اس کی خوشنودی رضا اور جنت کے بدلہ میں بکا ہوا ہے' اور وہاں ان کے لیے وہ کچھ مہیا ہے جس کے سامنے یہاں کا بڑا سے بڑا عیش و آرام بھی ہیچ ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ﴾ (توبہ:۱۱۱)

''اللہ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور مالوں کو اس قیمت پر خرید لیا ہے کہ ان کے لیے جنت ہے اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں پھر مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں۔''

اس سے پہلے سورۂ نساء میں اہل ایمان کو جو آخرت کے لیے دنیا کا سودا کر چکے ہیں' اعلان ہے۔

﴿فَلْیُقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یَشْرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَةِ وَ مَنْ یُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیُقْتَلْ اَوْ یَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا﴾ (نساء:۷۴)

''تو دنیا کی زندگی آخرت کے بدلہ بیچتے ہیں وہ اللہ کی راہ میں لڑیں اور جو اللہ کی راہ میں لڑے' پھر مارا جائے یا وہ غالب ہو تو ہم اس کو بڑی مزدوری دیں گے۔''

ان کے گناہ کے سارے دفتر دھل جائیں گے۔

﴿فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَ قٰتَلُوْا وَ قُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ﴾ (آل عمران:۱۹۵)

”تو جو لوگ اپنے وطن سے چھوٹے اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے اتاروں گا ان سے ان کی برائیاں اور داخل کروں گا ان کو جنت میں۔“

شہیدوں نے اس راہ میں اپنی جو سب سے بڑی دولت نثار کی وہ ان کی زندگی تھی۔ وہ ان کو ازسر نو اسی وقت دے دی جائے گی۔ اس عقیدہ کی تعلیم نے اس خیالِ باطل کا کہ شہید مر جاتے ہیں ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا اور کہہ دیا گیا کہ ان کو مردہ نہ خیال کرو وہ خدا کے پاس زندہ ہیں۔

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (آل عمران:۱۶۹)

”اور جو خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس روزی پاتے ہیں خدا نے ان کو اپنی مہربانی سے جو دیا اس سے خوش ہیں۔“

ان کی زندگی کو گو اس دنیا کے لوگ جان نہیں سکتے پھر بھی ان کو زبان سے بھی مردہ نہیں کہنا چاہیے:

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ (بقرہ: ۱۵۴)

”اور جو خدا کی راہ میں مارے جائیں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم کو اس کی خبر نہیں۔“

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

لیکن جہاد کے یہ اوصاف اور انعامات ان ہی کے لیے ہیں جو فی سبیل اللہ خدا کی راہ میں صرف خدا کی خوشنودی کے لیے لڑتے ہیں اس تعلیم نے مجاہدین کی غرض و غایت کو اتنا اونچا کر دیا ہے کہ وہ ذاتی خود غرضیوں اور نفسانی غیظ و غضب اور بہادری کی نیک نامی وغیرہ کے پست جذبات سے بالکل پاک کر دی گئی ہے اگر کوئی مال کے لیے کسی کو قتل کرے تو یہ کافروں کی سی جاہلانہ بات ہوگی فرمایا:

﴿تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا﴾ (نساء:۹۴)

”چاہتے ہو دنیا کی زندگی کا مال سو اللہ کے پاس بڑا مالِ غنیمت ہے تم (اسلام سے) پہلے ایسے ہی تھے تو خدا نے تم پر فضل کیا (یعنی اسلام بخشا) تو اب تحقیق کر لیا کرو۔“

رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص مالِ غنیمت کے لیے لڑتا ہے ایک شخص شہرت کے لیے لڑتا ہے ایک شخص اس لیے لڑتا ہے کہ خدا کی راہ میں اس کی پامردی کی نمائش ہو ایک شخص بہادری دکھانے کے لیے لڑتا

ہے' ایک شخص حمیت سے لڑتا ہے' ایک شخص نمائش کے لیے لڑتا ہے' ایک شخص غصہ و انتقام کے لیے لڑتا ہے' تو آپ ﷺ نے ان سب کا مشترک جواب یہ دیا۔

﴿مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةَ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا وَ هُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (۱)

''جو شخص اللہ کی بات سب سے بالا کرنے کے لیے لڑے اسی کا جہاد خدا کی راہ میں ہے۔''

ایک حدیث میں ہے کہ ''ایک شخص سے قیامت کے دن اس کے اعمال کے متعلق سوال کیا جائے گا تو وہ کہے گا کہ اے خدا میں نے تیری راہ میں جہاد کیا اور شہید ہوا' خدا کہے گا کہ تم جھوٹ کہتے ہو تم اس لیے لڑے کہ بہادر کہے جاؤ۔ (۲) سو تم اپنا اجر پا چکے' اور دنیا میں تم کو بہادر کہا جا چکا۔'' غرض جس شجاعت کا مقصودِ اصلی ریا و نمائش ہو اس کو اسلام نے مذموم قرار دیا ہے لیکن اگر جہاد میں اعلائے کلمۃ اللہ کے ساتھ ضمناً فخر کا بھی اظہار ہو جائے تو اسلام نے اس کو برا نہیں کہا ہے۔ (۳) کیونکہ اس فخر کا منشا بھی کلمۂ حق کی بلندی کا اظہار ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جہاد کے میدان میں کبر و تبختر کے شجاعانہ پہلوؤں کو پسند کیا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ ''بعض ناز و تبختر کو خدا ناپسند اور بعض کو پسند کرتا ہے' خدا جس ناز و تبختر کو پسند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص لڑائی کے وقت اترائے' (۴) کیونکہ اس سے دشمنوں پر رعب و داب قائم ہوتا ہے' اور دوستوں میں مستعدی و سرگرمی پیدا ہوتی ہے ایک صحابیؓ نے ایک کافر پر حملہ کیا اور شجاعانہ فخر و غرور کے لہجہ میں کہا لو میں ابن اکوع ہوں حافظ ابن حجر اس فقرے کی شرح میں لکھتے ہیں:

یہ فقرہ اس فخر سے الگ ہے' جس کی ممانعت کی گئی ہے کیونکہ حالت کا اقتضا یہی تھا اور وہ اس ناز و تبختر سے قریب ہے جو لڑائی میں جائز ہے' اور دوسرے موقعوں پر جائز نہیں۔'' (۵)

غزوۂ حنین میں جب مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو گھیر لیا تو آپ ﷺ نے خود عزم و ثبات کے عربی لہجہ میں فرمایا:

﴿اَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ اَنَا ابْنُ عَبْدُ الْمُطَّلِبْ﴾

''میں پیغمبر ہوں جھوٹ نہیں' میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔''

یعنی میں سچا پیغمبر ہوں اس لیے میدان سے نہ بھاگوں گا نہ ہٹوں گا۔ چنانچہ اس وقت غنیم کے تیروں کی

(۱) صحیح مسلم و صحیح بخاری کتاب الجہاد باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ہی العلیا فھو فی سبیل اللہ۔

(۲) صحیح مسلم کتاب الجہاد باب من قاتل للریاء والسمعۃ استحق النار و جامع ترمذی۔

(۳) فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۲۲ شرح حدیث مذکور۔

(۴) ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الخیلاء فی الحرب۔

(۵) فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۱۱۴۔

بارش سے گواور لوگ ہٹ گئے مگر آنحضرت ﷺ نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں فرمائی۔[1] صحابہ کہتے ہیں کہ ہم میں سب سے بہادر وہ سمجھا جاتا تھا جو آنحضرت ﷺ کے پاس کھڑا ہوتا تھا[2] وہ یہ بھی کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نہایت بہادر تھے۔ایک بار اہلِ مدینہ کے دلوں میں کسی طرف سے حملہ کا خوف پیدا ہوتو سب سے پہلے جو ادھر بڑھا وہ خود سرورِ کائنات ﷺ تھے' آپؐ تنہا گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ کا چکر لگا آئے اور واپس آ کر فرمایا ''خوف کی کوئی بات نہیں۔''[3] ایک موقع پر جب بدویوں نے آپؐ کو عطیہ کے لیے گھیر لیا تو آپؐ نے فرمایا کہ ''تم لوگ مجھ کو بخیل' جھوٹا اور بزدل نہ پاؤ گے''[4] بزدلی اسلام میں ایسا اخلاقی عیب ہے جس سے پناہ مانگنی چاہیے' رسول اللہ ﷺ بیچارگی (عجز)' کاہلی (کسل)' بزدلی اور بڑھاپے سے کہ یہ بھی بے چارگی کی ایک قسم ہے پناہ مانگتے تھے۔دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ ہر نماز کے بعد ان چیزوں سے پناہ مانگتے تھے[5] ایک روایت میں ہے کہ انسان میں سب سے بڑی بداخلاقی گھبرا دینے والا بخل اور دل ہلا دینے والی بزدلی ہے۔[6]

حضرت عبداللہؓ بن ابی اوفی صحابی نے ایک خط لکھ کر بھیجا تھا' اس کا ایک فقرہ یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جب دشمن سے مقابلہ آپڑے تو ثابت قدم رہو۔''[7] اسی خط میں آنحضرت ﷺ کا وہ بلیغ فقرہ بھی ہے جو ساڑھے تیرہ سو برس سے مسلمانوں کے بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔

﴿وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوْفِ﴾

''یقین کرو کہ بہشت تلواروں کی چھاؤں میں ہے۔''

استقامت

''استقامت'' کے لفظی معنی ''سیدھا رہنے یا سیدھا چلے چلنے'' کے ہیں' اور اس سے مقصود یہ ہے کہ جس بات کو حق سمجھا جائے اس پر قائم رہا جائے مشکلیں پیش آئیں مخالفتیں ہوں' ستایا جائے' ہر خطرہ کو برداشت کیا جائے مگر حق سے منہ نہ پھیرا جائے اور اس راستہ پر ثابت قدمی کے ساتھ چلا جائے۔

آنحضرت ﷺ کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے:

(۱) صحیح بخاری غزوۂ حنین و کتاب الجہاد باب بغلة النبی ﷺ۔
(۲) صحیح مسلم باب غزوۂ حنین۔
(۳) صحیح بخاری کتاب الجہاد کتاب الحمائل وتعلیق السیف بالعنق۔
(۴) بخاری کتاب الجہاد باب الشجاعة فی الحرب والجبن۔
(۵) بخاری کتاب الجہاد باب ما یتعوذ من الجبن۔
(۶) ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الجراۃ والجبن۔
(۷) صحیح بخاری کتاب الجہاد باب الصبر عند القتال۔

﴿اِنَّمَآ اِلٰـهُكُمۡ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ فَاسۡتَقِيۡمُوۡۤا اِلَيۡهِ وَاسۡتَغۡفِرُوۡهُ﴾ (حم السجدۃ:۶)

''تمہارا معبود ایک ہی ہے' سو اس کی طرف سیدھے رہو اور اس سے گناہ بخشواؤ۔''

یعنی ہماری عبادتیں اسی ایک کے لیے ہوں اور ہماری توجہات کا وہی ایک مرکز ہو۔ اس سے کسی حال میں ادھر ادھر نہ ہوا جائے' سیدھے اسی کی طرف چلے چلو' ایک اور آیت میں بارگاہِ الٰہی سے جنابِ رسالت مآب ﷺ اور آپ ؐ کے ساتھیوں کو حکم ہوتا ہے کہ اسی راہ پر سیدھے چلے چلو' نہ راہ سے بھٹکو نہ حکم ماننے سے سرکشی کرو۔

﴿فَاسۡتَقِمۡ كَمَاۤ اُمِرۡتَ وَمَنۡ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطۡغَوۡا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ﴾ (ھود:۱۱۲)

''تو (اے پیغمبر!) تو سیدھا چلا چل جیسا تجھ کو حکم ہوا اور جس نے توبہ کی تیرے ساتھ اور حد سے نہ بڑھو کہ وہ (اللہ) تمہارے کاموں کو دیکھتا ہے۔''

عرب کا گرم ریگستان دینِ حق کی مخالفت میں غیظ و غضب کا بھڑکتا ہوا تنور بن گیا' ذرہ ذرہ کی زبان سے رسولِ حق علیہ السلام کی دشمنی کی آواز نکل رہی ہے اور عرب کی وسیع سرزمین مسلمانوں پر دم بدم تنگ ہوتی جاتی ہے' اس موقع پر رسول اللہ علیہ السلام اور آپ ؐ کے ساتھ مسلمانوں کو اعلانِ حق' اور حق پر استقامت کی تاکید ہو رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اسی دینِ حق کی طرف سب کو بلاتے رہو' اور ثابت قدمی دکھاؤ' اور مخالفوں کی کسی خواہش کی پیروی نہ کرو۔

﴿فَلِذٰلِكَ فَادۡعُ ۚ وَاسۡتَقِمۡ كَمَاۤ اُمِرۡتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ﴾ (شوریٰ:۱۵)

''پس اسی کی طرف بلا' اور قائم رہ جیسا کہ تجھے فرمادیا' اور ان کی خواہشوں کے پیچھے نہ چل۔''

ایسے ثابت قدموں کو جنہوں نے اللہ کو اپنا پروردگار مان کر ہر خوف و خطرہ کو اپنے سے نکال دیا ہے یہ خوش خبری سنائی جا رہی ہے کہ کامیابی تمہارے ہی لیے ہے وہ دن آئے گا جب نہ تمہیں کسی کا ڈر ہوگا اور نہ کسی چیز کا غم ہوگا۔

﴿اِنَّ الَّذِيۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ﴾ (احقاف: ۱۳)

''بے شک جنہوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ ہے' پھر وہ (اس پر) جمے رہے تو نہ ڈر ہے ان کو اور نہ وہ غم کھائیں گے۔''

اس دن جس دن ہیبت سے سب کے دل لرزتے ہوں گے' ان کو جن کو استقامت اور ثابت قدمی کا اطمینان یہاں حاصل تھا' وہاں تسکین و تسلی کا اطمینان بھی حاصل ہوگا' ایسے ثابت قدموں کے کانوں میں ان کی استقامت کی مزدوری میں فرشتوں کی بشارت سنائی دے گی۔

﴿اِنَّ الَّذِيۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَيۡهِمُ الۡمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَ

(۱) ایضاً باب الجنة تحت بارقة السيوف و باب كان النبی ﷺ اذا لم يقاتل اول النهار اخر القتال حتى تزول الشمس ''بخاری ج ۱ ص ۴۱۶۔

﴿اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴾ (حم السجدۃ:۳۰)

''بے شک جنہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر جمے رہے، ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ خوف اور غم نہ کھاؤ اور اس بہشت کی خوش خبری سنو جس کا تم سے وعدہ ہے۔''

ان ہی آیتوں کی شرح میں اس حدیث کو سمجھئے کہ ایک صحابی دریافت کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھے کوئی ایسی بات بتایئے کہ میں اس سے چمٹ جاؤں، ارشاد ہوا، کہو کہ میرا پروردگار اللہ ہے پھر اس پر جم جاؤ۔[1] صحابہ نے ان نصیحتوں پر جس استقامت کے ساتھ عمل کیا، اور اپنی ایمانی اخلاقی بہادری کے جو کارنامے پیش کیے ساڑھے تیرہ سو برس گزر گئے، مگر ان پر تاریخ کی زبان سے برابر احسنت، اور آفرین کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔

خود اللہ تعالیٰ نے غزوۂ احزاب کے سلسلہ میں ان کی استقامت کا ایک نقشہ کھینچا ہے، فرمایا:

﴿اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ○ هُنَالِكَ ابْتُلِیَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِیْدًا ○﴾ (احزاب:۱۰-۱۱)

''جب کفار کی متحدہ فوجیں تمہارے اوپر سے اور تمہارے نیچے سے آئیں اور جب ڈگنے لگیں آنکھیں اور دل گلے کو آنے لگے اور تم اللہ سے طرح طرح کے گمان کرتے تھے، وہاں ایمان والے جانچے گئے اور خوب جھڑجھڑائے گئے۔''

اس کے بعد اس موقع پر منافقوں نے جو کمزوری دکھائی، اس کی تفصیل ہے، اس کے بعد ہے۔

﴿وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ صَدَقَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ مَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِیْمَانًا وَّ تَسْلِیْمًا﴾ (احزاب:۲۲)

''اور جب ایمان والوں نے کفار کی ان متحدہ فوجوں کو دیکھا تو بولے کہ یہ وہی ہے جس کا وعدہ ہم کو دیا تھا اللہ اور اس کے رسول نے اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا اور اس نے ان کو یقین اور اطاعت میں اور بڑھا دیا۔''

اس کے بعد جن مسلمانوں نے اس قسم کے خطروں میں اپنی کامل استقامت اور ثبات کا وعدہ کیا تھا اور اس کو پورا کر دکھایا، ان کی تعریف فرمائی جاتی ہے۔

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَیْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّنْتَظِرُ وَ مَا بَدَّلُوْا تَبْدِیْلًا﴾ (احزاب:۲۳)

''ایمان والوں میں بعض وہ مرد ہیں جنہوں نے خدا سے جس چیز کا عہد کیا۔ اس کو سچ کر دکھایا، تو ان میں کوئی تو اپنا کام پورا کر چکا اور کوئی ان میں وقت کی راہ دیکھ رہا ہے اور انہوں نے ذرا بھی نہیں بدلا۔''

---

(۱) ترمذی باب ماجاء فی حفظ اللسان۔

یعنی بعض تو خدا کی راہ میں جان دے کر اپنا فرض انجام دے چکے اور بعض ابھی زندہ ہیں اور اس دن کی راہ تک رہے ہیں، جب وہ اپنی استقامت کا امتحان دیں گے، اور ان تمام خطروں کے باوجود نہ تو منافقوں کی طرح انہوں نے اپنے دین و ایمان کو بدلا، اور نہ خدا سے جو عہد کر چکے تھے اس کو توڑا۔

حق کی راہ میں مشکلات کا پیش آنا، اور اس میں مردانِ خدا کی استقامت کی آزمائش اللہ تعالیٰ کا وہ اصول ہے جو ہمیشہ سے قائم ہے اور قائم رہے گا، اور جب تک اس میں کوئی شخص یا کوئی قوم پوری نہیں اترتی کامیابی کا منہ نہیں دیکھتی۔ فرمایا:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ﴾ (بقرہ:۲۱۴)

''کیا تم کو خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی تم پر تم سے پہلوں کے احوال نہیں آئے ان کو سختی اور تکلیف پہنچتی رہی، اور جھڑ جھڑائے گئے، یہاں تک کہ رسول اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے کہنے لگے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ سن رکھو اللہ کی مدد نزدیک ہے۔''

پہلوں کی استقامت کا جو امتحان لیا گیا اس کے دو واقعے قرآن نے بیان کئے ہیں، ایک تو طالوت کے مختصر سے لشکر کا ہے کہ اس نے تعداد کی کمی اور پیاس کے باوجود غنیم کے بہت بڑے لشکر کا مقابلہ کیا، اور آخر کامیاب ہوا اور اس عالم میں اس کی زبان پر یہ دعا جاری تھی۔

﴿رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ (بقرہ:۲۵۰)

''اے ہمارے پروردگار ہم میں ڈال دے پوری مضبوطی اور جما ہمارے پاؤں اور اس کافر قوم کے مقابلہ میں ہماری مدد کر۔''

اور دوسرا واقعہ اصحاب الاخدود کا ہے، احادیث و سیر میں ہے[1] کہ یمن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کے کچھ مخلص اور پکے مسلمان تھے یہودیوں نے ان کو طرح کی تکلیفیں دیں، اور آخر ان کو گڑھا کھود کر آگ میں جھونک دیا۔ مگر وہ دینِ حق سے برگشتہ نہ ہوئے۔

﴿قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝ اِذْهُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝ وَّ هُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۝ وَ مَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ﴾ (بروج:۴-۸)

''مارے گئے گڑھے کھودنے والے آگ بھری ایندھن سے جب وہ اس (گڑھے کے منہ) پر بیٹھے

(۱) صحیح مسلم و سیرت ابن ہشام قصہ اصحاب الاخدود۔

تھے‘ اور جو کچھ وہ ایمان والوں کے ساتھ کر رہے تھے‘ دیکھ رہے تھے اور وہ ان سے بدلا نہیں لیتے تھے مگر اسی کا کہ یہ زبردست خوبیوں والے خدا پر ایمان لے آئے تھے۔“

اگلوں کی استقامت کے ان احوال میں سے جن کو محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے سامنے نمونہ کے طور پر پیش کیا وہ واقعہ ہے کہ جس کو امام بخاری نے صحیح میں نقل کیا ہے‘ خبابؓ بن ارت صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم نے حضور ﷺ سے اپنی مصیبتوں کا حال عرض کیا‘ اور درخواست کی کہ ہمارے لیے دعا کیجیے چونکہ یہ بھی ایک قسم کی بے تابی کا اظہار تھا۔ اس لیے آپؐ نے فرمایا کہ ”تم سے پہلے لوگوں میں ایسا مرد بھی ہوا ہے جس کو زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا اور آرہ سے اس کو چیر کر دو کر دیا جاتا تھا‘ مگر یہ اس کو دینِ حق سے روگرداں نہیں کرتا تھا اور لوہے کی کنگھیوں سے اس کا گوشت ہڈی سے نوچ کر تار تار کر دیا جاتا تھا‘ مگر یہ بھی اس کو اس کے دین سے ہٹا تا نہ تھا۔ (۱)

رسولِ اسلام علیہ السلام کی ان تعلیمات اور تلقینات کا جو اثر آپؐ کے ساتھیوں پر ہوا وہ اہلِ تاریخ سے چھپا نہیں‘ ان ہی خبابؓ بن ارت کا جو اس روایت کے راوی ہیں یہ واقعہ ہے کہ اسلام کے جرم میں ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دی جاتی تھیں‘ آخر ایک دن زمین پر کوئلے جلا کر اس پر ان کو چت لٹا دیا گیا‘ اور ایک شخص ان کی چھاتی پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں‘ یہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے۔ (۲)

حضرت خبابؓ نے مدتوں کے بعد حضرت عمرؓ کو اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی تو تاپے ہوئے سونے کی طرح سنگ دل قریش کے ظلم وستم کا یہ سکہ ان کی پیٹھ پر چمک رہا تھا۔

حضرت بلالؓ گرم جلتی بالو پر لٹائے جاتے‘ پتھر کی بھاری چٹان ان کے سینہ پر رکھی جاتی گلے میں رسی باندھ کر زمین پر گھسیٹے جاتے اور کہا جاتا کہ اسلام سے باز آؤ‘ اس وقت بھی ان کی زبان سے ﴿احد احد﴾ (ایک خدا) ہی نکلتا تھا۔ حضرت خبیبؓ سولی پر لٹکائے جاتے ہیں مگر خدا کی راہ میں جان کی یہ قربانی ان کو اتنی پسند آتی ہے کہ دوگانۂ شکر ادا کرتے ہیں۔ خود آنحضرت ﷺ کا وہ فقرہ جس کو آپؐ نے اپنے چچا ابو طالب کے جواب میں کہا تھا اس کی تاثیر اس وقت تک کم نہ ہوگی جب تک آسمان میں سورج اور چاند کی روشنی قائم ہے فرمایا! چچا جان! اگر یہ کافر میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی دے دیں تب بھی میں اس دینِ حق سے باز نہ آؤں گا۔

خود مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کا خطاب ہے کہ فرض کرو کہ اگر یہ رسول اس راہ میں مر جائے‘ یا مارا جائے تو کیا تم اس راستہ سے جس پر تم چل رہے ہو‘ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ نہیں حق کسی کی موت وحیات سے وابستہ نہیں اس کا ساتھ تم اس لیے دیتے ہو کہ وہ حق ہے۔

﴿وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ وَ مَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا﴾ (آل عمران: ۱۴۴)

---

(۱) صحیح بخاری باب علامات النبوۃ فی الاسلام۔

(۲) ابن سعد جلد ۳ تذکرہ خبابؓ۔

’’اور محمد تو ایک رسول ہے اس سے پہلے بہت سے رسول ہو چکے‘ پھر کیا اگر وہ مر گیا یا مارا گیا تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور جو الٹے پاؤں پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔‘‘

پھر اگلی امتوں کا حال سنا کر تسلی دی جاتی اور صبر و ثبات اور استقامت کی تعلیم دی جاتی ہے۔

﴿وَ كَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ مَا ضَعُفُوْا وَ مَا اسْتَكَانُوْا وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ○ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ○﴾ (آل عمران: ۱۴۶۔۱۴۷)

’’اور کتنے پیغمبر ہیں کہ ان کے ساتھ ہو کر بہت سے خدا والے لوگ لڑے‘ تو پھر ان کو خدا کی راہ میں کچھ دکھ پڑا تو ہمت نہیں ہارے‘ اور نہ کمزور ہوئے اور نہ دب گئے۔ اور اللہ ثابت رہنے والوں کو پیار کرتا ہے اور نہ تھا ان کا کہنا‘ مگر یہی کہا اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہ اور ہم سے اپنے کام میں جو زیادتی ہوئی اس کو بخش دے اور ہمارے قدم جمائے رکھ‘ اور ہم کو کافر قوم پر مدد دے۔‘‘

سچے اور مخلص مسلمانوں کی استقامت اور ثبات قدم کی یہی کیفیت ہونی چاہیے اس ایمانی استقامت ہی کے برابر ایک اور چیز استقامتِ عمل ہے جس کا نام مداومت ہے‘ یعنی جس خوبی اور بھلائی کے کام کو اختیار کیا جائے۔ اس پر مرتے دم تک مداومت رہے‘ اس کو ہمیشہ اور ہر حال میں کیا جائے‘ ایسا نہ ہو کہ کبھی کیجیے اور کبھی نہ کیجیے کہ اس سے طبیعت کی کمزوری اور اس کام سے دل کا بے لگاؤ ہونا ظاہر ہوتا ہے‘ نماز پڑھنا انسان کے سب سے اچھے کاموں میں سب اچھا کام ہے مگر اللہ تعالیٰ نے تعریف ان مسلمانوں کی کی ہے جو اس پر مداومت رکھتے ہیں‘ فرمایا:

﴿اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ○﴾ (معارج: ۲۲۔۲۳)

’’لیکن وہ نمازی جو اپنی نماز پر مداومت رکھتے ہیں (یعنی ہمیشہ پڑھا کرتے ہیں)۔‘‘

اخلاق کی یکسانی! اخلاق کا بڑا جوہر ہے اور اس کی مشق مداومتِ عمل سے ہوتی ہے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے بار بار اس کی تلقین فرمائی ہے‘ ام المومنین حضرت عائشہؓ صدیقہ سے کسی نے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کو کون سا عملِ نیک سب سے زیادہ محبوب تھا‘ فرمایا وہ نیکی جس پر مداومت کی جائے۔ (۱) خود آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ خدا کے نزدیک سب سے بہتر عمل وہ ہے جس کو ہمیشہ کیا جائے‘ اگرچہ وہ تھوڑا ہو۔‘‘ (۲)

حق گوئی

یہ اخلاقی وصف بھی درحقیقت شجاعت ہی سے تعلق رکھتا ہے‘ جس طرح میدانِ جنگ میں دونوں طرف کی

(۱)و(۲) صحیح بخاری باب القصد و مداومۃ العمل۔

مسلح فوجیں ایک دوسرے کے مقابل میں ہاتھ پاؤں سے شجاعت اور پامردی کا اظہار کرتی ہیں بعینہٖ اسی طرح جب حق و باطل کے درمیان باہم معرکہ آرائی ہوتی ہے تو دل اور زبان کی مشترکہ قوت سے حق کی حمایت میں جو آواز بلند کی جاتی ہے اسی کا نام حق گوئی ہے۔

حق گوئی کا اظہار اس وقت سب سے زیادہ قابلِ ستائش سمجھا جاتا ہے' جب مادی قوت کے لحاظ سے حق کمزور اور باطل طاقتور ہو' اور اسلام نے اسی قابلِ ستائش حق گوئی کی تعلیم دی ہے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے:

﴿فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ○ اِنَّا كَفَيۡنٰكَ الۡمُسۡتَهۡزِءِيۡنَ ○ الَّذِيۡنَ يَجۡعَلُوۡنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ﴾ (الحجر:۹۴۔۹۶)

''پس تم کو جو حکم دیا گیا ہے' اس کو کھول کر سنا دو' اور مشرکین کی مطلق پروانہ کرو' ہم تم کو تمہاری ہنسی اڑانے والوں کے مقابلہ میں جو خدا کے ساتھ دوسرے معبود قرار دیتے ہیں' کافی ہیں۔''

یعنی اب مخفی طور پر دعوت توحید کا زمانہ گزر گیا' اور علانیہ اس کی دعوت دینے کا وقت آ گیا' اس لیے کھلم کھلا خدا کے اس حکم کو بیان کرو' اور مشرکین اس کی ہنسی اڑائیں تو ان کے تمسخر اور استہزا کی مطلق پروانہ کرو بلکہ ان کی قوت و طاقت کی بھی پروانہ کرو' سب کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ بس ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کو جو چیز حق گوئی سے باز رکھتی ہے' وہ خوف ہے جس کی مختلف قسمیں ہیں۔ ایک خوف تو لعنت ملامت کا ہے جس کو اس آیت میں بے اثر کیا گیا ہے' اور ایک دوسری آیت میں اس کو مسلمانوں کا ایک معیاری اخلاقی وصف قرار دیا گیا ہے۔

﴿وَلَا يَخَافُوۡنَ لَوۡمَةَ لَآئِمٍ﴾ (مائدہ:۵۴)

''اور یہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔''

یعنی اہلِ ایمان حق کے اظہار میں لوگوں کے لعن وطعن کی پروا نہیں کرتے۔

لعنت ملامت کے ساتھ جان و مال اور بہت سی دوسری چیزوں کا خوف بھی انسان کو حق گوئی سے باز رکھ سکتا ہے' لیکن اسلام نے حق گوئی کے مقابل میں ہر قسم کے خوف کو بے اثر کر دیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا کسی کو جب کوئی حق بات معلوم ہو تو اس کے کہنے سے چاہیے کہ انسانوں کا خوف مانع نہ ہو'' ایک بار آپؐ نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھے صحابہؓ نے کہا یا رسول اللہ! ہم میں کوئی شخص اپنے آپ کو کیونکر حقیر سمجھ سکتا ہے؟ فرمایا اس طرح کہ اس کو خدا کے بارے میں ایک بات کے کہنے کی ضرورت ہو اور وہ نہ کہے۔ ایسے شخص سے خدا قیامت کے دن کہے گا کہ تم کو میرے متعلق فلاں فلاں بات کے کہنے سے کس چیز نے روکا؟ وہ کہے گا کہ انسانوں کا خوف' ارشاد ہوگا کہ تم کو سب سے زیادہ میرا خوف کرنا چاہیے تھا۔

انسانوں کے مختلف گروہوں میں سب سے زیادہ ہیبت ناک شخصیت ظلم پیشہ بادشاہوں کی ہوتی ہے' اس لیے ان کے سامنے حق گوئی کو آپ ؐ نے سب سے بڑا جہاد قرار دیا اور فرمایا:

((افضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جابر))

''بہترین جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات کا کہنا ہے۔''

دوسری روایت میں کلمۂ حق کا لفظ ہے۔

اسلام میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جو مدارج قرار دیے گئے ان میں دوسرا درجہ اسی حق گوئی کا ہے۔ چنانچہ ایک بار مروان نے عید کے دن منبر نکالا اور نماز سے پہلے خطبہ دینا شروع کیا۔ اس پر ایک شخص نے کہا کہ مروان تم نے سنت کی مخالفت کی' آج تم نے منبر نکالا۔ حالانکہ آج منبر نہیں نکالا جاتا تھا' نماز سے پہلے خطبہ دیا' حالانکہ نماز سے پہلے خطبہ نہیں دیا جاتا تھا' اس پر حضرت ابوسعید خدریؓ نے فرمایا کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا' رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد میں نے سنا ہے کہ ''تم میں جو شخص برائی دیکھے اور اس کو ہاتھ سے مٹانے کی طاقت رکھتا ہو تو ہاتھ سے مٹا دے ورنہ زبان سے' اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے لیکن یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔ (۱)

صحابہؓ میں حضرت ابوذر غفاریؓ کا رتبہ حق گوئی میں بدرجۂ کمال تھا۔ یہ وہی تھے جنہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد کفارِ قریش کے بھرے مجمع میں حرم میں جا کر توحید کا نعرہ بلند کیا' اور اس وقت تک خاموش نہ ہوئے جب تک مار کھاتے کھاتے بیدم نہ ہو گئے لیکن اس پر بھی ان کا نشہ نہیں اترا' اور دوسرے دن پھر جا کر اعلانِ حق کیا اور وہی سزا پائی۔ آنحضرت ﷺ نے ان کی مدح میں فرمایا کہ ''آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر ابوذرؓ سے زیادہ حق گو کوئی نہیں۔'' (۲) چنانچہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں وہ جب شام میں تھے تو وہاں کے مسلمانوں میں سرمایہ داری کی جو غیر اسلامی شان پیدا ہو رہی تھی اس پر انہوں نے بے محابا دارو گیر کی' اور اس میں امیر معاویہؓ کی پروا انہوں نے ذرا بھی نہیں کی۔

حضرت ابوسعیدؓ خدری کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ ایک لمبا خطبہ دیا جس میں فرمایا ''ہشیار رہنا کہ کسی کی ہیبت تم کو اس حق بات کے کہنے سے باز نہ رکھے' جو تم کو معلوم ہے۔'' یہ سن کر حضرت ابوسعیدؓ روئے اور فرمایا کہ افسوس ہم نے ایسی باتیں دیکھیں اور ہیبت میں آ گئے۔ (۳)

---

(۱) سنن ابی ماجہ باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر میں تمام حدیثیں مذکور ہیں۔

(۲) جامع ترمذی مناقب حضرت ابی ذرؓ۔

(۳) ترغیب وترہیب منذری ۲' باب الترہیب من الغضب بحوالہ ترمذی۔

استغنا

استغنا کے معنی بے نیازی کے ہیں اور ہر چیز سے بے نیازی ایک ایسا وصف ہے جو صرف خداوند تعالیٰ ہی کو حاصل ہے۔

﴿وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (آل عمران:۹۷)

''اور جو (مقدور رکھے پیچھے نعمت کی) ناشکری کرے (اور حج کو نہ جائے) تو اللہ دنیا جہان سے بے نیاز ہے۔''

انسان کی بے نیازی یہ ہے کہ اس ذاتِ بے نیاز کے سوا دوسروں سے بے نیاز ہو اور یہی چیز اسلامی بے نیازی کے سبق کو دوسرے اسباق سے ممتاز کرتی ہے۔ اسلام کے آئینِ اخلاق میں اس استغنا اور بے نیازی کی تعلیم دو اصولوں پر قائم ہے' اول یہ کہ جو کچھ ملتا ہے اس کا دینے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے اس لیے اس کے سوا کسی اور کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا جائے قرآن مجید کی وہ سورت جس کو ہم ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں دہراتے ہیں۔ اس کی ایک درمیانی آیت یہ ہے۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔

''(اے خدا) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔''

خدا نے جابجا اپنے کو بندہ کا اصلی کارساز اور کارفرما بتا کر ان کے مضطرب دلوں کو تسکین دی ہے' فرمایا:

﴿وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ (آل عمران:۱۷۳)

''اور کیسا اچھا کارساز۔''

﴿وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا﴾ (نساء:۸۱)

''اور اللہ کارساز بس ہے۔''

﴿اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا﴾ (بنی اسرائیل:۲)

''میرے سوا کسی کو کارساز نہ بناؤ۔''

﴿وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا﴾ (نساء۱۱)

''اور اللہ کارساز بس ہے۔''

ایک آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے پوچھتا ہے۔

﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ﴾ (زمر:۳۶)

''کیا اللہ اپنے بندہ کو بس نہیں۔''

اس لیے کسی شاہ امیر اور دولت مند کے دروازہ کو جھانکنے کی ضرورت نہیں۔

دوسرا اصول جس پر اسلامی استغنا کی بنیاد ہے، وہ قناعت ہے یعنی یہ کہ کم سے کم جو ملا ہے اس پر طمانیت حاصل کی جائے اور زیادہ کی حرص اور لالچ نہ کیا جائے۔

﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (نساء:۳۲)

''اور جس چیز میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی اس کی ہوس مت کرو۔''

﴿وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ﴾ (طٰہٰ:۱۳۱)

''اور اپنی آنکھیں نہ پسار اس کی طرف جو ہم نے ان میں سے طرح طرح کے لوگوں کو سامان دیا ہے۔''

بعض لوگ باوجود دولت مند ہونے کے نہایت حریص ہوتے ہیں۔ مال و دولت سے ان کی نیت نہیں بھرتی اور اس کو ہر جائز و ناجائز طریقے سے حاصل کرتے ہیں۔ اس لیے وہ باوجود دولت مند ہونے کے محتاج ہوتے ہیں۔ لیکن ایک شخص بہت زیادہ دولت مند نہیں ہوتا تاہم خدا نے اس کو جو کچھ دیا ہے اس پر قانع رہتا ہے اور اس سے زیادہ کی حرص نہیں کرتا۔ اس لیے وہ باوجود مال کی کمی کے مستغنی اور بے نیاز ہے۔ اس بنا پر استغناء و بے نیازی کا تعلق دولت کی کمی اور بیشی سے نہیں ہے، بلکہ روح اور قلب سے ہے اور اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

((ليس الغنى عن كثرة العروض و لكن الغنى غنى النفس))

''دولت مندی مال و اسباب کی کثرت کا نام نہیں ہے بلکہ اصلی دولت مندی دل کی بے نیازی ہے۔''

اس حدیث کا ترجمہ شیخ سعدی نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے تونگری بدل است نہ بہ مال۔

ایک اور حدیث میں اس نکتہ کو آپ ﷺ نے اور بھی زیادہ واضح طور پر بیان فرمایا۔ حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ابوذرؓ تمہارے خیال میں مال کی کثرت کا نام بے نیازی ہے؟ میں نے کہا ''ہاں'' فرمایا تو تمہارے خیال میں مال کی قلت کا نام محتاجی ہے؟ میں نے کہا ''ہاں'' فرمایا بے نیازی دل کی بے نیازی ہے اور محتاجی دل کی محتاجی۔ (۱) اس بنا پر بے نیازی درحقیقت رضا و تسلیم سے پیدا ہوتی ہے، مال و دولت سے پیدا نہیں ہوتی، یعنی خدا انسان کو جو کچھ دے دے اگر وہ اس پر دل سے راضی ہو جائے تو اسی کا نام بے نیازی ہے یا کم از کم اس سے بے نیازی کا جوہر نفس میں پیدا ہوتا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوہریرہؓ کو یہی تعلیم دی اور ان سے فرمایا کہ جو کچھ تمہاری قسمت میں ہے اگر تم اس پر راضی ہو جاؤ، تو سب سے زیادہ بے نیاز ہو جاؤ گے۔ (۲) ایک بار چند انصاریوں نے آپ ﷺ سے مال کا سوال کیا اور آپ ﷺ نے ان کا سوال پورا کیا۔ لیکن وہ اس پر راضی نہیں ہوئے اور پھر سوال کیا۔ آپ ﷺ نے پھر ان کا سوال پورا کیا۔ جب دیتے دیتے تمام مال ختم ہو چکا تو فرمایا کہ میرے پاس جو کچھ مال ہوگا میں تم سے بچا کر جمع نہ کروں گا جو شخص خودداری چاہتا ہے خدا اس کو خوددار بناتا ہے

(۱) فتح الباری ج ۱۱ ص ۲۳۲ بحوالہ صحیح ابن حبان و موارد الظمان زوائد ابن حبان للہیثمی قلمی نسخہ دار المصنفین باب الغنی غنی النفس۔

(۲) فتح الباری جلد ۱۱ صفحہ ۲۳۴۔

اور جو شخص بے نیازی حاصل کرنا چاہتا ہے خدا اس کو بے نیاز کر دیتا ہے۔ [1] اسی طرح ایک بار حضرت حکیم بن حزامؓ نے آپؐ سے بار بار مال کا سوال کیا۔ اور آپؐ نے ہر بار ان کا سوال پورا کیا لیکن آخیر میں فرمایا کہ اے حکیم یہ مال نہایت مرغوب چیز ہے جو شخص اس کو کھلے دل سے لیتا ہے خدا اس میں برکت دیتا ہے اور جو شخص اس کو حرص کے ساتھ لیتا ہے اس میں برکت نہیں ہوتی اور اس شخص کے مثل ہوتا ہے جو کھاتا ہے لیکن اس کا پیٹ نہیں بھرتا' ان پر اس تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ انہوں نے اس کے بعد کسی کا عطیہ قبول نہیں کیا۔ [2]

فضالہؓ بن عبید سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خوش خبری ہو اس کو جس کو اسلام کی ہدایت ملی' اور اس کی روزی ضرورت کے مطابق ہے اور اللہ نے اس کو اس پر قانع بنا دیا ہے۔ [3] حضرت سہل بن سعدؓ کہتے ہیں کہ جبریل امینؑ نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا کہ مومن کا شرف رات کی نماز اور مومن کی عزت انسانوں سے بے نیاز ہو جانا ہے۔ [4]

❀❀❀

(۱) ابوداؤد کتاب الزکوۃ باب فی الاستعفاف۔

(۲) ترمذی کتاب الزہد۔

(۳) زوائد صحیح ابن حبان قلمی نسخہ دار المصنفین باب فی القناعۃ۔

(۴) مستدرک حاکم ج۴ ص ۳۵۲ کتاب الرقاق۔

رذائل

رذائل کے معنی

رذائل (یعنی بری خصلتیں) وہ اخلاقِ ذمیمہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے جن سے بچنے کا حکم اس نے اپنے بندوں کو دیا ہے جن کے کرنے والے اس کے حضور میں گناہ گار ٹھہرتے ہیں۔ جن کی برائی کو ہر عقل مند جانتا اور مانتا ہے اور جن کے بدولت انسانی افراد اور جماعتوں کو روحانی اور مادی نقصانات پہنچتے ہیں اور ان کی معاشرت تباہ ہو جاتی ہے بلکہ جب وہ کسی قوم میں عام ہو جاتے ہیں تو پوری قوم کی تباہی و بربادی کا سبب بن جاتے ہیں۔ یعنی اس کی دینی و دنیاوی ترقیوں کی راہیں مسدود اور سعادت و اقبال کا دروازہ اس پر بند ہو جاتا ہے۔

رذائل کے قرآنی نام

اس قسم کے رذائل کے متعدد اوصافی نام قرآن پاک میں آئے ہیں' مثلاً اکثر ان کو ﴿منکر﴾ (بری باتیں) اور ﴿فحشاء﴾ (بے حیائی) اور کبھی ﴿فاحشة﴾ (فحش) ﴿سيئة﴾ (برا) ﴿سوء﴾ (برائی) ﴿مکروہ﴾ (ناپسندیدہ) ﴿خطاء﴾ (ناصواب یا بھول) ﴿اثم﴾ (گناہ) ﴿عدوان﴾ (زیادتی) وغیرہ کہا گیا ہے ان ہی لفظوں سے اندازہ ہوگا کہ رذائل سے متصف ہونا کتنا گھنونا اور نفرت کے قابل ہے اور یہ کہ وہ ایسے کام ہیں جو عقل اور شرع دونوں کی نگاہوں میں بدنما ہیں فرمایا:

﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ اِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًاO وَ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ سَآءَ سَبِيْلًا O...... وَ لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَ لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًاO كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا﴾ (بنی اسرائیل: ۳۱-۳۲......۳۷-۳۸)

''اور اپنے بچوں کو مفلسی کے ڈر سے مت مار ڈالو ہم ہیں ان کو اور تم کو روزی پہنچاتے' بے شبہ ان کا مار ڈالنا بڑی چوک ہے اور زنا کے پاس مت جاؤ بے شبہ یہ بے حیائی اور بری راہ ہے......اور زمین میں اترا کر نہ چل کہ تو زمین کو پھاڑ ڈالے گا اور نہ لمبائی میں پہاڑ کو پہنچ جائے گا۔ ان میں سے جو بری بات ہے وہ تیرے پروردگار کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔''

رذائل کے لیے قرآن پاک کا سب سے عام لفظ منکر ہے' چنانچہ سورہ مائدہ میں جن برائیوں کی روک تھام نہ کرنے پر بنی اسرائیل کو ملامت کی گئی ہے ان کو ایک ہی لفظ منکر سے ادا کیا گیا ہے۔

﴿كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ﴾ (مائدہ:۷۹)

''وہ ایک دوسرے کو اس منکر سے جو کرتے تھے روکتے نہ تھے کیا برا کام ہے جو وہ کرتے تھے۔''

اس بدکار قوم کی برائیاں گنائی جارہی ہیں۔اس سلسلہ میں ہے:

﴿وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ﴾ (عنکبوت:۲۹)

''اور تم اپنی مجلس میں منکر کے مرتکب ہوتے ہو۔''

اچھے لوگوں کی صفت یہ ہے:

﴿وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (توبہ:۱۱۲)

''اور منکر سے منع کرنے والے۔''

﴿وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران:۱۰۴، وتوبہ:۶۷)

''اور منکر سے منع کرتے ہیں۔''

اور کہیں ﴿فحشاء﴾ اور ﴿منکر﴾ کا لفظ ساتھ ساتھ آیا ہے۔

﴿فَاِنَّه يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ﴾ (نور:۲۱)

''اور فحشا اور منکر کا حکم دیتا ہے۔''

نماز کی خوبی یہ ہے کہ:

﴿تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ﴾ (عنکبوت:۴۵)

''وہ فحشا اور منکر سے باز رکھتی ہے۔''

فحشا منکر اور بغی

کہیں آیت میں تین لفظ جمع ہیں، فحشا، منکر، اور بغی۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِيْتَآءِ ذِى الْقُرْبٰى وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ (نحل:۹۰)

''(مسلمانو!) اللہ انصاف اور احسان کرنے کا اور قرابت والوں کو دینے کا حکم دیتا ہے، اور فحشا اور منکر اور بغی سے منع فرماتا ہے تم لوگوں کو نصیحتیں کرتا ہے تاکہ تم خیال رکھو۔''

یہ آیت ہر قسم کے فضائل اور رذائل کو محیط ہے، حضرت عثمانؓ بن مظعون کا بیان ہے کہ میں پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرم وحیا سے اسلام لایا تھا، اسلام نے میرے دل میں جگہ نہیں پکڑی تھی، لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی تو ایمان نے میرے دل میں جگہ پکڑ لی۔[1]

(۱) مسند احمد بن حنبل عن ابن عباسؓ۔

حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ قرآن مجید میں خیر وشر کی سب سے زیادہ جامع آیت یہی ہے۔ [1]

قتادہؒ کہتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں جن اخلاقِ حسنہ پر عمل کیا جاتا تھا اور وہ پسند کیے جاتے تھے ان میں کوئی خلق ایسا نہیں ہے جس کا خدا نے اس آیت میں حکم نہ دیا ہو اور کوئی بد اخلاقی ایسی نہیں ہے جس کی آیت میں ممانعت نہ کی ہو۔ [2]

اس آیت میں منہیات کے سلسلہ میں تین لفظ آئے ہیں ﴿فَحْشَآءَ﴾ اور ﴿منکر﴾ اور ﴿بغی﴾ ان میں سے ہر ایک لفظ کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے۔

فحشاء کے معنی

ان میں پہلا لفظ ﴿فَحْشَآءُ﴾ ہے جس کی دوسری صورت ﴿ فَاحِشَةٌ﴾ کی ہے یہ لفظ فحش سے نکلا ہے۔ جس کے اصلی معنی حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں۔ [3] اور اس کے دوسرے لازمی معنی قبح یعنی برائی کے ہیں کیونکہ جس چیز کی جو حد خالقِ فطرت نے مقرر کر دی ہے اس سے آگے بڑھنا قبح یعنی برائی ہے یا یہ کہ برائی حد سے زیادہ ہو جائے وہی فحشاء کہلاتی ہے۔ قرآن پاک نے گناہ کے معنی میں حدودِ الٰہی سے تعدی اور تجاوز کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں، مثال سے یوں سمجھیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی قوتِ شہوانی کی تسکین کے لیے کچھ حدیں مقرر فرما دیں۔ اب جو ان حدود سے آگے بڑھتا ہے وہ تعدیِ حدود اور فحشا اور فاحشہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ فرمایا:

﴿وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ○ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ○ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ○﴾ (مومنون: ۵۔۷)

''اور جو اپنی شرمگاہوں کی نگہبانی کرتے ہیں، لیکن اپنی بیویوں پر یا اپنے ہاتھ کی مملوکہ پر، تو انہیں ملامت نہیں کی جائے گی، پھر جو کوئی اس کے سوا کو ڈھونڈے تو وہی حد سے بڑھنے والے ہیں۔''

اور وسعت کے ساتھ اس کا اطلاق ہر فحش گوئی اور فحش کاری پر ہوتا ہے جس کی ہر نوع سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ کو باز رہنے کی تاکید کی ہے۔

منکر کے معنی

دوسرا لفظ منکر ہے اس کے لغوی معنی ناشناسا کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو کام لوگوں میں عام طور سے پسند کیا جاتا ہے اور جس کا کرنے والا لوگوں میں ممدوح ہوتا ہے، وہ تو جانا پہچانا کام ہے اسی لیے اس کو ﴿مَعْرُوْفٌ﴾ (شناسا) کہتے ہیں اور جو کام ہر طبقہ میں ناپسند کیا جاتا ہے اور اس کا کرنے والا سب کی نگاہ سے گر جاتا ہے وہ

(۲) مستدرک حاکم ج ۲ ص ۳۵۲ وابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور۔

(۳) ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور۔

(۴) الصحاح للجوہری لفظ فحش ولسان العرب لفظ فاحش زیر ''فحش''

﴿مُنکر﴾ (ناشناسا) ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے کچھ ناشناسا مہمان آجاتے ہیں تو وہ کہتے ہیں۔

﴿قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ﴾ (حجر:۶۲ والذاریات:۲۵)

''یعنی لوگ ان جانے اور ان پہچانے ہیں۔''

حضرت یوسفؑ کے سامنے جب ان کے بھائی آئے تو انہوں نے تو پہچان لیا۔ مگر وہ لوگ ان کو پہچان نہ سکے‘ اس موقع پر قرآن میں ہے:

﴿فَعَرَفَهُمْ وَ هُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ﴾ (یوسف:۵۸)

''یعنی یوسف نے تو ان کو پہچان لیا مگر وہ ان کو پہچان نہ سکے۔''

ناگواری کی حالت میں انسان کا چہرہ ہر شخص کو نظر آتا ہے کہ وہ کس طرح بگڑ جاتا ہے اور اس کے طور و انداز سے بداہتاً ناگواری ظاہر ہونے لگتی ہے‘ یہ کیفیت بھی منکر ہے۔ فرمایا:

﴿وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا﴾ (حج:۷۲)

''اور جب ان (کافروں) کو ہماری کھلی ہوئی آیتیں سنائی جائیں‘ تو کافروں کے چہروں میں تو منکر (بگڑی ہوئی شکل) پہچانے گا‘ نزدیک ہوتے ہیں کہ وہ ان پر جو ہماری آیتیں سناتے ہیں حملہ کر بیٹھیں۔''

اس آیت میں ناخوش گواری کے اثر سے چہرہ میں جو بدنمائی پیدا ہوتی ہے۔ اس کو منکر کہا گیا ہے‘ ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ منکر وہ کام ہیں جن کو ہر شخص فطرۃً اور بلاشبہ ناپسند کرتا ہے اور ان کی برائی ایسی کھلی ہوتی ہے کہ اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی اور یہی سبب ہے کہ ہر مذہب و ملت اور ہر اچھے تمدن و تہذیب میں وہ یکساں برے سمجھے جاتے ہیں۔

بغی کے معنی

تیسرا لفظ بغی ہے جس کے لفظی معنی کسی پر زیادتی یا دست درازی کرنا ہیں۔

﴿خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ﴾ (صٓ:۲۲)

''ہم دو جھگڑنے والے ہیں‘ ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔''

خدا فرماتا ہے کہ اگر لوگوں کو بے انتہا دولت دے دی جائے تو وہ ایک دوسرے پر زیادتی کرنے لگیں۔

﴿وَ لَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ﴾ (شوریٰ:۲۷)

''اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لیے روزی پھیلا دے تو وہ زمین میں زیادتی کریں۔''

اسی سورہ میں ہے۔

﴿اِنَّمَا السَّبِیۡلُ عَلَی الَّذِیۡنَ یَظۡلِمُوۡنَ النَّاسَ وَ یَبۡغُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ﴾ (شوریٰ: ۴۲)

''راہ ان ہی پر ہے جولوگوں پر ظلم اور زمین میں زیادتی کرتے ہیں۔''

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ بغی کے معنی دوسروں پر زیادتی اور تعدی کے ہیں۔

اخلاقِ ذمیمہ برے کیوں ہیں

اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ رذائل تین یعنی ﴿فَحۡشَآءَ مُنۡکَرٍ﴾ اور ﴿بَغۡی﴾ میں منحصر ہیں صفاتِ ذمیمہ ﴿فَحۡشَآءُ﴾ یعنی حد درجہ قبیح اور بے حیائی کے کام ہیں اور ایسی باتیں ہیں جن کو سارے انسان فطرۃً ناپسند کرتے ہیں اور ان کے جائز کر دینے سے دوسرے کے حقوق پر تعدی لازم آتی ہے۔

سورہ اعراف کی ایک آیت ہے۔

﴿قُلۡ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الۡفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنۡهَا وَ مَا بَطَنَ وَالۡاِثۡمَ وَ الۡبَغۡیَ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ﴾ (اعراف: ۳۳)

''اے پیغمبر! کہہ دے کہ میرے پروردگار نے برائی کے سارے کاموں (فواحش) کو جو کھلے ہوں یا چھپے اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو منع کیا ہے۔''

اس آیت میں بھی رذائل کو تین لفظوں میں منحصر کیا ہے ایک فواحش یعنی برائی اور بے حیائی کے سارے کام جو کھلے ہوں یا چھپے' دوسرے گناہ کے کام' اور تیسرے ناحق زیادتی۔ ان اخلاقِ ذمیمہ کی جن کو ہر مذہب اور ہر انسانی معاشرت نے یکساں برا کہا ہے' اگر تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ درحقیقت برائی اور بے حیائی کے کام ہیں اور دین وشرافت کی نگاہ میں گناہ اور ناپسندیدہ ہیں اور اگر ان کو جائز ٹھہرایا جائے تو افراد کے باہمی حقوق سے امان اٹھ جائے اور کسی کی جان و مال اور عزت وآبرو سلامت نہ رہے۔ (۱)

رذائل کی ترتیب

ان رذائل کی ترتیب دو نظریوں کے مطابق دی جاسکتی ہے' ایک یہ کہ کسی برائی کے اثر کا دائرہ کتنا وسیع ہے' اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ناپسندیدگی اور عدمِ رضا سے کس کو کتنا لگاؤ ہے' اوپر کی آیت میں ترغیب کے ساتھ رذائل کو تین بڑے عنوانوں میں گویا تقسیم کر دیا گیا ہے سب سے پہلے ﴿فَحۡشَآءُ﴾ پھر ﴿مُنۡکَرٍ﴾ پھر ﴿بَغۡیِ﴾

﴿فَحۡشَآءُ﴾ میں جس برائی کی طرف اشارہ ہے وہ اساسًا ایک فرد کی ذات تک محدود رہتی ہے' جیسے ننگے رہنا' بدکاری میں مبتلا ہونا وغیرہ ﴿مُنۡکَرٍ﴾ سے پوری جماعت کی معاشرتی زندگی متاثر ہوتی ہے' جیسے شوہر کا ظلم'

(۱) منطقی اصطلاح میں ﴿فَحۡشَآءُ مُنۡکَرٍ﴾ اور بغی میں مانعۃ الخلو ہے' یعنی کسی بداخلاقی میں ان تینوں کا اجتماع تو ہوسکتا ہے مگر کوئی بداخلاقی ان تینوں میں سے کسی ایک سے خالی نہیں رہ سکتی یعنی ہر بداخلاقی میں تینوں کا یا تینوں میں سے ایک کا پایا جانا ضروری ہے۔

باپ کی سنگ دلی، اولاد کی نالائقی اور ﴿بَغْیٌ﴾ جماعت سے آگے بڑھ کر پورے ملک وملت کو چھالیتی ہے جیسے چوری، قتل ڈاکہ وغیرہ۔

یہ تو ایک نظریہ کے مطابق رذائل کی ترتیب ہوئی دوسرے نظریہ کے رو سے پہلے صفاتِ ذمیمہ ہیں جن سے خدا کی رحمت چھن جاتی ہے پھر وہ برائیاں ہیں جو خدا کی محبت سے محروم کر دیتی ہیں اور پھر وہ ہیں جو رضائے الٰہی سے خالی ہیں۔

جھوٹ

انسان کے سارے اخلاقِ ذمیمہ میں سب سے زیادہ بری اور مذموم عادت جھوٹ کی ہے، یہ جھوٹ خواہ زبان سے بولا جائے یا عمل سے ظاہر کیا جائے، کیونکہ ہمارے تمام اعمال کی بنیاد اس پر ہے کہ وہ واقعہ کے مطابق ہوں، اور جھوٹ ٹھیک اس کی ضد ہے۔ اس لیے یہ برائی ہر قسم کے قولی اور عملی برائیوں کی جڑ ہے۔ انسان کے دل کے اندر کی بات سوا خدا کے کوئی دوسرا نہیں جانتا، کوئی دوسرا کسی شخص کے متعلق اگر کچھ جان سکتا ہے یا باور کر سکتا ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص خود اپنی زبان سے یا عمل سے ظاہر کرے۔ اب اگر وہ اپنی اندرونی صحیح اور واقعہ کے مطابق بات جان بوجھ کر نہیں ظاہر کرتا بلکہ اس کے خلاف ظاہر کر رہا ہے تو وہ ساری دنیا کو فریب دے رہا ہے، ایسے شخص میں دنیا کی جو برائیاں بھی نہ ہوں وہ کم ہے کیونکہ اس نے تو اسی آئینہ کو توڑ ڈالا جس میں حقیقت کا چہرہ نظر آتا ہے۔

اسی لیے نبی کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ صادق ہو، چنانچہ بعض پیغمبروں کے لیے یہ صفت کے طور پر بولا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَ اذْکُرْ فِی الْکِتَابِ اِدْرِیْسَ اِنَّهٗ کَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا﴾ (مریم:۵۶)

''اور اس کتاب میں ادریس کا ذکر کر، وہ بے شک بڑا سچا نبی تھا۔''

اسی لیے جو کاذب ہے وہ نبی نہیں ہو سکتا، کیونکہ پھر اس کے دعویٰ اور پیام پر کسی کو بھروسہ کیونکر ہوگا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنی نبوت کا دعویٰ فرعون کے سامنے پیش کیا، اور اس نے اس کے ماننے سے انکار کیا تو اس کے ایک درباری نے جو دل میں مسلمان تھا فرعونیوں کے سامنے حضرت موسیٰ کے صدقِ نبوت پر ان کی عام سچائی ہی سے دلیل پیش کی، اور کہا کہ جھوٹا خدا کا نبی نہیں ہو سکتا۔

﴿وَ اِنْ یَّکُ کَاذِبًا فَعَلَیْهِ کَذِبُهٗ وَ اِنْ یَّکُ صَادِقًا یُّصِبْکُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُکُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ کَذَّابٌ﴾ (مومن:۲۸)

''اگر یہ جھوٹا ہوگا تو اس کا جھوٹ اسی پر پڑے گا اور اگر سچا ہوگا تو تم پر پڑے گا کوئی وعدہ جو تم کو دیتا ہے بے شک اللہ اس کو راہ نہیں دکھاتا جو بے باک جھوٹا ہو۔''

اس میں یہ تلمیح بھی چھپی ہے کہ مدعیِ نبوت کے برخلاف فرعون اپنے ہر کام کر گزرنے میں بے باک اور جھوٹا ہے' اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹے انبیاء علیہم السلام کی راہ سے ہٹے ہوئے ہیں' اور کفار کے طور وطریق پر چلتے ہیں روم کے قیصر نے بھی اپنے دربار میں ابوسفیان سے جو باتیں پوچھی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ مکہ کا مدعی اپنے دعوائے نبوت سے پہلے کیا جھوٹ بولا کرتا تھا۔ ابوسفیان نے جواب دیا نہیں۔ قیصر نے کہا جو بندہ پر جھوٹ نہیں باندھتا وہ خدا پر جھوٹ باندھے گا؟ یہ نہیں ہوسکتا۔ (۱)

قرآن پاک میں نبی کی صداقت کی دلیل میں ایک آیت ہے:

﴿تَنَزَّلُ عَلٰی کُلِّ اَفَّاکٍ اَثِیْمٍ ○ یُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَ اَکْثَرُھُمْ کٰذِبُوْنَ﴾ (شعراء: ۲۲۲۔ ۲۲۳)

''شیطان اترتے ہیں ہر جھوٹے گناہ گار پر' لا ڈالتے ہیں سنی بات اور بہت ان میں جھوٹے ہیں۔''

اس سے بھی معلوم ہوا کہ جھوٹ انبیائے کرام علیہم السلام کی سنت اور روش کے سراسر خلاف ہے اسی لیے جو جھوٹا ہوتا ہے اس کے دل سے خدا کی روشنی (ہدایت) بجھ جاتی ہے' ارشاد ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ کٰذِبٌ کَفَّارٌ﴾ (زمر: ۳)

''بے شک اللہ اس کو راہ نہیں دکھاتا جو جھوٹا ہے احسان نہیں مانتا۔''

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جھوٹ گناہ (فجور) کی طرف لے جاتا ہے' اور گناہ دوزخ میں اور جھوٹ بولتے بولتے آدمی خدا کے ہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے۔ (۲)

حضرت عبداللہ بنؓ عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ یارسول اللہ ﷺ! جنت میں لے جانے والا کام کیا ہے؟ فرمایا سچ بولنا' جب بندہ سچ بولتا ہے تو نیکی کا کام کرتا ہے' وہ ایمان سے بھرپور ہوتا ہے اور جو ایمان سے بھرپور ہوا وہ جنت میں داخل ہوا۔ اس نے پھر پوچھا کہ یارسول اللہ! دوزخ میں لے جانے والا کام کیا ہے؟ فرمایا جھوٹ بولنا' جب بندہ جھوٹ بولے گا تو گناہ کے کام کرے گا اور جب گناہ کے کام کرے گا تو کفر کرے گا۔ اور جو کفر کرے گا دوزخ میں جائے گا۔ (مسند احمد اول ص ۱۷۶ مصر)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جھوٹ کی برائی کی وسعت اتنی ہے کہ کفر بھی اس میں آ جاتا ہے جس سے زیادہ بری چیز کوئی دوسری نہیں' اور جس کے لیے نجات کا ہر دروازہ بند ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دائرہ بہت وسیع ہے' وہ دنیا کے ذرہ ذرہ کو گھیرے ہوئے ہے' اس کی رحمت کی چھاؤں میں ساری کائنات آرام کر رہی ہے مگر رحمتِ الٰہی کے اس گھنے سایہ سے وہ باہر ہے جس کا منہ جھوٹ کے بادِ سموم

(۱) صحیح بخاری بدء الوحی۔

(۲) صحیح بخاری کتاب الادب۔ وجامع ترمذی باب ماجاء والکذب وابوداؤد کتاب الادب باب التشدید فی الکذب۔

سے جھلس رہا ہے۔

اسلام کے لغت کا سخت ترین لفظ ''لعنت'' ہے' لعنت کے معنی ''اللہ کی رحمت سے دوری اور محرومی'' کے ہیں' قرآن پاک میں اس کا مستحق شیطان بتایا گیا ہے' اور اس کے بعد یہودیوں' کافروں اور منافقوں کو اس کی وعید سنائی گئی ہے لیکن کسی مومن کو کذب کے سوا اس کے کسی فعل کی بنا پر لعنت سے یاد نہیں کیا گیا جھوٹ بولنے اور جھوٹ الزام لگانے کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت کی جائے' مباہلہ کے موقع پر یہ فرمایا گیا کہ دونوں فریق خدائے تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا مانگیں کہ جو ہم میں جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو۔

﴿ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ﴾ (آل عمران:۶۱)

''پھر دعا کریں' پھر جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔''

میاں بیوی کے لعان کی صورت میں جب شوہر بیوی پر بدکاری کا الزام لگائے اور شوہر کے پاس اس کا کوئی گواہ نہ ہو تو اس کو چار دفعہ اپنی سچائی کی قسم کھانے کے بعد پانچویں دفعہ یہ کہنا پڑے گا۔

﴿اَنَّ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ﴾ (نور:۷)

''اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹ ایسی بری چیز ہے کہ جو اس کا مرتکب ہوتا ہے وہ کافروں اور منافقوں کی طرح کی بددعا کا مستحق ہوتا ہے۔

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ جان کر کوئی انجان بن جائے حق کا علم رکھ کر بھی اس کے اظہار سے باز رہے' اللہ تعالیٰ نے ایسے جھوٹوں پر لعنت فرمائی ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَ الْهُدٰى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ﴾ (بقرہ:۱۵۹)

''بے شک جو چھپاتے ہیں جو اتارے ہم نے صاف حکم اور راہ کے نشان' اس کے بعد کہ ہم نے کتاب میں ان کو انسانوں کے لیے کھول کر کہہ دیا ہے' ان پر اللہ لعنت بھیجتا ہے' اور لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔''

یہ جھوٹ کی سلبی صورت ہے کیونکہ اس خاموشی اور اخفا سے مقصود یہ ہے کہ لوگ اس حق کو باور نہ کریں اور اس کو جھوٹا سمجھیں' اس لیے وہ جھوٹ کے گو قولاً نہیں' لیکن عملاً مرتکب ہوتے ہیں اور نفاق کی پرورش کرتے ہیں۔

نفاق اس کو کہتے ہیں کہ دل میں کچھ ہو اور زبان پر کچھ' اس لیے جو منافق ہوگا وہ جھوٹا بھی ضرور ہوگا چنانچہ قرآن پاک نے بھی اس کی تصدیق کی ہے' فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ﴾ (منافقون:۱)

''اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔''

اسی لیے آنحضرت ﷺ نے جھوٹ کو منافق کی نشانی قرار دیا ہے۔ فرمایا کہ منافق کی پہچان تین ہے۔ جب کہے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے پورا نہ کرے اور جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔ [1] لفظوں میں تو یہ باتیں تین ہیں لیکن حقیقت میں یہ ایک ہی شکل کی تین مختلف تصویریں ہیں جھوٹ باتیں کرنا تو جھوٹ ہی ہے مگر وعدہ کر کے پورا نہ کرنا بھی جھوٹ ہی ہے، اور اسی طرح امین بن کر خیانت کرنا بھی عملی جھوٹ ہے کیونکہ جو امین بنتا ہے وہ معنیً اپنی نسبت یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ اس میں خیانت نہ کرے گا اور جب اس نے اس کے خلاف کیا تو وہ عملاً جھوٹ بولا۔

جھوٹ اکیلی برائی نہیں، بلکہ اس کی وجہ سے جھوٹے میں، بیسیوں قسم کی دوسری برائیاں بھی لازمی طور سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کاذب کے ساتھ ساتھ دوسری بری صفتیں بھی ظاہر کی ہیں، جیسے:

﴿اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ﴾ (شعراء:۲۲۲)

''جھوٹ بولنے والا گناہ گار۔''

﴿كٰذِبٌ كَفَّارٌ﴾ (زمر:۳)

''جھوٹ بولنے والا، احسان کا حق نہ ماننے والا۔''

﴿مُسْرِفٌ كَذَّابٌ﴾ (مومن:۲۸)

''بے باک جھوٹا۔''

ان آیتوں نے بتایا کہ جھوٹا گناہوں میں لت پت ہوتا ہے کیونکہ جھوٹ کی عادت کے سبب سے وہ کسی برائی کے کرنے سے جھجکتا نہیں کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ موقع پر جھوٹ بول کر میں اس کو چھپالوں گا۔ اس لیے وہ ہر برائی کے کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جو جھوٹا ہوگا وہ اپنے کسی محسن کا احسان نہیں مانے گا۔ کیونکہ جو خود جھوٹا ہے وہ دوسرے کو بھی اس کے عمل اور نیت میں جھوٹا ہی سمجھے گا۔ اور اگر وہ زبان سے کہے بھی کہ میں مانتا ہوں تو کسی کو اس کی بات پر یقین کا ہے کو آنے لگا، اسی طرح جو جھوٹ بولتا ہے، اس کو کسی برے سے برے کام کے کرنے میں باک نہیں ہوتا، وہ ہر گناہ پر دلیر اور حد سے بڑھ جاتا ہے۔

جھوٹ کی عام قسم تو یہی ہے کہ زبان سے وہ کہا جائے جو دل میں نہیں، یا جو اس کے اندرونی علم و یقین کے خلاف ہو لیکن یہ کذبِ قولی یعنی زبان کا جھوٹ ہے کذبِ عملی یعنی عمل کا جھوٹ یہ ہے کہ جو کہا جائے وہ نہ کیا جائے۔

﴿بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ﴾ (توبہ:۷۷)

''اس لیے کہ اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا اور اس لیے کہ جھوٹ بولتے تھے۔''

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الادب باب قولہ تعالیٰ۔

اس جھوٹ کے سبب سے ان کے دلوں میں نفاق نے جگہ پکڑی قسم کھا کر اور عہد کر کے کسی کام کو طاقت رکھ کر پھر نہ کرنا' ایک قسم کا فریب تو ہے ہی۔ مگر جھوٹ بھی ہے اور ایسا جھوٹ جو مہلک ہے۔

﴿وَ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ﴾ (توبہ:۴۲)

''اور وہ قسم کھائیں گے کہ ہم کو مقدور ہوتا تو ہم تمہارے ساتھ لڑائی میں چلتے' وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں' اور اللہ کو معلوم ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔''

سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے صادقین کا ذکر فرمایا ہے جنہوں نے اپنی سچائی کا عملاً ثبوت دیا اور جو عملاً جھوٹے ٹھہرے ان کو منافق کا خطاب دیا ہے' فرمایا:

﴿لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ﴾ (احزاب:۲۴)

''تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کے سبب سے اجر دے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے یا ان پر رجوع ہو (یعنی مسلمان ہو جائیں تو معاف ہو جائے)۔''

انسان کی طرح اس کا عضو عضو بھی جھوٹ کا مرتکب ہو سکتا ہے' فرمایا:

﴿نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ﴾ (علق:۱۶)

''جھوٹی خطا کار پیشانی۔''

ہر چند کہ اس کو استعارہ کہئے پھر بھی پیشانی کا جھوٹ کلنک کا ٹیکا ہے' جو مٹ نہیں سکتا۔

اسی طرح ریا کاری کرنا اور جو نہیں ہے اپنے کو وہ دکھانے کی کوشش کرنا بھی عملاً جھوٹ ہے:

﴿قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰكُمْ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾ (آل عمران:۱۶۷)

''انہوں نے کہا اگر ہم جانیں کہ لڑائی ہو گی تو ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں وہ اس وقت ایمان سے زیادہ کفر سے قریب ہیں' وہ منہ سے وہ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں۔''

دل کے ان بیماروں کے متعلق جو مسلمانوں اور یہودیوں دونوں کو خوش رکھنا چاہتے تھے' اور مسلمانوں کو آ کر اپنی صلح پسندی کا جھوٹا یقین دلاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾ (نساء:۶۳)

''یہ وہ ہیں جن کے دل کا حال اللہ جانتا ہے۔''

ایسے ہی وہ شخص جو اپنے کو وہ دکھانا چاہے جو وہ نہیں ہے یا اپنے میں وہ باور کرانا چاہے جو اس میں نہیں ہے' جھوٹا ہے۔ ایک دفعہ ایک عورت نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ میری ایک

پڑوسن (سوتن) ہے کیا اگر میں یہ ظاہر کروں کہ مجھے شوہر نے یہ دیا یہ دیا' اور واقعہ یہ نہ ہو صرف اس کو جلانا مد نظر ہو تو کیا یہ بھی گناہ ہے۔ فرمایا "جو جتنا نہیں دیا گیا اتنے کا دکھاوا کرنے والا جھوٹ کے دو پاجامے پہننے والے کی طرح ہے۔"[۱] حدیث کے شارح کہتے ہیں کہ دو پاجامے یوں کہ جو اس کے پاس نہیں اس کا ہونا اپنے پاس بتانا جھوٹ کا ایک جامہ ہوا' اور جس نے جو نہیں دیا اس کا دینا بتانا اس پر جھوٹ باندھنا ہے' یہ جھوٹ کا دوسرا جامہ' اسی طرح جو عالم نہیں وہ اپنے کو عالم باور کرانے کی کوشش کرے جو دولت مند نہیں وہ دولت مندی کا دکھاوا کرے' یعنی کسی کے پاس جو چیز نہیں اس کو اپنے پاس دکھانے کی کوشش کرنا درحقیقت دوسرے کو فریب دینے کی کوشش ہے۔ غالباً اسی لیے اس عورت کو جس کے سر کے بال چھوٹے ہوں اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ وہ مصنوعی بال لگا کر اپنے بالوں کو لمبا بنائے' آنحضرت ﷺ نے اس کو بھی زور فرمایا ہے۔[۲]

جھوٹ کے بہت سے مرتبے ہیں' اچھے اچھے لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ بے ضرر جھوٹ کو برا نہیں جانتے' جیسے اکثر لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ بچوں کو بہلانے کے لیے ان سے جھوٹے وعدے کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ ان وعدوں کو تھوڑی دیر میں بھول جائیں گے' اور گو ہوتا بھی اکثر یہی ہے مگر جھوٹ بہر حال جھوٹ ہے' اسلام نے اس جھوٹ کی بھی اجازت نہیں دی ہے ایک کم سن صحابی عبداللہؓ بن عامر کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میری ماں نے مجھے بلایا اور حضور انور ﷺ میرے گھر تشریف رکھتے تھے تو ماں نے میرے بلانے کے لیے کہا یہاں آؤ تجھے کچھ دوں گی حضور انور ﷺ نے فرمایا تم کہتی ہو مگر تم اس کو کچھ دینا نہیں چاہتی ہو ماں نے کہا اس کو کھجور دے دوں گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' ہاں اگر تم اس کو اس وقت کچھ نہ دیتیں تو یہ جھوٹ بھی تمہارا لکھا جاتا۔[۳]

اس تعلیم کا منشا یہ تو ہے ہی کہ مسلمان کو کسی حال میں بھی اپنے لب کو جھوٹ سے آلودہ نہیں کرنا چاہیے لیکن اس موقع پر سچ بولنے کی تاکید فرمانا اس لیے بھی ہے کہ ماں باپ کے غلط رویہ سے بچہ کی تعلیم و تربیت پر برا اثر پڑے وہ بچپن میں اسی سانچے میں ڈھلے گا۔ اس لیے لوگوں کو چاہیے کہ بچوں سے بھی جھوٹ نہ بولیں۔

بعض لوگوں کی عادت یہ ہوتی ہے کہ جب ان کو کھانے کے لیے یا کسی اور چیز کے لیے کہا جاتا ہے تو وہ تصنع اور بناوٹ سے کہہ دیتے ہیں کہ مجھے خواہش نہیں حالانکہ ان کے دل میں اس کی خواہش موجود ہوتی ہے' تو یہ بھی جھوٹ ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک صحابیہؓ خاتون حضرت اسماءؓ بنت یزید نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ ہم میں سے کوئی کسی چیز کی خواہش رکھے' اور پھر کہہ دے کہ مجھے اس کی خواہش نہیں تو کیا یہ بھی جھوٹ شمار ہوگا' ارشاد ہوا کہ ہر چھوٹے سے چھوٹا جھوٹ بھی جھوٹ لکھا جاتا ہے۔[۴]

---

(۱) ابوداؤد کتاب الادب۔

(۲) صحیح بخاری باب الوصل فی الشعر۔

(۳) ابوداؤد کتاب الادب باب التشدید فی الکذب۔

(۴) مسند احمد و طبرانی کبیر (مجمع الزوائد ہیثمی ص ۲۴۰ باب فی ذم الکذب)۔

اسی طرح وہ جھوٹ ہے جو خوش گپی کے موقع پر محض لطفِ صحبت کے لیے بولا جاتا ہے اس سے بھی اگرچہ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ بعض موقعوں پر یہ ایک دلچسپی کی چیز بن جاتا ہے تاہم اسلام نے اس کی بھی جازت نہیں دی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جو شخص لوگوں کے ہنسانے کے لیے جھوٹ بولتا ہے اس پر افسوس اس پر افسوس'' (۱) کیونکہ اس سے آدمی کا وزن ہلکا ہوتا ہے' اور اس کی بات بے اعتبار ہوتی ہے' اور ہر شخص یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کا سچ جھوٹ برابر ہے۔

اس صورت کے علاوہ جھوٹ کی جتنی خطرناک صورتیں ہیں ان کے خطرات کے لحاظ سے اسلام نے ان کے مدارج مقرر کیے ہیں' ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص ایک شخص کو سچا اور قابلِ اعتبار سمجھتا ہے اس لیے اس کی ہر بات کا یقین کر لیتا ہے لیکن وہ شخص اس کے علم و یقین سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے اور جھوٹ بول کر اس کو سخت فریب و نقصان میں مبتلا کر دیتا ہے اسلام نے اس کو سخت خیانت قرار دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''یہ یک بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے ایک جھوٹی بات کہو درآنحالیکہ وہ تم کو سچا سمجھتا ہو۔'' (۲) اس سے بھی زیادہ خطرناک جھوٹ وہ ہے جس سے لوگوں کے حقوق اور عزت و آبرو کو نقصان پہنچے اور اس سے معاشرتی نظام میں خلل واقع ہو۔ یہ جھوٹ عام جھوٹ سے اس قدر مختلف ہے کہ اسلام نے اس کا نام تک بدل دیا ہے اور اس کو ﴿زُور﴾ اور ﴿اِفکِ﴾ وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا ہے جس کے معنی منحرف ہونے اور الٹ پلٹ دینے کے ہیں۔

جھوٹ کی یہ صورت اس قدر خطرناک ہے کہ خداوند تعالیٰ نے شرک کے ساتھ ساتھ اس کا ذکر کیا ہے' اور مسلمانوں کو حکم دیا ہے۔

﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَ اجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ﴾۔(حج:۳۰)

''بتوں کی گندگی اور جھوٹی بات کہنے سے بچتے رہو۔''

زور اگرچہ ایک عام لفظ ہے جس میں کذب و بہتان وغیرہ سب شامل ہیں لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے خاص طور پر جھوٹی شہادت مراد ہے۔ جامع ترمذی میں ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ کیا میں تم لوگوں کو سب سے بڑا گناہ بتاؤں؟ صحابہؓ نے کہا ''ہاں یا رسول اللہ'' فرمایا کہ شرک اور ماں باپ کی نافرمانی۔ راوی کا بیان ہے کہ آپ ﷺ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے کہ دفعتاً اٹھ بیٹھے اور کہا کہ ''جھوٹی شہادت یا جھوٹی بات'' اور برابر یہی کہتے رہے یہاں تک کہ ہم نے کہا کہ کاش آپ ﷺ خاموش ہو جاتے۔ (۳)

اس آیت پاک اور اس کی اس تشریحی حدیث میں غور کرنے سے یہ نکتہ ملتا ہے کہ شرک کے بعد جو برائی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ذکر کے قابل تھی وہ یہی جھوٹ ہے' اس سے اندازہ ہوگا کہ اس کی گندگی کا کیا عالم ہوگا۔

---

(۱) سنن ابی داؤد کتاب الادب باب التشدید فی الکذب۔

(۲) ادب المفرد باب اذا کذب الرجل وھو لک مصدق۔

(۳) ابواب البر والصلۃ ماجاء فی حقوق الوالدین۔

﴿اِفْک﴾ اس سے بھی زیادہ سخت لفظ ہے اس کے معنی ہیں کسی پر جھوٹ باندھنا مشرک خدا پر جھوٹ باندھا کرتے تھے ان کو قرآن نے ﴿اَفَّاک﴾ کہا ہے اس سے معلوم ہوگا کہ اس کی سرحد کبھی کبھی شرک سے مل جاتی ہے۔ منافقین نے حضرت عائشہؓ پر جو اتہام لگایا تھا اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی لفظ ﴿افک﴾ سے تعبیر کیا ہے (نور:۱۱) اور قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ ﴿اِفْک﴾ بڑے خبث طینت کا کام ہے فرمایا:

﴿تَنَزَّلُ عَلٰی کُلِّ اَفَّاکٍ اَثِیْمٍ﴾ (الشعراء:۲۲۲)

''اور شیطان (تو) اترا کرتے ہیں ہر جھوٹ باندھنے والے بدکردار پر۔''

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ انسان جھوٹ سچ جو کچھ سنے اس کو بلاتحقیق دوسروں سے کہتا پھرے ایسا شخص بے اعتبار سمجھا جاتا ہے اور سوسائٹی میں اس کی بات کی کوئی قدر نہیں ہوتی اس لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

﴿کَفٰی بِالْمَرْءِ کَذِبًا اَنْ یُّحَدِّثَ بِکُلِّ مَا سَمِعَ﴾ (مقدمہ صحیح مسلم)

''آدمی کو یہ جھوٹ بس ہے کہ جو سنے وہ کہتا پھرے۔''

ایسے لوگوں کو جو ہر سنی سنائی بات پر یقین کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ﴿سَمّٰعُوْنَ لِلْکَذِبِ﴾ (جھوٹ کے بڑے سننے والوں) کا خطاب دیا ہے یہودیوں کے ایک گروہ کی نسبت فرمایا ہے:

﴿سَمّٰعُوْنَ لِلْکَذِبِ﴾ (مائدہ:۴۱)

''جھوٹ کے بڑے سننے والے ہیں۔''

جھوٹی قسمیں کھانا

قسم کھانا حقیقت میں شہادت یعنی گواہی ہے جو شخص کسی بات کو خدا کی قسم کھا کر کہتا ہے وہ اصل میں اپنے بیان کی سچائی پر خدا کو گواہ بناتا ہے ایسی حالت میں خیال کرنا چاہیے کہ اس معاملہ کی اہمیت کتنی بڑی ہے قسم کھانا کتنی غیر معمولی بات ہے لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ جھوٹ بولتے ہیں اور سچائی سے دور ہیں وہ بات بات پر قسم کھاتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ لوگ ان کے بیان کو سچا نہیں سمجھتے اس لیے وہ لوگوں کو فریب دینے کے لیے جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔

اول تو بے ضرورت قسم کھانا ہی برا ہے۔ پھر جھوٹی قسمیں کھانا تو اور بھی برا ہے اسی لیے قرآن پاک میں اس قسم کے قسم کھانے والوں کی بہت برائی آئی ہے یہ جھوٹ کی بدترین شکل ہے جس میں جھوٹ بولنے والا اپنے ساتھ خدا کو بھی شریک کرتا ہے اسی لیے کسی آئندہ کی بات پر اگر کوئی قسم کھالے تو اس کا پورا کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور اگر کسی سبب سے پورا نہ کر سکے تو وہ گناہ گار ہوتا ہے اور اس پر کفارہ لازم آتا ہے کفارہ یہ ہے کہ وہ کوئی غلام آزاد کرے یا دس مسکینوں کو کھانا کھلائے یا کپڑے پہنائے اگر یہ نہ ہو سکے تو تین روزے رکھے اور اس کی بھی اجازت

دی گئی ہے کہ قسم کھانے کے بعد اگر دوسری شکل بہتر معلوم ہو تو وہ اپنی قسم توڑ کر کفارہ ادا کر دے۔[1]

﴿لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغْوِ فِیْۤ اَیْمَانِکُمْ وَ لٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَیْمَانَ فَکَفَّارَتُہٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَۃِ مَسٰکِیْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَہْلِیْکُمْ اَوْ کِسْوَتُہُمْ اَوْ تَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ ثَلٰثَۃِ اَیَّامٍ ذٰلِکَ کَفَّارَۃُ اَیْمَانِکُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ وَ احْفَظُوْۤا اَیْمَانَکُمْ﴾ (مائدہ: ۸۹)

''اللہ تم کو تمہاری بے فائدہ قسموں پر نہیں پکڑتا لیکن اس قسم پر پکڑتا ہے جس کو تم نے گرہ باندھا' تو اس قسم کے توڑنے کا کفارہ دس محتاجوں کو کھلانا بیچ کا کھانا جو تم اپنے گھر والوں کو دیتے ہو یا ان کو کپڑا دینا یا ایک غلام آزاد کرنا تو جس کو یہ پیدا نہ ہو تو تین دنوں کا روزہ رکھنا' یہ ہے تمہاری قسموں کا اتار' جب تم قسم کھا بیٹھو اور اپنی قسموں کو نگاہ رکھو۔''

قسموں کو نگاہ رکھنا یہ ہے کہ جس بات پر نیت کر کے کھائی جائے' اگر وہ کوئی خلاف شرع' یا غیر انسب نہ ہو تو اس کی پوری ذمہ داری محسوس کی جائے اور اس کو حتی المقدور پورا کیا جائے اور اگر پوری نہ کی جا سکے تو اس کا کفارہ ادا کیا جائے' یہ کفارہ اسی لیے مقرر کیا گیا ہے تا کہ قسم کھا کر اس کے پورا کرنے کی ذمہ داری اور اہمیت کے خیال کو نقصان نہ پہنچے۔

کسی خلافِ شرع بات پر جو قسم کھائی جاتی ہے' یا وہ بات جس پر قسم کھائی گئی ہے بعد کو غیر انسب معلوم ہو تو اس قسم کو توڑ کر کفارہ ادا کر دینا درست ہے' خدا نے فرمایا:

﴿قَدْ فَرَضَ اللّٰہُ لَکُمْ تَحِلَّۃَ اَیْمَانِکُمْ﴾ (تحریم: ۲)

''خدا نے تم کو اپنی قسموں کا کھول ڈالنا ٹھہرا دیا ہے۔''

اور احادیث میں اس کی جزئی تصریحات مذکور ہیں۔

گزشتہ یا موجودہ واقعات پر قسم کھانا جیسا کہ کہا جا چکا ہے' حقیقت میں گواہی اور شہادت ہے اور معلوم ہو چکا ہے کہ گواہی اور شہادت میں جھوٹ بولنا کتنا بڑا گناہ ہے' اسی لیے ایسا شخص جو بات بات پر قسمیں کھاتا رہتا ہے حد درجہ بے اعتبار اور نا قابل اعتماد سمجھا جاتا ہے' اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ایسے شخص پر اعتبار نہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور اس کو انسان کا بڑا عیب بتایا ہے' رسول کو حکم ہوتا ہے۔

﴿وَ لَا تُطِعْ کُلَّ حَلَّافٍ مَّہِیْنٍ﴾ (قلم: ۱۰)

''اور بہت قسمیں کھانے والے ذلیل کا کہنا مان۔''

سمجھنے کی بات ہے کہ قسم کھانے کا مدعا یہ ہے کہ لوگ اس کا کہنا مانیں' اور اس کا اعتبار کریں لیکن اللہ تعالیٰ

(۱) ابوداؤد کتاب الایمان والنذور۔

سرے سے اس طرح کی قسمیں کھانے والے کی بات کے نہ ماننے کی ہدایت اور اس کی بے قدری اور بے اعتباری کا اعلان فرماتا ہے۔

چونکہ اس طرح کی قسمیں کھانے والے جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں' اسی لیے یہ نفاق کی بڑی نشانی ہے اور قرآنِ پاک میں اسی حیثیت سے اس کا ذکر بار بار آیا ہے' منافقوں کے تذکرہ میں ہے کہ جب ان پر کوئی افتاد پڑتی ہے تو قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہمارا منشا یہ نہ تھا۔ ہماری نیت نیک تھی' خدا فرماتا ہے کہ اللہ کو تمہارے دل کی بات خوب معلوم ہے۔

﴿فَكَيْفَ إِذَآ أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَآءُوكَ يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ إِنْ أَرَدْنَآ إِلَّآ إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ﴾ (نساء:۶۲)

''پھر کیسا جب ان کو اپنے ہی کرتوت سے کوئی تکلیف پہنچے پھر تیرے پاس اللہ کی قسمیں کھاتے آئیں کہ ہماری غرض بھلائی اور ملاپ کی تھی' یہ وہ ہیں جن کے دلوں کا حال اللہ کو معلوم ہے۔''

یعنی اللہ جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں کچھ ہے اور زبانوں پر کچھ ہے ایسے لوگ یہ چاہا کرتے ہیں کہ قسمیں کھا کر سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا کر متعلق اشخاص کو خوش کر دیں۔ خدا فرماتا ہے کہ اگر ان کے اندر ایمان ہو' تو ان کو چاہیے کہ سچائی اختیار کر کے خدا اور رسول کو خوش کریں۔

﴿يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوكُمْ وَاللّٰهُ وَرَسُولُهُۥٓ أَحَقُّ أَن يُرْضُوهُ إِن كَانُوا مُؤْمِنِينَ﴾ (توبہ:۶۲)

''تمہارے (مسلمانوں کے) آگے خدا کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ وہ تم کو راضی کر لیں۔ اور اللہ اور رسول کو راضی کرنا زیادہ ضروری ہے' اگر وہ ایماندار ہیں۔''

ایسے منافقوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب کوئی بری بات منہ سے نکالتے ہیں۔ اور اس پر پوچھ گچھ ہونے لگتی ہے تو فوراً مکر جاتے ہیں۔

﴿يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوا وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ﴾ (توبہ:۷۴)

خدا کی (جھوٹی) قسمیں کھاتے ہیں کہ انہوں نے نہیں کہا۔ حالانکہ انہوں نے بے شک کفر کی بات کہی۔''

ایک موقع پر منافقوں نے ایک نامعقول کام کیا خدا نے فرمایا کہ جب تم جا کر ان سے پوچھو گے تو وہ خدا کی قسم کھا جائیں گے ﴿سَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ﴾ (توبہ:۹۵) چنانچہ ایسا ہی ہوا' اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَحْلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِن تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضَىٰ عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ﴾ (توبہ:۹۶)

''تمہارے آگے قسمیں کھاتے ہیں' تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ تو اگر تم ان سے راضی بھی ہو جاؤ تو اللہ

نافرمان لوگوں سے راضی نہیں۔‘‘

اس لیے جو لوگ اللہ کی بات دل سے مانتے نہیں اور زبان سے قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ مانتے ہیں وہ فاسق اور نافرمان ہیں۔

اسی موقع پر کچھ منافقوں نے مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کی نیت سے ایک مسجد الگ کھڑی کر لی تھی۔ خدا نے فرمایا کہ اگر ان سے ان کی اس حرکت کا سبب پوچھو گے تو جھٹ قسم کھا بیٹھیں گے کہ ہماری نیت اچھی تھی۔ فرمایا:

﴿وَ لَیَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰی وَاللّٰہُ یَشْھَدُ اِنَّھُمْ لَکٰذِبُوْنَ﴾ (توبہ:۱۰۷)

’’اور قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے تو بھلائی ہی چاہی تھی‘ اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔‘‘

اہل نفاق کی حالت قرآن نے یہ بتائی ہے۔

﴿وَ یَحْلِفُوْنَ عَلَی الْکَذِبِ وَ ھُمْ یَعْلَمُوْنَ﴾ (مجادلۃ:۱۴)

’’اور وہ جان بوجھ کر جھوٹی باتوں پر قسمیں کھاتے ہیں۔‘‘

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَھُمْ جُنَّۃً﴾ (مجادلہ:۱۶ و منافقون:۲)

’’انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنایا ہے۔‘‘

یعنی قسمیں کھا کر سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ‘ اور اس کو اپنے بچاؤ کے لیے ڈھال بنایا کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے رسول کے ذریعہ اس گناہ سے بچنے کی تاکید فرمائی:

﴿وَ لَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْکِیْدِھَا وَ قَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰہَ عَلَیْکُمْ کَفِیْلًا اِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ○ وَ لَا تَکُوْنُوْا کَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَھَا مِنْ بَعْدِ قُوَّۃٍ اَنْکَاثًا تَتَّخِذُوْنَ اَیْمَانَکُمْ دَخَلًا بَیْنَکُمْ اَنْ تَکُوْنَ اُمَّۃٌ ھِیَ اَرْبٰی مِنْ اُمَّۃٍ﴾ (نحل:۹۱۔۹۲)

’’اور قسموں کو پکا کرنے کے بعد توڑ مت ڈالو‘ اور تم نے اپنے پر خدا کو ضامن بنایا ہے‘ بے شک اللہ تمہارے کاموں کو جانتا ہے‘ اور اس عورت کے جیسے نہ بنو جو اپنے کاتے سوت کو محنت کے پیچھے توڑ کر ٹکڑے کرتی تم اپنی قسموں کو آپس میں بیٹھنے کا بہانہ بناتے ہو کہ ایک فریق دوسرے فریق سے بڑھ چڑھ کر ہو۔‘‘

خدا کا نام لے کر کوئی معاہدہ کرنا‘ اور اس کو توڑ ڈالنا خدا کے مقدس نام کی تحقیر ہے اسی لیے فرمایا کہ جس بات پر کسی نے قسم کھائی اس پر اس نے گویا خدا کو ضامن ٹھہرایا اس لیے قسم کھا کر توڑا نہ کرو‘ اور لوگوں کو دھوکا نہ دیا کرو پھر ایسی قسم کو توڑ ڈالنا ایسا ہی حماقت کا کام ہے جیسا عرب کی ایک بے وقوف عورت کا تھا جو سوت کات کات کر کھول دیتی‘ یا ٹکڑے کر ڈالتی۔

جب ایک فریق دوسرے فریق سے خدا کا نام لے کر معاہدہ کرتا ہے تو گویا وہ خدا کی ضمانت پر دوسرے کو

مامون بنا تا ہے اب اگر وہ کوئی قوت پاکر بدعہدی کرتا ہے اور اس فریق سے ٹوٹ کر کسی دوسرے طاقتور سے ملنے کی کوشش کرتا ہے تو بڑی اخلاقی کمزوری ظاہر کرتا ہے۔

اسی طرح جھوٹی قسم کھا کر کسی دوسرے کے مال پر دعویٰ کرنا خدا کے نام پر جھوٹ بولنا ہے اور یہ ایک کے بجائے دو گناہوں کا مجموعہ ہے یعنی غصب اور جھوٹ اور وہ بھی خدا کے پاک اور مقدس نام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَ لَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ (آل عمران: ۷۷)

"بے شک جو لوگ خدا کے قرار اور اپنی قسموں پر (دنیا کا) تھوڑا سا مال خریدتے ہیں آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں نہ اللہ ان سے بات کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا قیامت میں نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔"

شانِ نزول اور آیت کے سیاق کے لحاظ سے یہ یہودیوں کی بددیانتیوں کی تصویر ہے مگر آیت اپنے حکم کے لحاظ سے بہر حال عام ہے۔ ایک دفعہ حضرت عبداللہ صحابیؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو کوئی جھوٹی قسم کھا کر کسی مسلمان کا مال لینا چاہے گا تو جب وہ خدا کے پاس جائے گا تو خدا اس پر غضب ناک ہوگا۔ اشعثؓ بن قیس صحابی نے کہا "خدا کی قسم یہ آیت میرے واقعہ میں اتری ہے میرے اور ایک یہودی کے درمیان ایک زمین تھی اس نے میری ملکیت سے انکار کیا میں نے یہ مقدمہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا حضور ﷺ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت یا گواہ ہے میں نے کہا نہیں تو آپؐ نے اس یہودی سے فرمایا کہ تم قسم کھاؤ تو میں نے عرض کی کہ یارسول اللہ وہ تو اب قسم کھا جائے گا اور میری چیز لے لے گا اس وقت یہ آیت آتری۔[1]

ابن جریر کی بعض روایتوں میں ہے کہ یہ آیت ان سوداگروں کی شان میں ہے جو جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنا سامان بیچتے ہیں ان کی تائید اس حدیث سے ہوتی کہ آپ نے تین دفعہ فرمایا "تین آدمی ہیں جن کی طرف خدا قیامت کے دن نہ دیکھے گا نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے" صحابیؓ کہتے ہیں میں نے کہا کہ یہ لوگ جو ناکام ہوئے اور ٹوٹے میں پڑے وہ کون ہیں یارسول اللہ ﷺ! فرمایا جو اپنا لباس گھٹنوں سے نیچے تک لٹکاتا ہے (کیونکہ یہ غرور کی علامت ہے) اور جو احسان جتاتا ہے اور جو جھوٹی قسمیں کھا کر اپنا مال بیچتا ہے (مسلم و داؤد و ترمذی ونسائی و ابن ماجہ) بہر حال جیسا کہ معلوم ہے کہ شانِ نزول سے مراد وہ واقعہ ہے جس پر کوئی آیت پوری طرح صادق آجائے اس لیے ان تمام واقعات پر آیت کا حکم یکساں جاری ہوگا۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا جو کسی مسلمان کے حق کو جھوٹی قسم کھا کر لینا چاہے گا تو خدا اس پر دوزخ کی آگ کو واجب کرے گا۔" صحابہؓ نے پوچھا یارسول اللہ! کیا اگرچہ کوئی معمولی سی چیز ہو فرمایا درخت (اراک)

---

(۱) ابوداؤد کتاب الایمان والنذور وابن جریر۔

ر کی ڈالی ہی کیوں نہ ہو۔''[۱] حضرت انسؓ صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا'' بڑے بڑے گناہ یہ ہیں خدا کا شریک ٹھہرانا' ماں باپ کی نافرمانی کرنا' کسی بے گناہ کی جان لینا۔ اور جھوٹی قسم کھانا'[۲] ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا جس شخص سے قسم کھلوائی جائے اور وہ جھوٹ قسم کھا جائے تو وہ اپنا چہرہ لے کر دوزخ میں ٹھکانا پائے گا۔[۳] چہرہ کی خصوصیت شاید اس لیے ہے کہ اس نے انسانی عزت وآبرو کے خلاف کام کیا اور بڑی ڈھٹائی دکھائی' جس کا اثر چہرہ پر نمایاں ہوتا ہے۔

عموماً تاجر اور سوداگر چیزوں کی قیمت اور مال کی اصلی حقیقت بتانے میں جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں اور جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں' اس لیے خاص طور سے رسول اللہ ﷺ نے ان کو اس سے بچنے کی ہدایت کی ہے' فرمایا۔'' جھوٹی قسم مال بکوا دیتی ہے' لیکن نفع (کی برکت) کو گھٹا دیتی ہے۔''[۴] روحانی حیثیت سے جو برکت گھٹتی ہے وہ تو ہے ہی' لیکن ظاہری حیثیت سے بھی ایسے شخص کی تجارت کو آخر میں چل کر اس کی عام بے اعتباری کی وجہ سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ بھی ظاہر ہے۔ چنانچہ اس کی تشریح ایک دوسری روایت میں ہے حضرت قتادہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تجارت میں بہت قسمیں کھانے سے پرہیز کرو' کیونکہ اس طرح پہلے کامیابی ہوتی ہے پھر بے برکتی ہو جاتی ہے' کیسے بلیغ فقرے ہیں۔ (مسلم ونسائی وابن ماجہ)

جھوٹی قسموں کے علاوہ عام طور سے بیباکی کے ساتھ قسمیں کھانا بھی اسلامی شرافت کے خلاف ہے قرآن پاک کی آیت اوپر گزر چکی ہے کہ بے سبب قسمیں کھانا ذلت وخواری کا سبب ہے وَ لَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ (قلم) حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''قسمیں کھانا قسم پوری نہ کرنے کے گناہ کا سبب ہے یا ندامت اور شرم ساری کا موجب ہے۔''[۵]

وعدہ خلافی

وعدہ کر کے اس کے خلاف کرنا بہت بڑی برائی ہے' اور یہ بھی حقیقت میں جھوٹ کی ایک قسم ہے' کسی قوم اور اس کے افراد کی عزت کا مدار بہت کچھ اس پر ہے کہ وہ اپنے وعدوں کے کتنے سچے اور اپنی بات کے کیسے پکے ہیں جب کوئی شخص کوئی وعدہ کر لیتا ہے' تو اپنے اوپر ایک ذمہ داری اوڑھ لیتا ہے' فرمایا:

﴿اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا﴾ (بنی اسرائیل:۳۴)

---

(۱) صحیح مسلم کتاب الایمان باب وعید من اقتطع حق مسلم بیمین۔

(۲) سنن نسائی باب فی ذکر الکبائر۔

(۳) سنن ابی داؤد کتاب الایمان۔

(۴) صحیح بخاری ومسلم وابوداؤد وترمذی ونسائی' منذری باب ترغیب التجار فی الصدق۔

(۵) ابن ماجہ وصحیح ابن حبان منذری باب ترغیب التجار فی الصدق ۱۲۔

''بے شک وعدہ کی باز پرس ہوگی۔''

اور جس کی باز پرس خدا فرمائے اس کی اہمیت کتنی بڑی ہوگی۔

قرآن پاک میں منافقوں کے سلسلہ میں ہے کہ ان کی بدعہدی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دل میں نفاق پیدا ہو گیا۔ فرمایا:

﴿فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ﴾ (توبہ:۷۷)

''پس اس کا اثر ان کے دل میں خدا نے نفاق رکھا' اس دن تک جب وہ اس سے ملیں گے' اس لیے کہ انہوں نے خدا سے وعدہ کر کے خلاف کیا' اور اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔''

صحیحین میں ہے کہ ''منافق کی نشانیاں تین ہیں' جب بولے جھوٹ بولے' جب وعدہ کرے خلاف کرے' جب امانت دار بنایا جائے تو خیانت کرے۔'' (صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے) اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو' روزے رکھتا ہو اور سمجھتا ہو کہ وہ مسلمان ہے۔'' صحیحین کی ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہ چار باتیں جس میں ہوں وہ پکا منافق ہے' اور جس میں ان سے کوئی ایک ہو اس میں منافق کی ایک نشانی ہے' جب تک اس کو چھوڑ نہ دے۔ جب امانت دار بنایا جائے خیانت کرے' جب بولے جھوٹ بولے' جب معاہدہ کرے خلاف کرے' جب جھگڑے گالی بکے۔[1] ایک دفعہ آپ ؐ نے فرمایا کہ مجھ سے تین باتوں کا ذمہ لو تو میں تمہارے لیے جنت کا ذمہ لیتا ہوں' جب بولو تو سچ بولو' اور جب وعدہ کرو تو پورا کرو' اور جب امین بنو تو خیانت نہ کرو۔''[2]

خیانت اور بددیانتی

ایک کا جو حق دوسرے کے ذمہ واجب ہو اس کے ادا کرنے میں ایمان داری نہ برتنا خیانت اور بددیانتی ہے' اگر ایک کی چیز دوسرے کے پاس امانت ہو اور وہ اس میں بے جا تصرف کرتا یا مانگنے پر واپس نہ کرتا ہو۔ تو یہ کھلی ہوئی خیانت ہے یا کسی کی کوئی چھپی ہوئی بات کسی دوسرے کو معلوم ہو' یا کسی نے دوسرے پر بھروسہ کر کے کوئی اپنا بھید اس کو بتایا ہو تو اس کا کسی اور پر ظاہر کرنا بھی خیانت ہے' اسی طرح جو کام کسی کے سپرد ہو اس کو وہ دیانت داری کے ساتھ انجام نہ دے تو یہ بھی خیانت ہی کہلائے گا۔ علٰی ہذا عام مسلمانوں' ائمہ وقت اور اپنے متفقہ قومی اور ملی مصالح کے خلاف قدم اٹھانا بھی ملت سے بددیانتی ہے' دوست ہو کر دوستی نہ نباہنا بھی خیانت ہے' بیوی میاں کی وفاداری نہ کرے تو یہ بھی خیانت ہے' دل میں کچھ رکھنا اور زبان سے کچھ کہنا اور عمل سے کچھ اور ثابت کرنا بھی خیانت ہے' اسلام کی اخلاقی شریعت میں یہ ساری خیانتیں یکساں ممنوع ہیں۔ فرمایا:

---

(۱) ترغیب وترہیب منذری باب الترغیب فی الصدق۔

(۲) احمد حاکم ابویعلی بیہقی منذری باب انجاز الوعد۔

﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰہَ وَ الرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِکُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ (انفال:۲۷)

''اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو اور نہ آپس کی امانتوں میں جان کر بد دیانتی کرو۔''

اللہ اور رسول کے ساتھ خیانت یہ ہے کہ اقرار کر کے پورا نہ کیا جائے۔ ایمان داری سے ان کے حکموں کی تعمیل نہ کی جائے' دین وملت کے مصالح کے ساتھ غداری کی جائے اور اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے دشمنوں کو چھپے چوری امداد پہنچائی جائے یا مسلمانوں کے چھپے راز ان کو بتائے جائیں اسی طرح آپس کی امانتوں میں خیانت یہ ہے کہ جو چیز جس کے پاس امانت ہو اس میں وہ ناجائز تصرف کرے' اور کسی کا جو راز کسی کو معلوم ہو اس کو دوسروں پر ظاہر کر دے۔

یہ حدیث کئی دفعہ اوپر آ چکی ہے کہ منافق کی تین علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو وہ اس میں خیانت کرے۔''(۱) ابن مسعودؓ سے موقوفاً روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ خدا کی راہ میں مارا جانا ہر گناہ کا کفارہ ہے لیکن امانت کا' قیامت کے دن بندہ کو لایا جائے گا اگرچہ وہ خدا کی راہ میں شہید ہی ہوا ہو' اور کہا جائے گا کہ تم امانت لاؤ اور ادا کرو' وہ کہے گا خداوندا! اب کیسے لاؤں دنیا تو ختم ہو چکی۔ کہا جائے گا اس کو دوزخ کے طبقہ ہاویہ میں لے جاؤ وہاں امانت کی چیز مثال بن کر اصل صورت میں سامنے آئے گی' تو وہ اس کو دیکھ کر پہچان لے گا' اور اس کے پیچھے گرے گا۔ یہاں تک کہ اس کو پکڑ لے گا اور اس کو اپنے کندھوں پر لاد کر لے چلے گا جب دوزخ سے نکلنا چاہے گا تو وہ بوجھ اس کے کندھے سے گر پڑے گا اور وہ پھر اس کے پیچھے ہمیشہ گرتا چلا جائے گا' پھر انہوں نے فرمایا نماز امانت ہے' وضو امانت ہے' تول بھی امانت ہے' ناپ بھی امانت ہے اور بہت سی چیزیں گنا کر فرمایا' اور ان سب سے زیادہ سخت معاملہ امانت کی چیزوں کا ہے۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے یہ حدیث براءؓ بن عازب صحابی کو سنائی' انہوں نے تصدیق کی اور فرمایا کیا تم نے قرآن کی یہ آیت نہیں سنی۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا﴾ (نساء:۵۸)

''بے شک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو ادا کر دیا کرو۔''(۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کہ سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے پھر جو اس کے بعد آئے گا' پھر جو اس کے بعد آئے گا پھر ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگ بن بلائے گواہی دیں گے' خیانت کریں گے امانت داری نہیں کریں گے اور نذر مانیں گے تو پوری نہ کریں گے (۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن بری باتوں سے خدا کی پناہ مانگا کرتے تھے' ان میں سے ایک خیانت بھی ہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ الٰہی! مجھے خیانت سے بچائے رکھنا کہ یہ بہت برا

(۱) صحیحین وغیرہ:۱۲۔

(۲) مسند احمد' بیہقی' منذری' باب الترغیب فی انجاز الوعد۔

(۳) صحیح بخاری وصحیح مسلم' منذری باب مذکور۔

اندرونی ساتھی ہے۔[۱]

خیانت کے ایک معنی یہ ہیں کہ کسی جماعت میں شامل ہو کر خود اسی جماعت کو جڑ سے اکھاڑنے کی فکر میں لگے رہنا، چنانچہ منافقین جو دل میں کچھ رکھتے تھے اور زبان سے کچھ کہتے تھے، وہ ہمیشہ اسلام کے خلاف چھپی سازشوں میں لگے رہتے تھے مگر ان کی یہ چال کارگر نہیں ہوتی تھی اور ہمیشہ اس کا بھید کھل جاتا تھا، فرمایا:

﴿وَ لَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰی خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ﴾ (مائدہ:۱۳)

''اور ہمیشہ تو خبر پاتا رہتا ہے ان کی ایک خیانت کی۔''

یعنی ان کی کسی نہ کسی خیانت کی خبر رسول کو ملتی ہی رہتی ہے۔

جس پر کسی امر میں بھروسہ کیا جائے اس کا اس بھروسہ کو پورا نہ کرنا بھی خیانت ہے۔ حضرت یوسفؑ نے اپنے اوپر الزام کی پوری چھان بین عزیز سے کرائی، اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ سب اس لیے کیا۔

﴿ذٰلِکَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ کَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ﴾ (یوسف:۵۲)

''تاکہ عزیز کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں نے چوری چھپے اس سے خیانت نہیں کی، اور بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کے فریب کو نہیں چلاتا۔''

حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں نے اپنے مقدس شوہروں سے بے وفائی کی، ان کی بے وفائی یہ تھی کہ وہ توقع کے خلاف اپنے شوہروں پر ایمان نہیں لائیں اور کافروں کا ساتھ دیتی رہیں، خدا نے فرمایا:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ کَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا صٰلِحَیْنِ فَخَانَتَاهُمَا فَلَمْ یُغْنِیَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا﴾ (تحریم:۱۰)

''خدا نے کافروں کے لیے نوحؑ کی بیوی اور لوط کی بیوی کی مثال بیان کی، یہ دونوں عورتیں ہمارے دو نیک بندوں کے گھر میں تھیں تو ان دونوں نے اپنے شوہروں سے خیانت کی تو یہ دونوں (پیغمبر ہو کر بھی) اپنی بیویوں کو خدا سے ذرا نہ بچا سکے۔''

مگر خیانت صرف دل ہی سے نہیں ہوتی ہے، بلکہ ایک ایک عضو سے ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ چشم و ابرو کے اشاروں سے ہو سکتی ہے، لیکن اگر یہ یقین ہو کہ ایک ذات ہے جو چوری چھپے کی ہر حرکت سے، ہر وقت باخبر رہتی ہے تو پھر انسان کو کسی قسم کی خیانت کاری کی جرأت نہ ہو، اسلام اسی یقین کو پیدا کر کے خیانتوں کا خاتمہ کرتا ہے، فرمایا۔

﴿یَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ﴾ (مومن:۱۹)

''اللہ جانتا ہے آنکھوں کی خیانت کاری کو اور جو چھپا ہے سینوں میں۔''

پھر اس سے چھپ کر کیوں کر کوئی کام کر سکتا ہے۔

---

(۱) ابوداؤد نسائی، ابن ماجہ، منذری باب مذکور۔

غداری اور دغا بازی

غداری اور دغا بازی کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو زبان دے کر اطمینان دلایا جائے اور پھر موقع پا کر اس کے خلاف کیا جائے۔ قرآن پاک نے اس کو بھی خیانت کہا ہے عربی میں عام طور سے غدر بھی کہتے ہیں' اسلام نے اس کی شدید برائی کی ہے۔ کفار میں سے جو بار بار امن اور صلح کے وعدے کر کے بدل جاتے تھے اور بار بار بدعہدی کرتے تھے' ان کے ذکر میں خدا فرماتا ہے۔

﴿اَلَّذِيْنَ عَاهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّ هُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ○ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ○ وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ○﴾ (انفال:۵۶-۵۸)

''جن سے تو نے معاہدہ کیا' پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں اور وہ تقویٰ (خدا کا لحاظ) نہیں رکھتے' سو اگر ان کو تو کبھی لڑائی میں پاوے تو ان کو ایسی سزا دے کہ ان کے پچھلے دیکھ کر بھاگیں۔ شاید وہ عبرت پکڑیں اگر تجھ کو کسی قوم کی دغا کا ڈر ہو تو ان کو تو برابر کا جواب دے اللہ کو دغا باز خوش نہیں آتے۔''

اس آیت میں گو ان کافروں کا ذکر ہے' جو ہر دفعہ عہد کر کے بدعہدی اور دغا بازی کرتے تھے مگر باتیں ان میں عمومیت کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ بدعہدی سراسر تقویٰ کے خلاف ہے' دوسری یہ کہ یہ غداری' دغا بازی اور بدعہدی اللہ تعالیٰ کی محبت سے محروم کر دیتی ہے' اور اس کی ناخوشی کی موجب ہے۔ بدر کے قیدیوں کو فدیہ اور وعدہ لے کر چھوڑ دینے کی اجازت جہاں دی گئی ہے وہیں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ اگر یہ خیانت اور دغا کریں تو اللہ ان سے سمجھ لے گا۔ پھر ان کو دوبارہ تمہارے قابو میں لے آئے گا' فرمایا:

﴿وَ اِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾ (انفال:۷۱)

''اور اگر وہ تیرے ساتھ خیانت (دغا) کرنا چاہیں تو وہ اس سے پہلے خدا سے بھی خیانت (دغا) کر چکے ہیں تو خدا نے ان پر قابو دے دیا اور اللہ جاننے والا' حکمت والا ہے۔''

خدا سے دغا کرنے کی صورت یہی ہے کہ اس کے ساتھ کفر کیا جائے' تو خدا تو سب کا حال جانتا ہے اور ہر مصلحت اس کو معلوم ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے اس نے ان کے چھوڑنے کی اجازت دی تو وہ بھی علم اور مصلحت سے دی ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا' قیامت کے دن ہر غدار کا ایک جھنڈا ہوگا۔[1] یعنی اس سے اس کی بدعہدی اور غداری کی تشہیر ہوگی۔ آنحضرت ﷺ اپنی فوج کے افسروں کو جو نصیحتیں فرماتے تھے ان میں سے ایک یہ

(۱) صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر۔

بھی ہوتی تھی کہ بدعہدی نہ کرنا۔ [1] یعنی دشمنوں سے معاہدہ کر کے پھر غداری نہ کی جائے' ظالم بادشاہوں' حاکموں' افسروں' سپہ سالاروں کا ایک چلتا ہوا حیلہ یہ ہوتا ہے کہ امن وامان کا وعدہ کر کے کسی کو اپنے پاس بلاتے ہیں۔ اور جب وہ ان کے قابو میں آ جاتا ہے تو اس کو سزا دیتے یا مروا دیتے ہیں' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے کسی کو جان کا امن دیا اور پھر مروا ڈالا تو میں اس سے الگ ہوں۔ اگرچہ مقتول کافر ہی کیوں نہ ہو۔ [2] خدا فرماتا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ﴾ (مائدہ:۱)

''اے ایمان والو! اپنی گرہوں (قول وقرار) کو پورا کرو۔''

عقود کی تعمیم میں وہ تمام شرطیں' وعدے اور معاہدے داخل ہیں۔ جو کوئی اپنے خدا سے یا بندہ سے یا کوئی جماعت کسی دوسری جماعت سے کرے' یہاں تک کہ مسلمان اپنے دشمنوں سے بھی جو معاہدہ کریں اس کا حرف بحرف پورا کرنا ضروری ہے۔ ایک دفعہ امیر معاویہؓ نے رومیوں سے مدتِ متعینہ کے لیے کوئی معاہدہ کیا' اس کے ختم ہونے کا زمانہ قریب آیا تو امیرؓ موصوف اپنی فوجیں لے کر ان کی سرحد کے پاس پہنچ گئے کہ ادھر مدت ختم ہو اور ادھر وہ حملہ کر دیں۔ یہ دیکھ کر عمروؓ بن عنبسہ نامی صحابی سوار ہو کر نکلے اور چلائے اللہ اکبر! اللہ اکبر! بدعہدی نہیں' امیر معاویہؓ نے بلوا کر پوچھا کہ کیا بات ہے؟ فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ کسی قوم سے معاہدہ کیا جائے تو اس کی کوئی گرہ نہ باندھی جائے نہ کھولی جائے (یعنی نہ اس میں سے کچھ کم کیا جائے نہ زیادہ کیا جائے) اور یا اس کو پہلے سے خبر دے کر معاہدہ کو یک قلم زد کر دیا جائے۔'' یہ سن کر امیر معاویہؓ واپس چلے آئے۔ [3] غور کی بات یہ ہے کہ امیر معاویہؓ نے معاہدہ کے لفظوں کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہی تھی۔ لیکن ان کا یہ فعل معاہدہ کی روح اور معنی کے خلاف تھا' رسول اکرم ﷺ کے تربیت یافتوں نے اس کو بھی بدعہدی سمجھا۔ اور امیر لشکر کو اس سے بھی روک دیا۔

بہتان

بہتان یہ ہے کہ جان بوجھ کر کسی بے گناہ کو مجرم ٹھہرایا جائے یا اس کی طرف کوئی ناکردہ گناہ یا برائی منسوب کی جائے' یہ بھی ایک طرح کا جھوٹ ہے۔ بلکہ قرآن نے اس کو بھی خیانت کہا ہے۔

بعض بہتان ایسے ہوتے ہیں جن کا سرے سے وجود ہی نہیں ہوتا۔ لیکن شرارت کی راہ سے کسی بے گناہ کے سر اس لیے تھوپا جاتا ہے کہ اس کی بدنامی ہو قرآن نے اس کا نام بہتان رکھا ہے۔ یہ دونوں باتیں جھوٹ ہونے

(۱) ایضاً۔

(۲) سنن ابی ماجہ وصحیح ابن حبان منذری باب الترغیب فی انجاز الوعد۔

(۳) سنن ابی داؤد باب الوفاء بالعہد۔

کے علاوہ حد درجہ شرافت کے خلاف ہیں اور اسی لیے جو لوگ جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے اس بہتان باندھنے میں شریک ہو جاتے ہیں وہ بھی گنہگار اور خیانت کار ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں طعمہ نامی مدینہ کے ایک منافق نے ایک صحابیؓ کے گھر میں چوری کی' مسلمانوں کو اس پر شبہ ہوا تو اس نے ایک مسلمان کا نام لے دیا۔ وہ تلوار کھینچ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ معاملہ آنحضرت ﷺ تک پہنچا۔ اس منافق کے گھر والوں نے اس کا ساتھ دیا اور اس کو بری ٹھہرایا۔ آنحضرت ﷺ نے اس کے موافق فیصلہ کرنا چاہا تو وحیِ الٰہی نے دفعتاً حقیقت کا پردہ چاک کر دیا۔ دوسری روایت یہ کی جاتی ہے کہ طعمہ کو ایک یہودی نے اپنی زرہ امانت رکھنے کو دی' اس نے خیانت کی اور واقعہ سے انکار کر دیا اور زرہ دوسرے کے گھر میں پھینک دی' لوگوں نے اس کو پکڑا' آخر معاملہ آنحضرت ﷺ تک پہنچا آپؐ نے ظاہر حال پر فیصلہ کرنا چاہا اس وقت یہ وحی آئی۔ (۱) بہرحال واقعہ جو کچھ ہو امرِ مشترک یہ ہے کہ گنہگار کو بے گناہ اور بے گناہ کو گناہ گار ٹھہرانے کے متعلق یہ آیتیں ہیں:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰکَ اللّٰهُ وَ لَا تَکُنْ لِّلْخَآئِنِیْنَ خَصِیْمًا○ وَّ اسْتَغْفِرِ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا○ وَ لَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِیْنَ یَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ خَوَّانًا اَثِیْمًا○ یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَ لَا یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ یُبَیِّتُوْنَ مَا لَا یَرْضٰی مِنَ الْقَوْلِ وَ کَانَ اللّٰهُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطًا﴾ (نساء:۱۰۵۔۱۰۸)

''ہم نے تیری طرف (اے پیغمبر!) یہ سچی کتاب اتاری ہے کہ تو لوگوں کے درمیان اس کے ذریعہ جو خدا نے تجھ کو سوجھایا انصاف کر' اور خیانت کاروں کی طرف سے نہ جھگڑنا اور اللہ سے قصور معاف کرا۔ بے شک اللہ بخشنے والا' رحم والا ہے' اور ان کی طرف سے نہ جھگڑ جو اپنے جی میں دغا رکھتے ہیں۔ بے شک اللہ خیانت کار گناہ گاروں کو دوست نہیں رکھتا۔ وہ لوگوں سے چھپنا چاہتے ہیں اور اللہ سے نہیں چھپنا چاہتے اور وہ ان کے ساتھ ہی ہے جب رات کو وہ سازش کرتے ہیں' جو خدا کو پسند نہیں اور ان کاموں کو گھیرے ہے۔''

آگے چل کر ہے:

﴿وَ مَنْ یَّکْسِبْ خَطِیْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ یَرْمِ بِهٖ بَرِیْٓئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِیْنًا﴾ (نساء: ۱۱۲)

''اور جو کوئی خطا یا گناہ کرے پھر وہ اس کی تہمت کسی بے گناہ پر دھرے اس سے طوفان اور کھلا گناہ (اپنے سر) لادا۔''

(۱) سنن ابوداؤد کتاب الادب۔

ان آیتوں میں خیانت کارانہ تہمت تراشی کی برائی کس خوبی سے ظاہر کی گئی ہے' سب سے پہلے تو رسول کو انصاف کی تاکید ہے' پھر یہ حکم ہے کہ خیانت کاروں کی حمایت اور ان کی طرف سے کوئی وکالت نہ کرے پھر فرمایا جو ایسے خائن ہیں وہ بڑے گناہ گار ہیں اور خدا کی محبت سے محروم ہیں یہ لوگ دنیا کی شرم کے مارے انسانوں سے چھپنے کے لیے اپنا گناہ دوسرے کے سر ڈالتے ہیں' اور خدا سے نہیں شرماتے' جو ہر جگہ ان کے ساتھ ہے اور ان کے ہر کام کو دیکھ رہا ہے۔ اس سے کوئی حقیقت چھپائے کیسے چھپ سکتی ہے اگر یہی یقین کسی کو ہو جائے تو وہ کسی پر تہمت اور بہتان باندھنے کی جرأت نہیں کرسکتا اس کے بعد یہ سرزنش اس کو سنائی گئی کہ جس نے مجرم ہو کر اپنا جرم دوسرے کے سر تھوپا اس نے بہتان باندھا اور گناہ کا بوجھ اپنے سر پر لادا۔

پہلے عرب میں دستور تھا کہ جو عورت کئی کئی مردوں سے ملتی تھی' وہ ان میں سے کسی ایک کی طرف بچہ کو منسوب کر دیتی تھی۔ یا مجہول بچہ کو اپنا کہہ کر شوہر کی نسبت دیتی تھی' خدا نے اس کو بہتان کہا اور آنحضرت ﷺ کو حکم ہوا کہ جو عورت مسلمان ہونے آئے۔ اس سے یہ بیعت لی جائے کہ وہ آئندہ اس جرم سے باز رہے گی۔

﴿وَلَا یَاْتِیْنَ بِبُھْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ اَیْدِیْھِنَّ وَ اَرْجُلِھِنَّ﴾ (ممتحنہ:۱۲)

''اور یہ کہ وہ بہتان نہ باندھیں گی اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے بیچ میں۔''

کسی مسلمان کو معمولی تکلیف پہنچانا بھی بری بات ہے۔ پھر بن کیے اس پر جھوٹا الزام رکھ کر اس کو دلی تکلیف پہنچانا کتنی بری بات ہے' خدا نے فرمایا:

﴿وَ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنَاتِ بِغَیْرِ مَا اکْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُھْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِیْنًا﴾ (احزاب:۵۸)

''اور جو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو بن کیے (تہمت لگا کر) تکلیف پہنچاتے ہیں انہوں نے بہتان اور کھلا گناہ (اپنے سر) لادا۔''

اس بہتان کی برائی کا اندازہ اس سے کرنا چاہیے کہ بہتان باندھنے والا خدا تعالیٰ کے حضور میں فاسق ٹھہرایا گیا' اور اس کی گواہی ہمیشہ کے لیے بے اعتبار ہو گئی۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو کوئی اپنے غلام پر تہمت لگائے گا۔ حالانکہ وہ بے گناہ ہو یعنی اس نے وہ جرم نہیں کیا تھا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس مالک کی پیٹھ پر کوڑے مارے گا' (۱) یہ گویا قذف یعنی تہمتِ بے جا کی مثالی سزا ہو گی' ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ جس میں جو برائی نہیں' اس کی نسبت اس کی طرف کرنا بہتان ہے' (۲) یعنی اس سے بچنا چاہیے۔

---

(۱) (۲) سنن ابوداؤد کتاب الادب۔

چغل خوری

چغل خور کا کام یہ ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان جھوٹی سچی باتیں بیان کر کے ایک کو دوسرے کے خلاف کائے اور اپنا رسوخ جتائے' اور چونکہ ایسے لوگ چل پھر کر ایک کی ایسی بات دوسرے کو پہنچاتے ہیں۔ جس سے دوسرے کو پہلے پر غصہ آئے اور اس سے نفرت پیدا ہو' اسی لیے قرآن نے ان لوگوں کے اوصاف میں جن کی بات نہیں ماننی چاہیے یہ لفظ کہے ہیں۔ ﴿مَشَّآءٍ بِنَمِيمٍ﴾ (القلم) جو چغلی کھاتا پھرتا ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ اصول مقرر فرما دیا کہ جب کوئی شخص کوئی خبر لے کر آئے تو پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ اس خبر کا لانے والا کیسا ہے؟ اگر وہ سچا مومن نہیں تو اس کی بات ہی نہ مانی جائے ایسا نہ ہو کہ اس کی بات مان کر جلدی میں کوئی ایسی حرکت کر بیٹھی جائے جس پر پیچھے افسوس ہو' فرمایا:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ نَدِمِينَ﴾ (حجرات:۶)

''اے ایمان والو! اگر کوئی گناہ گار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لو' کہیں کسی قوم پر نادانی سے جا نہ پڑو پھر اپنے کیے پر پچھتانے لگو۔''

اس آیت میں غور کے قابل خاص نکتہ یہ ہے کہ جھوٹی خبریں پھیلانے والے کو خدا نے فاسق کا خطاب دیا اور چونکہ اس بد اخلاقی کا مقصد زیادہ تر دو شخصوں' بالخصوص عزیز و اقارب اور دوست واحباب میں نا اتفاقی پیدا کرنا ہوتا ہے' اسی بنا پر حدیث میں آیا ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے برے لوگ کون ہیں' پھر خود ہی فرمایا۔

﴿اَلْمَشَّاؤُنَ بِالنَّمِيمَةِ الْمُفْسِدُونَ بَيْنَ الْاَحِبَّةِ﴾ (مسند احمد ج ۶ ص ۴۵۹ عن اسماء بنت یزید)

''جو چغلیاں کھاتے پھرتے ہیں اور دوستوں کے آپس کے تعلقات خراب کرتے ہیں۔''

صحیحین میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ ایک قبرستان کے پاس سے گزرے تو فرمایا کہ ان میں سے ایک پر اس لیے عذاب ہو رہا ہے کہ وہ چغلی کھاتا پھرتا تھا۔ (۱)

((اَلَا اُنَبِّئُكُمْ مَا الْعَضَةُ هِيَ النَّمِيمَةُ الْقَالَةُ بَيْنَ النَّاسِ))

''کیا میں تم کو بتاؤں کہ عضہ کیا ہے' وہ چغل خوری ہے جو لوگوں کے درمیان بیان کی جاتی ہے۔''

لغت میں عضہ کے معنی تفریق اور سحر کے ہیں' اس لیے اگر اس حدیث میں تفریق کے معنی لیے جائیں تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ دو شخصوں میں علیحدگی کرنا چغل خوری کی حقیقت میں داخل ہے' لیکن اگر سحر کے معنی لیے جائیں تو اس صورت میں بھی سحر اور چغل خوری میں مشابہت و مناسبت ہے کیونکہ سحر سے بھی دو شخصوں بالخصوص

(۱) صحیح بخاری کتاب الطہارۃ باب من الکبائر ان لایستتر عن بولہ و صحیح مسلم کتاب الطہارۃ باب الدلیل عن نجاسۃ البول۔

میاں بی بی میں علیحدگی کرائی جاتی ہے چنانچہ خود قرآن مجید میں ہے:

﴿فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهِ﴾ (بقرہ:۱۰۲)

''اس پر بھی ان (ہاروت ماروت) سے ایسی باتیں سیکھتے ہیں جن کی وجہ سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں۔''

عام طور پر مفسرین اس تفریق کا ذریعہ اس سحر کو قرار دیتے ہیں جو لوگ ہاروت ماروت سے سیکھتے تھے لیکن بعض علما کے نزدیک یہ مقصد چغل خوری سے حاصل کیا جاتا تھا۔

عام طور پر یہ مقصد اس طرح حاصل کیا جاتا ہے کہ ایک کی بات دوسرے تک پہنچائی جاتی ہے مثلاً یہ کہ فلاں شخص تمہاری نسبت یہ کہتا تھا۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرامؓ کو یہ ہدایت کی تھی۔[1] ((لا يبلغني احد من اصحابي عن احد شيئا فاني احب ان اخرج اليكم و انا سليم الصدر))

''میرے اصحاب میں سے کوئی مجھ تک کسی کی بات نہ پہنچائے کیونکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہارے پاس آؤں تو میرا دل صاف ہو۔''

لیکن اس قسم کی باتیں عام طور پر وہ ہوتی ہیں جو معیوب اور ناپسندیدہ سمجھی جاتی ہیں بعض اوقات تو خود وہ شخص اس کو معیوب سمجھتا ہے جو دوسرے تک اس کو پہنچاتا ہے بعض حالتوں میں جس شخص تک وہ بات پہنچائی گئی ہے اس کو ناگوار گزرتی ہے بعض موقعوں پر دوسرے لوگ اس کو برا سمجھتے ہیں غرض کسی نہ کسی طرح یہ بات ناپسندیدہ خیال کی جاتی ہے اور جو لوگ اس بد اخلاقی میں مبتلا ہوتے ہیں وہ اس قسم کی ناپسندیدہ باتوں کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں تاکہ ان کو پھیلا کر فتنہ وفساد کی آگ بھڑکائیں اسی بنا پر اہلِ عرب چغل خوروں کو ہیزم بردار کہتے ہیں یعنی جس طرح لکڑیاں بیچنے والے لکڑیاں چن چن کر لاتے ہیں اور ایندھن کے لیے گھوم گھوم کر بازاروں میں فروخت کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ اس قسم کی باتوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پھیلاتے ہیں اور آتشِ فتنہ وفساد کے لیے ایندھن بہم پہنچاتے ہیں۔[2]

قرآن مجید میں ابولہب کی بی بی کو بعض مفسرین کی رائے کے مطابق ﴿حَمَّالَةَ الْحَطَبِ﴾ (یعنی ہیزم بردار) کا خطاب اسی لیے دیا گیا ہے کہ لوگوں کی چغلیاں کھاتی پھرتی تھی۔

ان میں بعض لوگ استراقِ سمع کرتے ہیں یعنی چھپ چھپ کر لوگوں کی باتیں سنتے ہیں اور پھر ان کو دوسروں تک پہنچاتے ہیں اس قسم کے لوگوں کو لغت میں قتات کہتے ہیں اور ان کی نسبت رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّاتٌ))[3]

---

(۱) مسلم کتاب البر وصلة باب تحریم النمیمہ۔

(۲) ابوداؤد کتاب الادب باب فی رفع الحدیث۔

(۳) ابوداؤد کتاب الادب باب فی القتات۔

''جنت میں چغل خور داخل نہ ہوگا۔''

اس قسم کی باتیں خوب نمک مرچ لگا کر نہایت چرب زبانی کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں تا کہ ان کا اثر بڑھ جائے۔ اسی لیے عربی زبان میں چغل خوری کو ''وشایہ'' کہتے ہیں جس کے معنی نقش و نگار کے ہیں اور ادھر کی ادھر لگانے کے لیے چغل خوروں کو دوڑ دھوپ بھی کرنی پڑتی ہے' اسی مناسبت سے چغل خوری کو ''سعایہ'' بھی کہتے ہیں جس کے معنی دوڑ دھوپ کرنے کے ہیں۔

یہ کام اگر چہ زیادہ تر زبان سے لیا جاتا ہے' لیکن وہ صرف زبان ہی تک محدود نہیں' بلکہ تحریر و کتابت رمز و اشارات سے بھی چغل خوری کی جا سکتی ہے' اور وہ صرف اقوال ہی تک محدود نہیں بلکہ اعمال بھی اس میں داخل ہیں یعنی دوسرے شخص سے صرف یہی نہیں کہا جا سکتا کہ ''فلاں شخص یہ کہتا تھا۔'' بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ''فلاں شخص یہ کام کرتا تھا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ محض زبان سے ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا چغلی کی مکمل تعریف نہیں ہے بلکہ اس کی جامع تعریف یہ ہے کہ ایک شخص کی ایسی بات یا کام کو دوسرے تک پہنچانا جس سے دوسرا پہلے سے بدگمان ہو جائے۔

اسی بنا پر چغل خوری سے محفوظ رہنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ایک شخص لوگوں کے جو حالات دیکھے یا سنے ان کو بغیر جائز ضرورت کے ظاہر نہ کرے اور رسول اللہ ﷺ نے ترک مالایعنی کی جو ہدایت مسلمانوں کو کی ہے اس پر عمل کرنے سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔

چغل خوری ایک فتنہ پردازی ہے۔ جس کے نتائج بعض حالتوں میں نہایت خطرناک صورت میں ظاہر ہوتے ہیں' اور قتل و خون ریزی تک کی نوبت پہنچ جاتی ہے اسی کے ساتھ وہ متعدد گناہوں کا مجموعہ ہے' اور اس میں غیبت' بہتان' تجسس کذب و فریب' نفاق غرض مختلف بد اخلاقیوں کے عناصر شامل ہوتے ہیں' اس لیے وہ ان نتائج اور ان عناصر کے لحاظ سے گناہِ کبیرہ ہے' لیکن اسی کے ساتھ وہ تمدن و معاشرت کا ایک جزو ہوگئی ہے' اگر امرا کے درباروں میں تملق و خوشامد کے لیے چغل خوری کی جاتی ہے تو عام صحبتوں میں اس سے تفریحِ خاطر اور لطفِ صحبت کا کام لیا جاتا ہے' اس لیے یہ اخلاقی مرض اس کثرت سے پھیل گیا ہے کہ وہ ایک معمولی چیز بن گیا ہے اور اس کو لوگ گناہِ کبیرہ نہیں سمجھتے' اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ مدینہ کے کسی باغ سے نکلے تو دو مردوں کی آواز سنی جن پر ان کی قبروں میں عذاب ہو رہا تھا فرمایا ''ان پر عذاب ہو رہا ہے لیکن یہ عذاب کسی بڑے گناہ پر نہیں ہوتا' حالانکہ وہ بڑے گناہ کے کام ہیں' ان میں ایک تو پیشاب آڑ میں نہیں کرتا تھا اور دوسرا لوگوں کی چغلیاں کھاتا پھرتا تھا۔ (۱)

(۱) بخاری کتاب الادب باب النمیمۃ من الکبائر۔

اس حدیث شریف کی شرح میں محدثین نے بڑی بڑی موشگافیاں کی ہیں، یہاں تک کہ بعض محدثین نے لکھا ہے کہ پہلے تو آپؐ نے یہ فرمادیا کہ یہ کوئی بڑا گناہ نہیں پھر جب وحی کے ذریعہ سے آپؐ کو معلوم ہوا کہ یہ گناہ کبیرہ ہے تو اس کو منسوخ کر دیا اور فرمایا کہ وہ بڑے گناہ کا کام ہے محدثین نے اس قسم کی اور بھی بہت سی نکتہ آفرینیاں کی ہیں، حالانکہ حدیث کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ یہ دونوں بداخلاقیاں اس قدر عام ہوگئی ہیں کہ ان کو لوگ معمولی چیز سمجھنے لگتے ہیں، حالانکہ وہ معمولی چیز نہیں بلکہ کبائر و موبقات میں داخل ہیں۔

قرآن مجید میں بھی اس کی نظیر موجود ہے، چنانچہ افکِ عائشہؓ کے عام چرچے کے متعلق ارشاد الٰہی ہے:

﴿اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَ تَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّ تَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّ هُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ﴾ (نور:۱۵)

”جب تم لگے اپنی زبانوں سے اس کی نقل درنقل کرنے اور اپنے منہ سے ایسی باتیں کہنے جس کی تم کو مطلق خبر نہیں اور تم نے اس کو ایسی ہلکی (سی) بات سمجھا حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بڑی (سخت بات) ہے۔“

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو باتیں کسی کی تشہیر و تفضیح سے تعلق رکھتی ہیں، عام دل چسپی کی وجہ سے وہ معمولی خیال کی جاتی ہیں، حالانکہ وہ معمولی نہیں ہوتیں۔

کشفِ عورت اور کشفِ عیوب میں جو مناسبت ہے وہ بھی اس حدیث سے ظاہر ہوتی ہے، یہ بداخلاقی زیادہ تر نہایت دنی الطبع، پست حوصلہ، متبذل، اور ناقابل اعتبار اشخاص میں پائی جاتی ہے، بغض و انتقام لینے یا کسی ذی وجاہت شخص کے یہاں رسوخ حاصل کرنے یا سوسائٹی میں شریک ہونے کے لیے اور کوئی ذریعہ نہیں پاتے تو چغل خوری سے کام لیتے ہیں، اس لیے ان کے شر و فساد سے بچنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ان کی بات ناقابلِ اعتبار قرار دی جائے اور ان کا کہنا نہ مانا جائے اور قرآن مجید نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طریقہ کے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے:

﴿وَ لَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ○ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ ○ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ○﴾ (قلم: ۱۰۔۱۲)

”اور تو ایسے کا کہنا نہ مان جو بہت قسمیں کھاتا ہے، آبرو باختہ ہے (لوگوں پر) آوازے کسا کرتا ہے، چغلیاں لگاتا پھرتا ہے اچھے کاموں سے (لوگوں کو) روکتا رہتا ہے حد سے آگے بڑھ گیا ہے، بدکار ہے۔“

غیبت اور بدگوئی

شریعت کا ایک بڑا مقصد یہ ہے۔ کہ مسلمانوں کی عزت و آبرو محفوظ رہے اور ان کے باہمی تعلقات خوش

گوارا رہیں۔ اس بنا پر جن بد اخلاقیوں سے مسلمانوں کی عزت و آبرو کو صدمہ پہنچتا ہے اور ان کے تعلقات میں ناگواری پیدا ہوتی ہے، شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مجموعی طور پر ان کو ایک جگہ بیان کردیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَ لَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَ لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ وَ مَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ○ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّ لَا تَجَسَّسُوْا وَ لَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ○﴾ (حجرات: ۱۱۔۱۲)

''مسلمانو! مرد مردوں پر نہ ہنسیں عجب نہیں کہ (جن پر ہنستے ہیں) وہ (خدا کے نزدیک) ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں عورتوں پر ہنسیں عجب نہیں کہ (جن پر ہنستی ہیں) وہ ان سے بہتر ہوں، آپس میں ایک دوسرے کو طعنے نہ دو اور نہ ایک دوسرے کو نام دھرو، ایمان لائے پیچھے بد تہذیبی کا نام ہی برا ہے اور جو (ان حرکات سے) باز نہ آئیں تو وہی خدا کے نزدیک ظالم ہیں۔ مسلمانو! (لوگوں کی نسبت) بہت شک کرنے سے بچتے رہو کیونکہ بعض شک داخلِ گناہ ہیں اور ایک دوسرے کی ٹٹول میں نہ رہا کرو، اور تم میں سے ایک کو ایک پیٹھ پیچھے برا نہ کہے، بھلا تم سے میں کوئی (اس بات کو) گوارا کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے تو تم کو گھن آئے اور اللہ سے تقویٰ کرو، بے شک اللہ رجوع ہونے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

ان تمام اخلاقی احکام سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے قول و عمل سے مسلمانوں کے عیوب کی پردہ دری نہیں کرنی چاہیے، لیکن ان طریقوں میں سب سے زیادہ جس طریقہ سے مسلمانوں کے عیوب کی پردہ دری ہوتی ہے، وہ غیبت ہے، امام غزالی نے لکھا ہے کہ تعریض، تصریح، رمز و اشارات، تحریر و کتابت اور محاکات و نقالی ہر طریقہ سے دوسروں کے عیوب بیان کیے جاسکتے ہیں، اور ایک شخص کے نسب، اخلاق، دین و دنیا، جسم کپڑے، لتے، غرض ہر چیز میں عیب نکالا جاسکتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے نہایت پرزور طریقہ سے اس کی ممانعت کی ہے، اور اس کو خود اپنے بھائی کے مردار گوشت سے تشبیہ دی ہے، جس میں بلاغت کے بہت سے نکتے ہیں۔

(۱) انسان کا گوشت محض اس کی عزت و حرمت کی وجہ سے حرام ہے، اس لیے جو چیز اس کی عزت و حرمت کو نقصان پہنچاتی ہے وہ بھی اس کے گوشت کی طرح حرام ہے۔

(۲) لڑائی جھگڑے میں جب باہم مقابلہ ہوتا ہے تو بعض لوگ شدتِ غضب میں اپنے حریف کا گوشت نوچ لیتے ہیں اگرچہ یہ بھی ایک برا فعل ہے تاہم اس میں ایک قسم کی شجاعت پائی جاتی ہے، لیکن اگر کوئی حریف کے

مر جانے کے بعد اس کا گوشت نوچ لے تو مکروہ ہونے کے ساتھ یہ ایک بزدلانہ فعل بھی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص رو در رو کسی کو برا کہے تو گو یہ ایک ناپسندیدہ چیز ہے تاہم اس میں بزدلی نہیں پائی جاتی' لیکن ایک شخص کی پیٹھ پیچھے اس کی برائی کرنا نہایت بزدلانہ کام ہے' اور بعینہ ایسا ہے' جیسے کوئی اپنے حریف کے مقتول ہونے کے بعد اس کا گوشت نوچ کھائے۔

(۳) لوگ شدتِ محبت سے بھائی کی مردہ لاش کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے' اس لیے جو شخص اپنے مردہ بھائی کا گوشت نوچ کھاتا ہے' اس سے اس کی سخت قساوت و سنگ دلی اور بغض و عداوت کا اظہار ہوتا ہے' اور یہ اس لطف و محبت کے منافی ہے' جس کو اسلام مسلمانوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔

(۴) مردار گوشت کا کھانا سخت اضطرار کی حالت میں جائز ہے اور اس وقت بھی اگر کسی کو انسان کے بجائے بکری کا مردار گوشت مل جائے تو وہ انسان کا گوشت کھانا پسند نہ کرے گا۔ اس لیے غیبت اس وقت تک جائز نہیں ہو سکتی جب تک کوئی شرعی' معاشرتی' اخلاقی یا سیاسی ضرورت انسان کو مجبور نہ کرے اور اس حالت میں بھی جہاں تک ممکن ہو علانیہ غیبت سے احتراز کرنا چاہیے' اور صرف رمز و اشارہ سے کام لینا چاہیے اسی قرآنی تشبیہ کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے متعدد حدیثوں میں بلیغ طریقہ پر غیبت کی برائی بیان کی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ شب معراج میں میرا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جس کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ ان سے اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے' میں نے جبرئیل سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔؟ بولے یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے تھے' اور ان کی عزت و آبرو لیتے تھے۔ (۱)

اعمال اور اعمال کی جزا و سزا میں مناسبت ہوتی ہے' یہ لوگ چونکہ لوگوں کا گوشت نوچ کھاتے تھے۔ یعنی ان کی غیبت کرتے تھے اس لیے عالمِ برزخ میں ان کی یہ سزا مقرر کی گئی کہ خود اپنا گوشت نوچتے رہیں۔

ایک بار سخت بدبو پھیلی تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ سے کہا کہ جانتے ہو یہ کیا ہے؟ یہ ان لوگوں کی بدبو ہے جو مسلمانوں کی غیبت کرتے ہیں۔ (۲)

اس حدیث میں بھی اعمال اور جزاء و سزا کی مناسبت ظاہر ہے' مردار گوشت اکثر بدبودار ہوتا ہے اور یہ لوگ بھی گوشت کھاتے تھے' اس لیے یہ بدبو اسی مردارخواری کا نتیجہ تھی۔

اس حدیث میں ایک نکتہ یہ بھی ہے اور وہ یہ کہ غیبت کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ عیوب کی تشہیر و تفضیح کی جائے۔ اس لیے جس طرح غیبت کرنے والے لوگوں کے عیوب کو عام طور پر پھیلاتے ہیں اسی طرح ان کے اس عمل کی نجاست و گندگی کی بو بھی دنیا میں پھیل کر لوگوں کو ان سے متنفر کرتی ہے۔ اسی نکتہ کو آپ ﷺ نے دوسری حدیث میں بلا تشبیہ و تمثیل کے نہایت واضح طور پر بیان کیا اور فرمایا ''اے وہ لوگو! جو زبان سے تو ایمان لائے ہو لیکن ایمان

(۱) ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ۔

(۲) ادب المفرد باب الغیبۃ۔

تمہارے دلوں کے اندر جا گزیں نہیں ہوا ہے، نہ مسلمانوں کی غیبت کرو، اور نہ ان کی عیوب کی تلاش میں رہو، کیونکہ جو شخص ان کے عیوب کی تلاش میں رہے گا، خداوند تعالیٰ بھی اس کے عیب کی تلاش کرے گا۔ اور خدا جس کے عیب کی تلاش کرے گا خود اس کے گھر ہی کے اندر اس کو رسوا کرے گا۔ (۱)

لغت کی رو سے غیبت کسی شخص کی غیر موجودگی میں اس کی برائی کے بیان کو کہتے ہیں، مگر مذہبی تعلیم میں شخص کی غیر موجودگی غیبت کے لیے کوئی قید نہیں اسی طرح یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر کسی شخص کی واقعی برائیاں ظاہر کی جائیں تو یہ غیبت نہیں لیکن آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد سے ان دونوں باتوں کی تردید ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ غیبت کس کو کہتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا تمہارا اپنے بھائی کی اس چیز کا ذکر کرنا جس کو وہ ناپسند کرے، کہا گیا کہ اگر میرے بھائی میں وہ عیب موجود ہو جس کو میں بیان کرتا ہوں، تو فرمایا اگر وہ عیب اس میں موجود ہے تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر نہیں ہے تو تم نے اس پر بہتان لگایا۔ (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کی عدم موجودگی میں اس کی برائی بیان کرنا غیبت کی تعریف کا کوئی ضروری جز نہیں بلکہ اگر کسی شخص کے سامنے اس کی برائی بیان کی جائے تو یہ بھی غیبت ہوگی، لیکن اس لفظ کے اشتقاق کی مناسبت سے اہلِ لغت کے نزدیک غیبت صرف اس بدگوئی کا نام ہے جو کسی کے پیٹھ پیچھے یعنی اس کی عدم موجودگی میں کی جائے۔ باقی کسی کے سامنے اس کے عیوب کا بیان کرنا تو یہ غیبت نہیں ہے بلکہ سب وشتم میں داخل ہے۔

اسی طرح غیبت صرف زبان تک محدود نہیں ہے بلکہ ہاتھ پاؤں، اور آنکھ کے ذریعہ سے بھی غیبت کی جا سکتی ہے، کسی شخص کی نقل کرنا، مثلاً ایک لنگڑا ہے تو اس کے اس عیب کو نمایاں کرنے کے لیے لنگڑا چلنا بھی غیبت ہے۔ ایک بار حضرت عائشہؓ نے ایک شخص کی نقل کی تو رسول اللہ ﷺ نے اس پر اپنی سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا: (۳) اسی طرح چشم و ابرو کے اشارے سے کسی کے عیب کی پردہ دری کرنا بھی غیبت ہے اور قرآن پاک نے متعدد آیتوں میں غیبت کے ان ہی مخفی طریقوں کی برائی بیان کی ہے۔

﴿هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيمٍ﴾ (قلم:۱۱)

(''لوگوں پر) آوازے کسا کرتا ہے (ادھر کی ادھر) چغلیاں لگاتا پھرتا ہے۔''

﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ﴾ (الھمزۃ:۱)

''ہر شخص جو (لوگوں کی) عیب چینی کرتا (اور ان پر) آوازے کستا ہے اس کی (بھی بڑی) تباہی ہے۔''

ان آیتوں میں غیبت کے جن مخفی اور دلخراش طریقوں کی مذمت کی گئی ہے ان کی توضیح ترجمہ سے نہیں ہو سکتی،

---

(۱) ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ۔

(۲) ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ۔

(۳) ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ۔

بلکہ اس کے لیے اہل لغت کی تصریحات پیش نظر رکھنی چاہییں جو حسب ذیل ہیں:

(۱) (هُمَز) سامنے اور (لمز) پیٹھ پیچھے برائی کرنا

(۲) (هُمَز) خاص طور پر لوگوں کے نسب کی برائی بیان کرنا۔

(۳) (همز) ہاتھ کے اشارے سے اور (لمز) زبان سے غیبت کرنا۔

(۴) (همز) زبان سے اور (لمز) آنکھ کے اشارے سے غیبت کرنا۔

(۵) (همز) برے الفاظ سے ہم نشینوں کی دل آزاری کرنا۔

(۶) (لمز) آنکھ ہاتھ سر اور ابرو کے اشارے سے ہم نشینوں کی برائی بیان کرنا۔

اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ غیبت کا دائرہ کہاں تک وسیع ہے۔

کسی کی برائی بیان نہ کرنا اخلاقاً بڑی اچھی چیز ہے، لیکن خود اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کی واقعی برائی بیان کی جائے تا کہ ان کو تنبیہ اور ندامت و شرمندگی ہو، اگر بروں کی برائی بیان کرنے کو یک قلم بند کر دیا جائے تو ان کی برائی کی روک تھام کی کوئی صورت نہ ہو سکے گی۔ اسلام کی نگاہ سے یہ نکتہ چھپا نہیں رہ سکتا تھا، قرآن پاک میں کافروں، مشرکوں اور منافقوں کی علانیہ برائیاں کی گئی ہیں، مگر کہیں کسی کا نام نہیں لیا گیا ہے، بلکہ ہمیشہ عموم کے ساتھ پردہ میں یا صیغۂ مجہول کے ساتھ یا وصف کے ساتھ یوں کہا گیا ہے کہ جو جھوٹ بولتے ہیں، یا کفر کرتے ہیں، ان کا حال یہ ہے۔ اس طریقۂ تعبیر میں یہ فائدہ ہے کہ بروں کی برائی کا اظہار بھی ہوتا ہے اور کسی خاص شخص کو ناگواری کا حق بھی نہیں پہنچتا اور جن بڑے بڑے کفار کے نام لیے گئے ہیں وہ اس لیے کہ ان کی یہ برائیاں عالمِ آشکارا تھیں۔

لیکن معاملات میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں، جہاں تخصیص کی ضرورت پیش آتی ہے، قرآن پاک کی آیتوں اور حدیثوں سے ان موقعوں کی تعیین بھی معلوم ہوتی ہے، قرآن پاک کا چھٹا پارہ اس آیت سے شروع ہوتا ہے:

﴿لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا﴾ (نساء: ۱۴۸)

''اللہ کو بدگوئی پسند نہیں آتی، لیکن جس پر ظلم ہوا ہو، اور اللہ سنتا اور جانتا ہے۔''

مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہیں کہ کوئی کسی کی برائی کو پکار کر کہتا پھرے، لیکن مظلوم کو حق ہے کہ وہ اپنے ظلم کی داستان کو لوگوں سے بیان کرے اور ظالم کے ظالمانہ کاموں کو آشکارا کرے اللہ تعالیٰ سنتا اور جانتا ہے، ظالم کو اس کے برے اعمال کی سزا دے گا۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں باریابی کی اجازت طلب کی، آپؐ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ یہ اپنے خاندان میں کس قدر برا شخص ہے۔ لیکن جب وہ پاس آیا تو آپؐ نے نہایت لطف و

کرم کے ساتھ گفتگو کی۔[۱] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کے شر وفساد سے لوگوں کو آگاہ کرنے اور بچانے کے لیے اس کے احوال واقعی کا اظہار جائز ہے۔ غرض جس اظہار میں دوسروں کے ساتھ خیر خواہی کا جذبہ شامل ہو یا اس کے بغیر کوئی شرعی یا اخلاقی یا تمدنی مقصد حاصل نہ ہوسکتا ہو اس کو یا تو غیبت ہی نہیں کہہ سکتے اور اگر کہہ سکتے ہیں تو شریعت اس کو جائز رکھتی ہے' امام غزالی نے احیاء العلوم میں ان مقاصد کو چھ صورتوں میں محدود کر دیا ہے۔

(۱) حاکم کے مظالم کی بارگاہِ سلطانی میں فریاد کرنا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔ ((لصاحب الحق مقالاً))

(۲) مذہبی اور اخلاقی برائیوں کا انسداد کرنا یعنی بغرضِ احتساب (چنانچہ اسی بنا پر کفار اور منافقوں کی برائیاں قرآن نے طشت از بام کی ہیں۔)

(۳) فتویٰ طلب کرنا اسی بنا پر حضرت ہندؓ بنت عتبہ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حضرت ابوسفیانؓ کے بخل کی شکایت کی' اور آپؐ نے سن کر اس کا مناسب جواب دیا۔

(۴) ایک شخص کے شر و فساد سے لوگوں کا بچانا' چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اسی غرض سے ایک شخص کو ((بئس ابن العشیر ہ)) ''قبیلہ کا برا آدمی'' کہا تھا۔

(۵) ایک شخص کا کسی ایسے لقب سے مشہور ہو جانا جس سے گو اس کا عیب ظاہر ہو مگر غایت شہرت کی وجہ سے خود اس شخص کو بھی اس سے چڑ نہ ہو' مثلاً اعمش یا اعرج' کیونکہ یہ اس کی ایک امتیازی علامت قرار دیا گیا ہے اور یہ اس کو ناگوار بھی نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ نے خود ایک صحابی کو ذوالیدین (دو ہاتھوں والے) کے لقب سے پکارا تھا۔

(۶) علانیہ فسق و فجور کرنے والے کی برائی بیان کرنا (تاکہ اس کو تنبہ اور دوسروں کو عبرت ہو مثلاً مخنث کو مخنث کہنا)۔

دورخاپن

اگر دو شخصوں میں اختلاف ہو تو ایک شخص خلوص و صداقت کے ساتھ دونوں سے تعلقات رکھ سکتا ہے لیکن اس قسم کے تعلقات میں دورخاپن نہیں پایا جانا چاہیے یعنی دونوں کا دوست بن کر ایک کی بات دوسرے تک پہنچا کر دونوں کے تعلقات کو اور زیادہ خراب کرنا نہیں چاہیے' بلکہ یہ بداخلاقی چغل خوری سے بھی زیادہ سخت ہے کیونکہ چغل خور صرف ایک کی بات دوسرے تک پہنچاتا ہے اور دورخا آدمی دونوں کی بات ایک دوسرے تک پہنچاتا ہے۔

دورخے پن کے لیے صرف ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا ضروری نہیں ہے' بلکہ اگر ایک شخص سامنے ایک کی تعریف کرے اور اس کے پاس سے نکلے تو اس کی ہجو کرنے لگے تو بھی وہ دورخا کہلائے گا' نفاق میں جو

(۱) بخاری کتاب الادب مایجوز من اغیاب اہل الفساد والریب۔

خصوصیات پائی جاتی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے اسی لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کو بھی نفاق سمجھتے تھے ایک بار حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کہا گیا کہ "ہم لوگ امرا اور حکام کے پاس جاتے ہیں تو کچھ کہتے ہیں اور جب ان کے یہاں سے نکلتے ہیں تو کچھ کہتے ہیں۔" بولے ہم لوگ عہد رسالت میں اس کا شمار نفاق میں کرتے تھے۔ (۱) اور قرآن مجید میں بھی نفاق کی یہ خاص علامت بیان کی گئی ہے۔

﴿وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ﴾ (بقرہ:۱۴)

"اور جب ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لاچکے تو کہتے ہیں ہم (بھی تو) ایمان لاچکے ہیں اور جب تنہائی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو صرف مسلمانوں کو بناتے ہیں۔"

معاشرتی اور دنیوی حیثیت سے اس قسم کے اخلاقی منافقوں کو اردو میں دورخا اور عربی میں ذوالوجہین کہتے ہیں۔ اور احادیث میں اس قسم کے لوگوں کے لیے وعیدِ شدید آئی ہے مثلاً فرمایا "قیامت کے دن خدا کے نزدیک تم سب سے برا دورخے کو پاؤ گے جو کچھ لوگوں کے پاس جاتا ہے تو اس کا رخ اور ہوتا ہے اور دوسروں کے پاس جاتا ہے تو اور۔" (۲)

ایک اور حدیث میں فرمایا:

"دنیا میں جس کے دورخ ہوں گے قیامت کے دن اس کے منہ میں دو زبانیں ہوں گی۔" (۳) یہ گویا اس کی اس عادتِ ذمیمہ کی تمثیل ہوگی کہ وہ لوگوں سے دورنگ کی باتیں کیا کرتا تھا۔

بدگمانی

بدگمانی ایک قسم کا جھوٹا وہم ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے شخص کو ہر ایک کے کام میں بدنیتی معلوم ہوتی ہے اور کسی کے کام میں اس کو حسنِ نیت نظر نہیں آتا۔ دوسروں کی طرف ان ہوئی باتیں منسوب کرنے لگتا ہے۔ دوسرے کو بھی اس کا خیال ہوتا ہے اور وہ بھی کترانے لگتا ہے اس سے آپس میں نفرت اور دشمنی پیدا ہوتی ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اس سے باز رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾ (حجرات:۱۲)

"اے ایمان والو! بہت بدگمانی سے بچا کرو بے شک بعض بدگمانی گناہ ہے۔"

(۱) صحیح بخاری باب ما قیل فی ذی الوجہین۔

(۲) بخاری کتاب الادب باب ما قیل فی ذی الوجہین وصحیح مسلم و مالک۔

(۳) ابوداؤد کتاب الادب باب ذی الوجہین۔

آنحضرت ﷺ نے جب بدگمانی سے بچنے کی تاکید کی تو اس کے ساتھ ہی ساتھ بغض وحسد اور دوسرے کے معاملات کے تجسس وتلاش کی بھی ممانعت فرمائی کیونکہ وہ بدگمانی کے اسباب یالازمی نتیجے ہیں، فرمایا:

''تم بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے، تم دوسروں کے ٹوہ میں نہ رہا کرو، اور نہ ایک دوسرے پر بڑھنے کی بے جا ہوس کرو، اور نہ آپس میں حسد رکھو، اور نہ بغض رکھو، اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو، اور اے اللہ کے بندو! جیسا اللہ نے فرمایا ہے۔ آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ۔''(۱)

یہ بھی مناسب ہے کہ اگر کوئی شخص ایسا کام کر رہا ہو، یا کسی ایسی حالت میں ہو جس سے دوسرے کو بدگمانی کا موقع ہو تو وہ اس بدگمانی کو دور کر دے، تاکہ دوسرا فتنہ میں نہ پڑے۔ اس کی مثال خود آنحضرت ﷺ نے پیش فرمائی ہے، ایک دفعہ آپؐ اعتکاف میں بیٹھے تھے، رات کو ازواج مطہراتؓ میں سے کوئی آپؐ سے ملنے آئیں آپؐ ان کو واپس پہنچانے چلے کہ اتفاقاً راستہ میں ایک انصاری آپڑے، وہ آپؐ کو کسی عورت کے ساتھ دیکھ کر اپنے آنے کو بے موقع سمجھے اور واپس پھرنے لگے آپؐ نے فوراً آواز دی اور فرمایا یہ میری بیوی فلاں ہیں انہوں نے عرض کی یارسول اللہ! اگر مجھے کسی کے ساتھ بدگمانی بھی کرنی ہوتی تو آپؐ کے ساتھ کرتا؟ ارشاد ہوا شیطان انسان کے اندر خون کی طرح دوڑ جاتا ہے۔ (۲)

مداحی اور خوشامد

مداحی اور خوشامد، اخلاق کی پستی، دنائت اور ذلت کی علامت ہے، اور ساتھ ہی جھوٹ کی بھی ایک صورت ہے، اور یہ اس کے لیے بھی تباہی کا سامان ہے جس کی مداحی اور خوشامد کی جاتی ہے۔ خوشامد اور مداحی کرنے والا تین گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ ایسی تعریفیں کرتا ہے جو واقع کے مطابق نہیں ہوتیں، یہ جھوٹ ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ منہ سے جو تعریفیں کرتا ہے اس کو اپنے دل میں خود درست نہیں سمجھتا، یہ نفاق ہے۔ تیسرا یہ کہ دنیاوی فائدوں کے لیے ارباب قدر وجاہ کی خوشامدانہ تعریف کر کے ان کی اور لوگوں کی نظروں میں اپنے کو ذلیل ورسوا کرتا ہے، جس سے اس کی دناءت اور ذلت ظاہر ہوتی ہے۔

بیجا تعریفوں سے ممدوح میں بھی دو برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں، ایک غرور اور دوسری اپنی نسبت غلط فہمی۔ تعریفیں سن کر وہ خوش ہوتا ہے اور پھر اپنے اس مفروضہ کمال یا مبالغہ آمیز بیان پر مغرور ہو کر دوسرے کو آنکھ نہیں لگاتا ہے، اور پے در پے تعریفیں سن کر اس کو یقین آجاتا ہے کہ وہ واقعی ایسا ہی ہے، اور توقع رکھتا ہے کہ ہر شخص اس کو ایسا ہی سمجھے، بادشاہوں، امیروں، دولت مندوں اور بڑے لوگوں میں اس کے بدولت جو مضحکہ انگیز برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اور جس طرح وہ برخود غلط ہو جاتے ہیں اس کی نظیر تاریخ کے ہر دور میں مل سکتی ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری ومسلم وابوداؤد وترمذی ومالک باب تحریم الظن۔

(۲) صحیح مسلم باب ﴿انه یستحب لمن روی خالیًا بامراة یقول هذه فلانة﴾ صحیح بخاری تفسیر آل عمران۔

قرآن پاک میں یہودیوں اور منافقوں کے ایک گروہ کا یہ نقشہ کھینچا ہے اور ان کے انجام کی یہ خبر ان کو دی ہے۔

﴿لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ (آل عمران:۱۸۸)

''جو اپنے کارنامہ پر اتراتے ہیں اور جو انہوں نے نہیں کیا اس پر تعریف کیے جانے کو پسند کرتے ہیں تو ان کو نہ سمجھنا پھر نہ سمجھنا کہ وہ سزا سے بچ جائیں گے اور ان کے لیے دردناک سزا ہے۔''

ان آیتوں کا شانِ نزول گو خاص ہے، مگر اپنے اثر کے لحاظ سے عام ہے[۱] اس سے یہ معلوم ہوا کہ اپنے کئے ہوئے کاموں پر اترانا اور بن کئے کاموں پر اپنی تعریف چاہنا تو اتنی بری بات ہے کہ بن توبہ اس کی سزا سے بچنا مشکل ہے مگر یہ کہ مغفرتِ الٰہی دستگیری فرمائے، اور قرآنِ پاک کے اس اصول کے مطابق کہ جو کام گناہ ہیں ان کے کرنے پر اعانت اور تعاون کرنے والے بھی گنہگار ہوتے ہیں، وہ لوگ بھی جو ایسی مداحی اور خوشامد کا ننگ گوارا کرتے ہیں اس گناہ میں کسی نہ کسی درجہ میں شریک ہیں جس کی تفصیل بہت سی حدیثوں سے معلوم ہوتی ہے، ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو دوسرے کی مبالغہ آمیز تعریف کرتے ہوئے سنا تو فرمایا تم نے اس کو برباد کر دیا۔[۲] ایک اور موقع پر ایک صاحب نے کسی کی حد سے زیادہ تعریف کی تو فرمایا تم نے اپنے ساتھی کی گردن مار دی اگر تم کو کسی کی تعریف ہی کرنی ہو تو یوں کہو کہ میں یہ گمان کرتا ہوں بشرطیکہ اس کے علم میں وہ واقعی ایسا ہو اور قطعیت کے ساتھ غیب پر نہ لگایا جائے۔[۳]

مقصود یہ ہے کہ اگر کسی کی حد سے زیادہ تعریف کی جائے گی تو وہ اس کو سن کر مغرور ہو جائے گا اس کے بعد اس کا سارا کیا دھرا برباد ہو جائے گا اسی طرح کسی کی نسبت قطعیت کے ساتھ اس لیے بھی حکم نہیں لگانا چاہیے کہ کسی کو دوسرے کا اندرونی حال اور غیب کی خبر نہیں معلوم۔

ایک اور بات یہ ہے کہ ایسی تعریفیں جو لوگوں کے منہ پر کی جاتی ہیں۔ ان کو سن کر ان کے نفس موٹے ہو جاتے ہیں اور ان کی اپنے عیب و ہنر پر نظر ڈالنے والی آنکھوں کی روشنی زائل ہو جاتی ہے، ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت عثمانؓ کے منہ پر ان کی تعریفیں کیں۔ تو حضرت مقدادؓ صحابی نے اس کے منہ میں خاک جھونک دی اور فرمایا ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مداحی کرنے والوں سے ملو تو ان کے منہ میں خاک جھونک دو۔''[۴] ادب المفرد میں ہے کہ ایک دفعہ آپ مسجد میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے، آپ نے کسی سے پوچھا

(۱) فتح القدیر شوکانی۔
(۲) صحیح بخاری باب کراہیۃ التمادح۔
(۳) صحیح بخاری ومسلم وابوداؤد باب مذکور۔
(۴) صحیح مسلم وابوداؤد باب کراہیۃ التمادح۔

کہ یہ کون ہے تو اس نے اس کی بڑی تعریفیں شروع کیں، آپ نے فرمایا "اس کو سنا کر مت کہو کہ اس کو برباد ہی کر دو۔" (۱)

بخل

بخل بھی اساسی بداخلاقیوں میں سے ہے، یعنی ایسی بداخلاقی جو بہت سی بداخلاقیوں کی جڑ ہے، خیانت، بددیانتی، بے مروتی۔ بعض دفعہ بے رحمی، بدسلوکی اور دناءت بھی اسی سے پیدا ہوتی ہے، حرص، طمع، لالچ، تنگ نظری، کم ہمتی، پست طبعی، اور بہت سی برائیاں اسی ایک جڑ کی مختلف شاخیں ہیں۔ اسلام آیا تو جھوٹ کے بعد سب سے پہلے اسی جڑ پر اس نے کلہاڑی ماری اور بھوکوں کو کھلانا، ننگوں کو پہنانا محتاجوں کو دینا، یتیموں کی خبر گیری اور مقروضوں کی امداد مسلمانوں کا ضروری فرض قرار دیا۔ ان ہی فرائض کے مجموعہ کا نام زکوٰۃ اور اس کے مصارف ہیں، جو نماز کے بعد اسلام کا دوسرا فرض ہے۔ آنحضرت نے جب حضرت خدیجہؓ کے سامنے جبرائیلؑ کی آمد کا حال سنایا، تو حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو آپؐ کی نبوت کا یقین جن دلیلوں کی بنا پر دلایا وہ یہ ہیں۔

"یا رسول اللہ! آپؐ قرابت والوں کا حق اور مقروضوں کا قرض ادا کرتے ہیں، غریبوں کو سرمایہ دیتے ہیں۔ مہمانوں کو کھلاتے ہیں۔ اور حق کے مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں۔" (صحیح بخاری باب بدء الوحی۔)

غور کیجیے کہ نبوت کی ان تمام ابتدائی صفتوں کے اندر جو چیز خاص اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ نبی "بخیل" نہیں ہوتا، ورنہ فیاضی کے یہ اوصاف نبوت کے خصوصیات قرار نہ پاتے۔

بخالت ان بیماریوں میں سے ہے جو در حقیقت اعمال کی جزاء و سزا پر دلی اعتقاد نہ رکھنے کا نتیجہ ہیں کیونکہ جو اعمال کی پاداش کا یقین نہیں رکھتا وہ اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت دوسرے کے حوالہ کرنے پر آسانی سے تیار نہیں ہو سکتا۔ سورۂ مدثر آغازِ نبوت کی سورتوں میں سے ہے اس میں دوزخیوں کے سوال و جواب کا ایک مکالمہ ہے، ان سے جب پوچھا جائے گا کہ تم دوزخ میں کیوں ڈالے گئے، تو کہیں گے ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، مخالفوں کے ساتھ مل کر ہم دینِ حق پر اعتراض کیا کرتے تھے۔ اور یہ سب اس لیے تھا کہ ہم اپنے عمل کی جزا و سزا کے دن پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

﴿مَا سَلَکَکُمْ فِیْ سَقَرَ ○ قَالُوْا لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ ○ وَ لَمْ نَکُ نُطْعِمُ الْمِسْکِیْنَ ○ وَ کُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِیْنَ ○ وَ کُنَّا نُکَذِّبُ بِیَوْمِ الدِّیْنِ ○﴾ (مدثر: ۴۲۔۴۶)

"تم کو دوزخ میں کیا چیز لے گئی، کہیں گے ہم نمازیوں میں سے نہ تھے، اور مسکین کو کھلاتے نہ تھے اور بحث کرنے والوں کے ساتھ ہو کر ہم بھی بحث کیا کرتے تھے اور روز جزا کو جھٹلاتے تھے۔"

اس سے ظاہر ہوگا کہ بخل کی برائی دوزخ تک پہنچا کر رہتی ہے اور وہ عمل کی جزا و سزا پر یقین نہ رکھنے کا لازمی

(۱) باب ما یخشی فی وجوہ المداحین۔

نتیجہ ہے' کیونکہ جیسا کہ کہا گیا' جو مذہبی جزاء وسزا کا قائل نہ ہو وہ اخلاص سے دوسروں کے ساتھ فیاضی بھی نہیں کر سکتا' یہی نکتہ سورۂ ماعون میں جو مکہ کی پرانی سورتوں میں سے ہے' دہرایا گیا ہے' فرمایا:

﴿اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ○ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ○ وَ لَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ○﴾ (ماعون: ۱۔۳)

''کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو جزا کے دن کو جھٹلاتا ہے پس یہی وہ ہے جو بن باپ کے بچہ کو دھکا دیتا ہے' اور فقیر کے کھلانے پر آمادہ نہیں کرتا ہے۔''

یہی سبب ہے کہ اعمال کی جزا کا یقین کئے بغیر اگر کوئی فیاضی کرے بھی تو وہ قبول نہیں' کیونکہ یہ فیاضی اس اخلاص اور نیک نیتی کی بنا پر نہیں ہوسکتی' جو قبولیت کی سب سے پہلی شرط ہے' بخیل آدمی اگر کسی کو کچھ دیتا بھی ہے تو وہ اس کا معاوضہ اسی دنیا میں پانے کا متوقع رہتا ہے' اور جہاں کہیں اس کو اپنی یہ توقع پوری ہوتی معلوم نہیں ہوتی تو وہ ایک دھیلا بھی خرچ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس کے دل میں یہ یقین نہیں کہ ہمارے ہر نیک عمل کی جزا خدا کے پاس ہے' اور کبھی ضائع نہیں جاسکتی۔

ایک اور مکی سورہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے شخص کا تذکرہ کیا ہے جس کی روزی زیادہ نہیں اور اس لیے اس کو اپنے خدا سے گلہ رہتا ہے کہ اس نے مجھے ذلیل کیا ہے' خدا فرماتا ہے:

﴿کَلَّا بَلْ لَّا تُکْرِمُوْنَ الْیَتِیْمَ ○ وَ لَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ○ وَ تَاْکُلُوْنَ التُّرَاثَ اَکْلًا لَّمًّا ○ وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ○﴾ (الفجر: ۱۷۔۲۰)

''یہ خیال صحیح نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ تم بن باپ کے بچہ کی توقیر نہیں کرتے اور فقیر کے کھانے پر ایک دوسرے کو رغبت نہیں دلاتے' اور مردہ کے متروکہ مال کو کھا جاتے ہو' اور مال و دولت سے بڑی محبت رکھتے ہو۔''

ان آیتوں میں باتیں کئی بیان کی گئی ہیں' مگر یہ سب کی سب بخل کی مختلف صورتوں کی تشریح ہیں۔ سورۂ ہمزہ میں اس بخیل کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو دولت کی تھیلیوں کو گویا اپنی حیاتِ جاوید کی اکسیر جانتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ ان کے بدولت وہ ہمیشہ کی زندگی پائے گا' اور یہ چیز اس سے کبھی علیحدہ نہ ہوگی' حالانکہ یہ کتنا خیال خام ہے' فرمایا:

﴿اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ ○ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ○ کَلَّا لَیُنْۢبَذَنَّ فِی الْحُطَمَةِ ○﴾ (ہمزہ ۲۔۴)

''جس نے اکٹھا کیا مال کو اور گنا کیا اس کو سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا' ہرگز یوں نہیں' وہ بالضرور دوزخ میں ڈالا جائے گا۔''

اسی طرح مال و دولت کو سینت سینت کر رکھنے اور کارِ خیر میں خرچ نہ کرنے والے کو اس دوزخ کی دھمکی دی گئی ہے جو کھال تک کھینچ لے گی۔

﴿كَلَّا اِنَّهَا لَظٰى ○ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ○ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَ تَوَلّٰى ○ وَ جَمَعَ فَاَوْعٰى ○﴾ (معارج:۱۵۔۱۸)

''ہرگز نہیں وہ تپتی آگ ہے کھال کھینچ لینے والی، پکارے گی اس کو جس نے (حق سے) پیٹھ پھیری، اور منہ موڑا اور اکٹھا کیا اور سینتا۔''

بخیل اس نکتہ کو بھول جاتا ہے کہ مال و دولت مقصود بالذات چیز نہیں' بلکہ وہ صرف چیزوں کے حصول کا ذریعہ ہے' سونے اور چاندی کی اینٹیں خود بخود روٹی کپڑا اور مکان کی چاردیواری نہیں بن سکتیں' اس لیے ان کو سمیٹ کر رکھنے سے کچھ حاصل نہیں' ان کو ضروری اور اعلیٰ مقصودوں کے حصول میں خرچ کرنا ہی ان کا صحیح مصرف ہے اور یہی اعلیٰ مقصود ہیں جن کو خدا نے اپنی راہ کہا ہے۔ جو اس راہ میں خرچ نہیں کرتا' وہ اپنے لیے درہم و دینار نہیں جمع کرتا' اپنے سینہ اور پیشانی کے داغ کا سامان اکٹھا کرتا ہے' فرمایا:

﴿وَ الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِىْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ○﴾ (توبہ:۳۴۔۳۵)

''اور جو لوگ سونے اور چاندی کو گاڑ کر رکھتے ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو دردناک سزا کی خوش خبری سنا دے' جس دن اس کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا۔ پھر اس سے ان کی پیشانیاں' کروٹیں اور پیٹھیں داغی جائیں گی (اور کہا جائے گا کہ) یہ ہے وہ جس کو تم نے اپنے لیے گاڑ کر رکھا تھا تو جس کو گاڑ کر رکھا کرتے تھے اس کا مزہ چکھو۔''

یہ بخیل اس حقیقت سے بھی ناآشنا ہیں کہ یہ سونا چاندی فرد کی نہیں جماعت کی دولت ہے اس کو چلتا پھرتا رہنا چاہیے۔ اس کو ایک جگہ روک کر رکھنا اللہ تعالیٰ کی مصلحت کے خلاف اور اس جماعت کے لیے مضر ہے جس کے رکن وہ خود ہیں۔

﴿وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ (آل عمران:۱۸۰)

''اور جو لوگ اس مال کو جو خدا نے اپنی مہربانی سے ان کو دیا ہے روکے رکھتے ہیں وہ اس کو اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں' بلکہ وہ ان کے حق میں بدتر ہے' جس مال کا وہ بخل کرتے ہیں اس کا طوق بنا کر ان کے گلے میں قیامت کے دن پہنایا جائے گا۔''

یعنی جس دولت کو انہوں نے بخالت کے مارے دنیا میں اپنے گلے کا ہار بنا رکھا ہے وہ قیامت کے عالم مثال میں واقعی ان کے گلے کا ہار بن کر نظر آئے گا' حدیث میں ہے کہ یہ مال زہریلے سانپ کی صورت میں گلے

میں پڑا ہوا نظر آئے گا۔[1]

جو بخیل ہوتا ہے اس کو خلقِ خدا اور خدا کے کاموں سے قطعاً محبت نہیں ہوتی‘ اس کی محبت کا مرکز صرف دولت ہوتی ہے اور اسی کو زندگی کا مقصود جانتا ہے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے لوگ میری محبت کی دولت سے محروم رہیں گے۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۙ۝ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ﴾ (حدید:۲۳-۲۴)

”اور اللہ کسی اترانے والے شیخی باز سے محبت نہیں کرتا جو آپ بخل کرتے ہیں‘ اور لوگوں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں۔“

اور جس سے خدا محبت نہ کرے اس سے کون محبت کر سکتا ہے‘ اسی لیے ایسے شخص سے اور تو اور خود اس کے بال بچے اور عزیز و اقارب بھی محبت نہیں کرتے‘ اور ایسے لوگوں کو جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے اکثر دیکھا بھی گیا ہے کہ ان کو اپنے مال و دولت پر بڑا گھمنڈ ہوتا ہے اور اپنے سوا دوسروں کو ذلیل سمجھتے ہیں‘ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا اور اس کے بندوں کی نگاہوں میں بھی ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔

قرآن پاک میں بخل کی سب سے بڑی مثال کا نام قارون بتایا گیا ہے‘ جس کا قصہ سورۂ قصص میں ہے‘ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ان ہی کی قوم کا ایک آدمی تھا‘ اتنا مالدار تھا کہ (تمدن کے اس ابتدائی دور میں جب ایک تالے کی ایک ہی کنجی بنتی تھی اور وہ بھی خدا جانے کتنی بھاری اور بھدی ہوتی ہوگی) خزانے تو الگ رہے خزانے کی کنجیوں کے گچھوں کو کئی آدمی مل کر بھی مشکل سے اٹھا سکتے تھے‘ تو بجائے اس کے کہ وہ اللہ کا شکر گزار ہوتا کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے اس کو اتنا مال دار بنایا‘ کہتا کہ یہ مال و دولت تو میری محنت اور ہنر کا نتیجہ ہے‘ اس کو یہ خبر نہ تھی کہ دنیا میں اس سے پہلے اس سے بھی بڑے بڑے دولت مند گزر چکے ہیں جن کا انجام بڑا دردناک ہوا ہے‘ چنانچہ اس قارون اور اس کی دولت کا بھی انجام یہ ہوا کہ وہ زمین میں دھنس کر رہ گئی۔ خدا نے فرمایا:

﴿اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّ اَكْثَرُ جَمْعًا﴾ (قصص:۷۸)

”کیا وہ نہ جانا کہ اللہ اس سے پہلے قوموں میں سے اس سے زیادہ طاقتور اور اس سے زیادہ دولت مند کو تباہ کر چکا ہے۔“

زمانۂ محمدی کے قارون ابولہب کو بھی یہی بشارت سنائی گئی اور صاف کہہ دیا گیا:

﴿مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَ مَا كَسَبَ﴾ (ابی لہب ۲)

(۱) صحیح بخاری کتاب الزکوۃ۔

''ابولہب کو اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکا۔''

محض کسی شخص یا کسی قوم کے چند افراد کے پاس دولت ہونا اس شخص یا قوم کی بھلائی کا سبب نہیں ہوسکتا۔ جب تک وہ دولت جماعت یا جماعت کے افراد کی ضرورتوں میں خرچ نہ کی جائے، بخیل آدمی چاہتا ہے کہ یہ کل کی کل تنہا اسی کی ضرورت میں کام آئے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت کا اتنا حصہ بے کار ہو جاتا ہے اور جس کا ضرر پوری جماعت کو پہنچتا ہے، جس کا وہ بھی ایک فرد ہے۔

﴿هٰاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ یَّبْخَلُ وَ مَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اللّٰهُ الْغَنِیُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ﴾ (محمد:۳۸)

''ہاں! تم کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو بلایا جارہا ہے تو تم میں کوئی بخل کرتا ہے اور جو کوئی بخل کرتا ہے سو اپنے ہی سے بخل کرتا ہے، اور اللہ بے نیاز ہے اور تم ہی محتاج ہو۔''

یعنی اس کے بخل کے برے نتیجے اسی کو بھگتنے پڑیں گے۔

بخیل آدمی دنیا میں بھی طرح طرح کی مصیبتوں اور مشکلوں میں گرفتار رہتا ہے کہ سب کچھ پاس ہونے کے باوجود بھی اس کو نہ اچھا کھانا میسر آتا ہے نہ اچھا پہننا، نہ قرینہ کا گھر، نہ عزت نہ آبرو ہر شخص اس کو ذلیل وخوار جانتا ہے، ہر ایک اس کے نام سے نفرت کرتا ہے، فقرا اس کے لیے بددعا کرتے ہیں، یہاں تک کہ بیوی بچے جن کے لیے وہ سب کچھ کرتا ہے وہ بھی اس سے خوش نہیں رہتے، ہر ایک اس کی دولت کا خواہاں رہتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی طرح اس خزانہ کا یہ سانپ راستہ سے ہٹ جائے تو اس پر قبضہ کرے، چور اس کے درپے، ڈاکو اس کے لاگو، زہر وہ پاتا ہے، حملے اس پر ہوتے ہیں، مگر ان تمام مصیبتوں کو وہ سہتا ہے اور اپنی زندگی بھر اس میں سے کچھ خرچ نہیں ہونے دیتا۔ لیکن ادھر اس کی آنکھ بند ہوئی اور ادھر اس کے وارثوں نے اللے تللے میں اس کو اڑا دیا، بلکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ جس اولاد کے لیے وہ خود ساری عمر تکلیف اٹھا کر دولت جمع کرتا ہے وہ اس مالِ مفت کو دم کی دم میں اڑا دیتی ہے اور ہزاروں بری عادتوں میں مبتلا اور آخر میں مفلس وقلاش ہو جاتی ہے۔

خدا اپنے رسول کی زبانی فرماتا ہے:

﴿وَ اَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰی ○ وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰی ○ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی ○ وَ مَا یُغْنِیْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰی ○﴾ (اللیل ۸۔۱۱)

''اور لیکن جس نے دینے سے بخل کیا، اور (خدا کی یا نیکی کی باتوں کی) پروا نہ کی، اچھی بات کو جھٹلایا، تو ہم اس کو سخت کام کے لیے آسان بنائیں گے اور جب وہ کرے گا تو اس کا مال اس کے کام نہ آئے گا۔''

وہ سخت کام جس کو خدا اس کے لیے بطور سزا کے آسان کر دیتا ہے وہ بری عادت وخصلت اور برے کردار ہیں جن میں وہ ہمیشہ مبتلا رہتا ہے اور ان کو صرف اس لیے کہ کسی طرح اس کا مال خرچ نہ ہونے پائے بڑی آسانی سے کر گزرتا ہے، بھوکا وہ رہتا ہے، ننگا وہ رہتا ہے، میلا وہ رہتا ہے، مصیبتیں وہ جھیلتا ہے، راتوں کو آرام سے سو نہیں

سکتا۔ دنیا کی کسی چیز سے دل بھر کر لطف نہیں اٹھا سکتا' عزیز و اقارب' دوست و احباب سے اس کو مسرت نہیں ہوتی' وہ سب سے نالاں اور اس سے سب نالاں رہتے ہیں۔ پھر جب وہ کسی افتاد یا موت یا دوزخ کے گڑھے میں گرتا ہے یا گرے گا تو اس کی یہ عزیز اور محبوب دولت اس کے کچھ کام نہ آتی ہے نہ آئے گی' اس وقت افسوس آئے گا تو اللہ تعالیٰ پہلے ہشیار کر دیتا ہے:

﴿وَ اَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنِيْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَ اَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ (منافقون:۱۰)

''اور ہم نے تم کو جو روزی دی ہے اس میں سے اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آئے (خدا کی راہ میں) خرچ کرو۔ (ایسا نہ ہو کہ موت آنے لگے) تو کہے کہ میرے پروردگار تو نے مجھے تھوڑی دیر اور کیوں مہلت نہ دی کہ میں خیر خیرات کرتا اور نیکوکاروں میں سے ہو جاتا۔''

اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا یہ وقت ٹالے ٹل نہیں سکتا اس کے لئے سامان پہلے سے چاہیے تھا۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ غریب ہوتے ہیں تو بڑی بڑی دعائیں کرتے ہیں' خوب خوب وعدے کرتے ہیں کہ اگر خدا نے ہمیں اپنے فضل و کرم سے دولت دی تو ہم یہ کریں گے ہم وہ کریں گے' مگر اللہ تعالیٰ ان کو دولت دے دیتا ہے تو وہ اپنے سارے وعدے بھول جاتے ہیں' اور نیکی کے ہر راستہ سے منہ موڑ لیتے ہیں' ایسے ہی لوگوں کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے اس لفظوں میں کھینچا ہے:

﴿وَ مِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَ تَوَلَّوْا وَّ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾ (توبہ:۷۵-۷۶)

''اور ان میں کوئی ایسا ہے جس نے خدا سے عہد کیا کہ اگر خدا نے ہم کو اپنے فضل سے دیا تو ہم ضرور خیرات کریں گے اور نیکوکاروں میں سے ہوں گے پھر جب خدا نے ان کو اپنے فضل سے دیا تو اس میں بخالت کرنے لگے اور ٹل کر پھر گئے۔''

خدا فرماتا ہے بخل کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے دل میں نفاق نے گھر کر لیا۔

﴿فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾ (توبہ:۷۷)

''تو اللہ نے ان کے دلوں میں اس کا نتیجہ نفاق رکھا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ بخل کی شدت ایمان کو بھی برباد کر دیتی ہے شاید اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ دو خصلتیں سچے مومنوں میں جمع نہیں ہوتیں بخل اور بدخلقی۔[1] رسول اللہ ﷺ جن برائیوں سے بچنے کی خدا سے دعا مانگا کرتے تھے ان میں سے ایک بخل بھی ہے' فرمایا کرتے تھے کہ ''خداوندا میں بخل' کسل مندی' کبرسنی' قبر کے

(۱) جامع ترمذی۔

عذاب اور زندگی اور موت کی آزمائش سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ [1] اسلام میں زکوٰۃ کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے یہ زکوٰۃ کی فرضیت اور صدقات و مبرات کی ترغیبات شریعتِ محمدی میں اسی لیے ہیں کہ انسانوں کے دل اس بری خصلت کے میل سے ہمیشہ پاک صاف رہیں۔

یہ بھی پیش نظر رہے کہ بخل صرف ظاہری مال و دولت ہی کے حق نہ ادا کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ خدا نے اپنے فضل سے جس کو کچھ دیا ہے، مثلاً کسی کو علم دیا ہے، کسی کو عقل دی ہے، کسی کو جسمانی قوت دی ہے، تو جو لوگ خدا کی ان بخششوں کا حق ادا نہیں کرتے وہ بھی ایک قسم کے بخیل ہیں اور وہ بھی اپنے درجہ کی سزاؤں کے مستحق ہیں۔ جس کو علم ملا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے علم کو پھیلائے اور دوسروں کو بتائے جو ایسا نہیں کرتا وہ علم کا بخیل ہے، اسی لیے علم کا چھپانا اور جان کر نہ بتانا گناہ ہے۔

﴿وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ﴾ (بقرہ: ۱۴۰)

''اور کون اس شخص سے زیادہ ظالم ہوگا جو خدا کی شہادت کو جو اس کے پاس ہے چھپائے۔''

حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ اور رسول کے بعد سب سے بڑا سخی وہ ہے جس نے علم کو سیکھا اور اس کو پھیلایا۔'' [2] اس لیے لامحالہ جس نے علم رکھ کر علم کے فرض کو انجام نہیں دیا، اس کا شمار بخیلوں میں ہوگا۔

یہ کئی دفعہ کہا گیا ہے کہ ایمان کے بعد اسلام نے اعمال کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے اللہ کے حق اور بندے کے حق۔ اللہ کے حقوق کا اجمالی مجموعہ نماز اور بندوں کے حقوق کا مجمل مجموعہ زکوٰۃ، یعنی مستحق لوگوں کے ساتھ بخشش ہے۔ دیکھیے کہ ذیل کی آیتوں میں ان ہی دونوں کی عدم بجا آوری کو دوزخ میں جانے کا سبب قرار دیا گیا ہے۔

﴿مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ○ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ○ وَ لَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ○﴾ (مدثر: ۴۲۔۴۴)

''کیا چیز تم کو دوزخ میں لے گئی کہیں گے کہ ہم نمازیوں میں سے نہ تھے، اور نہ محتاجوں کو کھلاتے تھے۔''

پہلا گناہ حقوقِ الٰہی کی بجا آوری سے انحراف اور دوسرا بندوں کے حق سے تغافل ہے، یہی بات سورۂ ماعون کے آخر میں ہے۔

﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ○ وَ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ○﴾ (ماعون: ۴۔۷)

''پھر خرابی ہے ان نمازیوں کی جو اپنی نماز سے بے پروا رہتے ہیں، وہ جو دکھاوا کرتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کو مانگے نہیں دیتے۔''

---

(۱) صحیح مسلم۔

(۲) مشکوٰۃ کتاب العلم۔

پہلی بات تو نماز سے غفلت ہے کہ وقت پر نہیں ادا کرتے اور صرف دکھاوے کے لیے پڑھتے ہیں یہ حقوقِ الٰہی سے تغافل ہے اور دوسری آپس میں مانگنے کی معمولی چیزوں میں جیسے نمک' آگ' پانی اور ایسی ہی دوسری بے حقیقت چیزوں میں بخل سے کام لینا ہے' یہ بندوں کے حقوق سے غفلت ہے۔ اس تشریح سے معلوم ہوا ہوگا کہ بخل شریعت کے بہت بڑے حصہ کے عدم تعمیل کا سبب بنتا ہے اور اس لیے اس کی برائی جتنی بھی کی جائے کم ہے۔

❀❀❀

حرص وطمع

حرص وطمع یا لالچ وہ برائی ہے جس میں نفس کی دناءت پوری طرح ظاہر ہوتی ہے' خصوصاً وہ حرص وطمع جس میں بخالت کی بھی آمیزش ہو' عربی میں اس کو "شُحّ" کہتے ہیں جس کی برائی قرآن میں کئی موقعوں پر آئی ہے۔ خانگی زندگی کی ناگواری زیادہ تر اسی کا نتیجہ ہوتی ہے' گھر کا مالک زیادہ دینا نہیں چاہتا' اور گھر کے لوگ زیادہ مانگتے ہیں' شوہروں کو اپنے مال سے محبت ہوتی ہے' اس لیے وہ زیادہ خرچ نہیں دیتے اور بیویاں لالچ سے زیادہ کا مطالبہ کرتی ہیں یا ایک شخص کے کئی بیویاں ہوں تو ہر بیوی کو حرص ہوتی ہے کہ شوہر پر میرا حق زیادہ رہے اور شوہر کو اس بیوی کی حرص ہوتی ہے جس کو وہ چاہتا ہے اس سے خانگی معاملوں میں کشمکش پیدا ہوتی ہے اور سارا گھر روحانی تکلیف میں رہتا ہے اس کا علاج یہ ہے کہ باہم احسان وایثار کا سلوک ہو' اور ہر ایک دوسرے کے آرام کو اپنا آرام اور اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھے تو پھر وہی گھر جو پہلے غم کدہ تھا عشرت کدہ بن جائے گا' میاں بیوی کے ان ہی خانگی اختلافات کے سلسلہ میں قرآن کی تعلیم ہے:

﴿وَ اُحۡضِرَتِ الۡاَنۡفُسُ الشُّحَّ وَ اِنۡ تُحۡسِنُوۡا وَ تَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا﴾ (نساء: ۱۲۸)

"اور طبیعتوں (نفوس) میں حرص دھری ہے' اور اگر تم احسان کرو' اور تقویٰ اختیار کرو' تو اللہ کو تمہارے کاموں کی ساری خبر ہے۔"

یعنی میاں بیوی دونوں حرص اور لالچ چھوڑ دیں' اور احسان اور تقویٰ کی راہ اختیار کریں تو اللہ تعالیٰ جو ہر ایک کے کاموں سے واقف ہے سب کو ان کے کاموں کے مطابق جزا دے گا۔

اس کاروباری دنیا میں ہر چیز کا ایک اقتصادی پہلو بھی ہوتا ہے' جب تک انسان اپنی حرص وطمع کو روک کر اچھے کاموں میں روپیہ خرچ نہیں کرے گا وہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتا' خواہ یہ کامیابی دین کی ہو یا دنیا کی فرمایا:

﴿وَ اَنۡفِقُوۡا خَيۡرًا لِّاَنۡفُسِكُمۡ وَ مَنۡ يُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ﴾ (التغابن: ۱۶)

"اور خرچ کرو' اپنے لیے بھلائی کرو اور جو اپنے جی کو حرص سے بچایا گیا وہی کامیاب ہیں۔"

ایک اور موقع پر ہے کہ ان مسلمانوں کا وصف یہ ہے کہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھتے ہیں:

﴿وَ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَ مَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (حشر:۹)

''اور اپنے اوپر (اوروں کو) مقدم رکھتے ہیں اگرچہ خود ان کو ضرورت ہو اور جو اپنے جی کی لالچ سے بچایا گیا وہی کامیاب ہیں۔''

اسی کا نام ایثار ہے یہ ہر قوم کی دینی و دنیاوی کامیابی کا زینہ ہے اور یہ زینہ اس وقت تک کسی کو مل نہیں سکتا۔ جب تک حرص و طمع کا خاتمہ نہ ہوا اسی لیے خدا نے فرمایا جو حرص و آز سے پاک ہوں گے وہی کامیاب ہوں گے۔

لالچی یہی نہیں کہ اپنے مال کو خرچ نہیں کرتا بلکہ دوسرے کے مال پر نگاہ رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ سب کا سب اسی کو مل جائے اسلام نے ایسی آرزو کی ممانعت کی ہے کیونکہ اس میں دو اور بداخلاقیاں شامل ہیں ایک بخل اور دوسری حسد فرمایا:

﴿وَ لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰی بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَ لِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَ سْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا﴾ (نساء:۳۲)

''اور اس کی ہوس نہ کرو جس میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے۔ مردوں کے لیے ان کی کمائی ہے اور عورتوں کے لیے ان کی اور اللہ سے مانگو اس کے فضل میں سے حصہ بے شک اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ خدا نے کسی چیز میں کسی کو بڑائی بخشی ہے تو کوئی دوسرا اس کی ہوس اس خیال سے نہ کرے کہ اس کو یہ کیسے اور کیوں مل گئی کاش خود اسے ملتی بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے اس کے مطلق فیض و کرم میں سے اپنا حصہ طلب کرنے کے لیے ہاتھ پھیلانا چاہیے اگر اس کی مصلحت کا اقتضا ہوگا تو وہ عنایت کرے گا اس تعلیم پر عمل کرنے سے طبیعت میں قناعت پیدا ہوگی ساتھ ہی دوسرے پر حسد کرنے کا جذبہ جاتا رہے گا اسی لیے فرمایا:

﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ○ لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْكَ اِلٰی مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ﴾ (حجر:۸۷۔۸۸)

''اور بے شک ہم نے تجھ کو دیں سات آیتیں اور قرآن جس کا درجہ بڑا ہے تو اپنی آنکھیں ان چیزوں پر مت پسار جو ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو فائدہ اٹھانے کو دی ہیں۔''

یعنی جس کو قرآن جیسی دولت ملی اس کی نظر میں دنیاوی دولت کیا چیز ہے۔

یہی حرص و طمع کا جذبہ ہے جو ایک کو دوسرے کی جان لے لینے اور مال چھین لینے پر ابھارتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ حرص و طمع سے بچو کہ اسی نے تم سے پہلوں کو برباد کیا اسی نے ان کو آمادہ کیا کہ انہوں

نے خون بہایا اور حلال کو حرام سمجھا۔"(۱) یہ صحیح مسلم کی روایت ہے، صحیح ابن حبان اور حاکم میں اس سے زیادہ مفصل ہے فرمایا "حرص سے بچو، کیونکہ اسی نے اگلوں کو اس کی دعوت دی کہ انہوں نے (بے گناہوں کا) خون بہایا، اسی نے اگلوں کو دعوت دی کہ حرام کو حلال سمجھا۔" (۲) آنحضرت ﷺ نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا "حرص سے بچو کیونکہ تم سے پہلی قومیں اسی حرص سے تباہ ہوئیں، اسی نے ان کو کہا تو انہوں نے رشتہ کے حق کو کاٹا، اسی نے کہا تو انہوں نے بخل کیا، اسی نے ان کو فسق و فجور کے لیے کہا تو انہوں نے فسق و فجور کیا۔" (۳) آنحضرت ﷺ نے فرمایا انسان میں سب سے بری بات کڑھانے والی حرص اور گھبرا دینے والی نامردی ہے۔" (۴) حریص آدمی ہمیشہ غم میں کڑھتا رہتا ہے کہ یہ نہیں ملا، فلاں کے پاس یہ ہے، میرے پاس نہیں، اس لیے آنحضرت ﷺ نے حرص کو ہمیشہ غم اور کڑھن میں رکھنے والی فرمایا، نسائی میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "ایمان اور حرص ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ (۵) سبب ظاہر ہے کہ ایمانِ کامل کا نتیجہ صبر، توکل اور قناعت ہے، اور حرص کا نتیجہ بے اطمینانی بے صبری اور ہوس ہے، ایک دفعہ برائی کے لہجہ میں فرمایا کہ "انسان بوڑھا ہوتا ہے مگر اس کی دو چیزیں جوان رہتی ہیں جینے کی خواہش اور مال کی حرص۔" (۶) کئی صحابیوں کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ دو بھیڑیے جو بکریوں کے جھنڈ میں چھوڑ دیے جائیں وہ ان کو اتنا برباد نہیں کرتے جتنی مال اور جاہ کی حرص انسان کے دین و ایمان کو برباد کر دیتی ہے۔ (۷)

بے ایمانی

دنیا کی ہر شریعت اور قانون کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ہر شخص کی چیز اسی کی ملکیت ہے اور وہی اس میں تصرف کا حق رکھتا ہے، کسی دوسرے کو حق نہیں کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر اس کی ملکیت سے فائدہ اٹھائے اسی اصول کی بنا پر ہر شخص کی ملکیتیں محفوظ اور مامون ہیں، اور دنیا کے امن کا نظام قائم ہے، اب جو کوئی حق کے بغیر چوری سے یا دھوکے سے یا زبردستی سے کسی کی ملکیت پر قبضہ جمانا چاہتا ہے، وہ فطرت کے نظام عدل کو درہم برہم کرنا چاہتا ہے۔ اسلام نے اس نظام عدل کو اصول کی حیثیت سے ایک ہی مختصر سی آیت میں بیان کر دیا ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم باب تحریم الظلم۔
(۲) صحیح ابن حبان و مستدرک حاکم۔
(۳) صحیح ابن حبان و ابوداؤد کتاب الجہاد باب الجرأۃ والجبن۔
(۴) ابوداؤد، حاکم۔
(۵) نسائی۔
(۶) ترمذی۔
(۷) ترمذی و صحیح ابن حبان و طبرانی و ابویعلی و بزار منذری ج۲ ص ۲۳۸)

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ (نساء:۲۹)

''اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناحق طریقہ سے مت کھاؤ۔''

اس آیت نے ان تمام طریقوں کا جو ایمان داری کے خلاف ہیں اور جن کی جزئیات کی کوئی حد نہیں ہے' چار لفظوں میں خاتمہ کر دیا ہے یعنی خواہ کسی کی چیز کوئی دھوکا اور فریب سے لے یا زور وظلم سے لے یا غصب کرے یا چوری کرے یا اس میں خیانت کرے' رشوت لے سود کھائے' غرض جس ناجائز طریق سے بھی کوئی دوسرے کا مال لے' اس آیت کے عموم اور اطلاق کے اندر وہ داخل ہے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''جس نے ہم (مسلمانوں) پر ہتھیار اٹھایا' اور جس نے ہم (مسلمانوں) کو دھوکا دیا' وہ ہم (مسلمانوں) سے نہیں۔'' (۱) جان اور مال معاملات میں دو اہم چیزیں ہیں آنحضرت ﷺ کے اس مختصر سے فقرہ نے دونوں کی حفاظت کی اہمیت بتا دی' ایک دفعہ آنحضرت ﷺ بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک غلہ کا ڈھیر پڑا دیکھا' آپؐ نے اس میں ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ اندر بھیگا اور باہر سوکھا ہے آپؐ نے غلہ والے سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ عرض کی کہ بارش سے بھیگ گیا ہے فرمایا تو پھر اس کو اوپر کیوں نہیں رکھا کہ لوگ دیکھ لیں جو دھوکا دے وہ مجھ سے نہیں یعنی رسول سے اس کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ (۲)

ارشاد ہوا ''وہ جو بے وجہ کسی مسلمان کا مال لینے کے لیے جھوٹی قسم کھائے گا وہ خدا سے ملے گا تو خدا اس پر غضب ناک ہوگا۔'' (۳) ایک دفعہ ایک معاملہ میں ایک شخص نے اسی طرح کی قسم کھانا چاہی تو آپؐ نے فرمایا اگر اس نے قسم کھالی تاکہ وہ ظلم سے مال لے لے تو خدا سے جب وہ ملے گا تو خدا اس سے منہ پھیر لے گا۔'' (۴)

کسی کے مال و جائداد پر زبردستی قبضہ کر لینے کو ''غصب'' کہتے ہیں' غصب کر لینا ظالمانہ فعل ہے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے قصہ میں ایک بادشاہ کا ذکر ہے جو غریب مچھیروں کی کشتیاں زبردستی چھین لیتا تھا۔ خضرؑ نے فرمایا۔

﴿اَمَّا السَّفِیْنَۃُ فَکَانَتْ لِمَسٰکِیْنَ یَعْمَلُوْنَ فِی الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَھَا وَ کَانَ وَرَآءَ ھُمْ مَّلِکٌ یَّاْخُذُ کُلَّ سَفِیْنَۃٍ غَصْبًا﴾ (کہف:۷۹)

''وہ جو کشتی تھی سو کچھ غریبوں کی تھی' جو دریا میں محنت کرتے تھے' تو میں نے چاہا کہ اس میں کچھ عیب کر دوں اور ان کے پرے ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو چھین کر لیتا تھا۔''

یہ ایک ایسی کھلی ہوئی برائی تھی' کہ اس کا بیان کر دینا ہی کافی تھا' اس برائی کو برائی کہنے کی بھی ضرورت نہ

(۱) صحیح مسلم کتاب الایمان باب من حمل علینا السلاح فلیس منا۔
(۲) صحیح مسلم کتاب الایمان باب من غش فلیس منا۔
(۳) مسلم کتاب الایمان باب من قطع حق مسلم۔
(۴) صحیح مسلم کتاب الایمان باب من قطع حق مسلم۔

تھی۔

حضرت سعیدؓ بن زید صحابی روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو کوئی کسی کی ایک بالشت بھر زمین دبائے گا ﴿طوقه الله فی سبع ارضین﴾ تو اس کو زمین کے ساتوں طبقوں میں سے ہر ایک سے اتنے حصہ کے اٹھانے کو کہا جائے گا۔'' یا اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ اس کے گلے میں زمین کے یہ ساتوں طبق ہار کی طرح ڈالے جائیں گے۔ (۱)

بے ایمانی کی سب سے عام قسم وہ ہے جو مقدمہ بازی سے متعلق ہے' کتنے لوگ ہیں جو وکیلوں کی قوتِ بیان اور حکام کے ناجائز فیصلوں کے زور سے غیروں کی ملکیت پر زبردستی قبضہ کر لیتے ہیں' حالانکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ ان کی چیز نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''فریقین میں سے کوئی ایک زیادہ زبان آور ہوتا ہے اور وہ اپنے دعویٰ کو خوبی سے بیان کرتا ہے اور میں اس کے حق میں فیصلہ دے دیتا ہوں' اگر میں نے اس کو کوئی ایسی چیز دلا دی جو اس کی نہیں تو وہ خود نہ لے' کیونکہ میں نے اس کو آگ کا ٹکڑا دیا ہے۔''(۲)

بعض ایسے بے ایمان ہوتے ہیں جو یہ دیکھ کر کہ دوسرا فریق گو حق پر ہے مگر اس کے پاس ثبوت کی شہادت یا کوئی تحریری دستاویز نہیں' اپنا مقدمہ حاکم کے پاس لے جا کر فریق کے دعویٰ کو بے ثبوت ٹھہراتے اور اپنے ذمہ سے اس کے واجبی مطالبہ کو ساقط کرا دیتے ہیں۔

﴿وَ لَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ (بقرہ:۱۸۸)

''اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ سے مت کھاؤ اور نہ پہنچاؤ حاکموں تک اس کا معاملہ' تا کہ کھا جاؤ۔ لوگوں کا کچھ مال گناہ سے اور تم جان رہے ہو۔''

یعنی تم کو معلوم ہے کہ تمہارا دعویٰ اور تمہارے مطابق حاکم کا فیصلہ غلط ہے اسی طرح کمزوروں کو بے بس سمجھ کر یا اپنے بس میں پا کر ان کا مال خلافِ انصاف نہیں کھانا چاہیے جو ایسا کرتا ہے وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھرتا ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَّ سَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا﴾ (نساء)

''بے شک جو یتیموں کا مال ظلم سے کھا جاتے ہیں' وہ اپنے پیٹ میں آگ کھاتے ہیں' اور اب وہ آگ میں بیٹھیں گے۔''

(۱) صحیح مسلم باب تحریم الظلم وغصب الارض یہ عبارت کئی طرح سے ہے۔ فی سبع ارضین' من سبع ارضین' الی سبع ارضین۔

(۲) شرح نووی بر مسلم حدیث مذکور۔

(۳) ابوداؤد کتاب الاقضیہ۔

چوری

کسی کی رکھی ہوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر چھپا کر لے لینے کی سب سے کمینہ حرکت کا نام چوری ہے۔ اسی لیے اس کی سزا بھی بڑی رکھی گئی ہے یعنی ہاتھ کاٹ ڈالنا۔

﴿وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ﴾ (مائدہ:۳۸)

''اور جو کوئی چور ہو مرد ہو یا عورت ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو سزا ان کی کمائی کی' تنبیہ اللہ کی طرف سے اور اللہ ہے زور آور' حکمت والا۔''

چوری کی برائی کی وجہ یہی نہیں ہے کہ چور دوسرے کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر چپکے سے اپنے تصرف میں لے آتا ہے' بلکہ یہ بھی ہے کہ ایک شخص اپنی جائز محنت سے کما کر جو حاصل کرتا ہے' دوسرا بغیر کسی جائز محنت کے بے وجہ اس پر قبضہ کر کے پہلے کی محنت کو اکارت کر دیتا ہے اگر اس کی روک تھام نہ کی جائے تو کسی کو اپنی محنت کا پھل نہ ملے اس کے علاوہ اس ایک برائی میں کتنی برائیاں شامل ہیں۔

بے وجہ دوسرے کے گھر میں داخل ہونا اور اس کی ملکیت کا جائزہ لینا مرتکبِ فعل کے خبثِ باطن کو ظاہر کرتا ہے پھر اس کی بدولت ناحق خون بھی بہتا ہے اور بے گناہ جانیں بھی ضائع جاتی ہیں' اور چور چونکہ بڑے بڑے سرمایہ پر کسی جائز محنت کے بغیر قبضہ پا لیتا ہے' اس لیے وہ اس کو بڑی بے دردی سے ضائع کر دیتا ہے' اور خود بھی اس سے بہت کم فائدہ اٹھاتا ہے بلکہ اس دولت کا بڑا حصہ اخفائے جرم کی خاطر برباد کر ڈالتا ہے۔

اہلِ عرب میں شاید عام افلاس کے سبب سے یہ بیماری اتنی پھیلی تھی کہ اسلام نے اس کے انسداد کے لیے مسلمان ہونے والوں سے اس کی بیعت لینی بھی ضروری سمجھی' سورۂ ممتحنہ میں ان چند باتوں کا ذکر ہے۔ جن کا عہد مسلمان ہونے والی بی بیوں سے لیا جاتا تھا' ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ''وہ چوری نہ کریں گی۔'' فتح مکہ کے دن جب مکہ کی خواتین اسلام قبول کرنے آئیں' تو آپؐ نے ان سے بھی اس کا عہد لیا۔ اس موقع پر ابوسفیانؓ کی بی بی ہندؓ نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! ابوسفیانؓ بخیل آدمی ہیں وہ میرے اور میرے بچوں کے لیے پورا خرچ نہیں دیتے مگر یہ کہ ان کے مال سے کچھ چھپا کر لے لوں فرمایا۔ ''تم ان کے مال سے اتنا لے لیا کرو جو انصاف اور دستور کے مطابق تمہارے اور تمہارے بچوں کے لیے کافی ہو۔''(۱) اس روایت سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ اسلام کا جوش مسلمانوں میں ایک اخلاقی انقلاب پیدا کر دیتا ہے' اگر ایسا نہ ہوتا تو ہندؓ کو اتنی صفائی کے ساتھ اپنے گھر کا بھید کھولنے کی حاجت نہ تھی دوسری یہ کہ جس کا نفقہ ہمارے ذمہ ہے' اگر ہم اس کو ادا نہ کریں اور وہ حسبِ ضرورت ہم سے پوچھے بغیر ہمارے حساب سے کچھ لے لے تو یہ چوری نہیں۔

(۱) صحیح بخاری کتاب النفقات۔

یہ عہد صرف عورتوں ہی سے نہیں بلکہ مسلمان مردوں سے بھی آپؐ نے لیا ہے۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھے تھے' آپؐ نے فرمایا ہم سے عہد کرو کہ تم شرک' چوری اور بدکاری نہ کرو گے۔ پھر آیت پڑھی' جو کوئی یہ عہد پورا کرے گا تو اس کی مزدوری خدا کے ذمہ ہے اور جو ان میں سے کسی ایک کا مرتکب ہوا اور اس کی سزا اس کو دے دی گئی' تو اس کے اس گناہ کا کفارہ ہو گیا' اور اگر کسی نے ان میں سے کسی ایک کا ارتکاب کیا اور خدا نے اس کو چھپا دیا تو اس کی بخشش خدا کے ہاتھ میں ہے چاہے معاف کر دے چاہے سزا دے۔''(۱)

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے چور پر لعنت بھیجی' فرمایا اللہ تعالیٰ چور پر لعنت کرے کہ ایک معمولی خود یا رسی چراتا ہے پھر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔

چوری کا گناہ بھی بندہ اسی لیے کرتا ہے کہ وہ خدا کے حاضر و ناظر ہونے پر یقین نہیں کرتا' یا کم از کم یہ کہ فعل کے ارتکاب کے وقت اس کا یقین ماند پڑ جاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ جب بندے نہیں دیکھتے تو خدا بھی ہم کو نہیں دیکھتا اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جب چور چوری کرتا ہے تو اس میں ایمان نہیں رہتا۔(۲)

حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا کہ ''تم میں سے ہر ایک کا مال دوسرے پر حرام ہے' مگر حق کے ساتھ۔''(۳) جس کا مال ہو اس کی خوشی اور اجازت سے لو' یا اس کا کوئی کام کر کے معاوضہ میں حاصل کرو' یہی بات قرآن پاک کی اس آیت میں فرمائی گئی۔

﴿يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾ (نساء:۲۹)

''اے ایمان والو! تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے مت کھاؤ' لیکن یہ کہ لین دین ہو آپس کی خوشی سے۔''

یہ آیت ایک اصولی حیثیت رکھتی ہے' جس میں ہر اس مال کو حرام بتایا گیا ہے جو کسی سے ناجائز طریق سے حاصل کیا گیا ہو۔

عرب میں قبیلۂ مخزوم کی ایک عورت تھی جو لوگوں سے چیزیں عاریتاً لے کر مکر جاتی تھی' یہ مقدمہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا تو آپؐ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا' یہ بڑے گھرانے کی عورت تھی' اچھے اچھے لوگوں نے اس کی سفارش کی تو آپؐ نے فرمایا تم سے پہلے قومیں اس لیے تباہ ہوئیں کہ جب معمولی لوگ قصور کرتے تو ان کو سزا دیتیں اور جب کوئی معزز آدمی وہی کام کرتا تو اس کو چھوڑ دیتیں' خدا کی قسم اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہؓ بھی

(۱) صحیح بخاری کتاب الحدود۔
(۲) ایضاً۔
(۳) ایضاً۔

یہ کام کرتی تو اس کا ہاتھ کاٹتا۔ (۱) ایک صحابیؓ ایک چادر سرہانے رکھ کر سو رہے تھے' ایک چور آیا اور اس نے چالا کی سے ان کے سرہانے سے اس کو کھینچ لیا' وہ پکڑ کر لایا گیا تو صحابیؓ موصوف نے آ کر سفارش کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! یہ چادر صرف تیس درہم کی تھی' کیا تیس درہم کے لیے اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا' میں نے یہ چادر اس کے ہاتھ بیچ دی' اور قیمت اس کے ذمہ رہی' آپؐ نے فرمایا مجھ تک معاملہ آنے سے پہلے تم نے یہ کیوں نہیں کر لیا۔ (۲) ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نماز میں مصروف تھے کہ عین نماز کی حالت میں آپؐ کو جنت اور دوزخ کا نقشہ دکھایا گیا نماز سے فارغ ہو کر آپؐ نے فرمایا کہ میں نے دوزخ میں اس کو بھی دیکھا جو اپنی آنکڑی سے حاجیوں کا سامان چرا لیتا تھا' اور اگر مالک ہوشیار ہو جاتا تو کہہ دیتا تھا کہ اتفاق سے اس میں پھنس کر چلا آیا اور اگر بے خبر رہتا تو لے جاتا تھا۔ آپؐ نے اس کو دیکھا کہ وہ دوزخ میں اپنی آنتیں گھسیٹتا پھرتا تھا۔

ناپ تول میں کمی وبیشی

چوری کی عام قسم تو وہی ہے جس کو سرقہ کہتے ہیں' اور جس کی پاداش میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم شریعت نے دیا ہے اور جس کی برائی ہر مذہب اور اخلاقی مسلک نے یکساں کی ہے لیکن اسلام کی تکمیلی تعلیم یہ ہے کہ اس نے ان نازک سے نازک ناجائز معاملوں کی بھی جن کو عام طور سے چوری نہیں سمجھا جاتا تشریح کی اور ان کی برائیوں کی تشہیر کی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی عملی تعلیموں سے ان کی اہمیت کو ظاہر فرمایا اور ان سے بچنے کی تاکید کی ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم چیز ناپ تول کی کمی وبیشی ہے جس سے ہر شخص کو ہر وقت کام پڑتا ہے اور جس میں خاص طور سے تاجر اور بیوپاری مبتلا رہتے ہیں' اور جس سے سب سے زیادہ غریبوں کو نقصان پہنچتا ہے اللہ تعالیٰ کے فطری قوانین میں سے ایک بڑا قانون عدل ہے' جس کا منشا یہ ہے کہ جس کی جو چیز ہو وہ اس کو دے دی جائے۔ یہی وہ میزان یعنی ترازو ہے جسے خدا نے دنیا میں قائم کیا ہے' اور جس سے تول تول کر ہر شخص کو اس کا حق دینا چاہیے جو شخص دوسرے کا جو حق ہے اس کو نہیں دیتا یا دینے میں کمی کرتا ہے وہ اس ترازو سے کام نہیں لیتا ہے' فرمایا:

﴿وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۝ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ وَ اَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ﴾ (رحمٰن:۷۔۹)

''اور آسمان کو اونچا کیا اور ترازو رکھی کہ مت زیادتی کرو ترازو میں' اور انصاف کے ساتھ سیدھی ترازو تولو اور مت گھٹاؤ تول۔''

اس ترازو سے انسان کا ہر قول وفعل تلتا ہے' اور اسی کی برابری سے عالم کا نظام قائم رہتا ہے۔

---

(۱) ابوداؤد کتاب الحدود۔

(۲) ابوداؤد کتاب الحدود۔

ناپ تول میں کمی وبیشی کرنا حقیقت میں دوسرے کے حق پر ہاتھ ڈالنا ہے جوکوئی لینے میں تول کو بڑھاتا اور دینے میں گھٹاتا ہے وہ دوسرے کی چیز پر بے ایمانی سے قبضہ کرتا ہے اور یہ بھی چوری ہی ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں اس سے بچنے کی خاص طور پر تاکیدیں آئی ہیں، حضرت شعیبؑ کی قوم سوداگری کرتی تھی اسی لیے ان کی دعوت میں ناپ تول میں ایمان داری کی تاکید بار بار کی گئی ہے۔ حضرت شعیبؑ سمجھاتے ہیں:

﴿اَوۡفُوا الۡكَيۡلَ وَلَا تَكُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُخۡسِرِيۡنَ ۝ وَزِنُوۡا بِالۡقِسۡطَاسِ الۡمُسۡتَقِيۡمِ ۝ وَ لَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡيَآءَهُمۡ وَلَا تَعۡثَوۡا فِى الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِيۡنَ ۝﴾ (شعراء:۱۸۱۔۱۸۳)

''اور پورا بھر دو ناپ اور نہ ہو نقصان دینے والے کو اور تو لو سیدھی ترازو سے اور مت گھٹا کر دو لوگوں کو ان کی چیزیں اور مت پھرو ملک میں فساد پھیلاتے۔''

یہی حضرت شعیبؑ مدین والوں کو سمجھا کر کہتے ہیں، جو مشرق ومغرب کے تجارتی قافلوں کے رہ گذر میں آباد تھے۔

﴿وَلَا تَنۡقُصُوا الۡمِكۡيَالَ وَ الۡمِيۡزَانَ اِنِّىۡۤ اَرٰٮكُمۡ بِخَيۡرٍ وَّ اِنِّىۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ يَوۡمٍ مُّحِيۡطٍ ۝ وَ يٰقَوۡمِ اَوۡفُوا الۡمِكۡيَالَ وَ الۡمِيۡزَانَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡيَآءَهُمۡ وَ لَا تَعۡثَوۡا فِى الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِيۡنَ﴾ (ھود:۸۴۔۸۵)

''اور ناپ اور تول میں کمی نہ کرو، میں تم کو آسودگی میں دیکھتا ہوں اور گھیر لینے والے دن کی آفت کو تم پر ڈرتا ہوں اور میرے لوگو! ناپ اور تول کو انصاف سے پورا کرو اور لوگوں کی چیزیں ان کو گھٹا کر مت دو اور ملک میں فساد پھیلاتے مت پھیرو۔''

یہ آیت بتاتی ہے کہ ناپ تول کی بے ایمانی سے خیر وبرکت جاتی رہتی ہے، یا ظاہری نظر سے دیکھیے تو یوں کہیے کہ بازار میں ایسے لوگوں کی جو ناپ تول میں کمی وبیشی کرتے ہیں ساکھ جاتی رہتی ہے اور یہ بالآخر ان کے بیوپار کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے، یہ چاہتے تو یہ ہیں کہ اس بے ایمانی سے کچھ سرمایہ اور نفع بڑھالیں گے مگر ہوتا یہ ہے کہ ان کی یہ اخلاقی برائی ان کی اقتصادی اور معاشی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

حضرت شعیبؑ کی یہی نصیحت پھر سورہ اعراف میں دہرائی گئی ہے:

﴿فَاَوۡفُوا الۡكَيۡلَ وَ الۡمِيۡزَانَ وَلَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡيَآءَهُمۡ وَلَا تُفۡسِدُوۡا فِى الۡاَرۡضِ بَعۡدَ اِصۡلَاحِهَا ذٰلِكُمۡ خَيۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ﴾ (اعراف:۱۱)

''تو ناپ اور تول پوری کرو اور مت گھٹا دو لوگوں کو ان کی چیزیں اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد خرابی مت ڈالو یہ تمہارے لیے بھلا ہے اگر تم کو یقین ہو۔''

آنحضرت ﷺ کے ذریعہ حضرت شعیبؑ کی یہ پرانی تعلیم پھر زندہ ہوئی اسلام میں جن چیزوں کو حرام ٹھہرایا گیا ہے اس کے بعد ہے۔

﴿وَ اَوْفُوا الْکَیْلَ وَ الْمِیْزَانَ﴾ (انعام:۱۵۲)

''اور ناپ اور تول کو پورا کرو۔''

سورۂ بنی اسرائیل میں جو اخلاقی نصیحتیں فرمائی گئی ہیں' ان میں سے ایک یہ ہے۔

﴿وَ اَوْفُوا الْکَیْلَ اِذَا کِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا﴾ (بنی اسرائیل:۳۵)

''اور جب تم ناپو تو ناپ پورا بھر دو' اور سیدھی ترازو سے تولو' یہ بہتر ہے اور اس کا انجام اچھا ہے۔''

آیت کا آخر ٹکڑا بتاتا ہے کہ بے ایمانی کی ناپ تول گو شروع میں کتنا ہی فائدہ پہنچائے مگر آخر کار وہ بیوپار کی تباہی کا باعث ہو کر رہتی ہے۔

خوب غور کر کے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس بداخلاقی کے پیدا ہونے کا اصلی سبب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے دلوں سے یہ یقین گم ہو جاتا ہے کہ ان کے اس چھپے ہوئے کرتوت کی دیکھنے والی آنکھیں ہر طرف کھلی ہیں۔ اور ایک دن آئے گا جب ان کو خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے ہر کام کا حساب دینا ہوگا۔ سورۂ مطففین میں جہاں اس بداخلاقی کی ممانعت کی گئی ہے اس بیماری کا یہ علاج بھی بتایا گیا' فرمایا:

﴿وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ ○ الَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ ○ وَاِذَا کَالُوْهُمْ اَوْوَّزَنُوْهُمْ یُخْسِرُوْنَ ○ اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ ○ یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○﴾ (مطففین:۱۔۶)

''خرابی ہے اس گھٹا کر دینے والوں کی جو اوروں سے جب ناپ کر لیں تو پورا لیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا دیں' کیا ان کو گمان نہیں کہ انہیں اس بڑے دن اٹھایا جائے گا جس دن سب لوگ دنیا کے مالک کے لیے کھڑے ہوں گے۔''

چھپا کر لینا

جو سامان و اسباب کئی آدمیوں میں ابھی تک مشترک ہو' اور وہ بانٹ کر علیحدہ علیحدہ نہ کیا گیا ہو' اس میں سے کوئی چیز دوسرے ساجھیوں سے چھپا کر لے لینا غلول کہلاتا ہے' مگر زیادہ تر مالِ غنیمت میں جو بددیانتی اور چوری کی جائے اس کو کہتے ہیں۔ غنیمت کا مال کوئی بھی لوٹے مگر وہ سارے سپاہیوں کا حصہ ہے جب تک امیر باقاعدہ بانٹ کر ہر ایک کا حصہ الگ الگ نہ کر دے' یا کسی کو خاص طور سے لے لینے کی اجازت نہ دے دے' اس میں سے کچھ چھپا کر لے لینا غلول ہے اور یہ ایسی برائی ہے جس میں بددیانتی اور چوری دونوں ملی ہوئی ہیں۔

اس فعل کے مرتکب کو یہ خیال ہوتا ہے کہ جب اس مشترک چیز میں ہر ایک کا حصہ ہے تو اس میں سے کسی کا کچھ لے لینا جائز ہونا چاہیے لیکن یہ نکتہ نگاہ سے اوجھل ہو جاتا ہے کہ جب تک وہ تقسیم نہیں ہوا ہے' اس میں ہر ایک کا

برابر برابر حصہ ہے، اور ان سب کی اجازت کے بغیر وہ کسی کے لیے حلال نہیں ہو سکتا، دوسری بات یہ ہے کہ جب کوئی اس میں سے کوئی چیز چھپا کر لیتا ہے تو گویا اس کا ضمیر اس کو بتاتا ہے کہ یہ اس کی تنہا ملکیت نہیں، اسی لیے وہ دوسروں سے چھپا کر چوری کا ارتکاب کرتا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ کسی چیز کو چھپا کر لے لینے سے اس کا یہ مقصد بھی ہوتا ہے کہ وہ دوہرا حصہ پائے کہ ایک تو بے قاعدہ چھپا کر چوری سے لے اور دوسرا باقاعدہ بانٹ سے پائے یہ صریح بے ایمانی ہے۔

قرآن پاک نے تصریح کی ہے کہ سپاہی تو سپاہی امیرِ عسکر بھی یہ حرکت کرے تو وہ بھی گناہ گار ٹھہرے گا۔ اور چونکہ انبیا علیہم السلام بھی امیر ہوتے ہیں اور وہ گناہوں سے مبرا ہوتے ہیں، اس لیے ان کی نسبت تو کسی کو یہ وہم بھی نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اس کا ارتکاب کریں گے۔

﴿وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ﴾ (آل عمران:۱۶۱)

''اور کسی نبی کی یہ شان ہی نہیں کہ وہ غنیمت میں سے چھپا کر لے لے۔''

پھر فرمایا:

﴿وَ مَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَآ غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ (آل عمران:۱۶۱)

''اور جو کوئی غنیمت کا مال چھپا کر لے گا تو قیامت کے دن اپنا چھپایا مال لے کر آئے گا، پھر ہر کوئی اپنا کمایا پورا پورا پائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

غزوۂ خیبر کے مال غنیمت میں سے مدعم نام ایک غلام نے ایک شملہ چرایا تھا، خیبر سے چل کر جب لوگ وادی القریٰ پہنچے تو ایک ناگہانی تیر اس غلام کو آکر ایسا لگا کہ اس کا کام ہی تمام ہو گیا۔ مسلمانوں نے کہا کہ اس کو جنت مبارک ہو۔ یہ سن کر آنحضرت ﷺ نے فرمایا، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جس شملہ کو اس نے خیبر میں تقسیم سے پہلے لے لیا تھا وہ اس پر آگ کا شعلہ ہو رہا ہے لوگوں نے یہ سنا تو یہ اثر ہوا کہ ایک شخص نے جوتے کا تسمہ لیا تھا، اس کو بھی لا کر سامنے ڈال دیا، یہ دیکھ کر حضور ﷺ نے فرمایا یہ آگ کا تسمہ ہے آگ کا۔(۱)

خیبر میں ایک اور واقعہ یہ گزرا کہ ایک مسلمان نے وفات پائی جب اس کا جنازہ تیار ہوا تو آپ ؐ سے عرض کیا گیا۔ آپ ؐ نے فرمایا، تم لوگ اپنے بھائی کے جنازہ کی نماز پڑھ لو یہ سن کر لوگوں کے چہروں کا رنگ بدل گیا اور سمجھے کہ کوئی بات ہے، یہ دیکھ کر آپ ؐ نے فرمایا، تمہارے بھائی نے مالِ غنیمت کی ایک چیز چھپا کر لی ہے، صحابہ ؓ کہتے ہیں کہ ہم نے اس کے اسباب کی تلاشی لی تو جھوٹے موتیوں کا ایک ہار نکلا جو چند آنوں سے زیادہ کا نہ تھا۔(۲)

(۱) و (۲) ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی تعظیم الغلول۔

قاعدہ یہ تھا کہ جب لڑائی ختم ہو چکتی تو حضرت بلالؓ تین بار منادی کرتے سب لوگ اپنا اپنا مال غنیمت لے کر آتے پھر اس میں سے پانچواں حصہ نکالا جاتا اور اس کے بعد بانٹ دیا جاتا اس کے بعد جو لے کر آتا وہ قبول نہ ہوتا اور وہ مجرم قرار پاتا' بلکہ کبھی سزا کے طور پر اس کا سارا سامان جلا دیا جاتا۔ ایک دفعہ اس طرح تقسیم وغیرہ کے بعد ایک شخص بالوں کی ایک لگام لے کر آیا' اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ ہم نے لوٹا تھا' فرمایا کہ تم نے بلالؓ کی تین دفعہ منادی نہیں سنی تھی' اس نے کہا سنی تھی' پوچھا پھر اس وقت کیوں لے کر نہیں آئے' اس نے معذرت کی' فرمایا تم اس کو قیامت میں لے کر آنا۔ میں نہیں قبول کرتا۔ (۱)

عمال کو ہدایت کی گئی کہ ان کو جو ملے اس کو مسلمانوں کے بیت المال میں لا کر پیش کریں' فرمایا اے لوگو! جو ہمارے کسی کام پر مقرر ہو وہ ایک سوئی بھی چھپا کر لے گا تو وہ غلول ہے' وہ اس کو قیامت کے دن لے کر آئے گا۔ (۲)

رشوت

کسی کے مال سے ناجائز طریقہ سے فائدہ اٹھانے کی ایک عام صورت ہے' رشوت کے معنی ہیں کہ کوئی اپنی باطل غرض اور ناحق مطالبہ کے پورا کرنے کے لیے کسی ذی اختیار یا کارپرداز شخص کو کچھ دے کر اپنے موافق کر لے۔ (۳)

پہلے عرب کے کاہن اپنی مفروضہ غیبی طاقت کی بنا پر بعض مقدموں کے فیصلے کرتے تھے۔ اہلِ عرض ان کو اس کے لیے مزدوری یا رشوت کے طور پر کچھ نذرانہ دیتے تھے' اس کو حلوان (مٹھائی) کہتے تھے' اسلام آیا تو اوہام کا یہ دفتر ہی اڑ گیا اس پر بھی آنحضرت ﷺ نے کاہن کے حلوان کی خاص طور سے ممانعت فرمائی۔ (۴)

عرب میں یہودیوں کے مقدمے ان کے احبار اور رئیس فیصل کرتے تھے اور چونکہ دولت اور تمول نے ان میں اونچے نیچے طبقے قائم کر دیے تھے' اس لیے وہ قانون کی ناہمواری کے دل سے خواہش مند رہتے تھے' قانون کی زد سے بچنے کے لیے علانیہ رشوت دیتے تھے' اور ان کے کاہن اور قاضی علانیہ لیتے تھے' اور ایک کا حق دوسرے کو ملا دیتے تھے اور اس ذریعہ سے توراۃ کے احکام پر مصالح وضرورت کے اقتضا سے پردہ ڈال دیتے تھے' (۵) چنانچہ توراۃ کے قوانین میں تحریف کا ایک بڑا سبب یہی رشوت خوری تھی قرآن مجید کی اس آیت میں ان کے اسی گناہ کی

(۱) ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی تعظیم الغلول۔
(۲) سنن ابی داؤد کتاب الاقضیہ۔
(۳) مجمع البحار علامہ فتنی۔
(۴) ترمذی باب ماجاء فی اکراہیۃ مہر البغی۔
(۵) صحیح بخاری رجم زانی۔

پردہ دری کی گئی ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ یَشۡتَرُوۡنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیۡلًا اُولٰٓئِکَ مَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ اِلَّا النَّارَ وَلَا یُکَلِّمُہُمُ اللّٰہُ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَلَا یُزَکِّیۡہِمۡ وَلَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ﴾ (بقرہ:۱۷۴)

''خدا نے کتاب سے جو اتارا اس کو جو چھپاتے ہیں اور اس کے ذریعہ معمولی معاوضہ حاصل کرتے ہیں' وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں' خدا ان سے قیامت کے دن بات نہ کرے گا' نہ ان کو پاک صاف کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

''پیٹ میں آگ بھرنا'' اس لیے فرمایا کہ یہود دنیا کی اس معمولی دولت کے لالچ میں آ کر خدا کے احکام میں ردوبدل اور منشائے الٰہی میں تحریف پیٹ ہی کی خاطر کرتے تھے اس لیے یہی سزا ان کو ملے گی۔ ابن جریر نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ یہودی رئیس اپنے علما کو اس لیے رشوتیں دیتے تھے کہ آنحضرت ﷺ کے جو اوصاف توراۃ میں ہیں وہ عام لوگوں کو نہ بتائیں' لیکن قرآن پاک کے نظم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ احکامِ الٰہی میں عام طور سے ردوبدل کیا کرتے تھے اور اس کے ذریعہ سے دنیا کی دولت کماتے تھے۔ چنانچہ سورہ مائدہ میں ان کی اس حرام خوری کا ذکر دو دفعہ ہے فرمایا:

﴿وَ تَرٰی کَثِیۡرًا مِّنۡہُمۡ یُسَارِعُوۡنَ فِی الۡاِثۡمِ وَ الۡعُدۡوَانِ وَ اَکۡلِہِمُ السُّحۡتَ لَبِئۡسَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ۝ لَوۡلَا یَنۡہٰہُمُ الرَّبّٰنِیُّوۡنَ وَالۡاَحۡبَارُ عَنۡ قَوۡلِہِمُ الۡاِثۡمَ وَ اَکۡلِہِمُ السُّحۡتَ لَبِئۡسَ مَا کَانُوۡا یَصۡنَعُوۡنَ﴾ (مائدہ:۶۲۔۶۳)

''اور تو ان میں سے بہتوں کو دیکھے کہ وہ گناہ اور زیادتی اور حرام کھانے پر دوڑتے ہیں' کیا برے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں' ان کے درویش اور عالم ان کو گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے کیا برے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں۔''

﴿سَمّٰعُوۡنَ لِلۡکَذِبِ اَکّٰلُوۡنَ لِلسُّحۡتِ﴾ (مائدہ:۴۲)

''جھوٹ کے بڑے سننے والے اور حرام کے بڑے کھانے والے۔''

قرآن پاک کی ایک آیت جو پہلے گزر چکی ہے یہاں پر بھی استدلال کے قابل ہے۔

﴿وَلَا تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَکُمۡ بَیۡنَکُمۡ بِالۡبَاطِلِ وَ تُدۡلُوۡا بِہَاۤ اِلَی الۡحُکَّامِ لِتَاۡکُلُوۡا فَرِیۡقًا مِّنۡ اَمۡوَالِ النَّاسِ بِالۡاِثۡمِ وَ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ﴾ (بقرہ:۱۸۸)

''اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے مت کھاؤ' اور نہ مال کو حاکموں تک پہنچاؤ تاکہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ سے کھا جاؤ اور تم جان رہے ہو۔''

یہ آیت اپنے اس ترجمہ کے لحاظ سے جس کو بعض مفسروں نے اختیار کیا ہے' رشوت کی ممانعت میں صاف و

صریح ہے۔

آنحضرت ﷺ نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔ (۱) رشوت دینے والے پر یوں کہ وہ جرم کی اعانت کرتا ہے اور جرم کی اعانت قانون اور اخلاق دونوں میں منع ہے۔

خیبر کے یہودیوں سے زمین کی آدھے آدھ پیداوار پر مصالحت ہوئی تھی جب پیداوار کی تقسیم کا وقت آتا تو آنحضرت ﷺ حضرت عبداللہ بن رواحہ صحابی کو بھیجتے وہ ایمان داری سے پیداوار کے دو حصے کر دیتے تھے اور کہہ دیتے تھے کہ ان دو میں سے جو چاہو لے لو،(۲) یہودیوں نے اپنے دستور کے مطابق ان کو بھی رشوت دینی چاہی، آپس میں چندہ کر کے اپنی عورتوں کے کچھ زیور اکٹھے کئے اور کہا کہ یہ قبول کرو اور اس کے بدلہ تقسیم میں ہمارا حصہ بڑھا دو۔(۳) یہ سن کر حضرت ابن رواحہؓ نے فرمایا ''اے یہودیو! خدا کی قسم تم خدا کی ساری مخلوق میں مبغوض ہو، لیکن یہ مجھے تم پر ظلم کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتا، اور جو تم نے رشوت پیش کی ہے وہ حرام ہے، ہم (مسلمان) اس کو نہیں کھاتے۔'' یہودیوں نے ان کی یہ تقریر سن کر کہا کہ ''یہی وہ (انصاف) ہے جس سے آسمان و زمین قائم ہیں۔''(۴) اسی لیے آنحضرت ﷺ نے عمال کو رعایا سے ہدیہ اور تحفہ قبول کرنے کی ممانعت فرمائی۔(۵) ایک دفعہ ایک عامل نے آ کر کہا کہ یہ صدقہ کا مال ہے، اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہے، یہ سن کر آنحضرت ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کی، حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

''عامل کا کیا حال ہے کہ ہم اس کو بھیجتے ہیں تو آ کر کہتا ہے کہ یہ تمہارا ہے اور یہ میرا ہے۔ تو اپنے باپ یا ماں کے گھر میں بیٹھ کر نہیں دیکھتا کہ اس کو تحفے ملتے ہیں یا نہیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، وہ اس میں سے جو لے جائے گا وہ قیامت میں اپنی گردن پر لاد کر لائے گا، اونٹ، گائے، بکری جو ہو، پھر آپؐ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر تین بار فرمایا۔ خداوند میں نے پہنچا دیا(۶)'' اس تقریر میں آپؐ نے جو کچھ فرمایا وہ غلول والی آیت کی تفسیر ہے۔

سود خوری

سود خوری، حرص و طمع، بخل اور ظلم کا مجموعہ ہے، حرص و طمع تو یوں کہ سود خور اس سود کے ذریعہ چاہتا ہے کہ

(۱) ابوداؤد کتاب الاقضیہ۔
(۲) موطا امام مالک کتاب المساقاۃ۔
(۳) ابوداؤد کتاب الاقضیہ وکتاب الجہاد۔
(۴) موطا امام مالک کتاب المساقات۔
(۵) ابوداؤد کتاب الاقضیہ وکتاب الجہاد۔
(۶) صحیح بخاری باب ہدایۃ العمال۔

ساری دولت سمٹ کر اس کے پاس آ جائے' بخل یوں کہ وہ کسی غریب مقروض کے ساتھ کوئی رعایت کرنا نہیں چاہتا اور نہ کسی کارِ خیر میں دے کر اپنے سرمایہ میں کچھ کمی پسند کرتا ہے' یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سودخوری کا ذکر زکوٰۃ اور خیرات کے مقابلہ میں کیا ہے' اور ظلم یوں کہ وہ سود اور سود در سود کے ذریعہ لوگوں کو ان کی محنتوں کے پھل سے محروم کر دیتا ہے اور رحم نہیں کرتا' اسی لیے سود کی ممانعت کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے خاص طور سے فرمایا:

﴿لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ﴾ (بقرہ:۲۷۹)

''نہ تم کسی پر ظلم کرو' اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔''

یعنی تم نے جتنا دیا ہے' اس سے زیادہ لو' تو یہ تمہارا ظلم ہے اور جتنا تم نے دیا ہے' اتنا تم کو نہ ملے تو یہ تم پر ظلم ہے۔ اس حرام خوری کی عادت بھی عرب میں یہودیوں کی بدولت پھیلی تھی' وہی سرمایہ کے مالک تھے اور غریب عرب کسان اور مزدور اکثر ان ہی سے سودی قرض لیتے تھے' یہودیوں پر نعمتوں کا دروازہ جو بند کیا گیا۔ اس کے اسباب کے بیان کے سلسلہ میں ہے۔

﴿وَ اَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَ اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ﴾ (نساء:۱۶۱)

''اور ان کے سود لینے کے سبب سے حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے اور لوگوں کے مال کو ناروا طریق سے کھانے کے سبب سے۔''

اسلام آیا تو اس نے سرمایہ داری کی اس لعنت کو جس سے دنیا دبی جا رہی تھی' ہمیشہ کے لیے دور کر دیا۔

﴿اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ○ یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ یُرْبِی الصَّدَقٰتِ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِیْمٍ﴾ (بقرہ:۲۷۵-۲۷۶)

''جو سود کھاتے ہیں وہ ایسے اٹھیں گے جیسے وہ اٹھتا ہے جس کے شیطان نے لپٹ کر حواس کھو دیے ہوں۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے کہا کہ خرید و فروخت کا معاملہ سود ہی کی طرح کا ہے' اور اللہ نے خرید و فروخت کے معاملہ کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے تو جس کے پاس اس کے پروردگار کی نصیحت پہنچی اور وہ باز رہا' تو اس کا ہے جو پہلے دیا گیا' اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہے' اور جو پھر ایسا کرے تو وہ دوزخی ہے وہ دوزخ میں رہیں گے خدا سود کو مٹاتا اور صدقہ و خیرات کو بڑھاتا ہے' اور اللہ کسی ناشکرے گناہ گار کو پیار نہیں کرتا۔''

قیامت میں سودخور کا بدحواس ہو کر اٹھنا اس کی دنیاوی بدحواسی کی پوری تمثیل ہوگی' دنیا میں سودخوروں کا یہی حال ہوتا ہے کہ وہ دن رات دوسروں کے مال و دولت کے چھیننے اور اپنی دولت کو ناجائز طریقوں سے بڑھانے

میں ایسے مشغول رہتے ہیں کہ انہیں کسی کارِ خیر کا خیال نہیں آتا' تو قیامت میں بھی وہ ایسے ہی اپنے حواس کھوئے ہوئے اٹھیں گے۔ آیت کے اخیر میں اللہ تعالیٰ نے سود خوروں کو ناشکر گناہ گار ٹھہرایا ہے کیونکہ خدا نے جو دولت ان کو دی تھی اس کا تقاضا یہ تھا کہ اس سے وہ کارِ خیر کرتے' غریبوں کو دیتے' مستحقوں کو بانٹتے' مگر انہوں نے اس کے بجائے غریبوں کو اور لوٹا' اور ظلم سے ان کی تھوڑی بہت پونجی کو بھی چھین لیا۔ اور یہ نعمت کی ناشکری تھی۔

یہودیوں کی دیکھا دیکھی عربوں میں بھی کچھ ایسے سرمایہ دار پیدا ہو گئے تھے جو سودی کاروبار کرنے لگے تھے جیسے حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب اور بنو عمرو بن عمیر وغیرہ' اور اب وہ اور ان کے مقروض جب مسلمان ہوئے اور ان میں سے قرض داروں نے مقروضوں سے پہلے کا سود مانگا تو اس پر یہ آیتیں اتریں جو پہلی ہی آیتوں کے سلسلہ میں ہیں۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ فَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ○ وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ وَ اتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○﴾ (بقرہ:۲۷۸۔۲۸۱)

''اے ایمان لانے والو! خدا کا خیال کرو اور سود جو رہ گیا ہو اس کو چھوڑ دو اگر واقعی مومن ہو' تو اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی کے لیے ہشیار ہو جاؤ اور اگر تم باز آؤ تو تمہارے لیے تمہارا اصل سرمایہ ہے' نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے' اور اگر وہ (مقروض) تنگدست ہو تو اس کو کشادگی تک مہلت دو' اور معاف کر دینا تمہارے لیے سب سے اچھا ہے' اگر تم کو سمجھ ہو' اور اس دن سے ڈرو جس میں خدا کی طرف لوٹائے جاؤ گے پھر ہر کسی کو وہ پورا پورا دیا جائے گا جو اس نے کمایا اور ان کا کچھ دبایا نہ جائے گا۔''

ان آیتوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک دن آئے گا جب سب خدا کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے' اور جس نے کسی کا مال ناحق کھایا ہو گا اس کا حساب ہو گا تو اگر تم نے نیکی کی ہو گی' اور مقروضوں کو معاف کیا ہو گا تو خدا کے یہاں پورا پورا مل جائے گا۔

جاہلیت میں ربا کی یہ صورت تھی کہ غریب کسان اگلی پیداوار کے موقع پر ادا کر دینے کے وعدے پر مہاجنوں سے قرض لیتے تھے' جب فصل کا وقت آتا اور کسان ادا نہ کر سکتے تو مہاجن کہتے کہ ہم مدت بڑھا دیتے ہیں تم جنس کی مقدار بڑھا دو مثلاً ایک روپیہ میں دس سیر کا وعدہ ہوتا تو ایک سال کی اور مہلت بڑھا کر بیس کر دیتے' اور اسی طرح جب تک وہ قرض نہ ادا کر دیتے یہ مدت بڑھاتے جاتے اور جنس کی مقدار بڑھتی چلی جاتی' یہاں تک کہ اصل سے کئی گنا سود ہو جاتا' خدا نے فرمایا:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَأْكُلُوا۟ ٱلرِّبَوٰٓا۟ أَضْعَٰفًا مُّضَٰعَفَةً ۖ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ وَٱتَّقُوا۟ ٱلنَّارَ ٱلَّتِىٓ أُعِدَّتْ لِلْكَٰفِرِينَ ۝﴾ (آل عمران: ۱۳۰۔۱۳۱)

''اے ایمان والو! (اصل سے) دوگنا چوگنا سود مت کھاؤ اور خدا سے تقویٰ کرو شاید کہ تم فلاح پاؤ اور اس آگ سے بچو جو منکروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔''

اس آیت میں تصریح ہے کہ سود خوری کی سزا جہنم ہے، وہ جہنم جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے آنحضرت ﷺ نے اپنے ایک رؤیائے صادقہ میں سود خوروں کو جس حال میں دیکھا اس کی تصویر یہ ہے، فرمایا میں نے دیکھا کہ خون کی ایک نہر ہے، اس میں ایک آدمی تیر رہا ہے اور ایک دوسرا آدمی ہاتھ میں پتھر لیے کنارہ پر کھڑا ہے پہلا آدمی تھک کر جب کنارہ پر آنا چاہتا ہے تو دوسرا آدمی ایسا تاک کر پتھر مارتا ہے کہ اس کا منہ کھل جاتا ہے اور وہ پتھر لقمہ بن کر اس کے پیٹ میں چلا جاتا ہے، وہ پتھر کھا کر پھر پیچھے لوٹ جاتا ہے، جبرائیل نے بتایا کہ یہ جو خون کی نہر میں تیر رہا ہے، سود خور ہے۔ (۱)

سزا کی مماثلت ظاہر ہے، لوگ اپنا خون پسینہ ایک کر کے محنت سے جو روزی پیدا کرتے ہیں، سود خور آسانی سے اس پر قبضہ کر لیتا ہے تو وہ انسان کے خون میں تیرتا ہے اور جو پتھر لقمہ بن کر اس کے منہ میں چلا جاتا ہے وہ دولت ہے جس کو وہ سود سے جمع کرتا ہے۔

گناہ کے شریک وہ بھی ہیں جو کسی گناہ کی اعانت میں شریک ہوں اسی لیے آنحضرت ﷺ نے سود کھانے والے سود کھلانے والے (یعنی دینے والے) سود پر گواہ ہونے والے اور سود کی دستاویز لکھنے والے سب پر لعنت فرمائی۔ (۲)

شراب خوری

شراب خوری ان عادات ذمیمہ میں سے ہے جن کی برائی کھلی ہوئی ہے پھر بھی یہ کتنی عجیب بات ہے کہ دنیا کی اکثر قومیں اس میں مبتلا نظر آتی ہیں۔ اسلام سے پہلے جو مذہب تھے ان میں بھی اس کی برائی کچھ نہ کچھ بیان کی گئی ہے اور اس کا پینا اچھا نہیں سمجھا گیا ہے (۳) لیکن اس کو حرام قطعی ٹھہرانے کی عزت صرف اسلام کو حاصل ہے، شراب عرب کی گھٹی میں پڑی تھی، شراب پینا پلانا اچھے اچھے گھرانوں میں لطف اور تفریح کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ بی بیاں شوہروں کو اور (۴) چھوٹے اپنے بزرگوں (۵) کو اپنے ہاتھوں سے پلاتے تھے۔

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الجنائز باب اولاد المشرکین وکتاب التعبیر باب تعبیر رؤیا بعد صلاۃ الصبح۔

(۲) ابوداؤد کتاب البیوع۔

(۳) لوقا ۱۔۱۵۔

(۴) سبعہ معلقہ میں قصیدہ الاہبی بصحنک۔

(۵) صحیح بخاری کتاب الاشربہ۔

اسلام سے پہلے اگرچہ بعض نیک بخت لوگوں نے شراب چھوڑ دی تھی، مگر سارا ملک اسی مصیبت میں گرفتار تھا، لوگ شراب پیتے اور متوالے ہو کر آپس میں لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کا سر پھوڑتے جس سے دلوں میں آپس کی دشمنی بیٹھ جاتی، کبھی ترنگ میں آتے تو جو اونٹ ملتا اس کو پچھاڑ ڈالتے اور یہ نہیں دیکھتے کہ یہ کس کا ہے[۱] اور ساتھیوں کو اس کے کباب بنا کر کھلا دیتے، ساتھ ہی ساتھ جوا ہوتا، اور اس میں مویشیوں کی بازی لگاتے ان کو ذبح کر کے ان کے گوشت کے حصے کیے جاتے، ان کو سب مل کر آپ کھاتے اور بچ رہتا تو غریبوں کو بھی کھلاتے۔

اسلام آیا تو اس نے رفتہ رفتہ شراب کی چاٹ گھٹانی شروع کی پہلے تو یہ کہا کہ نشہ کوئی اچھی چیز نہیں خدا نے تم کو کھجور اور انگور دیے جو بہت بڑی نعمت ہیں لیکن تم ان سے نشہ تیار کرتے ہو اور کھانے کے کام میں بھی لاتے ہو فرمایا:

﴿وَ مِنۡ ثَمَرٰتِ النَّخِیۡلِ وَ الۡاَعۡنَابِ تَتَّخِذُوۡنَ مِنۡهُ سَكَرًا وَّ رِزۡقًا حَسَنًا اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ﴾ (نحل:۶۷)

”اور کھجور اور انگور کے میوے دیے تم ان سے نشہ بناتے ہو اور اچھی روزی اس میں ان لوگوں کے لیے خدا کی نشانی ہے جو سمجھتے ہیں۔“

اس آیت میں نشہ کو ”رزقِ حسن“ کے مقابلہ میں رکھا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ نشہ رزقِ حسن نہیں[۲] ان آیتوں میں میرے نزدیک درحقیقت خیر و باطل کے التباس کی تشبیہیں ہیں، اوپر دودھ اور گوبر اور خون اور نیچے شہد کا ذکر ہے کہ یہ بھی دودھ کی طرح آلائشوں کے اندر سے کیسا پاک وصاف نکلتا ہے، یہی حال کھجور اور انگور کا ہے کہ ان سے نشہ جیسی ناپاک اور غذا جیسی پاک چیز دونوں پیدا ہوتی ہیں۔[۳]

مدینہ میں آ کر شراب کی حرمت کے مسئلہ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا، حکم ہوا:

﴿لَا تَقۡرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنۡتُمۡ سُكٰرٰی حَتّٰی تَعۡلَمُوۡا مَا تَقُوۡلُوۡنَ﴾ (نساء:۴۳)

”تم جب نشہ میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ تم جانو کہ تم کیا کہتے ہو۔“

اس آیت نے ہشیاروں کو چونکا دیا، کچھ لوگوں نے بالکل چھوڑ دی، اور دوسروں نے اپنے پینے کا وقت نماز کے اوقات کے علاوہ مقرر کیا، اب اتنی جانچ ہو چکی تو وقت آیا کہ کنایہ تصریح کی صورت اختیار کرے، لوگوں کے دلوں میں آپ سے آپ سوال پیدا ہو رہا تھا کہ شراب اور جوئے کے بارہ میں اسلام کا آخری فیصلہ کیا ہوگا۔

﴿یَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡخَمۡرِ وَ الۡمَیۡسِرِ قُلۡ فِیۡهِمَاۤ اِثۡمٌ كَبِیۡرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ اِثۡمُهُمَاۤ اَكۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِهِمَا﴾ (بقرہ:۲۱۹)

---

(۱) سبعہ معلقہ میں طرفہ کا قصیدہ اور صحیح بخاری میں حضرت حمزہؓ کا قصہ۔

(۲) تفسیر کبیر امام رازی۔

(۳) مفسرین کی مختلف رائیں ہیں۔

(''اے پیغمبر)! تجھ سے شراب اور جوئے کے بارہ میں پوچھتے ہیں کہہ دے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فائدہ کی چیزیں بھی ہیں اور ان کا گناہ ان کے فائدہ سے بڑا ہے۔''

فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کا کچھ غم غلط ہوتا ہے' صحبت اور تفریح طبع کا لطف آتا ہے لوگ کھاتے پیتے ہیں' دوسروں کو بھی ان کے بدولت کچھ کھانے پینے کو مل جاتا ہے' لیکن اس کی خرابیاں اس تھوڑے سے فائدہ سے بہت زیادہ ہیں' اس آیت نے بہت سے لوگوں کو ہشیار کر دیا اور وہ شراب سے تائب ہو گئے' لیکن چونکہ ابھی قطعی فیصلہ کا وقت نہ آیا تھا' اس لیے اس کے فائدہ کے پہلو کی رخصت سمجھ کر کچھ لوگ پیتے بھی تھے' آخر یہ آیت اتری:

﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطَانِ فَاجْتَنِبُوْہُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطَانُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃَ وَ الْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ وَ یَصُدَّکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَ عَنِ الصَّلٰوۃِ فَھَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَھُوْنَ ○﴾ (مائدہ:۹۰۔۹۱)

''اے ایمان والو! شراب اور جوا اور چڑھاوے کے بت اور پانسے گندے کام ہیں' شیطان کے سوان سے بچتے رہو' شاید تمہارا بھلا ہو' شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے آپس میں شراب اور جوئے سے دشمنی اور بیر ڈال دے اور تم کو اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے پھر کیا اب تم باز آتے ہو۔''

جب یہ حکم آیا تو بعض صحابہؓ نے چلا کر کہا' خداوندا! ہم باز آ گئے۔ (۱) اس دن مدینہ کا یہ حال تھا کہ ہر طرف گلیوں میں خم الٹے جا رہے تھے اور شراب زمین پر بہائی جا رہی تھی۔(۲)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شراب کی حرمت کے اسباب بھی بتا دیے اول یہ کہ شیطان کا کام ہے دوسرا یہ کہ اس کو پی کر شرابی آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں اور تیسرا یہ کہ یہ انسان کو اس کے بہت سے ضروری کاموں سے غافل کر دیتی ہے ان تینوں اسباب کی سچائی روز روشن کی طرح آج بھی آشکارا ہے۔

اوپر کی آیت میں شراب اور جوئے کو جو شیطان کا کام بتایا گیا ہے' اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں ایک چیز تو کھلی ہوئی ہے' یعنی شراب اور جوئے کو چڑھاوے کے بتوں اور بانٹ کے پانسوں کے ساتھ ملا کر شیطان کے ناپاک اور برے کاموں میں سے شمار کیا ہے' اس لیے ان سب کی باطنی گندگی اور نجاست میں کوئی شک ہی نہیں اس کے علاوہ کسی کام کے شیطان کی طرف نسبت کرنے سے مقصود حد درجہ کی برائی کا اظہار بھی ہے' جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ جب ان کے گھونسہ سے اتفاقاً ایک قبطی مر گیا تو فرمایا: ﴿ھٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ﴾ (قصص:۲) ''یہ ہوا شیطان کے کام سے'' ''یعنی بہت ہی برا کام ہوا' اسی طرح اس آیت ﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّیَاطِیْنِ﴾ (بنی اسرائیل:۲۷) ''بے شبہ فضول خرچ کرنے والے شیطان کے

(۱) ابوداؤد اشربہ۔

(۲) صحیح بخاری کتاب الاشربہ۔

بھائی ہیں۔'' کی روشنی میں ادھر خیال جاتا ہے کہ شراب' جوئے' بتوں کے چڑھاوے' اور جیتے ہوئے جانوروں کو بے کار ذبح کر کے پانسوں سے ان کی بانٹ میں جن کو عرب جاہلیت میں فیاضی کا کام سمجھا جاتا تھا' مال و دولت کی بے فائدہ بربادی کی طرف بھی اشارہ نکل سکتا ہے۔ کون نہیں جانتا' شراب خوری' قمار بازی اور دکھاوے کی جھوٹی فیاضیوں نے خاندان کے خاندان اور قوم کی قوم کو تباہ کر دیا ہے جن کی مثالیں زمانہ کے صفحوں پر لکھی آج بھی ملتی ہیں۔

اس کے بعد ان شیطانی کاموں کی دو برائیاں قرآن نے بتائی ہیں' ایک معاشرتی اور دوسری مذہبی' معاشرتی خرابی یہ کہ شراب سے بدمست ہو کر لوگ آپس میں لڑتے ہیں اور وہ کام کر گزرتے ہیں جن کو وہ ہوش کی حالت میں کبھی نہ کرتے' کتنے قتل' کتنی خودکشیاں اور کتنے سخت حادثے اس کے بدولت روزانہ پیش آتے ہیں۔ مذہبی برائی یہ ہے کہ انسان شراب پینے اور جوا کھیلنے میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ خدا کی یاد اور نماز سے جو زندگی کا سب سے بڑا فرض ہے' غافل ہو جاتا ہے بلکہ خود اپنے مفید دنیاوی کاموں سے بھی ایسا کھویا جاتا ہے کہ وہ دین کے ساتھ دنیا کے کام کا بھی نہیں رہ جاتا اور اس کی ساری زندگی ناکام اور نامراد ہو جاتی ہے۔ (۱)

شراب کے لفظ سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس سے مراد کوئی خاص قسم کی شراب ہے قرآن نے اس کے لیے خمر کا لفظ استعمال کیا ہے' خمر کہتے ہیں چھا جانے کو۔ اس لیے ہر وہ شے جس کا کھانا پینا عقل اور ہوش کو چھا لے وہ خمر میں داخل ہے۔ حضرت عمرؓ نے منبر نبوی پر کھڑے ہو کر فرمایا شراب (خمر) وہ ہے جو عقل کو ڈھانک لے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''ہر وہ شے جو نشہ پیدا کرے حرام ہے۔'' (۲) فرمایا جس نے دنیا میں شراب پی اور اس سے توبہ نہ کی وہ آخرت میں اس سے محروم رہے گا۔ (۳) آنحضرت ﷺ جب معراج میں تشریف لے گئے تو آپؐ کے سامنے دستِ غیب نے دو پیالے رکھے۔ ایک میں دودھ تھا اور دوسرے میں شراب سرورِ کائنات ﷺ نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا۔ ناموسِ وحی حضرت جبرائیلؑ نے کہا ''اس خدا کی حمد جس نے آپؐ کو فطرت کی راہ دکھائی' اگر آپؐ شراب کا پیالہ اٹھاتے تو آپؐ کی امت گمراہ ہو جاتی''(۴) گویا شراب مثال کی دنیا میں گمراہی کی تصویر ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا ''کوئی مومن جب شراب پینے لگتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان اس سے رخصت ہو جاتا ہے۔''(۵) یہ بھی فرمایا کہ ''قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ شراب کا پینا بڑھ جائے گا۔''

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الاشربہ۔
(۲) صحیحین کتاب الاشربہ۔
(۳) ایضاً۔
(۴) ایضاً۔
(۵) ایضاً۔

اسلام نے جب شراب کو حرام کیا تو اس کے سارے لوازم اور متعلقات بھی سدِ ذرائع کے طور پر حرام کیے یہاں تک کہ شروع شروع میں ان برتنوں کے استعمال کو بھی حرام کیا' جن میں شراب عموماً بنائی جاتی ہے' پھر جب لوگ شراب چھوڑنے کے عادی ہو گئے تو اس سختی کو اٹھا دیا۔ (۱)

اس اصول کا ذکر کئی دفعہ آ چکا ہے کہ: ﴿وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (مائدہ: ۲) ''گناہ اور تعدی میں ایک دوسرے کی اعانت نہ کرو۔'' کے اصول کی بنا پر نہ صرف شراب پینا بلکہ اس کا پلانا' بیچنا' خریدنا' لینا' لے جانا' سب حرام ٹھہرایا گیا' فرمایا ''خدا نے شراب' اس کے پینے والے' پلانے والے' بیچنے والے' خریدنے والے' دوسروں کے لیے نچوڑنے والے اپنے لیے نچڑوانے والے' اس کے لیجانے والے اور جس کے پاس لے جائی جائے' سب پر لعنت فرمائی ہے' (۲) یہ بھی ارشاد ہوا کہ ہر نشہ کی چیز حرام ہے' اور جس کے زیادہ پینے سے نشہ ہو اس کا تھوڑا پینا بھی ویسا ہی حرام ہے۔ (۳)

غیظ وغضب

غیظ وغضب کی بے اعتدالی بھی بہت بڑی برائی ہے' بہت سے ظالمانہ اور بیدردانہ کام انسان صرف غیظ و غضب اور غصہ میں کر بیٹھتا ہے' اور بعد کو اکثر نادم اور پشیمان ہوتا ہے اس لیے ایک مسلمان کو چاہیے کہ اپنے غصہ پر قابو رکھے اور بے سبب غیظ وغضب کا اظہار نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اچھے مسلمانوں کی یہ تعریف کی ہے۔ ﴿وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ﴾ (آل عمران: ۱۴) ''اور وہ اپنے غصہ کو دبا لیتے ہیں'' اور دوسری جگہ فرمایا ﴿وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ﴾ (شوریٰ: ۳۷) اور جب ان کو غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔'' انسان کا سکون کی حالت میں معاف کر دینا آسان ہے' لیکن غصہ کی حالت میں جب وہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے معاف کرنا آسان نہیں ہے لیکن ایک مسلمان کی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ وہ اس وقت بھی اپنے کو قابو میں رکھے اور معاف کر دے اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''پہلوان وہ نہیں ہے جو دوسرے کو پچھاڑ دے' پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے کو قابو میں رکھے۔''(۱)

حضرت ابوہریرہؓ' حضرت ابن عمرؓ' حضرت جاریہؓ بن قدامہ' حضرت ابودرداءؓ وغیرہ کئی صحابیوں سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آ کر رسول اللہ ﷺ سے عرض کی یا رسول اللہ! مجھے کوئی نصیحت فرمائیے' ارشاد ہوا کہ غصہ نہ کیا کرو اس کو یہ معمولی بات معلوم ہوئی تو اس نے دوبارہ سہ بارہ عرض کی' آپؐ نے ہر دفعہ یہی فرمایا کہ غصہ نہ کیا

(۱) ایضاً۔
(۲) ابوداؤد کتاب الاشربہ۔
(۳) صحیحین وابوداؤد وترمذی کتاب الاشربہ۔
(۴) صحیح مسلم باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب وبخاری کتاب الادب باب یحذر من الغضب۔

کرو[(۱)] مسند احمد میں ہے کہ ان صاحب کا بیان ہے کہ پھر میں نے دل میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ غصہ حقیقت میں ساری برائیوں کی جڑ ہے۔

مشہور صحابی حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپؐ نے عصر کی نماز کے بعد صحابہؓ کو کھڑے ہو کر نصیحتیں فرمائیں، جن میں سے ایک یہ تھی۔ فرمایا ''آدم کے بیٹے کئی طبقوں میں پیدا کئے گئے ہیں، ان میں کوئی ایسا ہے جس کو غصہ دیر میں آتا ہے اور سکون جلد ہو جاتا ہے، اور کسی کو غصہ بھی جلد آتا ہے، اور دور بھی جلد ہو جاتا ہے، تو ان دونوں میں ایک بات کی دوسری بات سے اصلاح ہو جاتی ہے، اور کوئی ایسا ہے کہ اس کو غصہ جلد آ جاتا ہے اور دفع بہت دیر میں ہوتا ہے تو ہاں! ان میں سب سے اچھا وہ ہے جس کو غصہ دیر میں آئے اور دور جلد ہو جائے، اور ان میں سب سے برا وہ ہے جس کو غصہ جلد آ جاتا ہو اور دور بہت دیر میں ہوتا ہو، ہاں! غصہ ابن آدم کے دل کی ایک چنگاری ہے، دیکھتے نہیں کہ اس کی آنکھیں لال اور اس کی رگیں پھول جاتی ہیں، تو جس کو اپنے غصہ کا احساس ہو اس کو چاہیے کہ وہ زمین سے لگ جائے۔'' [(۲)]

ابوداؤد میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا ''غصہ شیطان سے ہے، اور شیطان آگ سے بنا ہے اور آگ کو پانی ٹھنڈا کرتا ہے، جس کو غصہ آئے اس کو چاہیے کہ وضو کرے'' [(۳)] حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جس کو غصہ آئے وہ اگر کھڑا ہے تو چاہیے کہ بیٹھ جائے اگر اس سے بھی کم نہ ہو تو چاہیے کہ لیٹ جائے۔ [(۴)]

صحیحین میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کے سامنے دو صاحبوں میں کچھ باتیں ہو گئیں، ان میں سے ایک صاحب کو اتنا غصہ آیا کہ چہرہ غصہ سے لال ہو گیا اور رگیں پھول گئیں تو آنحضرت ﷺ نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا، پھر فرمایا مجھے ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر وہ اس کو کہہ لے تو یہ غصہ جاتا رہے اور وہ یہ ہے کہ وہ ﴿اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ﴾ کہے۔[(۵)]

اس اخیر حدیث کی تائید قرآن پاک کی اس آیتِ کریمہ سے ہوتی ہے:

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ○ وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○﴾ (اعراف:۱۹۹۔۲۰۰)

''معاف کرنے کی عادت ڈال نیکی کی بات کہہ اور نادانوں سے درگزر کر اور اگر شیطان کی چھیڑ تجھ کو ابھار دے تو اللہ کی پناہ پکڑ، بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔''

---

(۱) صحیح بخاری و مسند احمد و ابن حبان و طبرانی (منذری باب الترہیب من الغضب)

(۲) جامع ترمذی (منذری باب مذکور)

(۳) سنن ابی داؤد کتاب الادب باب من کتم غیظا۔

(۴) ایضاً۔

(۵) صحیح بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب و مسلم باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب۔

اسی قسم کی آیت سورۂ حم السجدہ ۳۴ میں بھی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے۔

’’نیکی اور بدی برابر نہیں، برائی کا جواب نیکی سے دے پھر جس کے اور تیرے درمیان دشمنی ہوگی وہ ایسا ہو جائے گا، جیسے دوست رشتہ والا اور یہ بات ملتی ہے اس کو جو بڑی قسمت والا ہے، اور اگر ابھار دے تجھ کو شیطان کی کوئی چھیڑ تو اللہ کی پناہ پکڑ، بے شک وہی سننے والا، جاننے والا ہے۔‘‘

آنحضرت ﷺ نے غصہ کے تین علاج بتائے ہیں، ایک روحانی اور دو ظاہری، روحانی تو وہی ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے، یعنی یہ کہ چونکہ یہ غصہ شیطان کا کام ہے اس لیے جب غصہ آئے تو فوراً دعا کرنی چاہیے کہ خداوندا! میں شیطان سے بھاگ کر تیری پناہ چاہتا ہوں، (اعوذ باللہ کا یہی مطلب ہے) خدا اس کی سنے گا اور شیطان کی اس چھیڑ سے اس کو محفوظ کرے گا، ظاہری طور سے بھی دیکھیے کہ جب کسی مسلمان کو دل سے یقین ہوگا کہ غصہ شیطانی حرکت ہے تو خدا کا نام لینے کے ساتھ وہ اس سے دور ہو جائے گا۔

دو ظاہری علاجوں میں سے ایک تو یہ ہے کہ انسان کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اور بیٹھا ہو تو لیٹ جائے۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ تبدیلِ ہئیت سے طبیعت بٹ جائے گی اور غصہ کم ہو جائے گا، دوسرا علاج یہ ہے کہ وضو کرلے، اس سے منشا یہ ہے کہ غصہ کی حالت میں گرمی سے خون کا دوران بڑھ جاتا ہے، آنکھیں لال ہو جاتی ہیں، چہرہ سرخ ہو جاتا ہے تو پانی پڑنے سے مزاج میں ٹھنڈک آئے گی، اور غصہ کی گرمی دور ہو جائے گی۔

بغض و کینہ

دل میں کسی کی دشمنی اور عداوت کا دیرپا جذبہ رکھنا بغض اور کینہ کہلاتا ہے، یہ ایسی بری چیز ہے کہ جو اس سے پاک رہنے کی دعا مانگا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی ہے:

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (حشر:۱۰)

’’اے ہمارے پروردگار! ہم کو اور ہمارے بھائیوں کو جو ہم سے آگے ایمان میں پہنچے، معاف کر اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کا کینہ مت رکھ اے ہمارے پروردگار تو نرمی والا، مہربان ہے۔‘‘

جنت کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں جو لوگ ہوں گے آپس میں بھائی بھائی ہوں گے وہاں بغض و کینہ کا گذر نہ ہوگا، فرمایا:

﴿وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ﴾ (حجر:۴۷)

’’اور ہم نے ان کے سینوں سے جو کینہ تھا نکال لیا بھائی بھائی ہو کر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے۔‘‘

﴿وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ﴾ (اعراف:۴۳)

’’اور ہم نے ان کے سینوں سے جو کینہ تھا نکال لیا، نہریں ان کے نیچے بہتی ہوں گی۔‘‘

ان آیتوں کے اشارہ سے معلوم ہوا کہ جب تک بھائیوں میں کینہ رہے گا جنت کا تخت ہاتھ نہ آئے گا۔ آنحضرت ﷺ نے ہم کو جو تعلیم دی ہے اس کا یہ منشا ہے کہ ہم کو دنیا ہی میں جنت کی سی زندگی بسر کرنی چاہیے فرمایا:

''اے لوگو! آپس میں ایک دوسرے پر حسد نہ کرو' ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو' اور ایک اللہ کے بندے بن کر آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ' کسی بھائی کے لیے حلال نہیں کہ اپنے بھائی کو تین دنوں سے زیادہ چھوڑ دے۔''(۱)

مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی کسی سبب سے دو بھائیوں میں کوئی ملال کی بات ہو جائے تو اس کو تین دنوں سے زیادہ کوئی اپنے دل میں نہ رکھے۔ ابوایوبؓ صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ اپنے بھائی کو تین دنوں سے زیادہ چھوڑ دے دونوں ملیں تو ایک دوسرے سے منہ پھیرے اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے۔ (۲) ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ ''کسی مومن کے لیے جائز نہیں کہ کسی مومن کو تین دن سے زیادہ چھوڑے۔ تین دن جب ہو جائیں تو ان میں سے ہر ایک دوسرے سے آ کر ملے پھر سلام کرے تو اگر دوسرے نے جواب دیا تو دونوں کو مزدوری ملی۔ اور اگر اس نے جواب نہیں دیا تو وہ (جواب نہ دینے والا) گناہ لے کر لوٹا' (۳) کئی حدیثوں میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا ہر دوشنبہ اور پنج شنبہ کو انسان کے اعمال پیش ہوتے ہیں' تو جس نے خدا کے ساتھ شرک نہیں کیا خدا اس کو معاف فرماتا ہے' لیکن جن دو آدمیوں میں آپس میں کینہ ہوتا ہے تو خدا فرماتا ہے کہ ان دونوں کو ابھی رہنے دو میل کر لیں۔ (۴) اس حدیث کی تشریح ایک روایت سے ہوتی ہے' فرمایا دوشنبہ اور جمعرات کو اعمال پیش ہوتے ہیں تو جس نے مغفرت مانگی ہو گی اس کو مغفرت دی جاتی ہے' اور جس نے توبہ کی ہو گی اس کی توبہ قبول ہوتی ہے' لیکن کینہ والوں کے اعمال ان کے کینہ کے سبب سے لوٹا دیے جاتے ہیں' جب تک وہ اس سے باز نہ آئیں۔''(۵) یہ بھی حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا تین شخصوں کی بخشائش نہیں' ان میں سے ایک وہ جو اپنے سے کینہ رکھتا ہے۔(۶)

ان حدیثوں پر غور کیجیے' شرک اور کینہ دونوں کو ایک خاص پہلو سے برابر کا درجہ دیا گیا ہے' دین دو چیزوں سے عبارت ہے' اللہ کا حق اور بندوں کا حق' جب تک شرک رہے گا' اللہ کا کوئی حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جن دو آدمیوں میں کینہ رہے گا ان میں سے کوئی ایک دوسرے کا کوئی حق ادا نہ کر سکے گا۔ غرض جس طرح شرک حق اللہ

(۱) صحیح بخاری و مسلم و مالک ابوداؤد' ترمذی' نسائی۔
(۲) مالک' بخاری' مسلم ترمذی' ابوداؤد۔
(۳) سنن ابوداؤد۔
(۴) مالک و مسلم ابوداؤد' ترمذی وادب المفرد بخاری۔
(۵) طبرانی فی الاوسط (منذری ص ۱۶۴ مصر)
(۶) ادب المفرد بخاری باب الشحنا۔

سے مانع ہے، بغض و کینہ حق العباد سے باز رکھتا ہے اور ان ہی دونوں حقوق سے عہدہ برآ ہونا جنت کی کنجی ہے۔

ظلم

ظلم کا لفظ قرآن پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے، یہاں تک کہ کفر و شرک اور عصیان کے معنوں میں بھی کثرت سے آیا ہے، مگر یہاں مراد اس ظلم سے ہے جو بندے بندوں پر کرتے ہیں قرآن میں اس کے لیے دو اور لفظ ﴿بغی﴾ (سرکشی) اور ﴿عُدْوَان﴾ (تعدی) آئے ہیں، یہ ظلم اسلام کی شریعت میں حرام ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ﴾ (اعراف:۳۳)

''کہہ دے کہ میرے رب نے بے حیائی کے کاموں کو جو کھلے ہوں یا چھپے اور گناہ اور حق کے بغیر سرکشی کو حرام ٹھہرایا ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَ یَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْیِ﴾ (نحل:۹۰)

''اور خدا بے حیائی اور ناپسندیدہ کام اور سرکشی سے منع کرتا ہے۔''

ان دونوں آیتوں میں سرکشی سے مراد حد سے آگے بڑھ کر دوسرے کے حقوق پر دست درازی اور ظلم ہے جس کی روک تھام اگر نہ کی جائے تو وہ پوری قوم اور ملک کے امن و امان کو برباد کر ڈالے، اس کی روک تھام کا پہلا قدم یہ ہے کہ جس پر ظلم کیا جائے اس کا یہ حق مانا جائے کہ وہ ظالم سے اپنا بدلہ لے سکے تاکہ لوگ انجام سوچ کر ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے بچیں گو کسی کو تکلیف پہنچانا اچھا نہیں، مگر ظالم کو اس کے ظلم کے بقدر تکلیف پہنچانے کی اجازت اس لیے دی گئی تاکہ یہ برائی آگے نہ بڑھنے پائے، فرمایا:

﴿وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْیُ هُمْ یَنْتَصِرُوْنَ ۝ وَ جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ (شوریٰ:۳۹۔۴۰)

''اور جن پر ظلم ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں اور برائی کا عوض اسی طرح کی برائی ہے۔''

یعنی جیسی برائی کوئی کرے ویسی ہی برائی اس کے ساتھ کی جائے۔

لیکن اگر کوئی مظلوم بدلہ لینے کی قدرت کے باوجود ظالم کو معاف کر دے، تو مظلوم اپنا انصاف خدا کے ہاں پائے گا اور ظالم خدا کی محبت سے محروم رہے گا۔

﴿فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ﴾ (شوریٰ:۴۰)

''پھر جو کوئی معاف کر دے اور سنوارے تو اس کی مزدوری اللہ کے ذمہ ہے بے شک اللہ ظالم لوگوں کو پیار نہیں کرتا۔''

لیکن اگر کوئی معاف نہ کرے اور بدلہ ہی لے تو اس کو ملامت نہیں کی سکتی۔

﴿وَ لَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِکَ مَا عَلَیْهِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ﴾ (شوریٰ:۴۱)

''اور جو کوئی اپنے ظلم کئے جانے کے بعد بدلہ لے تو اس پر کوئی ملامت کی راہ نہیں۔''

ملامت اس پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرنے میں پہل کرے اور ملک میں ناحق فساد برپا کرے۔

﴿اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِکَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ﴾ (شوری:۴۲)

''راہ ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق دھوم مچاتے ہیں، ان کے لیے دکھ والی سزا ہے۔''

اگر کوئی کسی کو ظلم سے مار ڈالے تو اس کے ولی کو طلب قصاص کی منصفانہ اجازت دی گئی۔

﴿وَ مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطَانًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ اِنَّهٗ کَانَ مَنْصُوْرًا﴾ (اسرائیل:۳۳)

''اور جو ظلم سے مارا گیا تو اس کے وارث کو ہم نے زور دیا ہے، تو وہ خون کرنے میں زیادتی نہ کرے، بے شبہ اس کو مدد دی جائے۔''

مقصود یہ ہے کہ ظالم قاتل کے خلاف مظلوم مقتول کی مدد کی جائے، تا کہ دنیا میں عدل قائم ہو لیکن مقتول کے وارثوں کو بھی چاہیے کہ انتقام کے جوش میں حد سے آگے بڑھ کر قاتل کے ساتھ اس کے اور عزیزوں اور دوستوں کے خون سے اپنے ہاتھ نہ رنگیں، ورنہ یہ سلسلہ جاہلیت کی طرح اسلام میں بھی کبھی ختم نہ ہوگا۔

مظلوم کو اس کی بھی اجازت ملی ہے کہ وہ ظالم کی ظالمانہ کاروائیوں کو علانیہ بیان کرے۔ اس کے دو فائدے ہیں ایک تو اس سے اپنی بدنامی کے ڈر سے ظلم کرنے میں کچھ ہچکچائیں گے، دوسرا یہ کہ اس طرح لوگوں کو مظلوم کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوگی، فرمایا:

﴿لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ وَ کَانَ اللّٰهُ سَمِیْعًا عَلِیْمًا﴾ (نساء:۱۴۸)

''اور اللہ کو بری بات کا پکارنا پسند نہیں آتا، مگر جس پر ظلم ہوا ہو اور اللہ سنتا، جانتا ہے۔''

اگر ظالم اپنی حرکت سے باز نہ آئے تو مسلمانوں کو اجازت ملی ہے کہ سب مل کر اس سے لڑیں اور اس کو خدا کے قانون کے آگے سرنگوں کریں:

﴿فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَی الْاُخْرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰهِ﴾ (حجرات:۹)

''تو اگر ان میں سے ایک دوسرے پر چڑھ آئے تو سب لڑو اس چڑھائی والے سے، یہاں تک کہ وہ اللہ

کے حکم پر پھر آ ئے۔''

یہ تو مسلمانوں کے آپس کی بات تھی، لیکن اگر فریقِ مخالف کافر ہو تو بھی اس پر زیادتی نہ کی جائے اور اگر کوئی مسلمان اس حکم کی خلاف کرے تو دوسرے مسلمانوں کو اس کا ساتھ نہیں دینا چاہیے فرمایا:

﴿وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْکُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا وَ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَ التَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ﴾ (مائدہ:۲)

''اور کسی قوم کی دشمنی اس لیے کہ وہ تم کو مسجدِ حرام سے روکتی تھی، اس جرم پر تم کو آمادہ نہ کرے کہ تم زیادتی کر بیٹھو اور نیکی اور تقویٰ کے کام پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور تعدی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک وہ سخت سزا والا ہے۔''

اس سے معلوم ہوگا کہ دنیا میں مظالم کے انسداد کا وہ سب سے بڑا اور مؤثر حربہ جس کا نام آج کل عدمِ تعاون اور نان کواپریشن ہے۔ اسلام نے اس کو بہت پہلے پیش کیا ہے، اور صاف وصریح حکم دیا ہے کہ گناہ اور ظلم و تعدی کے کاموں میں ظالموں کا ساتھ نہ دیا جائے اور ان کے ظلم کے کاموں میں شریک نہ ہوا جائے البتہ اس عدم شرکت کی صورتیں زمانہ کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو فرمایا کہ ''تم اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم'' صحابہؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کی جاسکتی ہے، مگر ظالم کی مدد کیونکر کی جائے، فرمایا ''اس کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روکا جائے۔''(۱) اس طریقۂ تعلیم کی جدت پر ایک نظر ڈالیے ظالم کی مدد کی ترغیب دلا کر سننے والوں کے دلوں میں توجہ کی خلش پیدا کردی، اور جب بظاہر اس عجیب تعلیم کی طرف وہ بدل وجان متوجہ ہوگئے تو اس کمال التفات سے فائدہ اٹھا کر آپؐ نے یہ تلقین فرمائی کہ ظالم کی مدد کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو ظلم کی برائی سے روکا جائے۔''

آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ یہ حدیثِ قدسی بڑے مؤثر انداز میں سنائی فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ارشاد فرماتا ہے کہ ''اے میرے بندو! میں نے اپنے لیے اور تمہارے لیے آپس میں ظلم کو حرام کیا ہے تو تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کیا کرو۔ (۲)

ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا ''ظلم سے بچو کہ ظلم قیامت کے دن ظلمات بن جائے گا۔''(۳) ظلمات عربی میں اندھیرے کو کہتے ہیں، ظلم اور ظلمات کا مادہ عربی میں ایک ہی ہے۔ ہماری زبان میں اسی لفظی

(۱) صحیح بخاری ابواب المظالم وصحیح مسلم باب نصر الاخ ظالما ومظلوما۔
(۲) صحیح مسلم باب تحریم الظلم وترمذی کتاب الزہد ومسند احمد جلد ۵ ص ۱۵۴ وص ۱۶۰ وص ۱۷۷ وادب المفرد بخاری باب الظلم۔
(۳) صحیح مسلم باب تحریم الظلم وصحیح بخاری ابواب المظالم۔

رعایت کے ساتھ اس کا ترجمہ یوں ہوسکتا ہے کہ اندھیر نہ کیا کرو کہ قیامت کے دن یہ اندھیرا ہو جائے گا۔ یہ ایک طرح کی مثالی سزا ہوگی۔ انسان اپنی غرض یا غصہ سے اندھا ہو کر دوسروں پر ظلم کر بیٹھتا ہے یہ اندھا پن قیامت کے دن ہولناک دن میں اندھیرا بن کر نمودار ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے چاہیے کہ وہ اس پر ظلم نہ کرے اور نہ اس کو بے مددگار چھوڑ دے۔''(۱) براءؓ بن عازب کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا اور سات باتوں سے روکا ہے ان میں ایک یہ ہے کہ مظلوم کی مدد کی جائے'(۲) حضرت معاذؓ کو امیر بنا کر جب آپؐ نے یمن بھیجا تو ان کو نصیحت فرمائی کہ ''مظلوم کی بددعا سے بچتے رہنا کیونکہ اس کے اور خدا کے بیچ میں کوئی پردہ نہیں۔''(۳) حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس نے اپنے بھائی کی آبرو یا کسی چیز پر ظلم کیا ہو تو اس کو چاہیے کہ آج ہی اس سے پاک ہولے اس دن سے پہلے کہ اس کے پاس دینے کو نہ دینار ہوگا نہ درہم۔ ظلم کے بدلہ ظلم کے برابر مظلوم کو ظالم کی نیکیاں دلوائی جائیں گی اور نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں ظالم پر لاد دی جائیں گی۔(۴) فرمایا کہ ظالم کو خدا مہلت دیتا ہے پھر جب اس کو پکڑتا ہے تو پھر چھوڑتا نہیں۔(۵)

فرمایا اہل ایمان دوزخ سے پاک ہو چکیں گے تو جنت اور دوزخ کے درمیان ایک پل کے پاس روکے جائیں گے وہاں دنیا میں ایک نے دوسرے پر ظلم کئے تھے ان کا بدلہ ایک دوسرے کو دلایا جائے گا جب اس سے بھی پاک ہو جائیں گے تب ان کو بہشت میں جانے کی اجازت ملے گی۔(۶)

❀❀❀

---

(۱) صحیح بخاری ابواب الظالم۔
(۲) ایضاً۔
(۳) صحیح بخاری ابواب المظا
(۴) ایضاً۔
(۵) صحیح مسلم باب تحریم الظلم۔
(۶) صحیح بخاری ابواب المظالم۔

فخر وغرور

انسان میں جب کوئی وصف یا کمال پایا جاتا ہے تو قدرتی طور پر اس کے دل میں اس کا خیال پیدا ہوتا ہے اور یہ کوئی اخلاقی عیب نہیں، لیکن جب یہ خیال اس قدر ترقی کر جاتا ہے کہ وہ اور لوگوں کو جن میں یہ وصف نہیں پایا جاتا یا کم پایا جاتا ہے، اپنے سے حقیر سمجھنے لگتا ہے تو اس کو کبر اور اس کے اظہار کو تکبر کہتے ہیں۔ دنیا میں سب سے پہلے اس بداخلاقی کا ظہور شیطان سے ہوا، اس نے آدم کے مقابلہ میں اپنے کو بالاتر سمجھا اور پکارا۔

﴿اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ﴾ (اعراف:۱۲)

''میں اس سے بہتر ہوں۔''

وہ مٹی سے بنا ہے اور میں آگ سے بنا ہوں، خدا تعالیٰ نے اس کی اس شیخی پر اس کو مردود قرار دیا، اور فرمایا:

﴿فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا یَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِیْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِیْنَ﴾ (اعراف: ۱۳)

''یہاں سے اتر جاؤ، یہاں تجھے غرور کرنا زیبا نہیں، نکل جا تجھے بڑائی کے بدلہ یہاں ذلت کی چھوٹائی ملی۔''

کبر وغرور ایک اضافی اور نسبی چیز ہے جس کے لیے محض اپنی عظمت کا تخیل کافی نہیں، بلکہ اس تخیل کے ساتھ دوسرے لوگوں کی تحقیر بھی ضروری ہے چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ ایک خوش جمال شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ میں ایک حسین شخص ہوں اور حسن مجھے نہایت محبوب ہے میں یہ نہیں پسند کرتا کہ کسی کو مجھ پر حسن میں تفوق حاصل ہو تو کیا یہ تکبر ہے؟ فرمایا نہیں تکبر یہ ہے کہ حق کو قبول نہ کیا جائے اور لوگوں کو حقیر سمجھا جائے۔''(۱)

تکبر کی اسی اضافی حیثیت نے اس کو مذہبی، اخلاقی، معاشرتی بداخلاقیوں کا سرچشمہ بنا دیا۔ پیغمبروں کی مزاحمت صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اپنے کو اور لوگوں سے بڑا سمجھتے ہیں، اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو اور غریب اور عام لوگ پیغمبروں کی ہدایت کو قبول کر لیتے۔

﴿وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِیْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ﴾ (ابراہیم:۲۱)

(۱) ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی الکبر۔

’’اور (قیامت کے دن) سب لوگ خدا کے روبرو نکل کر کھڑے ہوں گے تو (جو لوگ دنیا میں) کمزور (تھے اس وقت) ان لوگوں سے جو بڑی عزت رکھتے تھے کہیں گے کہ ہم تو تمہارے قدم بقدم چلنے والے تھے تو کیا (آج) تم عذاب خدا میں سے کچھ (تھوڑا سا) ہم پر سے ہٹا سکتے ہو۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارونؑ کو بڑی بڑی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے اعیانِ دولت کے پاس بھیجا، لیکن انہوں نے خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت کے قبول کرنے سے اس لیے انکار کیا کہ وہ اپنے آپ کو سب سے بالاتر سمجھتے تھے۔

﴿فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ﴾ (مؤمنون:۴۶)

’’تو وہ سب شیخی میں آ گئے اور وہ تھے (بھی) سرکش لوگ۔‘‘

اسی تکبر کی بنا پر وہ اپنے ہی جیسے کی جو عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہو اطاعت کرنا پسند نہیں کرتے تھے، ان کو اس سے ننگ و عار تھا کہ جس حلقے میں عام لوگ شامل ہو گئے ہیں اس میں وہ بھی شامل ہو جائیں۔

﴿فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ﴾ (هود: ۲۷)

’’اس پر ان کی قوم کے سردار جو (ان کو) نہیں مانتے تھے لگے کہنے کہ ہم کو تو تم ہمارے ہی جیسے بشر دکھائی دیتے ہو اور ہمارے نزدیک صرف وہی لوگ تمہارے پیرو ہو گئے ہیں جو ہم میں رذیل ہیں (اور پیرو ہو بھی گئے ہیں تو بے سوچے سمجھے) سرسری نظر سے اور ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے بلکہ ہم تم کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔‘‘

غرض پیغمبروں کی دعوت کے قبول کرنے سے صرف ان ہی لوگوں کو انکار تھا جو اپنے آپ کو مذہبی، قومی، سیاسی یا اور کسی وجہ سے لوگوں سے یا خود پیغمبروں سے بڑا سمجھتے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نہایت شدت سے ان لوگوں کی برائی بیان کی ہے اور مختلف الفاظ میں بیان کی ہے تاکہ کبر و غرور کے تمام مدارج پیش نظر ہو جائیں عام لفظ تو استکبار اور اس کے مشتقات ہیں، بعض جگہ اس کو عزت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے:

﴿بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍ﴾ (صٓ:۲)

’’لیکن جو لوگ منکر ہیں (ناحق کی) ہیکڑی اور مخالفت میں (پڑتے) ہیں۔‘‘

بعض جگہ اس سے بھی زیادہ قوی لفظ ’’جبار‘‘ اختیار کیا ہے۔

﴿كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ﴾ (مومن:۳۵)

’’جتنے مغرور سرکش ہیں اللہ ان کے دلوں پر اسی طرح مہر لگا دیتا ہے۔‘‘

دو موقعوں پر اس کے لیے مُخْتَالُ کا لفظ آیا ہے، یہ اس شخص کو کہتے ہیں جس کو گھمنڈ ہو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ایسے مغرور اور فخار میری محبت کی عزت سے محروم ہیں۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا﴾ (نساء:۳۶)

''اللہ اس کو پیار نہیں کرتا جو مغرور اور فخار ہو۔''

﴿اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ﴾ (نحل:۲۳)

''اللہ غرور کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

ان کو جہنم کی خوش خبری بھی یہیں دے دی گئی ہے۔

﴿اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ﴾ (زمر:۱۰)

''کیا جہنم میں مغروروں کا ٹھکانا نہیں۔''

﴿فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ﴾ (زمر:۸۲)

''تو دوزخ مغروروں کا ٹھکانا ہے۔''

مغروروں کے ساتھ یہ سختی اس لیے ہے کہ ان کا یہ غرور ان کو حق کے قبول سے باز رکھتا ہے۔

اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے کبر و غرور کے جو ثمرات ظاہر ہوتے ہیں، ان کا کوئی شمار ہی نہیں کیا جا سکتا مثلاً ایک متکبر شخص عام لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا بات چیت کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے، اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے رہیں، بلکہ بہت سے لوگوں کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ ان کو یہ شرف حاصل ہو جب لوگوں سے ملتا ہے تو چاہتا ہے کہ لوگ اس کو پہلے سلام کریں راستے میں لوگوں سے آگے چلنا چاہتا ہے، مجلسوں میں صدر بننے کی کوشش کرتا ہے، غرض اس کے ثمرات و نتائج ہزاروں صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی غرور ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ [1] اور امام غزالی نے اس حدیث کا یہ فلسفہ بیان کیا ہے کہ ''مسلمانوں کے جو مخصوص اخلاق ہیں وہی جنت کا دروازہ ہیں، اور غرور ان تمام دروازوں کو بند کر دیتا ہے، اس لیے جس شخص کے دل میں ذرہ بھر بھی غرور ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔'' یعنی دنیا کی طرح آخرت میں بھی مسلمانوں سے الگ تھلگ رہے گا۔

یہ بد اخلاقی چونکہ ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگوں میں پائی جاتی ہے، اور اس کے نتائج گونا گوں صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں، اس لیے ان سب کا استقصا تو مشکل تھا، البتہ شریعت نے ان کے بعض نتائج ظاہر کر دیے ہیں مثلاً کبر و غرور کے جو مظاہر امراء و سلاطین سے تعلق رکھتے ہیں ان کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے سامنے لوگ کھڑے رہیں اس کو اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لینا چاہیے۔ ایک بار آپ خود عصا ٹیکے ہوئے نکلے تو صحابۂ کرامؓ تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے فرمایا کہ ''عجمیوں کی طرح تعظیم کے لیے کھڑا نہ ہوا

(۱) ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی الکبر۔

کرو۔"(۱)

بڑے آداب والقاب کا اپنے ناموں کے ساتھ اضافہ کرنا اگر وہ خلافِ واقعہ ہوں تو جھوٹ ہے اور اگر واقعہ کے مطابق ہوں تو فخر وغرور کا ذریعہ ہیں' عجمی بادشاہ اپنے کو فخریہ ملک الملوک اور شہنشاہ کہلاتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا سب سے برا نام خدا کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی اپنے کو ملک الملوک اور شہنشاہ کہلائے۔"(۲)

کبر وغرور کی چند عام اور بدنما صورتوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کیا ہے مثلاً۔

﴿وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّکَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَ لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا○﴾ (بنی اسرائیل:۳۷)

"اور زمین میں اکڑ کر نہ چلا کر کیونکہ (اس دھماکے کے ساتھ چلنے سے) تو زمین کو تو پھاڑ نہیں سکے گا' اور نہ (تن کر چلنے سے) پہاڑوں کی لمبائی کو پہنچ سکے گا۔"

﴿وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّکَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ﴾ (لقمان:۲)

"اور لوگوں سے بے رخی نہ کر اور زمین میں اترا کر نہ چل' بے شک اللہ اس کو پیار نہیں کرتا جس کو گھمنڈ ہو فخار ہو۔"

گنہگار کی شان یہ بیان کی ہے۔

﴿ثَانِیَ عِطْفِهٖ﴾ (حج:۹)

"اینٹھتا ہوا۔"

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

﴿من جر ثوبه خيلاء لم ينظر الله اليه يوم القيمة﴾ (۳)

"جو شخص غرور سے اپنے کپڑے گھسیٹے گا خدا اس کی طرف قیامت کے دن نہ دیکھے گا۔"

ایک حدیث میں ہے کہ گزشتہ لوگوں میں ایک شخص ایک جوڑا پہن کر اتراتا ہوا نکلا تو خدا نے زمین کو حکم دیا جس نے اس کو پکڑ لیا اور اب وہ قیامت تک اس میں دھنسا چلا جا رہا ہے' (۴) اس کے برعکس بہت سے افعال ہیں جو تواضع وخاکساری پر دلالت کرتے ہیں' اور ان ہی کو خدا نے اپنی خاص عبودیت کی علامت قرار دیا ہے۔

(۱) ابوداؤد کتاب الادب باب فی قیام الرجل لرجل۔

(۲) صحیح بخاری۔

(۳) ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی اسبال الازار۔

(۴) ترمذی ابواب الزہد۔

﴿وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا﴾ (فرقان:۶۳)

''اور (خدائے) رحمٰن کے (خاص) بندے تو وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلیں' اور جب جاہل ان سے (جہالت کی) باتیں کرنے لگیں تو (ان کو) سلام کریں (اور الگ ہو جائیں۔)''

رسول اللہ ﷺ دوزانو بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے' ایک بدو بھی اس وقت موجود تھا اس نے کہا بیٹھنے کا یہ کیا طریقہ ہے فرمایا ''خدا نے مجھ کو شریف بندہ بنایا ہے متکبر اور سرکش نہیں بنایا ہے۔'' (۱)

ایک صحابیؓ نے جن کو لوگ مغرور و متکبر سمجھتے تھے' اسی قسم کے افعال سے اپنے کبر و غرور کی تردید کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کا خیال ہے کہ میں مغرور ہوں' حالانکہ میں گدھے پر سوار ہوتا ہوں' کمل اوڑھتا ہوں اور بکری کا دودھ دوہتا ہوں اور رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا ہے کہ ''جو شخص یہ سب کام کرتا ہے اس میں غرور نہیں پایا جاتا۔'' (۲)

کبر و غرور کے اسباب بہت سے ہیں لیکن عام طور پر دنیا دار لوگ جن چیزوں پر غرور کرتے ہیں وہ یہ ہیں حسب و نسب' حسن و جمال' مال و دولت' قوت اور اعوان و انصار کی کثرت' اسلام نے ان میں سے ہر ایک سبب کی نسبت اپنی قطعی رائے ظاہر کر دی اور بتا دیا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز فخر و غرور کا ذریعہ نہیں۔

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰی وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا﴾ (حجرات:۱۳)

''لوگو! ہم نے تم (سب) کو ایک مرد (آدم) اور ایک عورت (حوا) سے پیدا کیا' اور (پھر) تمہاری ذاتیں اور برادریاں ٹھہرائیں تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔''

اس کے بعد بتایا کہ شرافت و عظمت کی بنیاد نسب و حسب پر نہیں بلکہ روحانی فضائل پر ہے۔

﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ﴾ (حجرات:۲)

''اللہ کے نزدیک تم میں بڑا شریف وہی ہے جو تم میں بڑا پرہیزگار ہے۔''

اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی مزید تشریح کی' اور فرمایا کہ ''خداوند تعالیٰ نے تمہارے جاہلیت کے غرور اور باپ دادا کے اوپر فخر کرنے کے طریقہ کو مٹا دیا' اب صرف دو قسم کے آدمی ہیں' مومن پرہیزگار اور بدکار بدبخت' تم لوگ آدم کے بچے ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے' لوگ ایسے لوگوں پر فخر کرنا چھوڑ دیں جو جہنم کا کوئلہ ہیں یا خدا کے نزدیک اس گبریلے سے بھی زیادہ ذلیل ہیں جو اپنے منہ سے نجاست کو گھسیٹتا چلتا ہے۔'' (۳)

(۱) ابن ماجہ کتاب الاطعمۃ باب الاکل متکئا۔

(۲) ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی الکبر۔

(۴) ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی الکبر۔

جہاں تک زیب وزینت اور جسم کی ظاہری آرائش اور پاکیزگی کا تعلق ہے حسن وجمال کو ایک قابل قدر چیز قرار دیا، چنانچہ ایک خوبرو شخص نے جب آپؐ سے دریافت کیا کہ مجھ کو یہ پسند ہے کہ میرا کپڑا اور جوتا عمدہ ہو، تو فرمایا کہ خدا حسن کو پسند کرتا ہے۔''(۱) یعنی اس کا نام غرور نہیں، البتہ جن صورتوں میں حسن وجمال غرور وتکبر کے اظہار کا ذریعہ بن جاتا ہے، شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے چنانچہ ایک صحابیؓ کو آپؐ نے چند اخلاقی نصیحتیں کیں، جن میں ایک نصیحت یہ تھی کہ تہ بند کو بہت نیچے نہ لٹکاؤ کیونکہ یہ غرور کی ایک قسم ہے اور خدا غرور کو نہیں پسند کرتا۔ (۲)

تمدنی اور اجتماعی ضروریات کے لحاظ سے مال ودولت کی اہمیت کو قائم رکھا اور اسی لحاظ سے اس کی تعبیر قوام اور خیر کے لفظ سے کی، مال ودولت کے ضائع کرنے کی ممانعت فرمائی، اور اس کے تحفظ کو اس قدر ضروری قرار دیا کہ جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں قتل کیا جائے اس کو شہید کا لقب عنایت کیا لیکن اسی کے ساتھ اگر اس کو فخر وغرور کا ذریعہ بنالیا جائے تو اس کی حقیقت جلوۂ سراب سے زیادہ نہیں۔

﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّ زِيْنَةٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَ تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ﴾ (حدید:۲۰)

''(لوگو) جانے رہو کہ دنیا کی زندگی کھیل اور تماشا اور ظاہری طمطراق اور آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور ایک دوسرے سے بڑھ کر مال اور اولاد کا خواست گار ہونا (بس یہی کچھ ہے۔)''

احادیث میں مال ودولت کی برائی جن اسباب کی بنا پر بیان کی گئی ہے، ان میں ایک سبب یہ ہے کہ وہ فخر و غرور اور باہمی مسابقت کا ذریعہ بن جاتا ہے حالانکہ اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ اس سے اپنی اور دوسروں کی ضروریات پوری کی جائیں، ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم کو مال ودولت کی طلب میں باہمی مسابقت نے غافل کر دیا، آدم کا بچہ کہتا ہے کہ میرا مال، میرا مال، حالانکہ تیرا مال صرف وہی ہے جس کو تو نے صدقہ میں دے ڈالا، کھا پی ڈالا، اور پہن کر پھاڑ ڈالا۔ (۳)

قوت ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ سے ہر قسم کے تمدنی، مذہبی اور سیاسی کام انجام دیے جاسکتے ہیں اس لیے اس قسم کے موقعوں پر وہ ایک قابلِ ستائش وصف ہے، یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ''قوی امین'' کہا ہے اور حضرت لوطؑ نے ایک موقع پر یہ حسرت ظاہر کی ہے:

﴿قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰي رُكْنٍ شَدِيْدٍ﴾ (ھود:۸۰)

(''لوطؑ) بولے کہ اے کاش (آج) مجھ کو تمہارے مقابلہ کی طاقت ہوتی، یا میں کسی زبردست سہارے کا آسرا پکڑ جاتا۔''

---

(۱) ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی اسبال الازار۔

(۲) ترمذی کتاب الزہد باب ماجاء فی الزہادۃ فی الدنیا۔

(۳) ترمذی کتاب الزہد باب ماجاء فی الزہادۃ فی الدنیا۔

اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں تمام بنی نوع انسان پر اپنا یہ احسان جتایا ہے۔

﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً﴾ (روم:۵۴)

''اللہ (ہی) وہ (قادرِ مطلق) ہے، جس نے تم لوگوں کو کمزور حالت سے (جو ماں کے پیٹ میں ہوتی ہے) بنا کھڑا کیا، پھر (طفلی کی) کمزوری کے بعد (جوانی کی) توانائی دی۔''

اور مسلمانوں کو طاقتور بننے اور سامان جنگ سے آراستہ رہنے کا حکم دیا ہے:

﴿وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِیْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ یَعْلَمُهُمْ﴾ (انفال:۶۰)

''اور (مسلمانو!) سپاہیانہ قوت سے اور گھوڑوں کے باندھے رکھنے سے جہاں تک تم سے ہو سکے کافروں کے (مقابلہ) کے لیے ساز و سامان مہیا کیے رہو کہ ایسا کرنے سے اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے اور (نیز) ان کے سوا دوسروں پر بھی جن کو تم نہیں جانتے (اور) اللہ ان (کے حال) سے خوب واقف ہے۔''

قرآنِ مجید کے ساتھ احادیث سے بھی قوت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ طاقتور مسلمان خدا کے نزدیک کمزور مسلمان سے زیادہ بہتر اور زیادہ محبوب ہے (۱) اگرچہ متعدد حدیثوں میں ضعف کی فضیلت بھی بیان کی گئی ہے، تاہم غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ ضعف کی فضیلت نہیں، بلکہ تواضع و خاکساری کی فضیلت ہے جو ایک قابلِ ستائش وصف ہے۔ اسی بنا پر بعض حدیثوں میں ضعف کا مقابلہ کبر و غرور کے ساتھ کیا گیا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

((اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِاَهْلِ الْجَنَّةِ كُلُّ ضَعِیْفٍ مُتَضَعَّفٍ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِاَهْلِ النَّارِ كُلُّ عُتُلٍّ جَوَّاظٍ مُتَكَبِّرٍ)) (۲)

''کیا میں تم کو بتاؤں کہ جنتی کون ہے؟ ہر وہ شخص جو کمزور ہو اور لوگ اس کو کمزور سمجھیں کیا میں تم کو بتاؤں کہ دوزخی کون ہے؟ ہر اکھڑ بدخو اور مغرور شخص۔''

دوسری حدیث میں ہے۔

((اِحْتَجَّتِ النَّارُ وَالْجَنَّةُ فَقَالَتْ هٰذِهٖ یَدْخُلُنِی الْجَبَّارُوْنَ الْمُتَكَبِّرُوْنَ وَ قَالَتْ هٰذِهٖ یَدْخُلُنِی الضُّعَفَاءُ وَ الْمَسَاكِیْنُ)) (۳)

''دوزخ اور جنت نے باہم مباحثہ کیا دوزخ نے کہا مجھ میں جبار اور متکبر لوگ داخل ہوں گے اور جنت

---

(۱) مسلم کتاب القدر باب فی الامر بالقوة وترک العجز۔

(۲) بخاری کتاب الادب باب الکبر۔

(۳) مسلم کتاب صفات المنافقین واحکام باب النار یدخلہا الجبارون۔

نے کہا کہ مجھ میں کمزور اور مسکین لوگ۔"

ان حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ضعف بجائے خود قابلِ مدح وصف نہیں ہے بلکہ اس کو صرف اس لیے فضیلت حاصل ہے کہ وہ تواضع وخاکساری اور اس قسم کے دوسرے اوصاف کا مظہر ہے۔

اعوان وانصار کی کثرت ہمیشہ سے انسان کے لیے ایک مابہ الامتیاز چیز رہی ہے بالخصوص غیر متمدن قومیں ہمیشہ کثرت مال اور کثرتِ اولاد پر فخر وغرور کرتی ہیں اور اس فخر وغرور کے نشہ میں دوسروں کو حقیر سمجھتی ہیں۔ بلکہ خدا کو بھی بھلا دیتی ہیں' زمانہ سابق میں اسی قسم کا ایک شخص تھا جس کو اپنی دولت اور اعوان وانصار کی کثرت پر بڑا ناز تھا اور اس کا خیال تھا کہ یہ تمام چیزیں ہمیشہ قائم رہیں گی اور قیامت کبھی نہ آئے گی اور اگر آئی بھی تو قیامت میں بھی اس کی یہی شان قائم رہے گی وہ اس حیثیت سے ایک دوسرے شخص کو حقیر سمجھ کر کہتا ہے۔

﴿انا اکثر منک مالا و اعز نفرا﴾ (کہف:۳۴)

"میں تجھ سے زیادہ مالدار ہوں اور (میرا) جتھا (بھی) بڑا زبردست (جتھا) ہے۔"

دوسرا شخص نصیحت آمیز الفاظ میں کہتا ہے کہ ایک حقیر انسان کے لیے اس قدر کبر وغرور جائز نہیں۔

﴿اکفرت بالذی خلقک من تراب ثم من نطفة ثم سوٰک رجلا﴾ (کہف:۳۷)

"کیا تو اس (پروردگار) کا منکر ہے جس نے تجھ کو (پہلے) مٹی سے پھر نطفے سے پیدا کیا' پھر تجھ کو پورا آدمی بنایا۔"

نتیجہ یہ ہوا کہ عذابِ الٰہی نے اس کی دولت کو ملیا میٹ کر دیا اور اس کا جتھا ٹوٹ گیا اور اس کو معلوم ہو گیا کہ ایسی ناپائیدار چیز فخر وغرور کے قابل نہیں۔ اہلِ عرب کو بھی اس پر بڑا ناز تھا اور وہ قبیلہ کی کثرت پر ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے' اور زندوں سے گذر کر مردوں کی ذات پر بھی فخر کرتے تھے' اس فخر وغرور میں باہم مقابلہ ہوتا تھا اور اس مقابلہ کے لیے ایک خاص لفظ "تکاثر" ایجاد ہو گیا تھا' جس نے ان کو دینی امور سے غافل دبے پروا کر دیا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص سورہ میں انسانوں کو خطاب کر کے اس پر سرزنش کی۔

﴿الھٰکم التکاثر حتی زرتم المقابر﴾ (تکاثر:۱)

"تم کو مال اور اولاد کی کثرت میں ایک دوسرے پر بڑھ جانے کی کوشش نے غافل بنا دیا ہے' یہاں تک کہ تم قبروں سے جا ملتے ہو۔"

لیکن اسی کے ساتھ اسلام میں یہ چیز بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں' بلکہ اجتماعی اور تمدنی حیثیت سے نسلی ترقی ایک قابلِ فخر چیز ہے' بشرطیکہ فخر وغرور کے بجائے اس سے حق کی نصرت کا کام لیا جائے اور اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

((تزوجوا الودود الولود فانی مکاثر بکم الامم)) (۱)

(۱) ابوداؤد کتاب النکاح باب فی تزویج الابکار۔

''محبت کیش اور بچے جننے والی عورت سے نکاح کرو، کیونکہ کثرتِ تعداد میں تم پر دوسری قوموں کے مقابل میں فخر کروں گا۔''

آج تعداد کی اسی اقلیت واکثریت کے مسئلہ نے قوموں اور ملکوں کی سیاست کا رخ بدل دیا ہے اور اسلام کی نگاہ سے یہ نکتہ چھپا نہ تھا۔

ریا

ریا کے لغوی معنی دکھاوا اور نمائش کے ہیں، انسانی اعمال کی اصل حقیقت ان کی نیت اور غرض پر مبنی ہے، اس لیے اعمال کی راستی و ناراستی اور اچھائی کا بہت کچھ مدار غرض و نیت پر ہے صحیح حدیث میں ہے کہ

((انما الاعمال بالنیات))

(عمل نیت سے ہے)

اور ریا اسی نیت یعنی اعمال کی غرض و غایت ہی کی بنیاد کو کھوکھلی کر دیتی ہے، جس سے ساری عمارت ہی بودی اور کمزور ہو جاتی ہے، نمائش کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی اچھائی و بڑائی کا اظہار کر کے لوگوں میں اپنی نسبت حسن ظن پیدا کرے اور اپنے کو بڑا کر کے دکھائے، غرور بھی اسی شوق کا جذبہ ہے دونوں کو ایک ساتھ جگہ دی ہے اور ان کی برائی بیان کی ہے، جہاد میں مسلمانوں کو حکم ہوا کہ محض اپنی طاقت کا غرور اور اپنی قوت کی نمائش تمہاری لڑائی کا مقصد نہ ہو، بلکہ حق کی حمایت اور اللہ کی بات کو اونچا کرنا تمہارا مقصد ہو، فرمایا:

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّ رِئَآءَ النَّاسِ﴾ (انفال:۴۷)

''اور ان (کافروں) جیسے نہ بنو، جو مارے شیخی کے اور لوگوں کے دکھانے کے لیے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔''

یہ ریا اور نمائش انسان کے ہر اس عمل میں ظاہر ہوتی ہے جو خالصتاً لوجہ اللہ نہ کیا جائے بلکہ اس سے کوئی اور دنیوی غرض مطلوب ہو، اسی بنا پر اسلام نے ریا کا نام شرکِ خفی اور شرکِ اصغر رکھا ہے کیونکہ دنیوی غرض کی آمیزش سے ان اعمال میں خدا کے ساتھ ایک اور چیز کو شریک کر لیا جاتا ہے، اسی لیے خدا فرماتا ہے:

﴿اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ﴾ (فرقان:۴۳)

''کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنا لیا ہے۔''

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں شرک سے بے نیاز ہوں تو جو شخص میرے لیے کوئی ایسا عمل کرے جس میں کسی اور کو بھی شریک کرے تو مجھ کو اس سے کوئی تعلق نہیں، وہ اسی کے لیے ہے جس کو اس میں شریک کر لیا گیا ہے۔''

ایک صحابیؓ روایت کرتے ہیں کہ قیامت کے دن جب خدا اگلوں اور پچھلوں کو جمع کرے گا تو ایک منادی

پکار دے گا کہ جس شخص نے اپنے اس عمل میں جو خدا کے لیے کیا گیا ہے کسی اور کو شریک کر لیا ہے وہ اس کا ثواب اسی سے طلب کرے کیونکہ اللہ شرک سے بے نیاز ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ کو اپنی امت کی نسبت شرک کا سب سے زیادہ خوف ہے لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ وہ چاند سورج اور بتوں کی پرستش کرنے لگے گی بلکہ خدا کے علاوہ اور لوگوں کے لیے یا کسی مخفی خواہش سے عمل کرے گی۔ (۱)

اسلام کے لغت میں کفر کے بعد برائی میں نفاق کا درجہ ہے نفاق کیا ہے؟ یہ ہے کہ دل میں کچھ ہو اور زبان سے کچھ کہا جائے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نفاق والے کے ایمان اور عملِ خیر کی حقیقت ریا اور نمائش کے سوا کچھ نہیں رہ جاتی ہے وہ دل سے تو خدا کا منکر ہوتا ہے لیکن خوف و خطر یا دوسرے دنیوی فائدوں کے لیے ظاہری طور پر مذہبی اعمال بجالاتا ہے اس لیے قدرتی طور پر ان اعمال میں ریاکاری پائی جاتی ہے اس بنا پر قرآن مجید میں جابجا اس حیثیت سے منافقین کی برائی بیان کی گئی ہے۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِیْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ (بقرہ: ۲۶۴)

”مسلمانو! اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور (سائل کو) طعن دے کر اس شخص کی طرح اکارت مت کرو جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روزِ آخرت کا یقین نہیں رکھتا۔“

منافقوں کے ریاکارانہ اعمال کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ ان کا مقصد ایک جماعت میں شامل رہنے کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا دوسرے یہ کہ ان کے ذریعہ سے لوگوں پر اثر ڈالنا اور ان کو اپنی طرف مائل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ پہلا مقصد چونکہ اعمال کے سرسری طور پر ادا کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے اس لیے وہ نہایت بے پروائی غفلت اور کاہلی کے ساتھ ادا کیے جاتے ہیں اس کے برعکس دوسرے مقصد کے حاصل کرنے کے لیے مصنوعی خشوع و خضوع، للّٰہیت اور محویت و استغراق کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔

عہدِ رسالت میں منافقین کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ وہ ظاہری طور پر مسلمانوں کی جماعت میں شامل رہیں اس لیے وہ اسلام کی روزانہ عبادت یعنی نماز کو سرسری طور پر نہایت بے پروائی کے ساتھ ادا کرتے تھے تا کہ لوگ اس ظاہری نمائش سے ان کو مسلمان سمجھتے رہے ہیں اسی لیے ایسے شخص کے عمل میں للّٰہیت اور خلوص نہیں پیدا ہو سکتا۔

﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ (نساء: ۱۴۲)

”منافق (مسلمانوں کو دھوکا دے کر گویا) خدا کو دھوکا دیتے ہیں حالانکہ (حقیقت میں) خدا ان ہی کو

(۱) سنن ابن ماجہ باب الریاء والسمعۃ۔

دھوکے میں رکھے ہے اور (یہ لوگ) جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو الکساتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں۔ (ظاہر داری کر کے) لوگوں کو دکھاتے ہیں اور (دل سے) اللہ کو یاد نہیں کرتے، مگر کچھ یوں ہی سا۔"

﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُ وْنَ ۝﴾ (ماعون:۴-۶)

"تو ان (منافق) نمازیوں کی (بڑی) تباہی ہے جو اپنی نماز کی طرف سے غفلت کرتے ہیں اور وہ جو (کوئی نیک عمل کرتے بھی ہیں تو) ریا کرتے ہیں۔"

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ ایک بار صحابہؓ مسیح دجال کا ذکر کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ آ نکلے اور فرمایا "کیا میں تم کو وہ چیز بتاؤں جو میرے نزدیک تمہارے لیے مسیح دجال سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔" صحابہؓ نے کہا "ہاں" فرمایا "شرکِ خفی"، اور یہ کہ آدمی نماز کے لیے کھڑا ہو اور اس کو زیب و زینت کے ساتھ ادا کرے اس لیے کہ وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ اس کو دوسرا شخص دیکھتا ہے۔ (۱)

چونکہ ریا اور نمائش اعمال کی اصل شکل وصورت ہی کو بگاڑنا چاہتی ہے، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے اس کے ایک ایک ریشہ کی بیخ کنی ضروری سمجھی، اور اپنی امت کو اس کی ہر گھات سے آگاہ فرمایا، چنانچہ انسان کی عام فطرت اور عرب کی مخصوص اخلاقی حالت کے لحاظ سے ریا کاری کی جو صورتیں پیدا ہو سکتی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سب کی ممانعت فرمائی، مثلاً ان میں پہلی چیز تو داد و دہش ہے، جو عام طور پر نیک نامی، شہرت اور عزت کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔ بالخصوص عرب کے فضائلِ اخلاق میں نہایت نمایاں حیثیت رکھتی تھی، اور لوگ محض نام و نمود کے لیے اپنا کل سرمایہ لٹا دیتے تھے۔ اسلام نے صدقہ و خیرات کا حکم دیا تو اس بد اخلاقی کے ظاہر ہونے کا بھی خطرہ پیدا ہوا، اس لیے قرآن و حدیث میں باقاعدہ زکوٰۃ کو چھوڑ کر عام صدقہ و خیرات مخفی طور پر کرنے کی فضیلت بیان کی گئی، تا کہ اس میں ریا کاری کی آمیزش نہ ہونے پائے۔

﴿اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَ اِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ (بقرہ: ۲۷۱)

"لوگو! اگر خیرات ظاہر میں دو تو وہ بھی اچھا (کہ اس سے خیرات کے علاوہ دوسروں کو بھی ترغیب ہوتی ہے) اور اگر اس کو چھپاؤ اور حاجت مندوں کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے (کہ اس میں نام و نمود کا دخل نہیں ہونے پاتا۔)

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن جب کہ خدا کے سایہ کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہوگا، خدا سات آدمیوں کو اپنے سایہ میں لے گا جس میں ایک شخص وہ ہوگا جس نے صدقہ اس طرح چھپا کر دیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو یہ

(۱) ابن ماجہ باب الریاء والسمعۃ۔

نہ معلوم ہوسکا کہ اس نے داہنے ہاتھ سے کیا دیا۔ (۱) عرب کے محاسنِ اخلاق میں سب سے زیادہ نام ونمود کی جو چیز تھی وہ شجاعت تھی' اور اسلام نے جہاد کو فرض کر کے مسلمانوں کے لیے اظہارِ شجاعت کا بہترین موقع دیا تھا' اس کے علاوہ جہاد کے ذریعہ سے اور بھی بہت سے ذاتی اور دنیوی فوائد حاصل ہو سکتے تھے اس لیے وہ ریاکاری کی نمائش گاہ بن سکتا تھا۔ لیکن اسلام نے جہاد کو ان تمام اغراض سے پاک کر کے مسلمانوں کو اس کی اصلی حقیقت بتائی' چنانچہ ایک بدو نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ ایک شخص مالِ غنیمت کے لیے' ایک شخص شہرت کے لیے اور ایک شخص اظہار شجاعت کے لیے لڑتا ہے تو ان میں کس کا جہاد خدا کی راہ میں ہے فرمایا ''اس شخص کا جو اس لیے لڑتا ہے کہ خدا کا کلمہ بلند ہو۔''

آپؐ سے سوال کیا جاتا ہے کہ ایک شخص اظہارِ شجاعت کے لیے لڑتا ہے' ایک شخص قومی حمیت سے اور ایک شخص ریا سے جہاد کرتا ہے تو کس کا جہاد خدا کی راہ میں ہے وہی پہلا جواب ملا۔ (۲) ریاکاری کا ایک بڑا مظہر علمی فضیلت ہے' اور یہ فضیلت خاص طور پر اسلام نے پیدا کی تھی' اس لیے اس میں ریاکاری کی جو آمیزش ہوسکتی تھی اس کے نتائجِ بد رسول اللہ ﷺ نے نہایت مؤثر طریقہ سے بتائے۔ ایک حدیث میں ہے کہ سب سے پہلے قیامت کے دن اس شخص کے خلاف فیصلہ کیا جائے گا جس نے شہادت حاصل کی یہ شخص خدا کے سامنے لایا جائے گا اور خدا اس پر اپنے احسانات جتا کر پوچھے گا کہ تم نے ان سے کیا کام لیا؟ وہ کہے گا کہ میں تیری راہ میں لڑا اور شہید ہوا۔ خدا کہے گا کہ جھوٹ کہتے ہو' تم صرف اس لیے لڑے کہ تم کو بہادر کہا جائے۔ اس کے بعد اس کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ پھر وہ شخص لایا جائے گا جس نے علم حاصل کیا لوگوں کو علم سکھایا اور قرآن پڑھا' اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائے گا اور اور وہ جواب میں کہے گا کہ میں نے علم سیکھا علم سکھایا اور تیرے لیے قرآن پڑھا۔ ارشاد ہوگا کہ جھوٹ کہتے ہو' تم نے علم اس لیے حاصل کیا کہ عالم کہے جاؤ قرآن اس لیے پڑھا کہ قاری کہے جاؤ۔ پھر اسی طرح گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا اس کے بعد ایک دولت مند شخص لایا جائے گا اور اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائے گا وہ کہے گا کہ مال خرچ کرنے کے جو طریقے تجھ کو پسند تھے میں نے سب میں اپنا مال صرف کیا۔ ارشاد ہوگا کہ جھوٹ بکتے ہو تم نے یہ سب صرف اس لیے کیا کہ لوگ تم کو فیاض کہیں پھر اسی طرح اس کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ (۳)

خود بینی اور خود نمائی

خود بینی' خود نمائی اور خود رائی اپنے نفس سے غیر معمولی محبت کا نتیجہ ہے' اس میں اور کبر میں یہ فرق ہے کہ کبر

(۱) بخاری کتاب الزکوۃ باب الصدقۃ بالیمین۔

(۲) مسلم کتاب الامارۃ باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ہی العلیا فھو فی سبیل اللہ۔

(۳) مسلم کتاب الامارۃ۔

ایک اضافی چیز ہے' یعنی متکبر آدمی اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھتا ہے لیکن خود بینی کے لیے تنہا انسان کی ذات کافی ہے یہاں تک کہ اگر ایک انسان تنہا پیدا ہو تب بھی وہ اپنے اوصافِ کمالیہ پر غلط ناز کرسکتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان کو اپنے اندر جو کمالات اور خوبیاں نظر آتی ہیں وہ ان پر کبھی ایسا فریفتہ ہو جاتا ہے کہ اپنے سوا ہر چیز اس کو پست اور حقیر معلوم ہوتی ہے اور یہ تمام کمالات اور خوبیاں اس کو ایسی معلوم ہوتی ہیں گویا وہ خود اس کی اختیاری ہیں' اور اسی کی اپنی پیدا کی ہوئی ہیں اسی کا نام عُجب اور خود بینی ہے اسی سے نفس میں خودنمائی اور خود رائی پیدا ہوتی ہے' اور اکثر حالتوں میں وہ کبر وغرور کا سبب بن جاتی ہے۔

حنین کی لڑائی میں مسلمانوں کی تعداد کافروں سے زیادہ تھی یہ دیکھ کر مسلمانوں میں عُجب پیدا ہوا کہ اب کون ہمارا مقابلہ کرسکتا ہے خدا کو ان کی یہ شان پسند نہ آئی فوراً شکست کا اثر دکھائی دینے لگا۔ اب مسلمانوں کا یہ عُجب دور ہوا' تب نصرتِ الٰہی نے ان کے پاؤں تھام لیے اور شکست فتح سے بدل گئی' خدا نے فرمایا:

﴿وَ يَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا﴾ (توبہ:۳۵)

''اور حنین کے دن جب تمہاری کثرت تعداد نے تم میں خود بینی پیدا کردی' تو اس تعداد کی کثرت نے کچھ کام نہ دیا۔''

اسی لیے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ جب وہ جہاد کو نکلیں تو ان میں جھوٹا غرور اور خود بینی اور نمائش نہ پیدا ہو' بلکہ ان میں سے ہر ایک اخلاص اور ایثار کا پیکر ہو۔

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّ رِئَآءَ النَّاسِ﴾ (انفال:۴۷)

''اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو دکھاتے نکلے۔''

یہ قریش کا نقشہ ہے جو بدر کے موقع پر صرف اپنی طاقت کے اظہار اور قوت کی نمائش کو نکلے تھے۔

جب کسی قوم میں تمدن کی وسعت' دولت کی بہتات اور خوش حالی عام ہو جاتی ہے تو افراد میں خودغرضی اور خود بینی کا مرض عام ہو جاتا ہے۔ نہ اللہ کا فرض یاد رہتا ہے اور نہ بندوں کا حق' ہر شخص اپنی ہی دولت کے گھمنڈ میں رہتا ہے اور یہی ان کی تباہی کا وقت ہوتا ہے' فرمایا:

﴿وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا﴾ (قصص:۵۸)

''اور کتنی بستیاں ہم نے برباد کردیں جب وہ اپنے گزران میں اترا کر چلیں۔''

یہ تو چند بستیوں کی تباہی کا حال تھا' لیکن ایک وقت آئے گا کہ جب ساری دنیا ایک ساتھ برباد ہو جائے گی' یعنی قیامت آئے گی تو اس بربادی کے دن کی جو نشانیاں آنحضرت ﷺ نے بتائی ہیں' ان میں ایک یہ بھی ہے کہ جب ہر شخص کو اپنی ہی رائے بھلی معلوم ہوگی' اور اسی پر ناز کرے گا اور اترائے گا اور یہی وہ موقع ہے جس میں ہر شخص کو اپنی فکر کرنی چاہیے۔[1]

(۱) ابوداؤد کتاب الملاحم۔

مذہبی حیثیت سے جن لوگوں کی ظاہر حالت اچھی ہوتی ہے ان کو اسی عُجب وخود بینی کی بنا پر اپنی پرہیز گاری کا بڑا دعویٰ ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی تعلّی کی ممانعت فرمائی ہے۔

﴿فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى﴾ (نجم:۳۲)

''تم (بہت) اپنی پاکیزگی نہ (جتایا) کرو پرہیز گاروں کو وہی خوب جانتا ہے۔''

قدیم مذہبی اور علمی شرف نے یہود ونصاریٰ میں عُجب وخود بینی کا اس قدر مادہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو خدا کا محبوب اور فرزند سمجھنے لگے تھے۔

﴿وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ وَ النَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ﴾ (مائدہ:۱۸)

''اور یہودی ونصاریٰ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔''

﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ﴾ (جمعہ:۶)

(''اے پیغمبر! ان یہودیوں سے) کہو کہ اے یہود اگر تم کو اس بات کا گھمنڈ ہے کہ تمام آدمیوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے چہیتے ہو۔''

ان تمام آیتوں میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عجب وخود بینی ایک فریب کا نام ہے اور جب اس فریب کا پردہ چاک ہو جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت جلوۂ سراب سے زیادہ نہ تھی' لیکن معاشرتی اور سیاسی حیثیت سے تو یہ پردہ دنیا ہی میں چاک ہو جاتا ہے' مگر مذہبی حیثیت سے آخر میں چاک ہوگا۔

اس عیب کا مادہ جن ذرائع سے پیدا ہوتا ہے' اسلام نے ان کا پورا انسداد کیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایک شخص کسی کی مبالغہ آمیز طریقہ پر تعریف کر رہا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا کہ تم نے اس کو ہلاک کر دیا۔'' ایک بار آپ ؐ کے سامنے کسی کا ذکر آیا تو ایک شخص نے اس کی تعریف کی' آپ ؐ نے فرمایا کہ ''تم نے اس کی گردن کاٹ لی' اگر کسی کی تعریف ہی کرنا ہے تو یہ کہو کہ میں اس کو ایسا سمجھتا ہوں۔'' (۱) مدح کی یہ ممانعت اس لیے کی گئی ہے کہ اس سے ممدوح میں عُجب وخود بینی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

لیکن اس بیماری کا سب سے بہتر علاج یہ ہے کہ کوئی اپنی کسی خوبی کو اپنی کوشش کا نتیجہ نہ سمجھے بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اور عطیہ سمجھے' اسی لیے بار بار اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے ذکر میں بندوں کے سامنے اس پہلو کو نمایاں کیا ہے فرمایا:

﴿لَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ﴾ (حدید:۲۳)

''خدا نے جو دیا ہے اس پر اتراؤ نہیں۔''

---

(۱) بخاری کتاب الادب باب ما یکرہ من التمادح۔

فضول خرچی

فضول خرچی یہ ہے کہ انسان اپنی حیثیت اور موقع کی ضرورت سے زیادہ خرچ کرلے' چونکہ اسلام عرب میں آیا' اور عربوں کی فیاضی فضول خرچی کی حد تک تھی' اس لیے تمام مذہبوں میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب جس نے فضول خرچی کو روکا ہے اور انسان کو اپنی حد میں رہ کر خرچ کرنے کا حکم دیا ہے کیونکہ فضول خرچی کی عادت سے قومی سرمایہ بہت بری طرح برباد ہوکر فنا ہوجاتا ہے' اور اس بے موقع خرچ سے جماعت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا' نیز فضول خرچی عموماً فخر وغرور اور نمائش کے پردہ میں ظاہر ہوتی ہے' اور ان بداخلاقیوں کی برائی چھپی نہیں۔

اہل عرب جب جلسوں میں شراب پیتے اور جوا کھیلتے تو جوا میں جو کچھ جیتتے' نشہ کے ترنگ میں اسی وقت لٹا دیتے' جانور ملتے تو اسی وقت بے وجہ ذبح کرڈالتے' جاہلیت کی شاعری میں اس قسم کے فخریہ اشعار بکثرت ہیں۔ شہرت طلبی کی ایک صورت یہ تھی کہ دو شخص فیاضی کے اظہار کے لیے اونٹ پر اونٹ ذبح کرتے جاتے تھے' یہاں تک کہ دونوں میں ایک کے تمام اونٹ ختم ہوجاتے تھے تو وہ اپنے حریف کے مقابل میں مغلوب سمجھا جاتا تھا۔ اس کو معاقرہ کہتے تھے آنحضرت ﷺ نے اس ریائی فیاضی کو روک دیا۔ (۱)

اہل عرب کی فیاضی کی بنیاد اکثر فخر وغرور اور نام ونمود پر قائم تھی' اور اس نے ان کی فیاضی میں بے اعتدالی پیدا کردی تھی' اس کا دینی نتیجہ یہ تھا کہ خلوص کے نہ ہونے سے وہ خدا کے نزدیک مقبول نہ تھی' اور دنیوی حیثیت سے بعض اوقات وہ تمام مال و دولت کو اڑا کر خود مفلس اور قلاش ہوجاتے تھے۔ پھر اس قسم کی فیاضی کے لیے جائز مال کافی نہیں ہوتا تھا۔ تو وہ لوگ لوٹ مار سے مال جمع کرتے تھے' اور نمائش کے موقعوں پر اسی مال کو خرچ کرتے تھے اس بے اعتدالی کے دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حقوق مقرر فرمائے اور فضول خرچ کو شیطان کے بھائی کا لقب دیا۔

﴿وَ اٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِیْنَ وَ ابْنَ السَّبِیْلِ وَ لَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا ○ اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ وَ كَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا﴾ (اسرائیل: ۲۶۔۲۷)

''اور رشتہ دار اور غریب اور مسافر (ہر ایک) کو اس کا حق پہنچاتے رہو اور (دولت کو) بیجا مت اڑاؤ (کیونکہ دولت کے) بیجا اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں' اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔''

آیت کے آخیر ٹکڑے سے ثابت ہے کہ فضول خرچی خدا کی ناشکری ہے' امام رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں' ''بعض علما کا قول ہے کہ اس آیت کا مفہوم اہل عرب کی عادت کے موافق ہے کیونکہ وہ لوگ لوٹ مار سے مال جمع کرتے تھے' پھر اس کو فخر وغرور کے حاصل کرنے کے لیے صرف کرتے تھے۔''

(۱) ابوداؤد۔

آج بھی جو لوگ شادی بیاہ اور خوشی و غم کی تقریبوں میں اس قسم کی فضول خرچیوں کے مرتکب ہوتے ہیں وہ قرآن کی اصطلاح میں شیطان کے بھائی کہلائیں گے۔ یہ تعلیم فیاضی کے خلاف نہیں ہے کیونکہ فیاضی بخل و اسراف کے درمیان کا نام ہے اور اسی کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا' اور بتا دیا ہے کہ فضول خرچی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم مفلس اور تہی دست ہو کر کسی کام کے نہیں رہو گے' بلکہ الٹے تمہیں کو لوگ قابلِ ملامت ٹھہرائیں گے۔

﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا﴾ (بنی اسرائیل:۲۹)

''اور اپنا ہاتھ نہ تو اتنا سکیڑو کہ (گویا) گردن میں بندھا ہے اور نہ بالکل اس کو پھیلا ہی دو۔ (ایسا کرو گے) تو تم ایسے بیٹھے رہ جاؤ گے کہ لوگ تم کو ملامت بھی کریں گے (اور) تم تہی دست بھی ہو گے۔''

چونکہ یہ اعتدال کا وصف خاص اسلام کی اخلاقی تعلیم نے پیدا کیا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو مسلمانوں کا امتیازی وصف قرار دیا اور فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَ لَمْ يَقْتُرُوْا وَ كَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا﴾ (الفرقان:۶۷)

''اور خرچ کرنے لگیں تو فضول خرچی نہ کریں اور نہ بہت تنگی کریں بلکہ ان کا خرچ افراط اور تفریط کے درمیان بیچ کا ہو۔''

، کوئی اس تعلیم کا یہ نتیجہ نہ سمجھے کہ اسلام بدحیثیتی کو پسند کرتا ہے اور کھانے پینے' پہننے اوڑھنے میں ہر قسم کی کفایت شعاری کا حوصلہ بڑھاتا ہے' بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر شخص کو اپنی چادر کے اندر رہنا چاہیے اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ نہیں کرنا چاہیے۔ مطلب ہے کہ ہر شخص کی فضول خرچی کا معیار خود اس کی اپنی ذات ہے۔ سورہ اعراف میں خدا فرماتا ہے:

﴿وَ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ﴾ (اعراف:۳۱)

''اور کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی نہ کرو' بے شک اللہ فضول خرچی کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔''

صدقات اور مبرات سے بڑھ کر تو کوئی نیکی کا کام نہیں' مگر اس میں بھی بعض مفسروں کے قول کے مطابق اپنی حیثیت سے بڑھ کر دینا پسندیدہ نہیں۔

﴿كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ﴾ (انعام:۱۴۱)

''درخت کے پھل سے جب وہ پھلے تم کھاؤ' اور اس کا حق ادا کرو جب فصل کٹے اور حد سے آگے نہ بڑھو اللہ حد سے آگے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

حسد

اگر ایک شخص پر اللہ تعالیٰ اپنا کوئی احسان کرے، مثلاً اس کو علم وفضل مال ودولت، عزت وشہرت یا اور کوئی دینی یا دنیوی نعمت عطا فرمائے، تو ان چیزوں کو دیکھ کر اگر کسی دوسرے شخص کے دل میں ان کے حاصل کرنے کی خواہش ہو تو اس کو رشک ومنافست کہتے ہیں اور یہ کوئی بداخلاقی نہیں بلکہ دینی امور میں پسندیدہ ہے، لیکن اگر وہ ان چیزوں کو دوسرے کے لیے پسند نہ کرے اور اس کی یہ خواہش ہو کہ خدا کی یہ نعمتیں اس سے چھین لی جائیں، تو اسی کا نام حسد ہے اور قرآن مجید سے بھی یہی تعریف مستنبط ہوتی ہے۔ کیونکہ عہد رسالت میں خدا تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنا خاص احسان کیا تھا کہ ان کو قرآن وایمان کی دولت عطا فرمائی تھی جس کو دیکھ کر مسلمانوں کے حاسد یعنی یہودی جلے مرتے تھے۔

﴿اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (النساء:۵۴)

''یا خدا نے جو اپنے فضل سے لوگوں کو نعمت (قرآن) عطا فرمائی ہے، اس پر جلے مرتے ہیں۔''

اور ان کی خواہش تھی کہ یہ دولت مسلمانوں سے چھین لی جائے۔

﴿وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ﴾ (بقرہ:۱۰۹)

''(مسلمانو!) اکثر اہل کتاب اپنے دلی حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر تم کو کافر بنا دیں۔''

حسد کی تین قسمیں اور درجے ہیں۔

(۱) یہ کہ ایک شخص کی صرف یہ خواہش ہو کہ دوسرے سے ایک نعمت سلب کر لی جائے گو وہ اس کو نہ حاصل ہو سکے یا وہ اس کو خود حاصل نہ کرنا چاہے حسد کی مذموم ترین قسم یہی ہے اور اسی بنا پر منافقین کی خواہش یہ تھی کہ مسلمان بھی ان ہی کی طرح کافر ہو جائیں:

﴿وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً﴾ (نساء:۸۹)

''ان منافقوں کی خواہش یہ ہے کہ جس طرح خود کافر ہو گئے ہیں، اسی طرح تم (سچے مسلمان) بھی کفر کرنے لگو (اور وہ) اور تم (سب) ایک ہی طرح کے ہو جاؤ۔''

(۲) دوسرے یہ کہ اس کی خواہش یہ ہو کہ وہ نعمت اس کو حاصل ہو جائے، اس صورت میں اس کا مقصود بالذات تو صرف اس نعمت کا حاصل کرنا ہوتا ہے، لیکن چونکہ بعض اوقات جب تک وہ نعمت دوسرے سے چھین نہ لی جائے۔ اس کو مل نہیں سکتی اس لیے بالفرض اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسرے سے سلب کر لی جائے۔

(۳) تیسرے یہ کہ ایک شخص خود اسی قسم کی نعمت حاصل کرنا چاہے، لیکن اس کی یہ خواہش نہ ہو کہ وہ دوسرے

سے سلب کر لی جائے۔

ان میں پہلی صورت حسد کی مذموم ترین قسم ہے، دوسری صورت میں چونکہ زوالِ نعمت بالذات مقصود نہیں ہوتا۔ اس لیے اس کو حقیقی معنوں میں حسد تو نہیں کہہ سکتے تاہم قرآن مجید میں ہے:

﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (نساء:۳۲)

''اور خدا نے جو تم میں سے ایک کو دوسرے پر برتری دے رکھی ہے اس کا کچھ ارمان نہ کرو''۔

اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو نعمت کسی کو حاصل ہو بعینہٖ اس کی خواہش کرنا پسندیدہ نہیں ہے، اس لیے یہ بھی مذموم ہے، البتہ اس کے مثل دوسری نعمت کی خواہش کرنا مذموم نہیں۔ اسی لیے فرمایا۔

﴿وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (نساء:۳۲)

''اور خدا سے اس کا فضل مانگو''

تیسری صورت بالکل مذموم نہیں بلکہ دینی امور میں مستحسن ہے، اور شریعت میں اسی کو مسابقت کہتے ہیں۔

حسد کے سات اسباب ہیں۔

(۱) بغض وعداوت، کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کے نزدیک دشمن کی برائی اور بھلائی دونوں یکساں ہوں اس لیے ایک دشمن کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے دشمن پر مصیبت آئے، اور جب یہ مصیبت آتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے اس کے بجائے جب خدا اس پر کوئی احسان کرتا ہے تو وہ اس کو پسند نہیں کرتا اور اسی کا نام حسد ہے۔

کفار اور منافقین کو مسلمانوں کے ساتھ جو عداوت تھی وہ اسی حسد آمیز طریقہ سے ظاہر ہوتی ہے۔

﴿وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَ مَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ﴾ (آل عمران:۱۱۸)

''چاہتے ہیں کہ تم کو تکلیف پہنچے دشمنی تو ان کی باتوں سے ظاہر ہو ہی چکی ہے اور (غیظ وغضب) جو ان کے دلوں میں (بھرے) ہیں وہ (اس سے بھی) بڑھ کر ہیں۔''

﴿اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَ اِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا﴾ (آل عمران:۱۲۰)

''مسلمانو! اگر تمہیں کوئی فائدہ پہنچے تو ان کو برا لگتا ہے اور اگر تم کو کوئی گزند پہنچے تو اس سے خوش ہوتے ہیں۔''

بغض وعداوت کی وجہ سے جو حسد پیدا ہوتا ہے اس کے لیے مساوات شرط نہیں بلکہ ایک ادنیٰ آدمی بھی بڑے سے بڑے شخص کا بدخواہ ہو سکتا ہے۔

(۲) حسد کا دوسرا سبب ذاتی فخر کا غلط خیال ہے، کیونکہ امثال واقران میں جب ایک شخص کسی بلند منصب پر پہنچ جاتا ہے تو یہ اس کے دوسرے ہم چشموں کو گراں گذرتا، اور وہ اس کے اس ترفع کو پسند نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ یہ منصب اس سے چھن جائے تا کہ وہ ان کے مساوی ہو جائے۔

(۳) حسد کا تیسرا سبب یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کو اپنا مطیع و منقاد بنانا چاہتا ہے اس لیے جب وہ کسی شرف و امتیاز کی وجہ سے اس کے حلقۂ اطاعت سے نکل جاتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اس کا یہ شرف جاتا رہے تاکہ وہ اس کا مطیع و منقاد ہو سکے۔ کفار قریش اسی بنا پر مسلمانوں کی حقیر جماعت کو دیکھ کر کہتے تھے۔

﴿اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا﴾ (انعام:۵۳)

”کیا یہی (ذلیل) لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہم میں (اسلام کی توفیق دے کر) اپنا فضل کیا ہے۔“

حسد کا یہ سبب اکابر و اشراف سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے لیے کبر و غرور اور دوسروں کی تحقیر و تذلیل لازمی ہے۔

(۴) حسد کا چوتھا سبب یہ ہے کہ لوگ اپنے پندار میں جس کو معمولی آدمی سمجھتے ہیں اس کو کوئی غیر معمولی شرف حاصل ہو جاتا ہے تو ان کو تعجب ہوتا ہے اور اسی تعجب کی بنا پر وہ اس کے اس شرف کا انکار کرتے ہیں۔ کفار اسی وجہ سے پیغمبروں کی رسالت کا انکار کرتے تھے اور تعجب سے کہتے تھے۔

﴿اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا﴾ (بنی اسرائیل:۹۴)

”کیا خدا نے آدمی (کو) پیغمبر (بنا کر) بھیجا ہے۔“

(۵) حسد کا پانچواں سبب یہ ہے کہ جب دو شخصوں کا مقصد ایک ہوتا ہے تو دونوں باہم ایک دوسرے کو رشک و حسد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان میں جب ایک کو اس مقصد میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو دوسرا قدرتی طور پر اس کا بدخواہ ہو جاتا ہے ایک شوہر کی متعدد بیویوں اور ایک باپ کے متعدد بیٹوں میں جو رشک و حسد ہوتا ہے اس کی وجہ یہی ہوتی ہے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کے قتل کرنے کی جو سازش کی تھی اس کا سبب یہی تھا۔

﴿اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ﴾ (یوسف:۸)

”جب یوسف کے (بے مات) بھائیوں نے (آپس میں) کہا کہ باوجودیکہ ہم (حقیقی) بھائیوں کی بڑی جماعت ہے۔ تاہم یوسف اور اس کا (حقیقی بھائی (بن یامین) ہمارے والد کو ہم سے البتہ بہت ہی زیادہ عزیز ہیں۔“

(۶) حسد کا چھٹا سبب جاہ پرستی اور ریاست طلبی ہے اس لیے جو لوگ اس حیثیت سے یگانۂ روزگار ہونا چاہتے ہیں جب ان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اور شخص اس میں ان کا شریک و سہیم ہو گیا ہے تو یہ ان کو سخت گراں گزرتا ہے اور ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جس شرف و امتیاز سے دوسرا شخص جاہ و منزلت میں ان کا شریک ہو گیا ہے وہ اس سے چھن جائے۔

مسلمانوں کے ساتھ یہود اسی لیے حسد رکھتے تھے کہ اسلام سے پہلے ان کو علمی اور مذہبی حیثیت سے اہل عرب پر تفوق حاصل تھا لیکن اسلام کی وجہ سے ان کا یہ تفوق جاتا رہا اس لیے وہ اسلام ہی کی بیخ کنی پر آمادہ ہو

گئے۔ منافقین میں عبداللہ بن ابی کو اہل مدینہ اپنا بادشاہ بنانا چاہتے تھے' لیکن اسلام نے اس کی اس شاہانہ ریاست کا خاتمہ کر دیا۔ اس لیے اس کو یہ سخت ناگوار ہوا اور اسی ناگواری کی وجہ سے ایک مجمع میں وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گستاخانہ پیش آیا۔ (۱)

(۷) حسد کا ساتواں سبب خبثِ نفس اور بدنیتی ہے کیونکہ بعض اشخاص کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے کہ جب کسی کو بہتر حالت میں دیکھتے ہیں تو ان کو ناگوار ہوتا ہے' اور جب کسی پر مصیبت آتی ہے تو ان کو مسرت ہوتی ہے' اس صورت میں حسد کے پیدا ہونے کے لیے اشتراک' رابطہ یا کسی اور خواہش کی ضرورت نہیں ہوتی' بلکہ اس قسم کے خبیث النفس لوگ ہر شخص پر حسد کرتے ہیں۔

حسد کے یہ اسباب زیادہ تر ان لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں' جن میں کوئی چیز مابہ الاشتراک ہوتی ہے' اس لیے بیگانوں میں یہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ صرف ان لوگوں میں پیدا ہوتا ہے' جن میں باہم ربط و اشتراک ہوتا ہے۔

ایک عالم دوسرے عالم پر' ایک عابد دوسرے عابد پر اس لیے حسد کرتا ہے کہ ان میں ایک چیز یعنی علم و عبادت مشترک ہے' اس کے بخلاف ایک عالم یا عابد کو کسی تاجر پر حسد نہیں ہوتا کیونکہ ان میں کوئی چیز مابہ الاشتراک نہیں۔

اسلام نے مسلمانوں میں باہم اخوت کا رشتہ قائم کر کے نہایت وسیع اور عالمگیر اشتراک پیدا کر دیا تھا اس لیے ان میں حسد کا جذبہ نہایت آسانی کے ساتھ پیدا ہو سکتا تھا اور حسد کے جس قدر اسباب و مراتب ہیں وہ سب کے سب اس وسیع برادری میں جمع ہو سکتے تھے اس لیے اصولاً جو بداخلاقیاں اس اخوت کا شیرازہ برہم کر سکتی تھیں رسول اللہ ﷺ نے ان سب سے مسلمانوں کو بچنے کی ہدایت کی اور فرمایا:

((اِیَّاکُمْ وَ الظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَکْذِبُ الْحَدِیْثِ وَ لَا تَحَسَّسُوْا وَلَا تَجَسَّسُوْا وَ لَا تَحَاسَدُوْا وَ لَا تَدَابَرُوْا وَ لَا تَبَاغَضُوْا وَ کُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا))

'بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے نہ لوگوں کے عیوب کی ٹوہ لگاؤ نہ باہم حسد کرو' نہ ایک دوسرے سے بے تعلق رہو نہ باہم بغض رکھو' بلکہ اے خدا کے بندو! بھائی بھائی ہو جاؤ۔''

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کی شرح میں قرطبی کا یہ قول نقل کیا ہے۔

المعنی کونوا کاخوان النسب فی الشفقة و الرحمة و المحبة و المواساة و المعاونة و النصیحة۔

''اس کے معنی یہ ہیں کہ رحم و شفقت' غم خواری' محبت اعانت اور خیر خواہی میں نسبی بھائیوں کی طرح ہو جاؤ۔''

(۱) بخاری کتاب الاستیذان باب التسلیم فی مجلس فیہ اخلاط المسلمین والمشرکین۔

لیکن یہ اخوت اسی وقت قائم رہ سکتی ہے جب ان تمام بداخلاقیوں سے احتراز کیا جائے' ورنہ اس کے بجائے دشمنی پیدا ہو جائے گی' اور یہ اور اس قسم کے تمام محاسنِ اخلاق جو اخوت کا لازم نتیجہ ہیں' یا ان سے اخوت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے فنا ہو جائیں گے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

كَأَنَّهُ قَالَ اِذَا تَرَكْتُمْ هٰذِهِ الْمَنْهِيَاتَ كُنْتُمْ اِخْوَانًا مَفْهُوْمِهِ اِذْ لَمْ تَتْرُكُوْهَا تَصِيْرُوْا اَعْدَاءً وَ مَعْنَى كُوْنُوْا اِخْوَانًا اكْتَسِبُوا مَا تَصِيْرُوْنَ بِهِ اِخْوَانًا مِمَّا سَبَقَ ذِكْرُهٗ وَ غَيْرَ ذٰلِكَ مِنَ الْاُمُوْرِ الْمُقْتَضِيَةِ لِذٰلِكَ نَفْيًا وَ اِثْبَاتًا.

''گویا رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا کہ جب تم لوگ منہیات کو چھوڑ دو گے تو بھائی بھائی ہو جاؤ گے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب ان کو نہ چھوڑو گے تو دشمن ہو جاؤ گے اور بھائی بھائی بننے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اخلاقی خوبیاں حاصل کرو جن کی وجہ سے بھائی بھائی بن جاؤ' اور یہ اخلاقی خوبیاں وہ ہیں جن کا ذکر اوپر گزرا اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے امور ہیں جو اخوت کو نفیاً یا اثباتاً پیدا کرتے ہیں۔''

ان بداخلاقیوں میں سب سے زیادہ خطرناک چیز حسد ہے' کیونکہ وہ ایک ایسا جذبہ ہے جس سے بمشکل کوئی دل خالی ہو سکتا ہے' ایک حدیث میں ہے کہ کوئی شخص شگون' بدگمانی اور حسد سے خالی نہیں ہو سکتا کہا گیا کہ ان سے نکلنے کی کیا صورت ہے' فرمایا شگون کا خیال پیدا ہو تو جو کرنا چاہتے ہو اس کی وجہ سے اس کو مت چھوڑ دو' اور جب بدگمانی پیدا ہو تو مت اس کو سچ سمجھو' اور جب حسد پیدا ہو تو ظلم پر آمادہ نہ ہو جاؤ۔ (۱) لیکن عملی طور پر اس حسد کا اظہار ہوا تو اسلام کے تمام محاسنِ اخلاق کا خاتمہ ہو جائے گا اور یہ شرارہ خرمنِ اسلام کو پھونک کر خاک سیاہ کر دے گا۔ اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے خاص طور پر حسد سے بچنے کی ہدایت کی اور فرمایا:

((اِيَّاكُمْ وَ الْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ يَاْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَاْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ)) (۲)

''تم لوگ حسد سے بچو' کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی حیثیت سے حسد نہایت خطرناک چیز ہے' اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اور ہر مسلمان کو اس کے خطرہ سے پناہ مانگنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

﴿وَ مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ﴾ (الفلق : ۵)

''اور برا چاہنے والے کی بدی سے جب وہ حسد کرے۔''

---

(۱) مصنف عبدالرزاق بحوالہ فتح الباری ج ۱۰ ص ۴۰۳ مصر۔

(۲) ابوداؤد کتاب الادب فی الحسد۔

فحش گوئی

فحش گوئی کی مختلف قسمیں ہیں، ایک قسم تو قوتِ شہوانیہ سے تعلق رکھتی، اور اس کے مرتکب زیادہ تر رند، بیباک نوجوان اور بے تکلف دوست واحباب ہوتے ہیں، مثلاً جب اس قسم کی بے تکلفانہ اور رندانہ صحبتیں قائم ہوتی ہیں تو عورتوں کے حسن و جمال کا ذکر ہوتا ہے، اور اس سلسلہ میں اس قسم کے حالات و واقعات بیان کیے جاتے ہیں جو بعض اوقات شرم ناک حد تک پہنچ جاتے ہیں۔

عربی زبان میں اس قسم کی فحش گوئی کو رفث کہتے ہیں اور قرآن مجید کی اس آیت میں

﴿فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ﴾ (بقرہ: ۱۸۷)

''حج کے دنوں میں نہ شہوت کی کوئی بات کرنی چاہیے نہ گناہ کی اور نہ لڑائی کی۔''

اس کی ممانعت کی گئی ہے لیکن زمانۂ حج کی تخصیص اس لیے کی گئی ہے کہ اس زمانہ میں مردوں اور عورتوں کا عام اجتماع ہوتا ہے اور اس سفر میں پردے کی پوری پابندی مشکل ہوتی ہے اس لیے اس قسم کے چرچے نہایت آزادی کے ساتھ کیے جا سکتے ہیں، حالانکہ یہ زمانہ صرف ذکرِ الٰہی کا ہوتا ہے ورنہ حج کی کوئی تخصیص نہیں بلکہ اسلام میں عام طور پر اس قسم کی فحش گوئی ممنوع ہے، چنانچہ سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے عورتوں اور مردوں کے ایک مجمع میں خطبہ دیا[1] اور حمد و ثنا کے بعد مردوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ کیا تم میں کوئی ایسا آدمی ہے جو اپنی بی بی کے پاس جاتا ہے تو دروازہ بند کر لیتا ہے۔ اور اس پر پردہ ڈال دیتا ہے اور اس طرح خدا کے پردہ میں چھپ جاتا ہے؟ لوگوں نے کہا ہاں پھر فرمایا کہ اس کے بعد لوگوں کی صحبتوں میں بیٹھتا ہے تو کہتا ہے کہ میں نے یہ کیا، میں نے یہ کیا۔ اس پر سب لوگ خاموش ہو رہے، پھر عورتوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ ''کیا تم سب اس قسم کے واقعات بیان کرتی ہو؟ اس پر ایک عورت نے دوزانو بیٹھ کر کہا کہ ہاں مرد اور عورت دونوں اس قسم کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ فرمایا تم لوگ جانتے ہو کہ اس کی کیا مثال ہے؟ اس کی مثال اس چڑیل کی ہے جو گلی میں ایک شیطان سے ملی اور اس نے اس سے مباشرت کی، حالانکہ لوگ اس کو دیکھ رہے تھے۔[2]

مقصود یہ ہے کہ علانیہ کرنا اور کھول کر بیان کرنا دونوں کی بے شرمی کی صورت یکساں ہے۔ اس فحش گوئی کی ممانعت کا فلسفہ یہ ہے کہ حدودِ الٰہی کی حرمت کا تخیل ہر حال میں برقرار رہے، ورنہ جب باتیں زبانوں پر آئیں گی تو وہ اہمیت کھو دیں گی، اور قول عمل کے لیے ایک دن راستہ صاف کر دے گا۔ یہی سبب ہے کہ اس قسم کی باتوں کے بیان کے لیے جب ناگزیر ضرورتیں پیش آتی ہیں تو مجاز و استعارہ کی زبان میں ان کو ادا کیا جاتا ہے، تاکہ مدعا ظاہر ہو اور شرم کا پردہ بھی ڈھکا رہے، چنانچہ قرآن مجید میں اس قسم کے واقعات مجاز و استعارہ ہی کے پردہ میں بیان کیے

---

(۱) دونوں کی نشستیں الگ تھیں ''س''

(۲) ابوداؤد کتاب النکاح باب ما یکرہ من ذکر الرجل۔

گئے ہیں مثلاً۔

﴿وَ قَدۡ اَفۡضٰی بَعۡضُکُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ﴾ (نساء:۲۱)

’’حالانکہ تم ایک دوسرے تک پہنچ چکے (یعنی میاں بی بی ہم صحبت ہو چکے)‘‘ ﴿اَوۡ لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ﴾ (نساء) یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو (یعنی ان سے صحبت کی ہو)۔‘‘

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے کہ خدا شرمیلا اور شریف ہے اسی لیے اس نے جماع کو کنایۃً لمس (چھونے) کے لفظ سے بیان کیا ہے اسلام نے اس کے لیے اور جو الفاظ پیدا کیے ہیں جو فقہی مسائل کی تشریح میں مجبوراً آتے ہیں گو وہ اب عام استعمال کی وجہ سے تصریح کے درجہ کو پہنچ چکے ہیں لیکن درحقیقت وہ سب کے سب کنائے اور استعارے ہیں اسلامی تعلیمات کے مطابق پائخانہ پیشاب اور دوسرے نفرت انگیز اور شرمناک امراض کا ذکر بھی کنایتاً کرنا چاہیے پائخانہ اور پیشاب کے لیے احادیث میں ’’قضائے حاجت‘‘ کا لفظ مستعمل ہے جو ایک کنایہ ہے قرآن مجید میں اس کے لیے غائط کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو لغت میں نشیب زمین کو کہتے ہیں۔

﴿اَوۡ جَآءَ اَحَدٌ مِّنۡکُمۡ مِّنَ الۡغَآئِطِ﴾ (نساء:۴۳)

’’یا تم میں سے کوئی پست زمین سے (ہو کر) آیا ہو۔‘‘

چونکہ عام طور پر لوگ اس مقصد کے لیے پست زمین کو پسند کرتے ہیں اس لیے استعارۃً اس سے پائخانہ مراد لیا گیا۔

اس موقع پر یاد رکھنا چاہیے کہ پائخانہ بھی ایک استعارہ ہے جس کی اصل پائیں خانہ ہے چونکہ پائخانے عموماً مکانوں کے کنارے بنائے جاتے ہیں اس لیے استعارۃً ان کو پائیں خانہ کہا گیا۔ پھر تخفیف کے اصول کے مطابق پائخانہ ہو گیا اور اب کثرتِ استعمال سے اس میں استعارہ کی شان باقی نہ رہی قرآن مجید میں خداوند تعالیٰ نے ’’برص‘‘ کی تعبیر ’’سوء‘‘ کے لفظ سے کی ہے جس کے معنی برائی یا عیب کے ہیں۔

﴿وَ اضۡمُمۡ یَدَکَ اِلٰی جَنَاحِکَ تَخۡرُجۡ بَیۡضَآءَ مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ اٰیَۃً اُخۡرٰی﴾ (طٰہٰ:۲۲)

’’اور اپنے ہاتھ کو سکیڑ کر اپنی بغل میں رکھ لو (اور پھر نکالو) تو وہ بدوں اس کے کہ کسی طرح کا روگ ہو سفید (براق) نکلے گا (اور یہ) دوسرا معجزہ ہے۔‘‘

فحش گوئی کی دوسری قسم کا تعلق قوتِ غضبیہ سے ہے جس کا نام سب و شتم یا گالی گلوچ ہے اور یہ صورت عموماً جنگ و جدل کے موقع پر پیش آتی ہے زمانہ حج میں چونکہ عام اجتماع ہوتا ہے اور اس حالت میں لڑائی جھگڑے کا زیادہ امکان ہوتا ہے اس لیے خداوند تعالیٰ نے ایک لفظ ’’فسق‘‘ سے اس کی ممانعت کی۔

﴿فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوۡقَ وَلَا جِدَالَ فِی الۡحَجِّ﴾ (بقرہ:۱۸۷)

’’حج کے دنوں میں نہ شہوت کی کوئی بات کرنی چاہیے نہ فسق کی نہ جھگڑے کی۔‘‘

گالی گلوچ کی مختلف صورتیں ہیں۔ بعض اوقات انسان ایک شخص کے ماں باپ کو برا بھلا کہتا ہے اس کے

نسب میں عیب نکالتا ہے، کبھی خود اس شخص کے عیوب ظاہر کرتا ہے، یہاں تک کہ اگر وہ کسی نفرت انگیز مرض مثلاً برص یا جذام میں مبتلا ہو تو اس پر بھی طنز کرتا ہے، بعض حالتوں میں اگر اس نے کوئی برا کام کیا ہے یا اس کے ساتھ کوئی برا برتاؤ کیا گیا ہے، تو اس کا اظہار کرتا ہے۔

قرآن مجید نے اجمالی طور پر ان تمام صورتوں کی ممانعت صرف ایک لفظ سے کی ہے۔

﴿لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ﴾ (نساء:۱۴۸)

''اللہ کو بری بات کا پکار کر کہنا پسند نہیں مگر جس پر ظلم ہوا ہو (وہ ظلم کو برملا بیان کر سکتا ہے)۔''

اور قرآن وحدیث میں جا بجا بدزبانی سے بچنے کے حکم ومصالح نہایت تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

(۱) ایک مصلحت یہ ہے کہ گالی گلوچ میں لوگ عموماً تعدی کرتے ہیں، یعنی اگر ایک شخص ایک گالی دیتا ہے تو دوسرا دو دیتا ہے، اگر ایک شخص کسی کے باپ کو برا کہتا ہے تو دوسرا اس کے باپ ماں دونوں کو اس میں شامل کر لیتا ہے، اس لیے دوسرے کی تعدی سے محفوظ رہنے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی کو گالی نہ دی جائے۔ خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید کی اس آیت میں یہی نکتہ بیان کیا ہے۔

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (انعام:۱۰۹)

''اور (مسلمانو!) خدا کے سوا دوسرے جن معبودوں کو یہ پکارتے ہیں ان کو برا نہ کہو کہ یہ لوگ (بھی) نادانی سے بڑھ کر خدا کو برا کہہ بیٹھیں گے۔''

اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا کہ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ ماں پر لعنت بھیجے، کہا گیا یا رسول اللہ ﷺ کوئی اپنے ماں باپ پر کیونکر لعنت بھیج سکتا ہے؟ فرمایا اس طرح کہ جب کوئی کسی کے باپ کو برا بھلا کہے گا تو وہ بھی اس کے ماں باپ دونوں کو برا بھلا کہے گا۔''(۱)

(۲) بدزبان آدمی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے فوائد سے محروم ہو جاتا ہے اور لوگ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیتے ہیں، حدیث میں ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ سے ملنے آیا۔ آپ ؐ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ ''اپنے قبیلہ میں یہ نہایت برا آدمی ہے۔'' لیکن جب وہ آپ ؐ کے پاس بیٹھا تو آپ ؐ اس سے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ملے، جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہ ؓ نے کہا کہ جب آپ ؐ نے اس کو دیکھا تو برا کہا، پھر اس سے نہایت لطف ومحبت کے ساتھ ملے، فرمایا ''عائشہ ؓ تم نے مجھ کو بدزبان کب پایا؟ خدا کے نزدیک قیامت کے دن سب سے برا شخص وہ ہوگا جس کی بدزبانی کے خوف سے لوگ اس کو چھوڑ دیں۔''(۲)

(۳) بدزبانی دورِ وحشت وجہالت کی یادگار اور تہذیب وشائستگی کے خلاف ہے۔ ایک بار حضرت ابوذر ؓ نے ایک غلام کو ماں کی گالی دی، رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ تم میں جاہلیت کا اثر باقی

(۱) بخاری کتاب الادب باب لا یسب الرجل والدیہ۔

(۲) بخاری کتاب الادب باب لم یکن النبی ﷺ فاحشا ولا متفحشا۔

ہے۔(۱) امام بخاری نے ادب المفرد میں اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ غلاموں یا نوکروں کو برا بھلا کہنا جائز نہیں۔

(۴) رفق و ملاطفت و شرم و حیا شریفانہ اخلاق ہیں اور اسلام نے خاص طور پر ان کی تعلیم دی ہے لیکن بدزبانی ان کے بالکل مخالف ہے۔ ایک بار کچھ یہود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کے بجائے ''اَلسَّامُ عَلَیْکُمْ'' (تم کو موت آئے) کہا حضرت عائشہؓ نے جواب میں کہا ''عَلَیْکُمْ وَ لَعَنَکُمُ اللّٰہُ وَ غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ۔'' ''یعنی تم کو موت آئے' خدا تم پر لعنت بھیجے' اور تم پر خدا کا غضب نازل ہو' رسول اللہ ﷺ نے سنا تو فرمایا ''اے عائشہؓ نرمی اختیار کرو اور سختی اور بدزبانی سے بچو۔'' (۲)

(۵) گالی گلوچ کی ممانعت کا ایک نہایت دقیق نکتہ یہ ہے کہ اس میں عموماً بے شرمی اور بے حیائی کی باتوں کو الفاظ کی صورت میں منہ سے نکالا جاتا ہے اور سنایا جاتا ہے اس سے سوسائٹی میں ان مکروہ باتوں کے سننے اور سنانے کی جرأت پیدا ہوتی ہے اور بے حیائی کے الفاظ بڑھ کر اعمال کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ حدیث میں آنحضرت ﷺ نے بدزبانی کو حیا کے بالمقابل ذکر فرمایا' ارشاد ہے کہ ''بدزبانی جس چیز میں شامل ہوتی ہے' اس کو بدنما بنا دیتی ہے' اور حیا جس چیز میں ہوتی ہے اس کو زینت دے دیتی ہے۔'' (۳) اس سے معلوم ہوا کہ بدزبانی اور فحش گوئی حیا کے خلاف ہے۔

گالی گلوچ سے لوگوں کے دلوں کو اذیت پہنچتی ہے' حالانکہ مسلمانوں کو ایذا رسانی سے احتراز کرنا چاہیے اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں (۴) مردوں کو برا بھلا کہنے کی ممانعت اسی لیے کی گئی ہے کہ اس سے زندوں یعنی مردوں کے عزیز و اقارب اور دوست واحباب کے دلوں کو اذیت پہنچتی ہے۔ (۵)

(۷) گالی گلوچ لڑائی کا پیش خیمہ ہے اور مسلمانوں کے ساتھ لڑنا بھڑنا کفر ہے اس لیے جو چیز اس کا ذریعہ بنتی ہے وہ اگر کفر نہیں تو کم از کم فسق ضرور ہے اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَ قِتَالُهٗ كُفْرٌ)) (۶)

''مسلمان کو برا بھلا کہنا گناہ ہے اور اس کے ساتھ لڑنا کفر۔''

ان تمام مراتب کے پیشِ نظر رکھنے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بدزبانی اور فحاشی اسلامی تعلیمات اور

---

(۱) بخاری کتاب الادب باب ما ینھی من السباب واللعن۔

(۲) بخاری کتاب الادب باب لم یکن النبی فاحشا ولا متفحشا۔

(۳) ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی الفحش۔

(۴) مسلم کتاب الایمان باب بیان تفاضل الاسلام وای امورہ افضل۔

(۵) ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی الشتم۔

(۶) بخاری کتاب الادب باب ما ینھی من السباب واللعن۔

اسلامی خصوصیات کے منافی ہے اس لیے جو شخص صحیح اسلامی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے وہ اس بداخلاقی میں مبتلا رہنا پسند نہ کرے گا اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَانِ وَ لَا اللَّعَانِ وَ لَا الْفَاحِشِ وَ لَا الْبَذِی)) (۱)

''جو مسلمان ہے وہ طنز و تشنیع نہیں کرتا لعنت نہیں بھیجتا بدزبانی اور فحش کلامی نہیں کرتا۔''

ایک اور حدیث میں بدزبانی کو نفاق کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ (۲)

یہ تمام وجوہ تو انسانوں کی باہمی گالی گلوچ اور لعن طعن سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اس قسم کی بدزبانیاں صرف انسانوں تک محدود نہیں ہیں بلکہ بے جان اور عقل سے خالی چیزوں سے بھی جب نقصان پہنچتا ہے تو لوگ ان کو بھی برا بھلا کہہ بیٹھتے ہیں مثلاً جب کوئی شخص حوادثِ زمانہ کا شکار ہوتا ہے تو وہ زمانہ کو برا بھلا کہنے لگتا ہے یہ نہیں سوچتا کہ ان میں زمانہ کا کیا قصور ہے یہ جو کچھ ہوا ہے مشیتِ الٰہی سے ہوا ہے اس بنا پر اسلام نے ان چیزوں کے برا بھلا کہنے کی بھی ممانعت کی ہے اور اس مفہوم کو رسول اللہ ﷺ نے خود اللہ تعالیٰ کی زبان میں اس طرح ادا کیا ہے کہ ''خدا کہتا ہے کہ انسان زمانہ کو برا بھلا کہتا ہے حالانکہ میں خود زمانہ ہوں اور رات دن میرے ہاتھ میں ہیں۔'' (۳)

یعنی زمانہ کو برا بھلا کہنا خود خدا کو برا بھلا کہنا ہے۔

ایک بار ہوا ایک شخص کی چادر کو ادھر ادھر اڑانے لگی۔'' اس نے ہوا پر لعنت بھیجی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس پر لعنت نہ بھیجو وہ تو صرف خدا کی فرمان بردار ہے۔'' (۴)

ایک سفر میں ایک عورت نے اپنی اونٹنی پر لعنت بھیجی رسول اللہ ﷺ نے اونٹنی کو الگ کر دیا اور یہ اس عورت کی سزا تھی تا کہ وہ دوبارہ اس قسم کا کلمہ نہ کہہ سکے۔ (۵)

اسلام میں گالی گلوچ کے صرف یہی معنی نہیں کہ کسی کو مغلظات سنائے جائیں بلکہ ہر وہ بات جس سے کسی کی توہین اور دل آزاری ہو گالی ہے۔ کسی کو فاسق یا کافر کہنا اگرچہ عرف عام میں گالی نہیں ہے لیکن اسلام میں وہ ایک سخت گالی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ کوئی شخص اپنے بھائی کو فاسق و کافر نہ کہے۔ کیونکہ اگر وہ فاسق و کافر نہ ہوگا تو یہ تہمت خود تہمت لگانے والے پر لوٹ آئے گی۔ (۶)

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر وہ شخص فاسق یا کافر ہوگا تو اس کا کہنے والا فاسق و کافر نہ ہوگا تاہم اگر اس کا

---

(۱) ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی اللعنۃ۔

(۲) بخاری کتاب الایمان باب علامات المنافق۔

(۳) بخاری کتاب الادب لاتسبوا الدہر۔

(۴) ابوداؤد کتاب الادب باب فی اللعن۔

(۵) ابوداؤد کتاب الجہاد باب النہی عن لعن البہیمۃ۔

(۶) بخاری کتاب الادب باب ما ینہی من السباب واللعن ومسلم کتاب الایمان۔

مقصود محض اس شخص کی تفضیح وتشہیر ہوتو وہ گنہگار ضرور ہوگا۔[1] بہر حال اسلام نے جان و مال کی طرح ہر مسلمان کی عزت وآبرو کو بھی محفوظ کر دیا ہے' اور رسول اللہ ﷺ نے ایک مقدس دن' ایک مقدس مہینہ اور ایک مقدس شہر میں (یعنی حجۃ الوداع میں) ایک خطبہ میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی ہے کہ خدا نے تمہارے خون تمہارے مال اور تمہاری عزت کو اسی طرح حرام کر دیا ہے جس طرح تمہارا یہ دن تمہارے اس مہینہ اور تمہارے اس شہر میں محترم ہے۔

رذائل پر مختصر تبصرہ

گزشتہ صفحوں میں جن رذائل کی تشریح کی گئی ہے ان کے علاوہ اور بہت سی ایسی چھوٹی بداخلاقیوں اور بری عادتوں کو گنایا جا سکتا ہے' جن کی ممانعت اسلام میں کی گئی ہے مگر اصولی حیثیت سے وہ درحقیقت ان ہی مذکورۂ بالا رذائل میں سے کسی کے تحت میں ہیں' اس لیے ان کے پورے استقصا کی کوشش نہیں کی گئی ہے اور چونکہ ان رذائل کے اخذ و رد میں خالص فلسفیانہ اصول کی پیروی نہیں کی گئی ہے اس لیے صرف ان ہی کے بیان پر قناعت نہیں کی گئی جن کو فلسفۂ اخلاق کے مصنفوں نے رذائل میں شمار کیا ہے۔ بلکہ مذہبی تعلیمات کو سامنے رکھ کر اخلاق و عادات ذمیمہ کی یہ فہرست مرتب کی گئی ہے۔

اس فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بھید کھل جاتا ہے کہ اسلام نے تین اساسی برائیاں قرار دی ہیں اور جس قدر رذائل ہیں ان میں ان ہی تین میں سے کوئی برائی پائی جاتی ہے۔

سب سے پہلی اساسی برائی عدمِ صدق ہے' اس سے مقصود یہ ہے کہ دل اور زبان میں یکسانی نہ ہو' جھوٹ' غیبت' خلاف وعدگی' اتہام' بدگمانی' خوشامد' چغل خوری' دورخاپن' جھوٹی قسم وغیرہ اسی ایک جڑ کی مختلف شاخیں ہیں' دوسری اساسی برائی حبِ مال ہے مقصود دنیا کے مال و دولت سے غیر معمولی محبت ہے بخالت' حرص' طمع' چوری' غصب' خیانت' غلول' ناپ تول میں کمی وبیشی وغیرہ ایک ہی اصل کی مختلف فروع ہیں تیسری اساسی برائی حبِ ذات ہے' اس سے مقصود اپنی ذات سے غیر معمولی شغف ہے' حسد' تکبر' عُجب فخار غیظ وغضب' ظلم' کینہ وغیرہ ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ جو شخص ان تینوں اساسی برائیوں سے ہر طرح پاک رہنے کی کوشش کرے گا' وہ ہر قسم کے رذائل سے اپنے کو محفوظ کر لے گا۔ یہ تینوں اساسی برائیاں ہوائے نفس یعنی نفس کی غلط اور بے جا خواہشیں ہیں جو ان سے اپنا دامن بچائے گا وہ جنت میں آرام پائے گا۔

﴿وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰىۙ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰىؕ۝﴾ (نازعات: ۴۰۔۴۱)

''اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا' اور اپنے نفس کو غلط خواہش سے بچایا تو جنت

(۱) فتح الباری کتاب الادب باب ما ینھی من السباب واللعن۔

اس کی آرام گاہ ہے۔"

آداب

انسانی زندگی کے رات دن کے ضروری مشاغل رہنے سہنے' اٹھنے بیٹھنے' چلنے پھرنے' بولنے چالنے' کھانے پینے' سونے جاگنے' نہانے دھونے کے وہ تمام عمدہ قواعد جو ایک متمدن زندگی کے ضروری جز ہیں' آداب' کہلاتے ہیں' ان ہی آداب کی پابندی کے بدولت وحشی اور متمدن لوگوں میں امتیاز ہوتا ہے ان کے آداب میں خوبی اور لطافت ملحوظ رکھنا حسنِ ادب ہے' اس کی پابندی سے اجتماعی اور معاشرتی امور میں خوش گواری پیدا ہوتی ہے اور انسان مہذب' شائستہ اور باوقار بن جاتا ہے۔

یہ آداب درحقیقت اس اصول پر مبنی ہیں کہ ان روزانہ کے کاموں کے بجالانے میں ایسی خوبی ملحوظ رکھی جائے جس سے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو آرام مل سکے' اور ایک کے کام کا طریقہ دوسرے کی تکلیف یا ناگواری کا باعث نہ ہو جائے اور یا یہ کہ وہ کام خوبی' خوب صورتی اور عمدگی کے ساتھ انجام پائے۔ پیغمبر اسلام علیہ السلام نے اپنی عملی و قولی ہدایات سے مسلمانوں کے لیے اس کا بہترین نمونہ قائم کر دیا ہے۔

دنیا کی دوسری قومیں مذہب ایک جگہ سے اور اپنے آداب و عوائد یعنی ایٹی کیٹ کسی دوسری جگہ سے لیتی رہی ہیں۔ عیسائی قوموں نے مذہب انجیل سے اور آداب و آئین یونان اور روم سے حاصل کیا' لیکن اسلام میں جو مذہب کا سرچشمہ ہے وہی اس کے آداب و عوائد کا ماخذ بھی ہے' اسی لیے اسلام وحشی سے وحشی قوموں میں صرف قرآن اور اپنے پیغمبر کی سیرت لے کر جاتا ہے اور ان کو چند روز میں مہذب اور شائستہ بنا دیتا ہے۔

ہمارے محدثین کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان آداب کی نوعیت کو مکارمِ اخلاق سے الگ کر دیا ہے اور ان کو کتاب الطہارۃ' کتاب الاطعمہ' کتاب الاشربہ' کتاب اللباس' کتاب الاستیذان' کتاب الآداب اور کتاب السلام میں درج کیا ہے' ہم صحاح و سنن کی عام کتابوں اور خصوصاً بخاری' مسلم' ترمذی اور ابوداؤد کے ان ہی ابواب سے اس قسم کی تعلیمات کو الگ کر کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

فطری آداب

اسلام دین فطرت ہے اس لیے اس کے آداب کا بڑا حصہ بھی فطری ہے یعنی فطرۃً وہ پسندیدہ ہیں' اور تمام انبیاء علیہم السلام نے ان کی پیروی کی ہے' یہ ایسے آداب ہیں جو انسانوں کو جانوروں سے ممتاز کرتے ہیں' انسانوں کو اپنی برہنگی چھپانی پڑتی ہے' اس کے بال بڑھتے ہیں' ناخن بڑھتے ہیں بدن گندا ہوتا ہے' کپڑے میلے ہوتے ہیں

تو ان سب چیزوں کی اصلاح شائستہ اور ناشائستہ انسانوں میں فرق پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ چار چیزیں تمام پیغمبروں کی سنت ہیں، حیا کرنا، عطر لگانا، مسواک کرنا، اور نکاح کرنا،(۱) ایک روایت میں ختنہ کو بھی اس میں داخل کیا گیا ہے۔

حیا کرنے کا نتیجہ برہنگی کا چھپانا، یعنی سترِ عورت اور ضرورت کے وقت پردہ کرنا، عطر لگانا اور مسواک کرنا، صفائی اور طہارت کے تمام اقسام کو بتاتا ہے، اور ختنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی مبارک نسل کی سنت ہے، یہاں تک کہ تورات کے بیان کے مطابق یہ خدا اور حضرت ابراہیم کے درمیان عہد کی جسمانی نشانی ہے۔ (۲)

حضرت ابراہیم علیہ السلام انسانیت کے سب سے پہلے معلم ہیں ان کے عہد میں دنیا اس عمر کو پہنچ چکی تھی جب کہ اس کو تہذیب و وقار کے آداب بتائے جائیں چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جسمانی طہارت و نظافت کے مختلف آداب سکھائے گئے جن کو خصالِ فطرت کہتے ہیں، امام بخاری کی ادب المفرد میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے سب سے پہلے ختنہ کرایا، مونچھیں ترشوائیں، اور ناخن کٹائے۔ (۳) ایک حدیث میں ہے ایک صحابیؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ خصال فطرت پانچ ہیں، ختنہ کرنا موئے زیرناف اور بغل کے بال صاف کرنا اور ناخن اور مونچھیں ترشوانا، (۴) ایک دوسری حدیث میں یہ آداب دس تک پہنچ گئے ہیں، مونچھ ترشوانا، ڈاڑھی بڑھانا۔ مسواک کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، ناخن ترشوانا، انگلیوں کے درمیان جو جگہ ہے اس کو دھونا۔ بغل کے بال بنوانا، موئے زیرناف کو صاف کرنا۔ پانی سے استنجا کرنا، راوی کہتا ہے کہ دسویں بات میں بھول گیا غالباً کلی کرنا ہوگی۔ (۵)

فطرت کے یہ آداب اسلامی طہارت کے اصول بن گئے ہیں چنانچہ وضو میں مسواک کرنا مستحب اور انگلیوں کا دھونا ناک میں پانی ڈالنا اور کلی کرنا، واجب قرار دیا گیا ہے۔

ناخن ترشوانا، بال بنوانا، مونچھیں ترشوانا، صفائی کے لوازم ہیں جن کے ناخن بڑے اور مونچھیں بڑی ہوتی ہیں وہ کھانے کی ہر چیز کو گندا کر کے کھاتے پیتے ہیں، جس سے نہ صرف دوسروں کو کراہت ہوتی ہے بلکہ خود ان کو بھی طبی طور پر نقصان پہنچتا ہے، یورپ میں ناخن بڑھانا اور ان کو ریت ریت صاف کرنا اور اسی طرح بعض لوگوں میں بڑی بڑی مونچھیں رکھنا حسن سمجھا گیا ہے، مگر یہ دونوں باتیں صریحاً خلافِ فطرت ہیں اور کھانے پینے کی گندگی کا باعث ہیں۔

---

(۱) ترمذی ابواب النکاح۔

(۲) توراۃ پیدائش۔

(۳) ایضاً۔

(۴) باب الختان الکبیر۔

(۵) صحیح مسلم باب خصال الفطرہ۔

مونچھوں کے بڑھانے کا فیشن یورپ کا آئینہ بدل جانے سے اب کم ہو رہا ہے مگر ڈاڑھی بڑھانے کے بجائے اس کے منڈانے کا فیشن ابھی اسی طرح قائم ہے بلکہ اب تو ڈاڑھی اور مونچھ دونوں کے صاف کرنے کا فیشن ترقی پر ہے' یہ تمام باتیں اسلامی شعار کے خلاف ہیں اور اس شعار کے مخالف ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے لیے مقرر کیا تھا۔

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا مجوسیوں کے برخلاف تم مونچھیں ترشواؤ اور ڈاڑھی بڑھاؤ (۱) حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مشرکوں کے برخلاف تم مونچھیں باریک ترشواؤ اور ڈاڑھی بڑھاؤ (۲) ان تعلیمات کے مطابق اسلامی صورت کو قائم رکھنا غیرتمند مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے اچھی اور بری معلوم ہونے کا تخیل زمانہ کے رسم و رواج کا واہمہ ہے جس رنگ کی عینک لگایئے' دنیا اسی رنگ کی نظر آئے گی۔

طہارت اور اس کے آداب

تہذیب و شائستگی کی باتوں میں سب سے اہم چیز طہارت اور پاکی ہے' گو کہ اسلام ایک ایسے ملک میں ظاہر ہوا جہاں پانی نسبتاً بہت کم تھا۔ پھر بھی اس نے بعض خاص حالات میں غسل کرنا فرض قرار دیا' زن و شو کی ہم بستری کے بعد جب تک دونوں غسل نہ کرلیں نماز جو فرض ہے ادا نہیں ہو سکتی' فرمایا:

﴿وَ اِنْ کُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا﴾ (مائدہ:۶)

''اور اگر تم ناپاک ہو تو نہا کر پاک ہو۔''

کپڑے شرعی طور سے پاک ہوں' فرمایا:

﴿وَ ثِیَابَکَ فَطَهِّرْ﴾ (مدثر:۴)

''اور اپنے کپڑے کو پاک کر۔''

اگر پاکی کے لیے پانی نہ مل سکے' یا بیماری کے سبب سے پانی استعمال کرنے سے نقصان کا اندیشہ ہو تو پاک مٹی سے تیمم کرنا چاہیے۔

﴿فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا﴾ (مائدہ:۶)

''تو پاک مٹی کا قصد کرو۔''

جب نماز پڑھنا چاہیں تو پہلے ہاتھ' منہ اور پاؤں دھولیں اور بھیگے ہاتھوں کو سر پر پھیر لیں اس کا نام وضو ہے۔

﴿اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَکُمْ وَ اَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِکُمْ وَ اَرْجُلَکُمْ اِلَی الْکَعْبَیْنِ﴾ (مائدہ:۶)

---

(۱) ایضاً

(۲) صحیح مسلم خصال الفطرہ۔

''جب نماز کا ارادہ کرو تو اپنے منہ اور کہنیوں تک اپنے ہاتھ دھولو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں دھوو۔''

جمعہ کے دن نماز سے پہلے نہانے کا حکم دیا کہ لوگ پاک صاف اور نہا دھو کر جماعت میں شریک ہوں' تا کہ کسی کی گندی بدبو سے دوسرے نمازیوں کو تکلیف نہ ہو اور پورا مجمع پاکی اور صفائی کی تصویر ہو۔ قضائے حاجت اور پیشاب کے بعد استنجا کرنا اور عضوِ خاص و مقامِ خاص سے گندگی کو دور کرنا ضروری ٹھہرایا گیا۔ (۱)

ان احکام سے معلوم ہوگا کہ اسلام میں طہارت اور صفائی کو خاص اہمیت حاصل ہے بلکہ وہ خدا کی محبت کے حصول کا ذریعہ ہے۔

﴿وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴾ (بقرہ:۲۲۲)

''اور (اللہ) طہارت کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

اسی طہارت کی پابندی اور دلوں میں طہارت کا خیال پیدا کرنے کے لیے مختلف سنن اور طریقے سکھائے گئے مثلاً

(۱) آپؐ نے فرمایا جب کوئی شخص سو کر اٹھے تو جب تک تین بار ہاتھ نہ دھولے اس کو پانی کے برتن میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے' کیونکہ سونے میں معلوم نہیں کہ اس کا ہاتھ کہاں کہاں پڑا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوگا کہ ہم کو اپنے جسم کے ہر عضو کی طہارت کا سوتے جاگتے ہر حالت میں خیال رکھنا چاہیے۔ سونے میں کسی خواب کی وجہ سے بھی اگر انسان ناپاک ہو جائے تو نہانا ضروری قرار دیا گیا۔ (۲)

ہاتھ کی صفائی پر اس لیے زور دیا گیا کہ برتن سے پانی نکالنے میں ناپاک ہاتھ پانی میں بھیگ کر پانی کو ناپاک نہ کر دے اس لیے خیال رکھنا چاہیے کہ ہاتھ پانی کے برتن میں اس وقت تک نہ ڈبوئے جائیں جب تک ہاتھوں کی طہارت کا یقین نہ ہو۔

(۲) دانتوں کی صفائی جو بہت سی گندگیوں اور بیماریوں کی جڑ ہے' ضروری بتلائی' مسواک کرنا سنت ٹھہرایا' فرمایا اگر میری امت پر شاق نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا' (۳) ایک دفعہ کچھ مسلمان حاضر ہوئے جن کے دانت صاف نہ ہونے کی وجہ سے زرد تھے تو فرمایا تمہارے دانت زرد کیوں دیکھ رہا ہوں' مسواک کیا کرو' (مسند احمد جلد ا ص ۴۲۱)

(۳) عام راستوں اور درختوں کے سایہ میں قضائے حاجت نہیں کرنا چاہیے (۴) یہ اس لیے کہ راستہ چلنے والوں اور درخت کے سایہ میں بیٹھنے والے مسافروں کو اس نجاست اور گندگی سے تکلیف نہ ہو۔

---

(۱) مسلم کتاب الطہارۃ۔

(۲) ابوداؤد کتاب الطہارۃ

(۳) ایضاً۔

(۴) ایضاً۔

(۴) ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کر کے پھر اس میں غسل کرنا جائز نہیں‘ ایسے ٹھہرے ہوئے پانی میں غسل جنابت بھی نہیں کرنا چاہیے‘ بلکہ مجنب کو چاہیے کہ اس سے پانی لے کر غسل کرے‘ کیونکہ ہماری تھوڑی سی سہل انگاری سے وہ پانی دوسروں کے لیے ناپاک یا قابل کراہت بلکہ عام حالت میں خود اس کی طبیعت کے لیے گھن پیدا کرے گا۔

(۵) عام طور سے بے ضرورت کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کرنا چاہیے‘ کیونکہ اس حالت میں یہ خوف ہے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم پر پڑ جائیں نیز بے ستری کا بھی امکان ہے اور تہذیب و وقار کے بھی خلاف ہے اگر یہ احتمالات نہ ہوں یا زمین پر بیٹھنے کے قابل نہ ہو تو جائز ہے۔

(۶) پیشاب نرم زمین پر کرنا چاہیے کیونکہ سخت زمین سے پیشاب کے چھینٹے اڑ کر جسم پر پڑ سکتے ہیں۔

(۷) غسل خانہ کی زمین میں پیشاب نہیں کرنا چاہیے خصوصاً جب کہ وہ کچی ہو‘ کیونکہ جگہ کی گندگی اور ناپاکی سے پانی کی چھینٹیں گندی اور ناپاک ہو کر اڑیں گی اور بدن کو ناپاک کریں گی‘ یا ناپاک ہونے کا وسوسہ دل میں پیدا کریں گی۔

(۸) بول و براز کے بعد استنجا کرنا چاہیے‘ ڈھیلے یا کسی اور پاک و جاذب چیز سے صفائی کے بعد پانی سے دھو لینا اچھا ہے‘ استنجا بائیں ہاتھ سے کیا جائے‘ اس میں داہنا ہاتھ نہ لگایا جائے۔

(۹) طہارت کے بعد پانی کے علاوہ مٹی سے بھی ہاتھ دھونا چاہیے۔[1]

(۱۰) ہفتہ میں ایک روز ہر مسلمان پر غسل کرنا‘ کپڑے بدلنا‘ عطر اور تیل لگانا مستحسن ہے بلکہ بعض فقہا اور محدثین کے نزدیک حدیث کے الفاظ کی بنا پر غسل واجب ہے۔

اسلام نے اس لیے جمعہ کا دن مقرر کیا ہے‘ جو مسلمانوں کے عام اجتماع کا دن ہوتا ہے اور اس کی وجہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ بیان کی ہے کہ عرب کے لوگ سخت تنگ دست اور پشمینہ پوش تھے‘ اور محنت مزدوری کرتے تھے‘ ان کی مسجد نہایت تنگ اور اس کی چھت نہایت پست تھی‘ جو چھپر کی تھی‘ ایک بار گرم دن میں رسول اللہ ﷺ جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے آئے تو لوگوں کو اس پشمینہ میں پسینہ آیا اور اس کی بو کے پھیلنے سے ہر شخص کو تکلیف ہوئی‘ رسول اللہ ﷺ نے یہ بدبو محسوس کی تو فرمایا کہ لوگو! جب یہ دن آئے تو غسل کر لیا کرو‘ اور ہر شخص کو جو بہترین تیل میسر ہو سکے لگائے۔[2] جمعہ کے علاوہ معمولاً کسی کو بودار چیز مثلاً لہسن یا پیاز کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت بھی فرمائی۔[3]

(۱۱) جمعہ کے علاوہ عام حالات میں بھی انسان کو صاف ستھرا رہنا چاہیے‘ چنانچہ ایک بار جب رسول

(۱) یہ تمام مسائل کتب سنن کی کتاب الطہارۃ میں دیکھیے ۱۲۔

(۲) ابوداؤد کتاب الطہارۃ۔

(۳) مسلم کتاب الصلوٰۃ۔

اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں، تو فرمایا کہ اس کے پاس بال ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟ ایک دوسرے شخص کو میلے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ اس کو پانی نہیں ملتا تھا، جس سے وہ اپنے کپڑے کو دھولیتا۔ (۱)

اس کے ساتھ اسلام نے طہارت و نظافت کی تعلیم میں سادگی اور بے تکلفی کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور ایسی تعلیم نہیں دی ہے جو تشدد، غلو اور وہم و وسوسہ کی حد تک پہنچ جائے۔ اس بنا پر اسلام نے بعض سختیوں کو دور کیا ہے جو اس معاملہ میں اور مذاہب میں پائی جاتی تھیں، مثلاً یہودیوں کے مذہب کی رو سے ناپاکوں کی پاکی کے لیے ضروری تھا کہ نہانے کے بعد بھی اس دن کا آفتاب ڈوب لے تب نہانے والا پاک ہو، لیکن اسلامی تعلیمات کی رو سے انسان کو اس معاملہ میں صرف اس قدر احتیاط کرنی چاہیے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم یا کپڑے پر نہ پڑنے پائیں، اس سے زیادہ احتیاط تشدد اور غلو کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ شدتِ احتیاط کی وجہ سے شیشی میں پیشاب کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بنو اسرائیل کے جسم پر جب پیشاب لگ جاتا تھا تو اس کو قینچی سے کاٹ ڈالتے تھے، لیکن حضرت حذیفہؓ نے اس تشدد کو ناپسند فرمایا اور کہا کہ کاش وہ اس قدر سختی نہ کرتے کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو معمولی طور پر استنجا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ (۲)

یہودیوں کے یہاں یہ بھی دستور تھا کہ جب کوئی عورت ایام سے ہوتی تھی تو اس کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے تھے اور اس کو گھر سے بالکل الگ کر دیتے تھے۔ صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق دریافت فرمایا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ﴾ (بقرہ:۲۲۲)

''اور (اے پیغمبر) لوگ تم سے حیض کے بارہ میں دریافت کرتے ہیں تو (ان کو) سمجھا دو کہ وہ گندگی ہے تو حیض کے دنوں میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک پاک نہ ہولیں، ان سے مقاربت نہ کرو اور جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس آؤ۔''

اس کے مطابق آپ ﷺ نے حکم دیا کہ جماع کے علاوہ اس سے سب کام لے سکتے ہو، اور خود اپنے طرزِ عمل سے اس کی مثالیں قائم کر دیں۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں اس حالت میں آپ ﷺ کے بالوں میں کنگھی کرتی تھی، اور آپ ﷺ کے سر کو دھوتی تھی، ایک بار آپ ﷺ نے مجھ سے کوئی چیز اٹھا کر مانگی میں نے معذرت کی تو فرمایا۔ یہ ناپاکی تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ (۳)

(۱) ابوداؤد کتاب اللباس باب فی غسل الثوب۔

(۲) صحیح مسلم کتاب الطہارۃ باب المسح علی الخفین۔

(۳) صحیح مسلم کتاب الطہارۃ باب جواز غسل الحائض راس زوجہا

ناپاکی کی حالت میں مقدس مقامات مثلاً مسجد میں نہیں جاسکتے قرآن مجید کو نہیں چھو سکتے اسی اصول کی بنا پر بعض صحابہؓ نے حالتِ جنابت میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مصافحہ کرنے اور اٹھنے بیٹھنے سے اجتناب کیا لیکن آپؐ نے فرمایا کہ ''مسلمان نجس نہیں ہوتا۔''(۱) یعنی مسلمان جنابت اور حاجتِ غسل سے ایسا نجس نہیں ہو جاتا کہ اس کے چھونے سے کوئی دوسرا آدمی یا چیز ناپاک ہو جائے۔

ایک عورت نے حضرت ام سلمہؓ سے دریافت کیا کہ میں عورت ہوں اور میرے دامن لمبے ہوتے ہیں اور میں گندے مقامات پر چلتی ہوں، یعنی زمین پر گھسٹنے کی وجہ سے ممکن ہے کہ دامن میں نجاست لگ جاتی ہو بولیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس کے بعد کی زمین اس کو پاک کر دیتی ہے۔(۲) یعنی اس کے بعد جو خشک اور پاک زمین آتی ہے، وہ اس نجاست کو زائل کر دیتی ہے' ایک عورت نے آپؐ سے دریافت فرمایا کہ مسجد کی طرف ہمارا جو رستہ جاتا ہے وہ بدبودار ہے جب بارش ہو تو ہم کیا کیا کریں' فرمایا کہ اس کے بعد اس سے اچھا راستہ نہیں ہے؟ بولیں ہاں ہے' فرمایا تو وہ اس کی تلافی کر دیتا ہے' غرض اسلام کا اصول یہ ہے کہ خشک زمین پاک ہے اور پانی کی طرح دوسری چیزوں کو بعض حالات میں پاک کر سکتی ہے اسی لیے آپؐ نے فرمایا کہ زمین میرے لیے پاک کر دی گئی ہے اور اسی لیے وہ حالتِ تیمّم میں پانی کی قائم مقام ہو جاتی ہے جو تا زمین پر رگڑ لینے سے پاک ہو جاتا ہے۔

اسلام نے اس باب میں سب سے زیادہ جو آسانی پیدا کی وہ یہ تھی کہ تیمّم کو غسل اور وضو کا قائم مقام کر دیا' اور اس کو تمام صحابہؓ نے ایک برکت سمجھا۔

غسل کا طریقہ یہ سکھایا کہ پہلے دونوں ہاتھ دھو لیے جائیں' پھر کمر سے دھو کر نجاست دور کر لی جائے پھر سارے بدن پر پانی بہایا جائے' آنحضرت ﷺ ضرورت سے غسل اس طرح فرماتے تھے' پہلے دونوں ہاتھ دھوتے پھر داہنے ہاتھ سے پانی بہا کر بائیں ہاتھ سے کمر کے نیچے دونوں طرف دھوتے' پھر وضو کرتے لیکن پاؤں نہیں دھوتے پھر سر پر تین بار پانی بہا کر بالوں کی جڑوں کو ملتے' پھر سارے جسم پر پانی بہاتے اور آخر میں پاؤں دھوتے (مسلم باب صفۃ غسل الجنابۃ)

اسلام میں ہر روز نہانے کا کوئی حکم نہیں اور نہ عرب جیسے ملک میں یہ ہو سکتا تھا' لیکن اگر کوئی ایسے ملک میں ہو جہاں پانی کی بہتات ہو اور وہ صفائی کے لیے ہر روز نہا لے تو مباح ہے۔ آنحضرت ﷺ پانچوں وقت کی نماز کی تمثیل میں فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے دروازہ پر نہر بہہ رہی ہو' اور اس میں وہ دن میں پانچ دفعہ نہایا کرے تو اس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے۔

---

(۱) ابوداؤد کتاب الطہارۃ۔

(۲) ایضاً۔

کھانے پینے کے آداب

(۱) کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھولینا چاہیے' کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کے متعلق اگرچہ کوئی صحیح حدیث مروی نہیں ہے' لیکن اگر پیالہ میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہوتو سوکر اٹھنے کے بعد پانی کے برتن میں بے ہاتھ دھوئے ہاتھ ڈالنا منع ہے۔ اسی طرح بغیر ہاتھ دھوئے کھانے کے برتن میں ہاتھ ڈالنا اچھا نہیں' اور ابوداؤد میں بھی کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کی ایک ضعیف حدیث موجود ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اگر کسی کے ہاتھ میں کھانے کی چکنائی لگی رہ جائے اور وہ سو جائے اور کوئی جانور اس کے ہاتھ کو کاٹ لے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ایسا اسی کی غلطی سے ہوگا اور اس کو اس تساہلی پر اپنے ہی کو ملامت کرنا چاہیے' اس سے یہ معلوم ہوا کہ ادب کی یہ تعلیم اس کے لیے ہے جس کی انگلیاں کھانے میں ملوث ہوتی ہوں۔

(۲) مسلمانوں کا ہر کام خدا کے نام سے شروع ہونا چاہیے جیسا کہ حدیثوں میں مذکور ہے' اور دنیا کے سب کاموں میں کھانا جو زندگی کی بقا اور جسم کے قیام کا اصلی ذریعہ ہے' کتنا بڑا کام ہے۔ یہ کام خدا کے نام کے بغیر شروع نہ ہونا چاہیے' اس لیے کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ کہہ لینا چاہیے۔ صحابہؓ کہتے ہیں کہ جب ہم کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق ہوتا تھا تو جب تک آپؐ کھانا نہ شروع کرتے ہم لوگ کھانے میں ہاتھ نہیں ڈالتے تھے' لیکن ایک بار ایک بدو دوڑا ہوا آیا اور کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا' آپؐ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا' پھر اسی طرح ایک لونڈی آئی اور کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا۔ آپؐ نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا اور فرمایا کہ جس کھانے پر خدا کا نام نہیں لیا جاتا شیطان اس کو اپنے لیے جائز کر لیتا ہے۔ (۱) اور اگر کوئی شروع میں بسم اللہ کہنا بھول جائے تو بسم اللہ اولہ وآخرہ کہہ لے۔ (۲)

(۳) انسان کو ضرورت کے منشا کے مطابق پاک وناپاک ہر قسم کے کاموں اور چیزوں میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ صفائی کا اقتضا یہ تھا کہ انسان کے دونوں ہاتھ تقسیم کار کے اصول پر الگ الگ کاموں کے لیے خاص کر دیے جائیں' چنانچہ سب اچھے کاموں کے لیے داہنے ہاتھ کو اور دفعِ نجاست وغیرہ کے لیے بائیں ہاتھ کو خاص کر دیا گیا ہے' اس تخصیص میں ایک طبی اور فطری مصلحت بھی ہے انسان کے زیادہ تر کام فطرۃً پاک اور مباح ہوتے ہیں اور دفعِ نجاست وغیرہ کے کام کبھی کبھی ہوتے ہیں' اس لیے زیادہ تر کاموں کے لیے اس پہلو کو خاص کیا گیا ہے' جدھر قلب نہیں ہے یعنی دایاں پہلو' تاکہ کام کے ہچکولوں اور جھٹکوں سے قلب کو صدمہ نہ پہنچے' یہی وجہ ہے کہ ہر انسان فطرۃً سب کام داہنے ہاتھ سے کرتے ہیں اور بایاں ہاتھ صرف اس کی مدد کے لیے لگاتے ہیں اور یہی وجہ

(۱) ابوداؤد کتاب الاطعمہ۔

(۲) ایضاً۔

ہے کہ داہنے میں زیادہ پھرتی، چستی اور طاقت ہوتی ہے اسی لیے کھانا پینا بھی داہنے ہاتھ سے چاہیے۔ (۱) صرف کھانے پینے ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ شریعت نے اکثر باتوں میں اس کا لحاظ رکھا ہے ایک بار آپؐ کے سامنے دودھ پیش کیا گیا، مجلس میں آپؐ کے داہنے جانب ایک بدو بیٹھا ہوا تھا اور بائیں جانب حضرت ابوبکرؓ تھے، آپؐ نے دودھ پی کر بدو کی طرف پیالہ بڑھایا اور فرمایا کہ ترتیب میں داہنے جانب کا لحاظ ضروری ہے۔ (۲)

ایک بار آپؐ کے دائیں جانب ایک لڑکا اور بائیں جانب بڑے بوڑھے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپؐ نے کوئی چیز پی تو لڑکے سے کہا کہ اگر تم اجازت دو تو میں ان لوگوں کو دوں، اس نے کہا کہ میں اپنا حصہ کسی کو نہیں دے سکتا، مجبوراً آپؐ نے پہلے اسی کو دیا۔ (۳)

(۴) کھانا برتن کے کنارے سے کھانا چاہیے بیچ سے نہیں کھانا چاہیے کیونکہ اس سے ایک تو کھانے کی وہ مقدار جو کھانے سے بچ جائے گی، گندی نہ ہوگی، دوسرے یہ کہ برتن گندا نہ ہوگا اور تیسرے یہ کہ اگر کوئی اس طریق سے نہ کھائے تو اس سے اس کی حرص کا پتہ چلتا ہے اور حریص آدمی کبھی سیر نہیں ہوتا۔ اسی کو رسول اللہ ﷺ نے برکت سے تعبیر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ برکت کھانے کے بیچ میں نازل ہوتی ہے۔ (۴)

(۵) اپنے ساتھیوں کی اجازت کے بغیر کھجور یا انگور وغیرہ کو ایک ساتھ دو دو کر کے نہیں کھانا چاہیے (۵) کیونکہ اخلاقی حیثیت سے اس سے حرص اور لالچ کا اظہار ہوتا ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھانے والے کا منشا یہ ہے کہ جلدی جلدی اس کو اپنے پیٹ میں پہنچا دے تا کہ کوئی دوسرا آ کر شریک نہ ہو جائے اور اگر وہ چند لوگوں کے ساتھ مل کر اس طرح سے کھا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا منشا یہ ہے کہ وہ جلدی کر کے اپنے سب ساتھیوں سے زیادہ کھائے، یہ جذبہ ایثار کے سراسر منافی اور حرص وطمع پر دال ہے، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے، اور اگر کسی ضرورت سے کسی شریک کو ایسا کرنا پڑے تو اس کو دوسرے شریکوں سے پوچھ لینا چاہیے۔

(۶) کھانے میں عیب نہیں نکالنا چاہیے، کیونکہ اس سے گھر والوں میں اور کام کرنے والوں میں بات بات میں فیہ نکالنے والے کی طرف سے چڑ اور نفرت پیدا ہوتی ہے، اور اس سے گھر کا کام سدھرنے کی بجائے اور بگڑتا ہے، اس لیے اگر اتفاق سے کھانا بدمزہ پکا ہو تو اگر خواہش ہو تو کھا لینا چاہیے، ورنہ چھوڑ دینا چاہیے۔ (۶)

(۷) سب کا مل کر ایک ساتھ کام کرنا تمدن کی بنیاد اور حسنِ معاشرت کا ذریعہ ہے اسی لیے آنحضرت ﷺ

(۱) ابوداؤد کتاب الاطعمہ۔

(۲) صحیح بخاری کتاب الاشربہ۔

(۳) ایضاً۔

(۴) ترمذی ابواب الاطعمہ باب ماجاء فی کراہیۃ الاکل فی وسط الطعام۔

(۵) سنن ترمذی ابواب الطعام۔

(۶) بخاری کتاب الاطعمہ۔

نے اس کو پسند فرمایا ہے کہ دوست واحباب' یا گھر کے لوگ کھانا ایک ساتھ مل کر کھائیں' جیسا کہ قرآن پاک میں ہے' الگ الگ کھانا بھی جائز ہے' اور ایک ساتھ بھی' (۱) لیکن ایک ساتھ مل کر کھانے میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ برکت ہوتی ہے' اس طرح کھانا زیادہ برباد نہیں ہوتا کوئی تھوڑا کھاتا ہے کوئی زیادہ کھاتا ہے سب مل کر برابر ہو جاتے ہیں' اور ہر شخص کو تھوڑی بہت ہر چیز پہنچ جاتی ہے' پھر اس سے گھر والوں کا ایثار ثابت ہوتا ہے اور گھر کے مالک کا تشخص اور امتیاز جو غرور کی نشانی ہے' مٹتا ہے' اس سے گھر والوں اور عزیزوں اور دوستوں میں محبت ہوتی ہے۔ ایک بار صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ہم کھاتے ہیں لیکن آسودہ نہیں ہوتے' فرمایا غالباً تم لوگ الگ الگ کھاتے ہو' صحابہؓ نے کہا ہاں' فرمایا۔ ایک ساتھ کھاؤ اور بسم اللہ پڑھ لو تو برکت ہوگی۔ (۲)

(۸) کھانا ٹیک لگا کے بیٹھ کر یا منہ کے بل لیٹ کر نہیں کھانا چاہیے۔ کیونکہ روحانیت کے علاوہ یہ طبی حیثیت سے اس لیے مضر ہے کہ اس طرح غذا معدہ میں اچھی طرح سے بآرام نہیں پہنچتی ہے' کھانے کے لیے بیٹھنے کی مسنون صورتیں یہ ہیں کہ یا تو ایک پاؤں کھڑا کر کے اور دوسرے پاؤں کو گرا کر اسی پر بیٹھ کر کھایا جائے یا دوزانوں بیٹھ کر اور اگر جگہ کم ہو اور لوگ زیادہ ہوں تو اکڑوں بیٹھ کر کھایا جائے' یا دوزانوں بیٹھ کر (۳) آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ ٹیک لگا کر نہیں کھاتا' میں بندہ ہوں' غلاموں کی طرح کھاتا ہوں' یعنی خاکساری سے۔ (۴)

(۹) کھانا اپنے سامنے سے کھانا چاہیے' ادھر ادھر ہاتھ نہیں بڑھانا چاہیے' خصوصاً جب کئی آدمی ایک ہی برتن میں ساتھ ہوں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کھانا ہاتھ سے گندا نہیں ہوتا' دوسرے ہر شخص کا اپنا حصہ الگ ہو جاتا ہے اور دوسرے کے کھانے میں کوئی اچھا ٹکڑا اتفاقاً پڑ گیا ہے تو اس کے لیے لالچ سے بچتا ہے اور ایثار سیکھتا ہے۔

(۱۰) کھانا کھانے کے بعد برتن کو انگلیوں سے اور انگلیوں کو منہ سے اچھی طرح صاف کر لینا چاہیے اور اس کے بعد رومال سے ہاتھ پونچھنا چاہیے۔

(۱۱) پانی ٹھہر ٹھہر کر دو تین سانس میں پینا چاہیے' (۵) اس طرح پانی پینے سے پوری سیری ہوتی ہے اور ضرورت کے مطابق انسان پانی پیتا ہے اور اندر سے لگنے والی گندی سانس پانی میں نہیں لگنے پاتی۔

(۱۲) پانی کے برتن میں سانس نہیں لینی چاہیے کیونکہ ممکن ہے کہ منہ یا ناک سے تھوک وغیرہ نکل کر برتن میں پڑ جائے اور وہ آدمی کو مکروہ معلوم ہو پھر یہ بھی معلوم ہے کہ ہر سانس جو اندر سے باہر آتی ہے وہ بدن کی کثافتوں کو لے کر باہر نکلتی ہے اس لیے اس سانس کو اس سانس سے ملی ہوئی چیز کو پھر اندر نہیں کرنا چاہیے۔

---

(۱) ابوداؤد کتاب الاطعمہ۔

(۲) ایضاً۔

(۳) ابوداؤد کتاب الاطعمہ وابن ماجہ کتاب الاطعمہ وشرح سفر السعادۃ فیروز آبادی عبدالحق محدث دہلوی۔

(۴) ابوداود وابن ماجہ مع زرقانی علی السیر ۃ ج ۴ ص ۳۹۸۔

(۵) بخاری کتاب الاشربہ۔

(۱۳) پانی بے ضرورت کھڑے ہو کر نہیں پینا چاہیے کیونکہ یہ وقار کے خلاف ہے اور طبی حیثیت سے بھی مضر ہے البتہ کبھی کبھی اگر کوئی پی لے تو کچھ حرج نہیں کیونکہ آنحضرت ﷺ نے کبھی کبھی کھڑے کھڑے پانی پی لیا ہے۔ (۱) مگر اس کی عادت نہیں کرنی چاہیے' کیونکہ پانی پینے میں ضرورت ہے کہ اندر کے پٹھے ذرا ڈھیلے ہو جائیں اور یہ بات بیٹھ کر پینے سے حاصل ہوتی ہے البتہ زمزم کا پانی برکت' دعا اور شاید تعظیم کی خاطر کھڑے ہو کر پینا مسنون ہے۔

(۱۴) پانی مشکیزہ کے منہ یا پیالہ کے سوراخ سے نہیں پینا چاہیے کیونکہ اس سے اول تو پانی کی مقدار کا اندازہ نہیں ہوتا کہ کتنا پی لیا۔ پھر یہ دیکھا نہیں جا سکتا کہ اس کے اندر کوئی مضر چیز نہیں۔

(۱۵) کھانے اور پانی کے برتنوں کو ڈھانک کے رکھنا چاہیے' (۲) تاکہ اس میں گرد و غبار یا کوئی نجس چیز یا کوئی کیڑا اور مکوڑا نہ پڑنے پائے' یا کوئی جانور پانی نہ پینے پائے۔ (۳)

(۱۶) کھانے کے بعد خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے کھلایا اور پلایا اس موقع پر مختلف دعائیں حدیثوں میں آئی ہیں جن میں سے ایک مختصر دعا یہ ہے۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَ سَقَانَا وَ جَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ﴾

''اس خدا کا شکر ہے جس نے کھلایا اور پلایا اور مسلمان بنایا۔''

آدابِ مجلس

آدابِ مجلس میں اصولی بات یہ ہے کہ مجلس میں تہذیب اور وقار کی شکل پیدا ہو' اور شرکائے مجلس میں ہر ایک کا حق برابر ہوتا کہ یہ مجلس شرکا کی باہمی محبت بڑھانے کا سبب ہو' ان ہی دو باتوں کو قائم رکھنے کے لیے آنحضرت ﷺ کی شریعت نے نشست و برخاست کے کچھ آداب سکھائے ہیں۔

(۱) مجلس میں انسان کو جہاں بے تکلف پہلے جگہ مل جائے' یعنی جہاں تک نشست کا دائرہ اس کے آنے تک پہنچ چکا ہے وہیں بیٹھ جانا چاہیے' یہ نہیں کرنا چاہیے کہ مجمع کو چیر کر خواہ مخواہ آگے بیٹھنے کی کوشش کرے' کیونکہ اس سے ایک تو پہلے سے آنے والوں اور بیٹھنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے' اور دوسرے ایسا کرنے والوں میں غرور و نخوت پیدا ہوتی ہے اور اپنے تشخص کا خیال پیدا ہوتا ہے' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ کی مجلسوں میں اسی طریقہ سے بیٹھتے تھے۔ (۴) انتہا یہ ہے کہ مسجدوں میں بعد کے آنے والے نمازیوں کے لیے یہ سزاوار نہیں کہ وہ لوگوں کو روندتے

---

(۱) ابوداؤد کتاب الاشربہ۔

(۲) ایضاً موطا امام محمد۔

(۳) صحیح مسلم کتاب الاشربہ۔

(۴) آداب المفرد باب یجلس الرجل حیث انتہی۔

ہوئے آگے کی صف میں بیٹھنے کی کوشش کریں' جمعہ کی نماز میں یہ خاص طور سے دیکھنے میں آتا ہے اس لیے تخطی رقاب یعنی دوسرے کی گردنوں کو روند کر اور زیرِ قدم لا کر آگے بڑھنے کو جمعہ میں خاص طور سے منع کیا گیا ہے۔

(۲) مجلس میں کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ پر نہیں بیٹھنا چاہیے' کیونکہ اس سے تفوق پسندی اور خود بینی کا اظہار ہوتا ہے اور دوسرے کے دل میں کدورت پیدا ہوتی ہے۔

(۳) اگر کوئی شخص مجلس میں ایک جگہ بیٹھ کر کسی ضرورت سے خود اٹھ جائے تو پلٹنے کے بعد وہی اس جگہ کا مستحق ہے دوسرا اس جگہ نہیں بیٹھ سکتا' کیونکہ وہ اس پر پہلے قابض ہو چکا تھا' اور اس کا یہ حق عارضی طور سے اٹھ جانے سے چلا نہیں جاتا۔

(۴) اگر مجلس میں دو شخص باہم مل کر بیٹھے ہوئے ہوں تو ان کی اجازت کے بغیر دونوں کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ [(۳)] کیونکہ اکثر دو شخص اس طرح باہم آپس میں بات چیت کرنے کے لیے یا کسی اور مصلحتِ باہمی سے بیٹھتے ہیں اور ان دونوں میں موانست اور بے تکلفی ہوتی ہے' ان کا الگ کر دینا ان کے تکدر اور وحشت کا باعث ہوتا ہے۔

(۵) اگر کچھ لوگ مجلس میں حلقہ باندھ کر بیٹھے ہوئے ہوں تو کسی کو اس حلقہ کے وسط میں نہیں بیٹھنا چاہیے ایسے شخص پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت بھیجی ہے' [(۴)] کیونکہ اس حالت میں کچھ لوگوں کی طرف اس کا منہ ہوگا اور کچھ لوگوں کی طرف پیٹھ ہوگی' جو ایک قسم کی بدتمیزی ہے' یہ بھی ممکن ہے کہ مسخرے لوگ اس طرح بیٹھتے ہوں تاکہ سب کو ہنسا سکیں' اور یہ صورت تہذیب و وقار کے خلاف ہے۔

(۶) مجلس میں کسی شخص کے گرد یا سامنے کسی کو کھڑا نہیں رہنا چاہیے' [(۵)] کیونکہ یہ عجمیوں کی عادت تھی کہ نوکر چاکر آقا کے اور رعایا بادشاہ کے گرد کھڑی رہتی تھی۔ اور یہ ایک ایسی مبالغہ آمیز تعظیم تھی جس کا ڈانڈا شرک سے مل جاتا ہے' اس طرح ایک شخص گویا خدا بنتا تھا اور دوسرے اس کے آگے اپنی شخصی خودداریوں اور عزتِ نفس کو فنا کر دیتے تھے جو اسلام جیسے مساوات پسند مذہب میں اچھا نہیں سمجھا جا سکتا۔

(۷) راستہ میں نہیں بیٹھنا چاہیے کیونکہ یہ وقار کے خلاف ہے اور ہر آیندو روند کو تکنا بداخلاقی ہے لیکن اگر ضرورت مجبور کرے تو ایسے موقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ چند اخلاقی باتوں کی پابندی کرنی چاہیے' یعنی نگاہ نیچی رکھنا' ضرر رساں چیزوں کو راستہ سے دور کرنا' سلام کا جواب دینا' نیکی کا حکم دینا' بری باتوں سے روکنا اور راستہ

(۱) ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی کراہیتان یقام الرجل من مجلسہ ثم یجلس فیہ۔

(۲) ترمذی ابواب الاستیذان باب اذا قام الرجل من مجلسہ ثم رجع ہواحق بہ۔

(۳) ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی کراہیۃ الجلوس بین الرجلین بغیر اذنھما۔

(۴) ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی کراہیۃ القعود وسط الحلقہ۔

(۵) ابوداؤد کتاب الادب باب فی قیام الرجل۔

بھولے ہوؤں کو راستہ دکھانا اور مصیبت میں مارے ہوؤں کی مدد کرنا۔ (۱)

(۸) انسان پر سب سے زیادہ صحبت کا اثر پڑتا ہے اس لیے اپنے ہم نشینوں کے انتخاب میں اس کا ضرور لحاظ رہے کہ وہ ایسے لوگ ہوں جن کی صحبت سے اس کو فائدہ پہنچے ہر انسان جس کی صحبت کو پسند کرتا ہے اس سے خود انسان کی فطری استعداد اور فطری مناسبت کا پتہ چلتا ہے۔ اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ روحیں ایک مخلوط فوج ہیں جن میں باہم آشنائی ہوتی ہے ان میں الفت وموانست پیدا ہو جاتی ہے اور جن میں بیگانگی ہوتی ہے ان میں تفریق واختلاف پیدا ہو جاتی ہے (۲) ایک مشہور مثل ہے کہ ''اگر کسی کے اخلاق کا پتہ لگانا چاہو تو اس کے دوستوں کے اخلاق کا پتہ لگاؤ۔'' اس نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ان لفظوں میں ظاہر کیا ہے کہ ''آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے اس لیے ہر شخص کو یہ دیکھ لینا چاہیے کہ وہ کس سے دوستی کرتا ہے۔'' پھر فرمایا کہ اچھے ہم نشین اور برے ہم نشین کی مثال مشک بیچنے والے اور لوہار کی بھٹی جیسی ہے مشک بیچنے والے سے تم کو کچھ فائدہ ضرور پہنچے گا۔ یا اس کو خریدو گے یا اس کی خوشبو پاؤ گے لیکن لوہار کی بھٹی تمہارا گھر یا کپڑا جلائے گی۔ یا تمہارے دماغ میں اس کی ناگوار بو پہنچے گی۔ (۳)

مجلس میں جو معزز جگہ ہو وہاں بیٹھنے کی از خود کوشش نہ کی جائے کسی دوسرے کے یہاں جائے تو بھی اس کی اجازت کے بغیر اس کی معزز جگہ پر بیٹھنے کی کوشش نہ کرے فرمایا کہ ''اپنے بھائی کی معزز جگہ پر اس کی اجازت کے بغیر کوئی نہ بیٹھے۔'' (۴)

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ مجلس میں یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس معزز جگہ میں نہیں تو اس سے جس قدر قریب جگہ ہو اسی میں بیٹھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صدر نشین کے پاس جگہ بہت تنگ ہو جاتی ہے اور لوگوں کو وہاں سے ذرا سرکنے اور دوسروں کے لیے جگہ بنانے کے لیے کہا جائے تو وہ برا مانتے ہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس ادب کو سکھایا فرمایا:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ (مجادلۃ:۱۱)

''اے مسلمانو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں میں کشادگی کرو تو کشادگی کرو اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کشادگی کرے گا اور اگر کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ جاؤ اللہ ان کے رتبے اونچے کرے گا جو تم میں سے

(۱) ابوداؤد کتاب الادب باب فی الجلوس فی الطرقات۔

(۲) ادب المفرد باب الارواح جنود مجندہ۔

(۳) بخاری کتاب البیوع باب فی العطار و بیع المسک۔

(۴) ترمذی باب الاستیذان

ایمان لائے اور جن کو علم دیا گیا اور اللہ تمہارے کاموں کی خبر رکھتا ہے۔“

اسی طرح مجلس میں بیٹھ کر اس طرح آپس میں کانا پھوسی نہیں کرنی چاہیے کہ دوسرے حاضرین کو یہ معلوم ہو کہ آپ ان ہی کی نسبت کچھ کہہ رہے ہیں، منافقوں کے اس طرزِ عمل کی برائی قرآن پاک نے برملا کی ہے۔

﴿اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (مجادلہ:۱۰)

”یہ جو ہے کانا پھوسی سو شیطان کا کام ہے کہ دل گیر کرے ایمان والوں کو۔“

جہاں چند آدمی بیٹھے ہوں، وہاں کوئی دو آدمی آپس میں ایسی سرگوشی کرنے لگتے ہیں تو دوسروں کو یہ برا معلوم ہوتا ہے، ایک تو یہ خیال ہوتا ہے کہ انہوں نے ہم کو اس راز کے قابل نہیں سمجھا، دوسرے یہ کہ بدگمانی ہوتی ہے کہ وہ شاید ہماری ہی نسبت کچھ کہہ رہے ہیں اس لیے ارشاد ہوا کہ ”تیسرے کو چھوڑ کر دو آدمی آپس میں سرگوشی نہ کریں کہ اس سے تیسرا غمگین ہوگا۔“

مجلس کی راز کی باتوں کو برملا نہیں بیان کرنا چاہیے کہ المجالس بالامانۃ۔ قول نبوی ہے۔ [1]

آدابِ ملاقات

اسلام میں معاشرتی حیثیت سے دوستوں کی ملاقات کے لیے جانا ایک ثواب کا کام ہے، ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص نے کسی مریض کی عیادت کی یا بھائی کی (جس کی اخوت فی اللہ ہو) ملاقات کو گیا تو ایک پکارنے والا اس کو آواز دے گا کہ تم اچھے، تمہارا آنا اچھا اور تم نے جنت میں اپنے لیے ایک مکان بنالیا۔ [2]

اسلام نے ملاقات کے جو آداب مقرر کیے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) دوستوں کی ملاقات کے وقت چہرہ سے خوش دلی اور مسرت ظاہر کرنی چاہیے اسی لیے فرمایا کہ ”تمہارا اپنے بھائی کے سامنے مسکرانا یہ بھی صدقہ ہے۔“ [3] ملاقات کے وقت سب سے پہلے جو کلمہ منہ سے نکلے وہ محبت اور امن و سلامتی کا پیام ہو جس کو شریعت نے ﴿اَلسَّلَامُ عَلَيْكُم﴾ ”تم پر سلامتی ہو۔“ کے لفظوں میں ترتیب دیا ہے چھوٹے بڑے کو، بڑے چھوٹے کو سب سے پہلے یہی پیام دیں۔

دنیا کی تمام قوموں میں ملاقات کے وقت خوشی اور محبت کے ظاہر کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی لفظ یا فقرہ کہنے کا رواج تھا اور عرب کے لوگ ملاقات کے وقت ﴿اَنْعَمَ اللّٰهُ بِكَ عَيْنًا وَ اَنْعِمْ صَبَاحًا﴾ کہتے تھے یعنی تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔“ تمہاری صبح خوش گوار ہو۔“ امراء و سلاطین کے لیے دوسرے الفاظ تھے ایرانی ہزار سال بزی ”ہزار برس جیو“ کا فقرہ کہتے تھے، یورپ کے لوگوں میں صبح کو ”گڈ مارننگ“ (اچھی صبح) شام کو ”گڈ ایوننگ“

(۱) ابوداؤد کتاب الادب باب فی نقل الحدیث۔

(۲) ایضاً۔

(۳) ترمذی کتاب البر والصلہ باب ماجاء فی زیارۃ الاخوان۔

(اچھی شام) رات کو (گڈ نائٹ) ''اچھی رات'' وغیرہ کہنے کا رواج ہے' مگر اسلام نے ان سب کے بجائے ﴿اَلسَّلَامُ عَلَیْکُم﴾ کا لفظ ایجاد کیا اور اس میں حسبِ ذیل مصلحتیں ملحوظ رکھیں۔

(۱) یہ تمام انبیاء علیہم السلام کا متفقہ طریقہ ہے جیسا کہ قرآن پاک میں اس کے استعمالات سے جو انبیا علیہم السلام کی زبان مبارک سے ادا ہوئے ہیں ﴿و السلام علی﴾ (مریم) یا ان کے متعلق کہے گئے ہیں ﴿وَ سَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ﴾ (صفت) ظاہر ہوتا ہے۔

(۲) اس کی صورت ذکر و دعا کی ہے دنیوی تمتعات مثلاً طولِ عمر وغیرہ سے اس کو تعلق نہیں' اور نہ محدود و معین اوقات سے مقید ہے' اس میں دائمی اور سرمدی سلامتی کا راز چھپا ہے۔

(۳) اس میں مذہبی شان زیادہ پائی جاتی ہے کیونکہ اس سلامتی سے مقصود جس کی طرف السلام کا الف لام اشارہ کرتا ہے وہ سلامتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر نازل ہوتی ہے۔

(۴) اس میں مبالغہ آمیز تعظیم نہیں پائی جاتی جو بندگی' کورنش' آداب عرض اور دوسرے قسم کے غیر مشروع طریقوں میں پائی جاتی ہے' یہی وجہ ہے کہ جب حضرت قیسؓ بن سعد نے آپ ﷺ سے کہا کہ میں نے حیرہ والوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے رئیسوں کو سجدہ کرتے ہیں تو آپ ﷺ اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ ہم لوگ آپ ﷺ کو سجدہ کیا کریں تو آپ ﷺ نے ان کو اس کی اجازت نہیں دی' (۱) ایک اور شخص نے کہا کہ یا رسول اللہ! جب ہم میں کوئی اپنے بھائی یا دوست سے ملتا ہے تو کیا اس کے لیے جھک جائے' فرمایا ''نہیں'' اس نے کہا تو اس سے لپٹ جائے اور اس کا بوسہ لے' فرمایا ''نہیں'' (۲) اس نے کہا کہ اس کا ہاتھ پکڑ لے اور اس سے مصافحہ کرے فرمایا ''ہاں''۔

(۵) دنیا میں انسان کو جو بہتر سے بہتر دعا دی جا سکتی ہے وہ اسی سلامتی کی ہے کہ یہ جان و مال' آل و اولاد' دنیا و آخرت ہر قسم کی سلامتی کو مشتمل ہے۔

(۶) جب دو انسان آپس میں ملتے تھے تو ایک دوسرے سے بیگانگی کے سبب سے متوحش اور چوکنے ہوتے تھے اور ڈرتے تھے کہ کہیں غفلت پا کر دشمنی نہ کرے' اب جب کہ اسلام کے قاعدہ کے مطابق دونوں اس لفظ کو اپنے اپنے منہ سے ادا کرتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی طرف سے اطمینان دلاتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔

(۷) اسلام نے اپنے پیرووں کے درمیان اس کو گویا آپس میں پہچان کی علامت اور ''واچ ورڈ'' مقرر کیا ہے' آمنے سامنے جب دونوں سے یہ لفظ نکلتے ہیں تو دونوں اپنے سینوں میں ہزار بیگانگی کے باوجود آشنائی کی لہر پاتے ہیں اور آپس میں محبت کی کشش محسوس کرتے ہیں' یہ بتاتا ہے کہ دونوں ایک ہی ملتِ محمدیہ کے ایمانی فرزند ہیں۔

(۱) ابوداؤد کتاب النکاح باب فی حق الزوج علی المراۃ۔

(۲) یہ ممانعت اسی موقع سے مخصوص ہے جہاں کوئی شرعی محذور ہو مثلاً ملنے والا امرد ہو یا کوئی اور شہوت انگیز صورت ہو۔

جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو سب سے پہلے جو تعلیم دی، وہ یہ تھی:

((یَآ اَیُّھَا النَّاسُ اَفْشُوا السَّلَامَ وَ اَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَ صَلُّوا وَ النَّاسُ یَنَامُ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ)) (۱)

''لوگو! باہم سلام کو پھیلاؤ، کھانا کھلاؤ، اور جب تمام لوگ سو رہے ہوں تو نماز پڑھو، یہ سب کرو گے تو جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔''

ایک دوسری حدیث میں سلام کی غرض و غایت بھی بیان فرما دی اور فرمایا کہ تم لوگ اس وقت تک جنت میں داخل نہ ہو گے جب تک ایمان نہ لے آؤ اور اس وقت تک ایمان نہ لاؤ گے جب تک آپس میں محبت نہ کرو۔ میں تم کو ایک ایسی بات بتاتا ہوں کہ جب تم اس پر عمل کرو گے تو باہم محبت کرنے لگو گے اور وہ یہ ہے کہ باہم سلام کو پھیلاؤ۔ (۲)

سلام کرنے کے لیے شناسا و غیر شناسا، جانے اور انجانے کی تخصیص نہیں۔ (۳) مرد اور عورت کی تفریق نہیں (۴) بڑے اور بچہ کی تمیز نہیں، (۵) البتہ اسلام نے سلام کی ابتداء کرنے کے لیے دو اصولوں کو ملحوظ رکھا ہے جو تمام متمدن قوموں میں رائج تھے، ایک یہ کہ چھوٹا ادب و احترام کا لحاظ کرے، اور اس اصول کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ چھوٹا بڑے، کو گذرنے والا بیٹھنے والے کو اور چھوٹی جماعت بڑی جماعت کو سلام کرے، دوسرا یہ کہ سلام کے ذریعہ سے تواضع و خاکساری کا اظہار ہو اس اصول کی بنا پر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سوار کو پیدل چلنے والے کو سلام کرنا چاہیے۔ (۶)

ان مصالح کے لحاظ سے آپؐ نے اپنے اہل و عیال کو بھی لوگوں کو بھی گھر میں جانے کے وقت سلام کرنے کا حکم دیا اور اس کو موجبِ برکت قرار دیا، (۷) مجلس سے اٹھ کر جاتے وقت بھی لوگوں کو سلام کرنا چاہیے (۸) سلام میں رحمۃ اللہ و برکاتہ کے الفاظ کا اضافہ کرنا اور بھی موجبِ ثواب ہے۔ چنانچہ ایک بار ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا ﴿اَلسَّلَامُ عَلَیْکُم﴾ آپؐ نے فرمایا اس کو دس نیکیاں ملیں، دوسرا آدمی آیا تو کہا ﴿اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَ رَحْمَتُ اللّٰہِ﴾ آپؐ نے فرمایا اس کو بیس نیکیاں ملیں۔ تیسرا آدمی آیا اور اس نے کہا ﴿اَلسَّلَامُ

(۱) ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی المصافحہ۔
(۲) ترمذی ابواب الزہد ص ۴۰۹۔
(۳) ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی افشاء السلام۔
(۴) بخاری کتاب الاستیذان باب السلام للمعرفتہ۔
(۵) بخاری کتاب الاستیذان باب تسلیم الرجال علی النساء والنساء علی الرجال۔
(۶) بخاری کتاب الاستیذان باب التسلیم علی الصبیان۔
(۷) کتاب الاستیذان باب فی تسلیم الراکب علی الماشی۔ ترمذی کتاب الاستیذان باب فی التسلیم اذا دخل بیتہ۔
(۸) ترمذی کتاب الاستیذان باب التسلیم عند القیام والقعود۔

عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُه﴾ آپؐ نے فرمایا اس کو تیس نیکیاں ملیں۔ (۱)

جس شخص کو سلام کیا جائے اس کا یہ فرض ہے کہ سلام کا جواب اسی طریقہ سے بلکہ اس سے بہتر طریقہ سے دے یعنی سلام کرنے والے نے جو الفاظ کہے ہیں ان پر دوسرے مناسب الفاظ کا اضافہ کرے ورنہ کم از کم وہی الفاظ دہرا دے چنانچہ خود قرآن مجید نے یہ تعلیم دی ہے۔

﴿وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا﴾ (نساء:۱۶)

''اور (مسلمانو!) جب تم کو کسی طرح پر سلام کیا جائے تو تم (اس کے جواب میں) اس سے بہتر (طور پر) سلام کرو یا (کم سے کم) ویسا ہی جواب دو۔''

اس سے کم الفاظ کا جواب دینا اگرچہ فقہا کے نزدیک جائز ہے لیکن آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ استحسانًا ناکافی ہے۔

(۱) ملاقات کے وقت اظہارِ محبت اور اظہارِ مسرت کا دوسرا ذریعہ مصافحہ ہے اور اس سے اسلام کے اغراض کی تکمیل ہوتی ہے اس لیے اسلام نے اس کو بھی سلام کا ایک جزو قرار دیا' اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اسلام کا تکملہ ہاتھ کا پکڑنا یعنی مصافحہ کرنا ہے' (۲) مدینہ میں سب سے پہلے یہ تحفہ اہل یمن لائے (۳) اور رسول اللہ ﷺ نے اس کو قبول کر لیا اور مسلمانوں کے درمیان محبت اور اتحاد کا ایک ذریعہ قرار دیا' بعض حالات میں ملاقات کے وقت معانقہ کرنے یا بوسہ دینے کی جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے ممانعت آئی ہے لیکن اگر کوئی شرعی محذور نہ ہو تو اس کی اجازت بھی ہے' چنانچہ ایک بار حضرت زید بن حارثہؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے ان کو گلے لگا لیا اور ان کا بوسہ لیا۔ (۴)

کسی محبوب و محترم شخص کو آتے ہوئے دیکھ کر جوشِ محبت اور جوشِ عقیدت میں کھڑا ہو جانا بھی ممنوع نہیں' حضرت فاطمہؓ جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آتی تھیں تو آپؐ کھڑے ہو جاتے تھے' ان کا ہاتھ چومتے تھے اور اپنی جگہ ان کو بٹھاتے تھے' اور جب آپؐ ان کے یہاں آتے تھے تو وہ بھی یہی برتاؤ کرتی تھیں' ایک موقع پر جب حضرت سعدؓ بن معاذ جو بیمار اور زخمی تھے' آئے تو آپؐ نے تمام صحابہؓ کو حکم دیا کہ اٹھ کر جائیں اور ان کو لے آئیں۔ (۵)

دوسری قوموں میں ملاقات اور مجلس کے وقت بعض مشرکانہ قسم کے آداب جاری تھے' اسلام نے ان کو یک

---

(۱) ترمذی کتاب الاستیذان باب ماذکر فی فضل السلام۔

(۲) ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی المصافحہ۔

(۳) ابوداؤد کتاب الادب باب فی المصافحہ۔

(۴) ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی المعانقہ والقبلہ۔

(۵) یہ دونوں واقعے ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی القیام میں ہیں۔

قلم منسوخ کر دیا، ایک طریقہ یہ تھا کہ لوگ محبت کے بجائے غلامانہ اور بندگی کی ذہنیت سے اپنے امیروں اور بادشاہوں کے لیے کھڑے ہوتے تھے اور اسی طرح کھڑے رہ جاتے تھے، آپ نے اس سے منع کیا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے لیے ایسے نہ کھڑے ہوا کرو، جیسے عجمی کھڑے ہوتے ہیں۔ (۱)

اس قسم کے موقعوں پر خوش آمدید کے الفاظ مثلاً ''مرحبا'' کہنے کی مثال بھی شریعت میں موجود ہے۔ (۲)

(۳) ملاقات یا کسی اور کام کے لیے کسی کے گھر میں جانے کے لیے صاحبِ خانہ سے اجازت لے لینا ضروری ہے اور اس کا حکم اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں دیا ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَاۤ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ وَ اِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ○﴾ (نور: ۲۷-۲۸)

''مسلمانو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں گھر والوں سے پوچھے، اور ان سے سلام علیک کیے بغیر نہ جایا کرو، یہ تمہارے حق میں بہتر ہے (یہ حکم تم کو اس غرض سے دیا گیا ہے کہ جب ایسا موقع ہو تو تم اس کا خیال رکھو) پھر اگر تم کو معلوم ہو کہ گھر میں کوئی آدمی موجود نہیں تو جب تک تمہیں (خاص) اجازت نہ ہو ان میں نہ جاؤ اور اگر (گھر میں کوئی ہو اور) تم سے کہا جائے کہ (اس وقت موقع نہیں) لوٹ جاؤ تو (بے تامل) لوٹ آؤ، یہ (لوٹ آنا) تمہارے لیے زیادہ صفائی کی بات ہے، اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس کو جانتا ہے۔''

غیر محرم عورتوں سے ملنے کے لیے ان کے شوہروں سے اجازت لینے کی ضرورت ہے۔ (۳)

کسی کے گھر میں داخل ہونے کے لیے اجازت لینے کے اگرچہ اور بھی بہت سے فائدے ہو سکتے ہیں لیکن اس کا اصلی مقصد یہ ہے کہ انسان بعض اوقات ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ دوسروں کی نگاہ اس پر پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کسی مکان پر جاتے تھے تو چونکہ اس وقت دروازوں پر پردہ ڈالنے کا رواج نہ تھا، (۴) اس لیے اجازت لینے سے پہلے دروازہ کے دائیں یا بائیں کھڑے ہوتے تھے، سامنے نہیں کھڑے ہوتے تھے۔ (۵) تاکہ اندر کی چیزوں پر نگاہ نہ پڑے، ایک بار ایک شخص آئے اور آپ کے دروازہ کے

(۱) ابوداؤد کتاب الادب باب قیام الرجل للرجل۔

(۲) ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی مرحبا۔

(۳) ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی النہی عن الدخول علی النساء الا باذن ازواجہن۔

(۴) ابوداؤد کتاب الادب باب الاستیذان فی عورات الثلاث۔

(۵) ادب المفرد باب کیف یقوم عند الباب۔

سامنے کھڑے ہو گئے۔ تو آپ نے فرمایا کہ دروازہ کے دائیں یا بائیں کھڑے ہو کیونکہ اجازت لینے کا حکم اسی لیے دیا گیا ہے کہ گھر کے اندر کی چیزوں پر نگاہ نہ پڑنے پائے۔ (۱) ایک حدیث میں ہے کہ اگر بلا اجازت کوئی شخص کسی کے گھر میں تاک جھانک کرے اور کوئی اس کی آنکھ پھوڑ دے تو اس پر الزام نہیں۔ (۲) ایک بار کسی نے آپؐ کے حجرہ میں تاک جھانک کی، آپؐ اس وقت ایک لوہے کی کنگھی سے سر جھاڑ رہے تھے، فرمایا اگر میں یہ جانتا کہ تم دیکھ رہے ہو تو اس کو تمہاری آنکھوں میں کونچ دیتا پھر فرمایا **انما جعل الاذن من قبل البصر انما جعل الاستیذان من اجل البصر** اجازت کی ضرورت تو اسی لیے ہے کہ اس کو دیکھو نہیں۔ (۳)

اجازت لینے کا طریقہ یہ ہے کہ سلام کر کے یہ کہے کہ میں اندر آ سکتا ہوں (۴) تین بار سلام کرنے کے بعد اگر اجازت نہ ملے تو واپس جانا چاہیے۔ (۵) اگر کسی کو خود بلایا جائے تو اس کو اجازت لینے کی ضرورت نہیں، (۶) اگر کوئی شخص گھر کے دالان میں بیٹھا ہوا ہو اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا نہ ہو تو اس وقت بھی اجازت لینا غیر ضروری ہے، (۷) دو کانوں میں جانے کے لیے اور اسی قسم کے دوسرے پبلک مقامات میں بھی اجازت لینا ضروری نہیں خود اپنے گھر کے اندر بھی سلام کر کے جانا چاہیے، اس سے برکت کے علاوہ یہ فائدہ ہوگا کہ اگر گھر میں عورتیں بے تکلفی کی حالت میں ہوں گی یا گھر میں غیر محرم عورتیں آ گئی ہیں تو وہ ہوشیار ہو جائیں۔

یہ آداب تو اجنبی اور نا آشنا لوگوں کے لیے تھے، لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جن سے پردہ کرنا ضروری نہیں اور وہ ہر وقت گھر میں آتے جاتے رہتے ہیں، مثلاً چھوٹے چھوٹے بچے، یا لونڈی غلام، اس لیے اگر ان کے لیے بھی ہر وقت اجازت لینے کی ضرورت ہو تو اس سے بڑی تکلیف ہوگی، البتہ خاص خاص اوقات میں جن میں لوگ اکثر بے پردہ رہتے ہیں، ان کے لیے بھی اذن طلب کرنا ضروری ہے، اور خود قرآن مجید نے ان اوقات کی تعیین کر دی ہے یعنی نماز عشا کے بعد سے نماز صبح سے پہلے تک کہ کپڑے اتار کر سونے کا وقت ہے، اور دوپہر کو جب قیلولہ کے لیے کوئی لیٹے کہ یہ بھی تخلیہ کا وقت ہے، فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ

(۱) ابوداؤد کتاب الادب فی الاستیذان۔

(۲) ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالۃ البیت و بخاری کتاب الدیات باب من اطلع فی بیت قوم ففقؤا عینیہ فلا دیۃ لہ۔

(۳) اس کتاب کے صفحہ ۸۸ میں اس حدیث کے لفظ یہ لکھے گئے ہیں۔ انما الاذن لاجل الرؤیۃ مگر صحیح لفظ یہ ہیں جو یہاں نقل کیے گئے ہیں دیکھیے صحیح بخاری کتاب الاستیذان باب الاستیذان من اجل البصر و کتاب الدیات باب من اطلع فی بیت قوم۔

(۴) ابوداؤد کتاب الادب باب فی استیذان۔

(۵) ابوداؤد کتاب الادب باب کم مرۃ یسلیم الرجل فی الاستیذان۔

(۶) ادب المفرد باب مالا یستاذن فیہ۔

(۷) ادب المفرد باب الاستیذن فی حوانیت السوق۔

ثَلٰثَ مَرّٰتٍ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَ حِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِنَ الظَّهِيْرَةِ وَ مِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ بَعْدَهُنَّ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○ وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (نور:۵۸-۵۹)

''مسلمانو! تمہارے ہاتھ کے مال (یعنی لونڈی غلام) اور تم میں سے جو سنِ بلوغ کو نہیں پہنچے' تین وقتوں میں تمہارے پاس آنے کی تم سے اجازت لے لیا کریں (ایک تو) نمازِ صبح سے پہلے اور (دوسرے) جب تم دوپہر کو (سونے کے لیے معمول کے مطابق) کپڑے اتار دیا کرتے ہو اور (تیسرے) نمازِ عشا کے بعد (یہ) تین وقت تمہارے پردے کے وقت ہیں' ان (اوقات) کے سوا نہ (تو بے اذن آنے دینے میں) تم پر کچھ گناہ اور نہ (بے اذن چلے آنے میں) ان پر (کچھ گناہ کیونکہ وہ) اکثر تمہارے پاس آتے جاتے رہتے ہیں۔ (اور) تم میں سے بعض کو (یعنی لونڈی غلاموں کو) بعض (یعنی تمہارے) پاس آنے جانے کی ضرورت لگی ہی رہتی ہے (تو بار بار اذن مانگنے میں تم لوگوں کو بڑی تکلیف ہوگی) یوں اللہ (اپنے) احکام تم سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے' اور اللہ جاننے والا' حکمت والا ہے اور (مسلمانو!) جب تمہارے لڑکے حدِ بلوغ کو پہنچیں تو جس طرح ان سے اگلے (یعنی ان سے بڑی عمر کے گھروں میں آنے کے لیے) اذن مانگا کرتے ہیں اس طرح ان کو بھی اذن مانگنا چاہیے۔''

آدابِ گفتگو

آدابِ گفتگو میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نرمی سے گفتگو کریں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہما السلام کو ہدایت ہوتی ہے کہ تم فرعون کے پاس جاؤ تو اس سے نرمی کے ساتھ باتیں کرو:

﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا﴾ (طٰہٰ:۴۴)

''تو تم ان سے نرم بات کہنا۔''

پھر جو بات کہی جائے وہ بھی اچھی ہو' فائدہ مند' اس کے کہنے میں اپنا یا دوسرے کا نفع ہو' اسی لیے فرمایا:

﴿وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ (بقرہ:۸۳)

''اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔''

مجلس میں بیٹھیں تو ایسے فقرے نہ کہیں جن میں کسی پر کوئی طعن چھپا ہو یا کسی کی تحقیر نکلتی ہو یہود آنحضرت ﷺ کی مجلس میں آتے تو اسی قسم کی باتیں کہتے ﴿اُنْظُرْنَا﴾ (ہمارا خیال کیجیے) کی جگہ ﴿رَاعِنَا﴾ کہتے جس میں تخفیف کا چھپا پہلو نکلتا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس سے باز رکھا' فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا﴾ (بقرہ:۱۰۴)

''اے ایمان والو! ﴿رَاعِنَا﴾ نہ کہو ﴿اُنْظُرْنَا﴾ کہو۔''

اس کی پوری تفصیل سورۂ نساء رکوع ۷ میں ہے۔

باتیں ایسی کرنی چاہئیں جو منصفانہ اور درست ہوں' اگر جماعت کے بیشتر افراد اس کا لحاظ رکھیں تو آپس میں لڑائی جھگڑا بہت کم ہو اور لوگوں کے درمیان دشمنی اور عداوت نہ پیدا ہو' فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا ○ یُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾ (احزاب: ۷۰۔۷۱)

''اے ایمان والو! خدا سے تقویٰ کرو' اور بات سیدھی کہو' اللہ تمہارے کاموں کو سنوارے گا اور تمہارے گناہ معاف کرے گا۔''

عورتوں کو جب نامحرم مردوں سے گفتگو کا اتفاق ہو تو بات میں اور لہجہ میں ایسی نزاکت اور لوچ نہ ہو کہ سننے والے کے دل میں بدی کا خیال پیدا ہو' فرمایا:

﴿فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا﴾ (احزاب: ۳۲)

''تو (اے نبی کی بی بیو!) دبی زبان سے بات نہ کیا کرو' ایسا کرو گی تو جس کے دل میں کسی طرح کا کھوٹ ہے وہ خدا جانے تم سے کسی طرح کے توقعات پیدا کرلے گا اور بات کرو تو معقول بے لاگ۔''

مردوں کو نرم' معقول اور دل جوئی کے ساتھ باتیں کرنے کی تاکید آئی اور اس کا ثواب صدقہ کے برابر بتایا ہے' فرمایا:

﴿قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَیْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ یَّتْبَعُهَاۤ اَذًى﴾ (بقرہ: ۲۶۳)

''نیک بات کہنی اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری ہو۔''

بات کی جائے تو آہستگی کے ساتھ' بے موقع چیخ کر باتیں کرنا حماقت کی دلیل ہے' فرمایا:

﴿وَ اغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ﴾ (لقمان: ۱۹)

''اور کچھ اپنی آواز پست کر' کہ سب آوازوں میں بری آواز گدھوں کی ہے۔''

فضول باتوں سے پرہیز کرنا وقار کی نشانی ہے' مسلمانوں کی صفت یہ ہو۔

﴿وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ﴾ (المومنون: ۳)

''جو لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔''

کیونکہ انسان جو بات بھی منہ سے نکالتا ہے اس پر خدا کا فرشتہ گواہ رہتا ہے۔ خدا فرماتا ہے:

﴿مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ﴾ (قٓ: ۱۸)

''آدمی کوئی لفظ نہیں بولتا' لیکن ایک نگران اس پر حاضر رہتا ہے۔''

اس لیے ہر شخص بات منہ سے نکالنے سے پہلے اس کے ہر پہلو کو سوچ لے۔

حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ نیک بات کہے یا چپ رہے۔"(۱) اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے کی قید کے ساتھ حضور کا یہ فرمانا ادھر اشارہ کرتا ہے کہ ہم اپنے عمل کی جزا سے غفلت نہ کریں' کیونکہ جب ہم بری بات بولیں گے تو اس کی جزا بھی پائیں گے' ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "آدمی کے اسلام کی خوبیوں میں سے ایک یہ ہے کہ جس چیز سے اس کو مطلب نہ ہو ادھر توجہ نہ دے۔" (۲) یہ حدیث ان جوامع الکلم میں سے ہے جو دیکھنے میں تو بہت مختصر ہیں مگر درحقیقت اس کوزہ میں دریا بند ہے۔ مسلمان اگر اسی بات کا دھیان رکھیں تو مسلمانوں کے بہت سے کام بن جائیں۔

زبان انسان کو اظہار مطلب کے لیے ملی ہے' اسی لیے ضروری ہے کہ پہلے مطلب یعنی گفتگو کا مقصد و معنی درست اور صحیح ہوں' پھر ان کے اظہار کا طریقہ مناسب ہو اور یہ دونوں باتیں اعراض عن اللغو میں داخل ہیں' اگر کوئی مخاطب ایسا ہو جو ان دو باتوں میں سے کسی ایک میں کمی کرے تو اسلام کی ہدایت ہے کہ ایسے جاہل کا جواب بھی تلخ نہ دیا جائے' اور اپنی سلامت روی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔

﴿وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا﴾ (فرقان:۶۳)

"اور جب ناسمجھ ان کو خطاب کریں تو وہ جواب میں سلامتی کی بات کہیں۔"

گفتگو بضرورت کرنی چاہیے' احادیث میں ایسے لوگوں کی بہت برائی آئی ہے جو فضول باتیں کرتے ہوں' اور بکواس میں مبتلا رہتے ہوں' اور فرمایا ہے کہ ایسے لوگ امت کے بدترین افراد ہیں۔ (۳) یہ بھی فرمایا کہ اسی ایک بات سے یا تو اللہ تعالیٰ کی تاقیامت خوشنودی حاصل ہو جاتی ہے اور یا اس کی تاقیامت ناراضی ہاتھ آتی ہے' (۴) یہ حدیث ہم کو اپنی گفتگو کے ہر لفظ کی اہمیت کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ دین اور دنیا کے بہت سے کاموں کا رخ صرف زبان کے سبب سے ادھر یا ادھر پھر جاتا ہے یہی زبان نیکی کا ذریعہ بھی ہے اور یہی برائی کا آلہ بھی ہے اس سے دین بھی سدھرتا ہے اور دنیا بھی اور اسی سے دونوں کے کام بگڑ بھی جاتے ہیں' اسی لیے آیا ہے کہ جو دونوں جبڑوں کے بیچ یعنی زبان پر پورا قابو رکھے گا وہ جنت میں جائے گا۔ (۵)

مخاطب کو جو بات اچھی طرح سمجھانی ہو اس کو صفائی اور سہولت کے ساتھ کہا جائے بلکہ اس کو دہرا کر کہا

(۱) کتاب الایمان باب الحث علی اکرام الجار والضیف۔

(۲) موطا و شرعہ للباجی باب ماجاء فی الصدق والکذب و ترمذی کتاب الزہد۔

(۳) ادب المفرد باب فضول الکلام۔

(۴) موطا امام مالک باب یومر بہ من التحفظ فی الکلام۔

(۵) موطا امام مالک باب ماجاء فی مایخاف من اللسان۔

جائے تا کہ وہ اچھی طرح سمجھ جائے اسی غرض سے جب رسول اللہ ﷺ کوئی بات کہتے تھے تو تین بار اس کا اعادہ فرماتے تھے (۱) اور گفتگو اتنی جلدی جلدی نہیں کرتے تھے کہ مخاطب ہر لفظ کے مفہوم کو اپنی گرفت میں نہ لا سکے' ایک بار حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حجرہ کے پہلو میں بیٹھ کر حضرت ابو ہریرہؓ نے بڑی تیزی کے ساتھ حدیث بیان کرنی شروع کی حضرت عائشہؓ نے اس پر اعتراض کیا کہ رسول اللہ ﷺ ایسی تیزی کے ساتھ گفتگو نہیں کرتے تھے' بلکہ اس طرح ٹھہر ٹھہر کے گفتگو کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص آپؐ کے الفاظ کو گننا چاہتا تو گن سکتا تھا (۲) حضرت جابرؓ بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے کلام میں ترتیل و ترسیل پائی جاتی تھی' یعنی ہر لفظ جدا جدا ہوتا تھا اور گفتگو میں عجلت نہیں فرماتے تھے' اسی مفہوم کو حضرت عائشہؓ اس طرح ادا فرماتی ہیں۔

((کَانَ کَلَامُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ کَلَامًا فَصْلًا یَفْهَمُهُ کُلُّ مَنْ سَمِعَهُ)) (۳)

''رسول اللہ ﷺ کا کلام ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتا تھا اور جو شخص اس کو سنتا تھا سمجھ لیتا تھا۔''

گفتگو نہایت مختصر الفاظ میں کرنی چاہیے' ایک بار ایک شخص نے نہایت طویل گفتگو کی یا طویل خطبہ دیا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے سنا تو فرمایا کہ اگر وہ میانہ روی اختیار کرتا تو اس کے لیے بہتر ہوتا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ مجھ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں گفتگو میں اختصار کروں کیونکہ اختصار بہتر ہے۔ (۴)

گفتگو یا تقریر سے بعض اوقات فخر و مباہات اور شہرت مقصود ہوتی ہے' بعض اوقات اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنایا جاتا ہے' کبھی اس سے صرف تفریح مقصود ہوتی ہے' ان اغراض کے حاصل کرنے کے لیے لوگ نہایت مسجع' مقفی' اور تکلف آمیز تقریر کرتے ہیں گفتگو کو طول دیتے ہیں' چبا چبا کے باتیں کرتے ہیں' رسول اللہ ﷺ نے ان تمام باتوں کی ممانعت کی اور فرمایا کہ ''خدا اس بلیغ آدمی کو مبغوض رکھتا ہے جو اپنی زبان کو اس طرح توڑتا مروڑتا ہے جس طرح بیل اپنی زبان کو توڑ مروڑ کے گھاس کھاتا ہے۔'' نیز فرمایا کہ ''جو شخص اسلوبِ کلام میں اس لیے ادل بدل کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنائے خدا قیامت کے دن اس کا فدیہ و توبہ قبول نہ کرے گا۔ (۵)

جب چند لوگوں کے سامنے کوئی بات کہی جائے تو التفات ایک ہی طرف نہ رہے بلکہ ٹھہر ٹھہر کر ہر ایک کی

(۱) ابوداؤد کتاب العلم باب فی سرد الحدیث۔
(۲) ابوداؤد کتاب العلم باب فی سرد الحدیث۔
(۳) ابوداؤد کتاب الادب باب الہدی فی الکلام۔
(۴) ابوداؤد کتاب الادب ماجاء فی الاختصار فی الکلام۔
(۵) ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی المتشدق فی الکلام۔

طرف منہ کیا جائے تا کہ دوسروں کو عدم التفات کی شکایت نہ پیدا ہو جائے۔[1]

باہر نکلنے اور چلنے پھرنے کے آداب

آدمی کو راستہ میں متانت، سنجیدگی اور خاکساری کے ساتھ قدم اٹھانا چاہیے، خدا اچھے مسلمانوں کی تعریف میں فرماتا ہے۔

﴿وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ (فرقان:۶۳)

''اور رحمت والے خدا کے بندے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر دبے پاؤں۔''

اکڑ کر نہیں چلنا چاہیے یعنی چال میں غرور اور تبختر کے انداز نہ ہوں، فرمایا:

﴿وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّکَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَ لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا۝﴾ (بنی اسرائیل:۳۷)

''اور زمین میں اکڑ کر نہ چل (کہ اس طرح چل کر) نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ پہاڑوں تک اونچائی میں پہنچ سکتا ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ﴾ (لقمان:۱۸)

''اور زمین میں اکڑ کر نہ چل، بے شک اللہ مغرور اور فخار کو پسند نہیں کرتا۔''

عورت کو بجنے والے زیور مثلاً پازیب چھڑنے یا جھانجھ پہن کر چلنے میں زمین پر زور زور سے پاؤں نہیں رکھنا چاہیے کیونکہ اس کی آواز سے سننے والوں میں انتشارِ خیال پیدا ہوتا ہے۔ عرب کی عورتیں مردوں کے سامنے سے گذرتی تھیں تو اپنے پازیب کی آواز سنانے کے لیے زور زور سے زمین پر پاؤں رکھتی تھیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت کی اور فرمایا:

﴿وَلَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِیُعْلَمَ مَا یُخْفِیْنَ مِنْ زِیْنَتِهِنَّ﴾ (نور:۳۶)

''اور (چلنے میں) اپنے پاؤں ایسے زور سے نہ رکھیں کہ (لوگوں کو) ان کے اندرونی زیور کی خبر ہو۔''

شریف عورت جب بضرورت گھر سے باہر نکلے تو کسی بڑی چادر یا برقع سے اپنا سارا جسم سر سے پاؤں تک چھپا لے جس سے اس کی اصلی پوشاک اور زیب و زینت کی ساری چیزیں چھپ جائیں اور چادر یا نقاب کا کچھ حصہ منہ پر بھی آ جائے تا کہ ہر مرد کو معلوم ہو جائے کہ یہ شریف خاتون ہے لونڈی نہیں، پھر نگاہیں شرم سے جھکی رہیں۔

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ وَ بَنٰتِکَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ

---

(۱) ادب المفرد باب اذا احدث الرجل لا یقبل علی واحد۔

ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ﴾ (احزاب:۵۹)

''اے پیغمبر! اپنی بیویوں اور بیٹیوں مسلمانوں کی عورتوں کو کہہ دے کہ نیچے لٹکالیں اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں اس سے لگتا ہے کہ پہچانی پڑیں، تو کوئی نہ ستائے۔''

﴿وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِھِنَّ وَ یَحْفَظْنَ فُرُوْجَھُنَّ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَھُنَّ اِلَّا مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَ لْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِھِنَّ عَلٰی جُیُوْبِھِنَّ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَھُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِھِنَّ﴾ (نور:۳۱)

''اور اے پیغمبر! ایمان والیوں کو کہہ دے کہ اپنی آنکھیں ذرا نیچی رکھیں، اور اپنا ستر چھپائیں اور اپنا سنگار نہ دکھائیں مگر جو (فطرۃً) کھلا رہتا ہے اور اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈالے رہیں، اور اپنا سنگار نہ دکھائیں لیکن شوہر (وغیرہ محرم) کو (آخیر آیت تک پڑھیے۔)''

اسی اصول پر عورت کو کوئی تیز خوش بو لگا کر باہر نہیں نکلنا چاہیے، کیونکہ اس سے میلانِ طبع پیدا ہوتا ہے، اور عورت کا یہ خیال برملا ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ اس کی طرف توجہ کریں، اور کسی عورت کا ایسا خیال شرافتِ نسوانی کے خلاف ہے۔

راستہ میں مرد اور عورت کو مل جل کر نہیں چلنا چاہیے، اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے مرد کو دو عورتوں کے درمیان چلنے کی ممانعت فرمائی ہے عورتوں کو وسط راہ سے الگ ہو کر راستہ کے کنارے سے چلنا چاہیے۔ ایک بار راستہ میں مرد اور عورت باہم مل جل گئے۔ تو آپ ؐ نے یہ حکم دیا، اور اس کے بعد یہ حالت ہوگئی کہ عورتیں راستہ کی ادھر ادھر کی دیوار سے لگ کر چلنے لگیں۔ (۱)

راستہ چلنے میں ادب اور وقار کا پورا خیال رہنا چاہیے، یہاں تک کہ اگر مسجد میں جماعت ہو رہی ہو تو بھی جماعت میں ملنے کے لیے متانت کے خلاف دوڑنا نہیں چاہیے، (۲) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر مسجد میں تکبیر ہو رہی ہو یا نماز کھڑی ہو چکی ہو تو دوڑ کر اس میں شامل نہ ہو بلکہ تم متانت اور وقار کے ساتھ آ کر جماعت میں ملو۔ (۳)

مقدور ہو تو پاؤں کے بچاؤ اور طہارت اور پاکیزگی کے لیے جوتے پہنے جائیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اکثر جوتے پہنا کرو، یعنی جوتے پہن کر چلا کرو، کہ جوتا پہننے والا بھی ایک طرح کا سوار ہوتا ہے۔ (۴)

جوتے دونوں پاؤں میں پہن کر چلنا چاہیے یا دونوں پاؤں ننگے رہیں یعنی یہ نہیں کرنا چاہیے کہ ایک پاؤں

---

(۱) یعنی لوگ جان لیں کہ یہ شریف خاتونیں ہیں، ان کو کوئی راستہ میں چھیڑے نہیں۔

(۲) ابوداؤد کتاب الادب باب فی مشی النساء فی الطریق۔

(۳) صحیح مسلم باب استحباب ایتان الصلوٰۃ بوقار۔

(۴) ابوداؤد باب الانتعال۔

میں جوتا ہو اور دوسرا پاؤں ننگا ہو۔ (۱) کیونکہ یہ ادب و وقار کے خلاف ہے، ایسے شخص کو لوگ احمق اور سفیہ سمجھیں گے لیکن اگر گھر میں کوئی اس طرح دو چار قدم چل لے تو کوئی حرج نہیں۔ (۲)

آدابِ سفر

آنحضرت ﷺ نے جس زمانہ میں سفر فرمایا اس وقت زمانہ کے حالات اور سواریوں کے طریقے اور تھے، اس لیے اس کے آداب عرب کی زمین، عرب کی آب و ہوا، اور عرب کی عام اگلی حالت سے موزونیت اور مطابقت رکھتے تھے۔ عرب کی زمین خشک، بنجر اور پتھریلی، پانی کی قلت، ہوا کی گرمی، دھوپ کی تمازت، قتل و غارت گری کی وجہ سے قدم قدم پر جان کا خطرہ ان تمام حالات کو پیش نظر رکھ کر آنحضرت ﷺ نے سفر کے متعلق چند مفید ہدایتیں کی ہیں جن میں سے بعض کی حالات کے بدل جانے سے اس زمانہ میں پابندی ضروری نہیں تاہم جہاں اب بھی وہ حالات باقی ہیں، ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے بالخصوص دیہات و قصبات کے لوگ ان سے زیادہ متمتع ہو سکتے ہیں جن کو زیادہ تر پیدل سفر کرنا پڑتا ہے اور صحرا و بیابان کے راستوں میں ضرورتِ زندگی کے وہ ساز و سامان میسر نہیں آتے جن کی اسٹیشنوں اور ہوٹلوں میں بہتات ہوتی ہے۔

(۱) سفر کے وقت مسافر کو رخصت کرنا چاہیے، اور اس کو خیر و عافیت کی کوئی نیک دعا دینی چاہیے اور ہو سکے تو اس وقت وہ خاص دعا پڑھنا چاہیے جس کو رسول اللہ ﷺ فوج کے رخصت کرتے وقت پڑھا کرتے تھے۔ (۳)

﴿اَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكُمْ وَ اَمَانَتَكُمْ وَ خَوَاتِيْمَ اَعْمَالِكُمْ﴾

"یعنی تمہارے دین، امانت اور خاتمۂ عمل کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔"

(۲) سفر صبح کے تڑکے کرنا چاہیے۔ (۴) اس سے انسان کا وقت ضائع نہیں ہوتا بلکہ پورا دن کام میں آ جاتا ہے اور وہ دھوپ کی شدت اور ہوا کی گرمی سے محفوظ رہتا ہے اور ایک معتد بہ مسافت طے کر کے دوپہر کے وقت آرام کر سکتا ہے۔

(۳) سفر تنہا نہیں کرنا چاہیے بلکہ کم از کم تین آدمی ساتھ ہونے چاہییں۔ (۵) اس سے انسان بہت سے خطرات سے محفوظ رہتا ہے اور اسبابِ سفر کی حفاظت و نگرانی میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۴) اگر تین آدمی ایک ساتھ سفر کریں تو ان میں ایک اپنا امیر بنا لینا چاہیے۔ (۶) اسی شخص کو کاروان سالار

(۱)، (۲) ترمذی کتاب اللباس باب المشی فی نعل واحدۃ۔

۳) ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الدعا عند الوداع۔

۴) ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الابتکار فی السفر۔

۵) ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الرجل یسافر وحدہ۔

۶) ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی القوم یسافرون یومرون احدہم۔

کہتے ہیں۔

(۵) سفر سے آنے کے ساتھ ہی گھر میں داخل نہیں ہونا چاہیے بلکہ گھر والوں کو تیاری کا تھوڑا موقع دینا چاہیے۔ (۱)

(۶) اگر کوئی معزز یا محبوب شخص سفر سے واپس آئے تو اس کا استقبال کرنا چاہیے۔ (۲)

(۷) سفر رات کو کرنا چاہیے حدیث میں اس کی مصلحت یہ بتائی گئی ہے کہ رات کو مسافت خوب طے ہوتی ہے' (۳) اور درحقیقت لو' گرمی اور دھوپ کے نہ ہونے سے اس وقت آدمی نہایت تیزی کے ساتھ چل سکتا ہے' بہر حال عرب کی سرزمین کے لحاظ سے اسلام نے سفر کے لیے دو مناسب وقتوں کا مشورہ دیا ہے صبح کا وقت اور رات کا وقت۔

(۸) مسافر کو سفر میں سواری کے جانوروں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا چاہیے۔

(۹) رات کو قیام راستہ سے الگ ہو کر کرنا چاہیے' کیونکہ راستہ سے جانور گزرتے رہتے ہیں اور موذی جانوروں کا بھی خطرہ رہتا ہے۔ (۴)

(۱۰) جب سفر کی ضرورت پوری ہو جائے تو فوراً واپس آ جانا چاہیے' کیونکہ سفر بہر حال تکلیف اور بے اطمینانی کی چیز ہے۔ (۵)

آدابِ خواب

نیند کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات اور احسانات میں شمار کیا ہے اور فرمایا ہے۔

﴿وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّیْلِ﴾ (روم:۲۳)

''اور خدا کی نشانیوں میں سے ایک تمہارا رات کو سونا ہے۔''

سورۂ فرقان میں فرمایا:

﴿وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا وَّ النَّوْمَ سُبَاتًا وَّ جَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا﴾ (فرقان:۴۷)

''اور اسی نے تمہارے لیے رات کو پردہ اور نیند کو آرام اور دن اٹھ کھڑے ہونے کو بنایا۔''

سورۂ نباء میں ہے۔

(۱) ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الطروق۔

(۲) ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التلقی۔

(۳) ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی سرعۃ السیر۔

(۴) مسلم کتاب الامارۃ باب مراعاۃ مصلحۃ الدواب فی السیر والنہی عن التعریس فی الطریق۔

(۵) مسلم کتاب الامارۃ باب السفر قطعۃ من العذاب۔

﴿وَ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًاo وَ جَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًاo وَ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًاo﴾ (نباء: ۹۔۱۱)

''اور ہم نے نیند کو تمہارے لیے آرام اور رات کو پردہ اور دن کو کاروبار بنایا۔''

ان آیتوں کا اشارہ یہ ہے کہ نیند کے لیے رات کا وقت ہے، اور دن کا وقت کاروبار اور محنت کے لیے ہے یعنی دن کا بڑا حصہ محنت اور کام میں گزرے البتہ دوپہر کو گرمی کے سبب سے کچھ دیر اہل عرب آرام کرتے تھے جس کو قیلولہ کہتے تھے، جس کا ذکر سورۂ نور: ۵۸ میں ہے: ﴿حِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِنَ الظَّهِيْرَةِ﴾ اور رات آرام میں گزاری جائے۔ اور ہو سکے تو اس کے کچھ حصوں میں خدا کی یاد کی جائے جیسا کہ دوسری آیتوں میں ہے غرض یہ ہے کہ جو آرام طلب لوگ دن کو رات اور جو عیش پسند لوگ رات کو دن بناتے ہیں، وہ دونوں قدرت کے حکموں کی خلاف ورزی کرتے ہیں یہاں تک کہ ساری رات عبادتوں میں جاگ جاگ کر کاٹنا بھی پسندیدہ نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے، یہ [1] تو عام افراد کے لیے ہے لیکن خاصان خدا ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن کی تعریف اس آیت میں کی گئی ہے۔

﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ﴾ (ذاریات: ۱۷)

''یعنی تھے وہ رات کو تھوڑا سوتے۔''

(۱) سنت نبوی نے سونے اور جاگنے کے طریقے اور اوقات بتا دیے ہیں، نمازِ عشا پڑھنے سے پہلے سونا نہیں چاہیے کیونکہ اس سے پہلے سو جانا غفلت کی نشانی ہے، اور نمازِ عشا پڑھ کر پھر فضول بات چیت نہیں کرنی چاہیے، بلکہ ضروری کاموں سے اگر کوئی باقی رہ گیا ہو فارغ ہو کر فوراً سو جانا چاہیے۔ [2] یہ اس لیے تاکہ صبح تڑکے آنکھ کھل جائے اور آخیر وقت میں خدا کی عبادت میں نیند کی کمی کے سبب سے غشی نہ ہو۔

لیکن اگر کوئی ضروری یا مفید کام پیش ہو تو نمازِ عشا کے بعد اس کے لیے بات چیت کرنا منع نہیں۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں نمازِ عشا کے بعد بعض ضروری کاموں میں مشورہ کی غرض سے حاضر ہوئے ہیں اور آپؐ نے بات چیت فرمائی ہے۔ [3]

(۲) احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ سونے سے پہلے بستر کو جھاڑ لینا چاہیے پھر داہنی کروٹ لیٹنا چاہیے۔ [4]

(۳) ایسی چھت پر نہیں سونا چاہیے جس پر منڈیر یا جالی نہ لگی ہو، [5] کیونکہ ایسی حالت میں زمین پر گر

(۱) بخاری کتاب النکاح۔

(۲) ابوداؤد کتاب الادب باب النہی عن السمر بعد العشاء۔

(۳) صحیح مسلم باب اکرام الضیف۔

(۴) ابوداؤد کتاب الادب باب مایقال عند النوم۔

(۵) ابوداؤد کتاب الادب باب فی النوم علی سطح غیر محجر۔

پڑنے کا اندیشہ ہے۔

(۴) پاکی حالت میں سونا چاہیے‘ بلکہ سونے سے پہلے وضو کر لینا اچھا ہے۔ (۱)

(۵) پیٹ کے بل نہیں سونا چاہیے‘ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو اسی طرح سوئے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ سونے کا یہ طریقہ خدا کو پسند نہیں۔ (۲)

(۶) ایک پاؤں کو اٹھا کر اس پر دوسرے پاؤں کو رکھ کر لیٹنا نہیں چاہیے۔ (۳) کیونکہ عرب کے لوگ عموماً تہ بند باندھتے تھے اس لیے اس میں کشفِ عورت کا احتمال ہے البتہ اگر یہ اندیشہ نہ ہو تو جائز ہے کیونکہ ایک حدیث میں ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ اس طریقہ سے لیٹے تھے۔ (۴)

(۷) سونے کے وقت گھر کا دروازہ بند کر لینا چاہیے‘ کھانے پینے کے برتن کو ڈھانک دینا چاہیے‘ چراغ کو بجھا دینا چاہیے کیونکہ بعض اوقات تیل کی خاطر چوہے چراغ کی بتی کو اٹھا لے جاتے ہیں‘ جس سے گھر میں آگ لگنے کا اندیشہ ہے‘ یہی حال آگ کا بھی ہے‘ ایک بار مدینہ میں رات کو کسی کے گھر میں آگ لگ گئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آگ تمہاری دشمن ہے جب سوؤ تو اس کو بجھا دیا کرو۔ (۵)

(۸) سوتے اور سو کر اٹھتے وقت کوئی مسنون دعا پڑھنی چاہیے‘ سب سے مختصر دعا یہ ہے کہ سوتے وقت کہے:

﴿اَللّٰھُمَّ بِاسْمِکَ اَحْیٰی وَ اَمُوْتُ﴾

''اے اللہ! میں تیرے نام سے جیتا اور مرتا ہوں۔''

اور جاگے تو کہے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَآ اَمَاتَنَا وَ اِلَیْہِ النُّشُوْرِ﴾ (۶)

''اس کی حمد ہو جس نے مرنے کے بعد مجھے پھر جلایا اور جس کی طرف اٹھ کر جانا ہے۔''

حدیثوں میں اس موقع کے لیے اور بہت سی موثر دعائیں منقول ہیں۔

---

(۱) ابوداؤد کتاب الادب باب مایقال عند النوم و باب فی النوم علی طہارۃ۔

(۲) ابوداؤد کتاب الادب باب فی الرجل ینبطح علی۔

(۳) ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی کراہۃ فی ذلک۔

(۴) ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی وضع احدی الرجل علی الاخری مستلقیا۔

(۵) بخاری کتاب الاستیذان باب لایترک النار فی البیت عند النوم و باب اغلاق الابواب باللیل‘ مگر یہ اس حالت کے متعلق ہے جب گھر کی چھتیں پست ہوں اور بتی کا پرانا دیا جلایا جائے۔

(۶) ابوداؤد کتاب الادب باب مایقال عند النوم۔

آدابِ لباس

لباس سے اصلی مقصد دو ہیں' ایک جسمانی اور دوسرا اخلاقی۔ جسمانی یہ ہے کہ جسم کو سردی اور گرمی کی تکلیفوں سے بچایا جائے' اور اخلاقی یہ ہے کہ انسان کے بدن کے جن حصوں پر غیروں کی نظر نہیں پڑنی چاہیے وہ چھپے رہیں' اسلام کے علاوہ شاید کوئی اور مذہب نہیں جس نے برہنگی کو اعتراض کے قابل سمجھا ہو۔ اسلام پہلا مذہب ہے جس نے ستر پوشی کو مذہب کا ایک ضروری جز ٹھہرایا' یہاں تک کہ بلا مجبوری اس کے بغیر نماز بھی ادا نہیں ہو سکتی۔

مردوں کے لیے ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ اور شریف آزاد عورتوں کے لیے سر کے بالوں سے لے کر ٹخنوں کے گٹوں تک اور لونڈیوں کے لیے پیٹ اور پیٹ سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ ستر قرار دیا گیا [(۱)] جس کا غیر کے سامنے کھولنا جائز نہیں یہاں تک کہ تنہائی میں ان کا بے وجہ کھولنا پسندیدہ نہیں۔ ایک صحابیؓ نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ اگر ہم تنہائی میں ہوں یعنی کوئی دوسرا دیکھنے والا نہ ہو' فرمایا تو خدا تو دیکھتا ہے اس سے اور زیادہ حیا کرنا چاہیے۔ [(۲)] ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کبھی ننگے نہ ہو' کیونکہ تمہارے ساتھ فرشتے رہتے ہیں جو بضرورت برہنگی کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہیں تو ان سے شرم کرو' اور ان کا لحاظ رکھو۔ [(۳)]

حضرت آدم علیہ السلام اور حوا کو بہشت میں جو بہشتی جوڑے ملے تھے' خدا کی نافرمانی کرنے سے وہ ان کے بدن سے اتر گئے تو وہ فوراً درخت کے پتوں سے اپنی برہنگی چھپانے لگے۔

﴿فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ﴾ (اعراف:۲۲)

''تو جب ان دونوں نے درخت کو چکھا' ان کے ستر ان پر کھل گئے تو اپنے اوپر درخت کے پتوں کو جوڑنے لگے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ستر پوشی خدا تعالیٰ نے انسان کی فطرت بنائی ہے مگر دنیا میں آ کر یہ فطرت کبھی بگڑ جاتی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وحشی' جنگلی اور صحرائی قومیں ستر کے حدود کو صرف شرم گاہوں تک محدود کر لیتی ہیں۔ عرب میں بھی یہی حال تھا' بلکہ حج میں انہوں نے یہ دستور بنایا تھا کہ قریش کے علاوہ دوسرے قبیلوں کے مرد اور عورتیں خانہ کعبہ کے طواف کے وقت اپنے کپڑے اتار دیتے تھے' اور اگر قریش اپنے کپڑے دیتے تو وہ پہن لیتے تھے' [(۴)] ورنہ یونہی ننگے پھرا کرتے تھے' وحیِ الٰہی نے انسانوں کو تہذیب و سلیقہ کا یہ سبق دیا۔

---

(۱) عورت کا چہرہ' قدم اور ہتھیلیاں ستر میں داخل نہیں۔

(۲) سنن ترمذی ابواب الاستیذان والآداب باب ماجاء فی حفظ العورۃ۔

(۳) ایضاً باب ماجاء فی الاستتار۔

(۴) صحیح مسلم و طبری تفسیر آیات ذیل۔

﴿یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمۡ لِبَاسًا یُّوَارِیۡ سَوۡاٰتِکُمۡ وَرِیۡشًا وَ لِبَاسُ التَّقۡوٰی ذٰلِکَ خَیۡرٌ﴾ (اعراف:۲۶)

''اے آدم کے بیٹو! ہم نے اتاری تم پر پوشاک جو ڈھانکے تمہاری ستر اور زینت کا سامان اور پرہیز گاری کا لباس یہ بہتر ہے۔''

﴿یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ خُذُوۡا زِیۡنَتَکُمۡ عِنۡدَ کُلِّ مَسۡجِدٍ﴾ (اعراف:۳۱)

''اے آدم کے بیٹو! ہر نماز کے وقت اپنی زینت (یعنی لباس) اختیار کرو۔''

﴿قُلۡ مَنۡ حَرَّمَ زِیۡنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیۡۤ اَخۡرَجَ لِعِبَادِہٖ﴾ (اعراف:۳۲)

''کہہ دے! کس نے اللہ کی اس زینت کو جس کو اس نے بندوں کے لیے پیدا کیا ہے' منع کیا ہے۔''

﴿قُلۡ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الۡفَوَاحِشَ مَا ظَہَرَ مِنۡہَا وَ مَا بَطَنَ﴾ (اعراف:۳۳)

''کہہ دے کہ میرے رب نے تو بے حیائی کی باتوں کو خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی منع کیا ہے۔''

ان آیتوں میں جس بے حیائی کی طرف اشارہ ہے وہ برہنگی ہے' اور جس زینت کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ ستر پوشی ہے' ان آیتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کپڑے سے مقصد ستر پوشی کے علاوہ زیب و زینت بھی ہے' پہلی آیت کے آخر میں لباس کے باب میں اصول کلیہ کی صورت میں ایک بلیغ فقرہ ہے جو بہت سی جزئیات کو حاوی ہے۔

﴿وَ لِبَاسُ التَّقۡوٰی ذٰلِکَ خَیۡرٌ﴾ (اعراف:۲۶)

''اور پرہیز گاری کا لباس یہ بہتر ہے۔''

پرہیز گاری کے لباس سے کیا مقصود؟ بعضوں نے مجاز سمجھ کر اس سے ایمان' دوسروں نے اعمالِ صالحہ اور یا شرم و حیا مراد لی ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجاز سے پہلے خود حقیقت پر غور کرنا چاہیے' اسی لیے کچھ مفسروں نے اس کو حقیقت ہی پر محمول کیا ہے' مشہور تابعی مفسر ابن زید نے اس سے مطلق پوشاک مراد لی ہے کسی نے زرہ اور خود وغیرہ لڑائی کے سامان کو لباسِ تقویٰ قرار دیا ہے' کسی نے اس سے زہد و ورع کے صوفیانہ کپڑے سمجھے ہیں'(۱) لیکن یہ بھی حقیقت سے دور ہونا ہے' صحیح یہ ہے کہ لباس التقویٰ سے تقویٰ اور پرہیز گاری ہی کا لباس مراد ہے' یعنی وہ لباس پہننا چاہیے جو تقویٰ اور پرہیز گاری کا منشا ہے۔ اس کو آنحضرت ﷺ نے اپنی قولی اور عملی تفسیر سے ظاہر فرما دیا ہے۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اس آیت پر ترجمہ قرآن کے حواشی میں لکھتے ہیں:

''اب وہی لباس پہنو جس میں پرہیز گاری ہو' مرد لباس ریشمی نہ پہنے' اور دامن دراز نہ رکھے' اور جو منع ہوا ہے سو نہ کرے اور عورت بہت باریک نہ پہنے کہ لوگوں کو نظر آوے اور اپنی زینت نہ دکھاوے'' (تفسیر اعراف آیت مذکور)

اسلام میں لباس و پوشاک کی حد بندی اس کے سوا کچھ اور نہیں کی گئی ہے' اس حد بندی کی تشریح احادیث

(۱) روح المعانی تفسیر آیت مذکور۔

کے مطابق حسب ذیل ہے۔

(۱) مردوں کو کسی ضرورت اور مجبوری کے بغیر خاص ریشم کا بنا ہوا کپڑا نہیں پہننا چاہیے کیونکہ اس سے زنانہ پن کا اظہار ہوتا ہے اور وہ اس عیش و تنعم کی زندگی کی یاد دلاتا ہے جو مردوں کی جد وجہد اور محنت کی زندگی کے خلاف ہے۔ ضرورت اور مجبوری کی تشریح یہ ہے کہ جیسے لڑائی میں زرہ کے نیچے ریشمی کپڑے پہنتے ہیں تاکہ اس کی لوہے کی کڑیاں بدن میں نہ چبھیں یا کسی کے بدن میں کھجلی ہو تو سوتی کپڑے کے کھردرا پن سے بدن کے چھل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اس لیے ان دونوں موقعوں پر مرد ریشمی کپڑے پہن سکتے ہیں اگر کوئی دو چار انگل کی ریشمی دھجی کپڑے میں لگا لے تو اس کی بھی اجازت ہے۔

(۲) مردوں کے لیے عورتوں کی سی پوشاک اور عورتوں کے لیے مردوں کی سی پوشاک پہننا جائز نہیں کیونکہ اس سے دونوں کی اخلاقی تنگ دامانی کی کھلی شہادت ملتی ہے' آنحضرت ﷺ نے ان عورتوں پر جو مردوں کے لباس اور طور وطریق کی مشابہت کریں اور ان مردوں پر جو عورتوں کے لباس اور طور وطریق کی نقالی کریں' لعنت فرمائی ہے۔

(۳) عربوں میں لباس کا دامن اتنا لمبا یا تہبند اتنا نیچے رکھنا کہ وہ زمین پر گھسٹتا ہوا چلے بڑائی کی نشانی سمجھی جاتی تھی' ان کے بڑے بڑے امرا اور رئیس اتنے ہی لمبے دامن رکھتے تھے اور اتنا ہی نیچے تہبند باندھتے تھے آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو کوئی اپنا ازار فخر وغرور اور بڑائی کے اظہار کے لیے گھسیٹ کر چلے گا اللہ تعالیٰ اس کی طرف قیامت کے دن نظر نہیں اٹھائے گا' اسی لیے مرد کو پائجامہ کی مہریوں اور تہبند کو اتنا نیچے نہیں کرنا چاہیے کہ ٹخنے چھپ جائیں' بلکہ آپ ؐ نے پسند فرمایا کہ پائجامہ اور تہبند نصف ساق تک ورنہ کم از کم ٹخنوں سے اونچا رہے' فرمایا ازار نیچے لٹکانا غرور کی نشانی ہے اور خدا غرور کو پسند نہیں فرماتا' البتہ عورتوں کو دامن یا گھیر نیچے تک لٹکانا بلکہ ایک آدھ بالشت نیچے رکھنا درست ہے۔

(۴) ایسا لباس جس کی طرف بے اختیار لوگوں کی انگلیاں اٹھیں' پہننا ٹھیک نہیں' خواہ وہ امیروں کی زرق برق پوشاکیں ہوں' یا مولویوں کا نمائشی عبا' جبہ یا صوفیوں کی گیروا رنگ' کیونکہ ایسے کپڑوں کے پہننے والوں کا اصل منشا اپنے کو دوسروں سے ممتاز بنانے کی چھپی خواہش ہوتی ہے' اور یہ تفوق وامتیاز کی ہوس نفس کا کھلا غرور ہے۔

(۵) مرد ہو یا عورت کوئی ایسے باریک کپڑے نہ پہنے جن سے ستر دکھائی دے' عورتوں کے لیے خصوصیت کے ساتھ آپ ؐ نے یہ فرمایا ہے کہ کتنی کپڑے پہننے والیاں ہیں جو حقیقت میں ننگی رہتی ہیں۔

(۶) ایسا کپڑا پہننا جس سے پوری ستر پوشی نہ ہو' یعنی اس سے ستر کے پورے حدود نہ چھپیں جائز نہیں۔ ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ کوئی ایسا ہی کپڑا (۱) پہن کر حضور کے سامنے آئیں تو آپ ؐ نے

(۱) اس باب کی یہ ساری حدیثیں صحاح اور سنن کی کتاب اللباس میں ہیں' میرے پیش نظر اس وقت ابوداؤد اور ترمذی ہیں ان مسائل کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں ملیں گی۔

فرمایا' اے اسماء جب عورت جوان ہو جائے تو اس کو (چہرہ اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ) ان کے سوا کھولنا حلال نہیں۔

(۷) مرد شوخ رنگ خصوصاً سرخ رنگ کے کپڑے نہ پہنیں' سرخ دھاری کے کپڑے جائز ہیں' ایسی سرخ دھاریوں کی چادر آپ نے اوڑھی ہے' زرد رنگ کے کپڑے پہنے جاسکتے ہیں آپ کبھی زرد رنگ کا پورا لباس پہن لیتے تھے البتہ زعفرانی کپڑے درست نہیں اور خوشبو کے لیے بدن پر زعفران کے دھبے ڈالنا جس کا عرب میں رواج تھا مردوں کے لیے منع ہے' سبز رنگ کی چادر بھی آپ نے اوڑھی ہے' اور اس رنگ کا تہبند بھی آپ نے باندھا ہے سیاہ رنگ کا عمامہ زیبِ سر فرمایا ہے۔

(۸) مردوں کے لیے عام طور سے سپید رنگ کے کپڑے آپ نے پسند فرمائے ہیں۔

(۹) آستین والی پوشاک پہنتے وقت پہلے داہنے ہاتھ میں آستین ڈالنی چاہیے۔

(۱۰) نیا لباس پہنتے وقت آپ دعا پڑھا کرتے تھے جس میں اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر اس کا شکر ادا فرماتے تھے یہ دعا پڑھتے تھے۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ کَسَانِیْ هٰذَا وَ رَزَقَنِیْهِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّیْ وَ قُوَّةٍ﴾

''اس خدا کی حمد جس نے مجھ کو یہ پہنایا' اور روزی کیا میری قوت کے بغیر (یعنی محض اپنے فضل سے)''

آدابِ مسرت

انسان کو جن چیزوں پر مسرت حاصل ہوتی ہے' ان کی انتہا نہیں' مال و دولت علم و فضل عہدہ و منصب شادی بیاہ' عید اور تہوار' غرض انسان کو اپنی زندگی میں اظہارِ مسرت کے سینکڑوں مواقع پیش آتے ہیں لیکن یہ مسرت جب حدِ اعتدال سے بڑھ جاتی ہے تو اس کی سرحد فخر و غرور سے مل جاتی ہے قارون نے اپنے مال و دولت کی کثرت پر جب اس قسم کی فخر آمیز مسرت کا اظہار کیا تو اس کی قوم نے ناگواری سے کہا:

﴿اِذْ قَالَ قَوْمُه لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ﴾ (قصص:۷۶)

''جب کہا اس کو اس کی قوم نے اترا مت' اللہ کو نہیں بھاتے اترانے والے۔''

اسلام نے چونکہ تمام جذبات میں اعتدال پیدا کرنا چاہا ہے' اس لیے اس نے اس قسم کی مسرتوں کو انسان کی ایک اخلاقی کمزوری قرار دیا ہے۔

﴿وَ لَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ اِنَّه لَیَئُوْسٌ کَفُوْرٌ ○ وَ لَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْه لَیَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّیِّاٰتُ عَنِّیْ اِنَّه لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ○﴾ (ھود:۹-۱۰)

''اور اگر ہم چکھا دیں آدمی کو اپنی طرف سے مہر اور پھر وہ چھین لیں اس سے تو وہ ناامید' ناشکرا ہوا اور اگر ہم چکھا دیں اس کو آرام بعد تکلیف کے جو پہنچے اس کو تو کہنے لگے گئیں برائیاں مجھ سے تو وہ خوشیاں

کرتے بڑائیاں کرتا۔‘‘

اور اس کی ممانعت کی ہے:

﴿وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ﴾ (حدید)

’’اور نہ اتراؤ اس پر جو تم کو اس نے دیا اور اللہ نہیں چاہتا کہ کسی اتراتے بڑائی مارتے کو۔‘‘

ساتھ ہی اس کے مسلمانوں میں مردہ دلی نہیں پیدا کی ہے بلکہ معتدل طریقہ پر اظہارِ مسرت کی اجازت دی ہے اور اس کے معتدل طریقے بتائے ہیں۔

جب مسلمان کو کوئی مسرت حاصل ہو تو اس کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اسی کے فضل وکرم سے اس کو یہ خوشی حاصل ہوئی، اگر کوئی بڑی خوشی حاصل ہو تو سجدۂ شکر بجالانا چاہیے تاکہ غایت مسرت کی حالت میں دنیوی فخر وغرور کے بجائے انسان کی نیازمندی کا اظہار ہو رسول اللہ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی ایسا مسرت آمیز واقعہ پیش آتا تو سجدۂ شکر بجالاتے۔

ایک بار مکہ سے مدینہ کو جارہے تھے جب عزوراء کے قریب پہنچے تو سواری سے اتر پڑے اور تھوڑی دیر تک دعا کی، پھر سجدہ میں گر پڑے اس کے بعد دیر تک دعا کی پھر سجدہ میں گر پڑے اسی طرح تیسری بار بھی دعا کی اور سجدہ میں گر پڑے، اور فرمایا کہ میں نے خدا سے اپنی امت کے لیے شفاعت کی دعا کی تو اس نے میری ثلث امت کے لیے شفاعت قبول کر لی، اس لیے میں اپنے خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے سجدہ میں گر پڑا پھر میں نے سر اٹھا کر اپنی امت کے لیے یہی درخواست کی تو اس نے میری ثلث امت کے لیے اور میری درخواست قبول کی، اس لیے میں خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے سجدہ میں گر پڑا۔ پھر میں نے یہی التجا کی تو اس نے میری ثلث امت کے لیے اور میری التجا کو قبول کیا تو میں اپنے خدا کے لیے سجدہ میں گر پڑا۔ [۱]

صحابۂ کرامؓ کا بھی یہی دستور تھا، چنانچہ حضرت کعبؓ بن مالک کی توبہ جب قبول ہوئی اور ان کو اس کا مژدہ سنایا گیا تو وہ سجدہ میں گر پڑے اس قسم کے مسرت آمیز موقعوں پر دوسرے مسلمانوں کا اخلاقی فرض بھی یہ ہے کہ وہ اپنے بھائی کو مبارک باد دے کر اس کی مسرت میں شریک ہوں چنانچہ اس موقع پر صحابۂ کرامؓ بھی ان کے پاس جوق درجوق آئے اور ان کو مبارک باد دی۔ [۲]

سفر سے واپس ہونے کے بعد بھی انسان کو وطن میں پہنچنے کی مسرت ہوتی ہے اس موقع پر اعزہ واحباب کی دعوت کی جاسکتی ہے کہ وہ بھی اس مسرت میں شریک ہوں۔ چنانچہ ایک بار رسول اللہ ﷺ سفر سے مدینہ میں آئے تو اونٹ یا گائے ذبح کر کے لوگوں کو کھلایا، [۳] اس موقع پر دوسروں کا فرض یہ ہے کہ سفر سے واپس آنے والے کا

(۱) ابوداؤد کتاب جہاد باب فی سجود الشکر۔

(۲) بخاری کتاب المغازی حدیث کعب بن مالک۔

(۳) ابوداؤد کتاب الاطعمۃ باب الاطعام عند قدوم من السفر۔

استقبال کریں تاکہ اس طریقہ سے ان کی مسرت کا اظہار ہو۔رسول اللہ ﷺ جب غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے تو لوگوں نے ثنیۃ الوداع تک جا کر آپؐ کا استقبال کیا۔ جس میں بچے بھی شامل تھے۔ (۱) اجتماعی طور پر اظہارِ مسرت کا عام موقع شادی بیاہ میں پیش آتا ہے اور اس موقع پر اسلام نے اظہارِ مسرت کے لیے گانے اور ڈھول بجانے کی اجازت دی ہے تاکہ خوب اعلان ہو اور سب کو اس نکاح کی خبر ہو جائے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿فصل ما بین الحلال و الحرام الدف و الصوت﴾ (۲)

حلال اور حرام میں دف بجانے اور گانے سے فرق پیدا ہوتا ہے یعنی زنا اور نکاح میں فرق یہ ہے کہ دف بجا کر اور راگ گا کر نکاح کا اعلان کیا جاتا ہے تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ فلاں مرد اور فلاں عورت نے باہم مل کر ازدواجی زندگی بسر کرنے کا معاہدہ کیا ہے۔ اور زنا چھپ کر چپکے سے کیا جاتا ہے کہ کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔

حضرت ربیعؓ بنت معوذ بن عفراء کا نکاح ہوا تو رسول اللہ ﷺ تشریف لا کر ان کے پاس بیٹھے، چند لڑکیاں دف بجا بجا کر حضرت ربیع بنت معوذؓ کے ان بزرگوں کی تعریف میں اشعار گانے لگیں جو غزوۂ بدر میں شہید ہوئے تھے اسی حالت میں ایک نے یہ مصرع گایا۔

و فینا نبی یعلم ما فی غد

''ہم میں ایک پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے۔''

تو آپؐ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو، اور جو گا رہی تھیں اس کو گاؤ۔ (۳)

ایک بار حضرت عائشہؓ نے ایک انصاری سے اپنی ایک رشتہ دار عورت کا نکاح کر کے اس کو رخصت کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عائشہ تم لوگوں کے ساتھ گیت نہ تھا، کیونکہ انصار کو گیت پسند ہے ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا تم لوگوں نے اس کے ساتھ ایک لونڈی کیوں نہیں بھیجی جو دف بجاتی اور گاتی جاتی۔ (۴)

ایک دفعہ شادی کا موقع تھا، قرظہ بن کعبؓ اور ابو مسعودؓ انصاری بیٹھے لڑکیوں کا گانا سن رہے تھے اتنے میں عامر بن سعد ایک تابعی آ گئے انہوں نے یہ دیکھا تو اعتراض کیا اور کہا آپ دو صاحب بدری صحابیؓ ہیں اور آپ کے سامنے یہ ہو رہا ہے انہوں نے کہا تمہارا جی چاہے تو تم بھی بیٹھ کر سنو رسول اللہ ﷺ نے شادی بیاہ کے موقع پر ہم کو اس کی اجازت دی ہے (نسائی باب اللھو والغنا عند العرس)

---

(۱) ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التلقی۔

(۲) ترمذی کتاب النکاح باب ماجاء فی اعلان النکاح۔

(۳) بخاری کتاب النکاح باب ضرب الدف فی النکاح والولیمۃ۔

(۴) بخاری کتاب النکاح باب النسوۃ یہدین المراۃ الی زوجہا ودعائھن بالبرکۃ مع فتح الباری۔

عربوں میں رسم تھی کہ دولھا کو ﴿بالرفاء والبنین﴾ کہہ کر عیش و آرام اور اولادِ نرینہ کی دعا دیتے تھے آنحضرت ﷺ نے اس کی جگہ یہ دعا سکھائی۔

((بَارَکَ اللّٰهُ لَکَ وَ بَارَکَ عَلَیْکَ وَ جَمَعَ بَیْنَکُمَا فِی خَیْرٍ)) (۱)

''تمہارے لیے اللہ مبارک کرے تم پر برکت اتارے اور تم دونوں میں بھلائی میں میل ملاپ رکھے۔''

شادی بیاہ میں دوستوں اور عزیزوں کی دعوت مسنون ہے' اس کو ولیمہ کہتے ہیں جس سے جو کچھ ہو سکے اور جتنا ہو سکے عزیزوں اور دوستوں کو اس موقع پر کھلائے آنحضرت ﷺ نے فرمایا' اور کچھ نہیں تو ایک بکری ذبح کر کے کھلا دو (۲) اور خود کبھی پنیر' گھی اور چھوہارے بھی کھلائے ہیں (۳) اسی طرح دوست اور عزیز کو اس کی شادی میں تحفہ کے طور پر بھی کچھ بھیج سکتے ہیں (نسائی باب الھدیۃ لمن عرس)

مسلمانوں کے لیے اس سے بھی زیادہ وسیع پیمانہ پر اجتماعی اظہارِ مسرت کا موقع عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن پیش آتا ہے' زمانۂ جاہلیت میں اہلِ عرب نے سال میں دو دن مقرر کیے تھے' جن میں وہ خوشیاں مناتے تھے رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو فرمایا کہ تم لوگ دو دنوں میں خوشیاں مناتے تھے اب خدا نے ان کو تمہارے لیے ان سے دو بہتر دنوں سے بدل دیا' یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن۔ (۴) خوشی کے ان دو دنوں کی تعیین میں دوسری مشرک قوموں کی طرح فصل و موسم اور دوسرے غیر موحدانہ مشاہد کو یادگار کا ذریعہ نہیں بنایا گیا' بلکہ دینِ حنیف کے دو عظیم الشان واقعوں کو اظہارِ مسرت کے لیے پسند کیا گیا' عید الاضحیٰ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی خوشیوں اور خانہ کعبہ کی بنا پر اور فتح کی' اور عید الفطر اسلام کی آمد اور قرآن پاک کے نزول کی یادگار ہے۔

ان دونوں دنوں میں اظہارِ مسرت کے لیے عمدہ لباس پہننا اور خوشبو لگانا مسنون فرمایا اس کے علاوہ خوشی و مسرت کا گانا اور دوسری قسم کے جائز کھیلوں کو پسند فرمایا' حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ عید کے دن میرے پاس انصار کی دو لونڈیاں جو پیشہ ور گانے والیاں نہ تھیں' وہ اشعار گا رہی تھیں جو انصار نے بعاث کی لڑائی کے متعلق کہے تھے' اسی حالت میں حضرت ابوبکرؓ آئے اور کہا کہ ''شیطان کے مزامیر اور رسول اللہ ﷺ کے گھر میں۔'' لیکن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''اے ابوبکرؓ! ہر قوم کے لیے عید کا ایک دن ہوتا ہے اور یہ ہماری عید (۵) کا دن ہے۔'' یعنی اس دن گانا مباح ہے۔ (۶)

---

(۱) ابوداؤد کتاب النکاح باب مایقال للزوج۔

(۲) بخاری کتاب النکاح باب الولیمۃ ولو بشاۃ۔

(۳) نسائی کتاب النکاح باب النباء فی السفر۔

(۴) نسائی کتاب صلوٰۃ العیدین۔

(۵) بخاری باب سنۃ العیدین لاہل الاسلام۔

(۶) بشرطیکہ اس کے مضامین اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے برے نہ ہوں۔

حبشی لوگ عید کے دن فوجی کرتب دکھاتے تھے اور رسول اللہ ﷺ اس کو پسند فرماتے تھے ایک بار عید کے دن یہ لوگ اس قسم کا کرتب دکھا رہے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے خود حضرت عائشہ کو یہ تماشا دکھایا اور حبشیوں سے کہا ''باں بنوارفدہ'' اس سے آپ کا مقصد ان میں مستعدی اور نشاط پیدا کرنا تھا' یہاں تک کہ جب حضرت عائشہؓ تھک گئیں تو آپ نے کہا کہ ''بس'' انہوں نے کہا ''ہاں'' ارشاد ہوا تو جاؤ۔ (۱)

مسرت کے اس طریقۂ اظہار کا نام ''تقلیس'' تھا جس کے معنی دف بجانے' گانے اور دلچسپی کے لیے شمشیر بازی' نیزہ بازی وغیرہ کے کھیل تماشے دکھانے کے ہیں بعض لوگوں کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ لڑکے اور لڑکیاں راستوں پر کھڑے ہو کر ڈھول بجا کر اچھلیں کودیں' تماشے دکھائیں' عہدِ رسالت میں عید کے دن اس کا اس قدر رواج تھا کہ جب صحابہؓ کو کسی جگہ عید کے دن اظہارِ مسرت کا یہ طریقہ نظر نہیں آتا تھا تو ان کو تعجب ہوتا تھا' چنانچہ ایک بار عیاض اشعریؓ نے انبار میں عید کی تو فرمایا کہ جس طرح رسول اللہ ﷺ کے پاس لوگ ''تقلیس'' کیا کرتے تھے' اس طرح تم لوگ کیوں نہیں کرتے۔

حضرت قیسؓ بن سعد فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں جو چیزیں تھیں وہ سب میں نے دیکھ لیں بجز ایک چیز کے کہ عید کے دن رسول اللہ ﷺ کے سامنے ''تقلیس'' ہوتی تھی۔ (۲)

عیدین کے دن خوشی و مسرت کے اس طریقۂ اظہار کی اجازت کا فلسفہ یہ ہے کہ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ قوم کی زندگی میں سال میں ایک موقع ایسے مذہبی و قومی جشن کے آئیں جن میں لوگ کھل کر خوشی کر سکیں اور متین سے متین آدمی کچھ دیر انبساطِ خاطر کا اظہار کر لے۔ اسی لیے ان دونوں میں روزے رکھنے کی ممانعت آئی ہے اور آپ نے فرمایا ہے کہ یہ دن کھانے پینے' اہل و عیال سے لطف اٹھانے اور یادِ الٰہی کے ہیں۔ (۳) اسلام نے خوشی میں بھی اس کو یاد رکھا ہے کہ قلب کو خدا کی یاد سے غفلت نہ ہو' اس لیے عید کے دونوں موقعوں پر دوگانہ ادا کرنا سنت ٹھہرایا' تکبیر کہتے ہوئے ایک راستہ سے عیدگاہ کو جائیں اور دوسرے راستہ سے لوٹیں تا کہ ہر طرف اسلام کی شان و شوکت کا اظہار ہو اور ﴿لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ﴾ کی تعمیل ہو۔

آدابِ ماتم

خوشی اور غم توام ہیں' جس طرح انسان خوشی میں بے اعتدالی کرتا ہے غم کی حالت میں بھی وہ اعتدال سے گذر جاتا ہے عربوں میں فخر و غرور اور جہالت و وحشت کی وجہ سے تعزیت و ماتم کی عجیب عجیب رسمیں قائم ہو گئی تھیں' فخر کا خیال موت کے بعد بھی نہیں جاتا تھا' اس لیے اظہارِ فخر کے بہت سے طریقے جاری ہو گئے تھے' سب سے مقدم یہ

(۱) بخاری باب الحراب والدرق یوم العید۔

(۲) ابن ماجہ کتاب الصلوۃ باب ماجاء فی التقلیس یوم العید۔

(۳) شرح معانی الآثار طحاوی ص ۴۲۹' یہاں بعال کا ترجمہ اہل و عیال سے لطف اٹھانا کر دیا گیا ہے۔

کہ مرنے والا جس درجہ کا ہو اسی شان سے اس کا ماتم ہونا چاہیے' چنانچہ بڑے بڑے سردار جب مرتے تھے' تو وصیت کر جاتے تھے کہ ان کا ماتم ان کی شان کے موافق کیا جائے۔

ایک شاعر اپنی بیوی سے کہتا ہے۔

اذ امت فابکینی بما انا اھله
و شِقِّیُ علی الجیب یا ابنۃ معبد

''جب میں مر جاؤں تو میرے لیے میرے درجہ کے موافق رونا' اور میرے لیے گریبان کو چاک کر ڈالنا۔''

منہ پر تھپڑ مارنا' چھاتی کوٹنا' سر کے بال کھول دینا' عام رسم تھی اور شعرا اس کا فخریہ اظہار کرتے تھے۔

من کان سرورا بمقتل مالک
فلیات نسوتنا بوجه نھار
یجد النساء حواسرا یندبنه
یلطمن اوجھھن بالاسحار

''جو شخص مالک کے قتل سے خوش ہوتا تھا تو ہماری مستورات کو دن دہاڑے آ کر دیکھے وہ دیکھے گا کہ عورتیں سر کھول کر نوحہ کر رہی ہیں اور صبح کے وقت اپنی گالوں پر طمانچے مار رہی ہیں۔''

آنحضرت ﷺ نے ان رسوم سے نہایت سختی سے منع کیا' آپ ؐ نے فرمایا کہ ''جو شخص گریبان پھاڑتا' اور گالوں پر طمانچے مارتا' اور جاہلیت کی طرح چیختا اور چلاتا اور بین کرتا ہے وہ میری امت میں سے نہیں' یعنی یہ میری امت کے کام نہیں۔''(۱)

حضرت جعفر طیار ؓ سے آنحضرت ﷺ کو نہایت محبت تھی' ان کی شہادت کی جب خبر آئی تو ان کے خاندان کی عورتوں نے نوحہ شروع کیا۔ آپ ؐ نے منع کرا بھیجا' وہ باز نہ آئیں دوبارہ منع فرمایا۔ پھر جب نہ مانیں تو آپ ؐ نے حکم دیا کہ ''ان کے منہ میں خاک بھر دو۔'' (۲)

یہ بھی فخر میں داخل تھا کہ میت پر کثرت سے رونے والے ہوں۔ اس بنا پر دور دور سے عورتیں بلا کر آتی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ رسم مبادلہ کے طور پر داخلِ مراسم ہو گئی تھی' یعنی کسی میت کے لیے کسی خاندان کی عورتوں نے نوحہ کیا ہے تو اس میت کے خاندان پر گویا یہ ایک فرض ہوتا تھا جس کا ادا کرنا ضروری تھا۔ ایک دفعہ ایک خاتون نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ ''وہ کون سی بات ہے جس میں ہم کو آپ ؐ کی نافرمانی نہیں کرنی چاہیے۔'' آپ ؐ نے فرمایا یہ کہ ''نوحہ نہ کرو۔'' وہ بولیں کہ میرے چچا نے جب انتقال کیا تو فلاں خاندان کی عورتیں آ کر روئی تھیں۔ ان

(۱) ترمذی کتاب الجنائز باب ماجاء فی النھی عن ضرب الخدود۔
(۲) صحیح بخاری کتاب الجنائز باب من جلس عند المصیبۃ یعرف فیہ الحزن۔

کا یہ فرض مجھ کو ادا کرنا ہے آپ نے منع فرمایا' لیکن وہ کسی طرح نہ مانیں' بالآخران کے بار بار اصرار پر اجازت دی' لیکن وہ خاتون آنحضرت ﷺ کا اصلی منشا سمجھ گئی تھیں' اس لیے پھر کبھی کسی کے نوحہ میں شریک نہ ہوئیں۔ (۱)

دستور تھا کہ جب کوئی مرجاتا تھا تو عام منادی کراتے کہ لوگ کثرت سے آئیں اس کو عربی میں "نعیٰ" کہتے ہیں آنحضرت ﷺ نے اس سے بھی منع فرمایا۔ حضرت حذیفہؓ جب مرنے لگے تو (فرمانِ نبوی کی اس قدر احتیاط مدِ نظر تھی کہ) وصیت کی کہ "میرے مرنے کی کسی کو خبر نہ کرنا' میں نے آنحضرت ﷺ کو اعلانِ مرگ سے منع کرتے دیکھا ہے' اور شاید خبر کرنا بھی اعلان میں داخل ہو۔" (۲)

جنازہ کے ساتھ نوحہ اور ماتم کرنے والے چلتے' اور بخوردان جلا کر لے جاتے آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ جنازہ کے پیچھے کوئی آگ اور راگ نہ لے جائے' راگ سے مقصود کفارِ ہند کی طرح گانا بجانا بھی ہوسکتا ہے تب یہ مطلب ہوگا کہ "جنازہ کے پیچھے کوئی آگ اور باجا نہ لے جائے۔ (۳)

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ ایک جنازہ میں شریک تھے ایک عورت انگیٹھی لے کر آئی۔ آپ نے اس کو اس زور سے زجر کیا کہ وہ بھاگ گئی۔ (۴)

جنازہ کے پیچھے چلتے تھے تو چادر پھینک دیتے تھے' صرف کرتہ بدن پر رہ جاتا تھا۔ ایک دفعہ آپ نے لوگوں کو اس صورت میں دیکھا تھا تو فرمایا کہ جاہلیت کی رسم پر چلتے ہو' میرا یہ ارادہ ہوا کہ میں تمہارے حق میں ایسی بددعا کروں کہ تمہاری صورتیں بدل جائیں لوگوں نے فوراً چادریں اوڑھ لیں اور پھر کبھی کسی نے ایسا نہیں کیا۔ (۵)

آنحضرت ﷺ نے سوگ کی مدت بھی مقرر کر دی' اور فرمایا کہ کسی مومن کے لیے یہ جائز نہیں کہ تین دنوں سے زیادہ کسی کا سوگ کرے البتہ بیوہ کو چار مہینے دس دن سوگ کرنے کا حکم دیا' جس میں وہ کوئی رنگین کپڑا نہ پہنے' خوشبو نہ لگائے اور نہ کوئی اور آرائش وزیبائش کرے۔ (۶)

کسی عزیز کی موت پر آنکھوں سے آنسو نکلنا جو فطرت کا اقتضا ہے برا نہیں لیکن زور زور سے چیخنا چلانا بین کرنا منع ہے' اور اس پر سخت تہدید فرمائی آنحضرت ﷺ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم نے جب وفات پائی تو آنحضرت ﷺ کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے نکل آئے اور فرمایا کہ اے ابراہیم ہم تیری جدائی سے مغموم ہیں لیکن زبان سے وہی نکلے گا جو رب کی مرضی ہے۔ (۷)

---

(۱) ترمذی تفسیر سورہ ممتحنہ۔
(۲) ترمذی کتاب الجنائز باب کراہیۃ النعی۔
(۳) باب الاسلام یہدم ما قبلہ ص ۱۹۹۔
(۴) ابوداؤد جلد ۲ کتاب الجنائز باب فی النار یتبع بہا المیت مع بذل المجہود فی شرح ابی داؤد۔
(۵) اسد الغابۃ جلد ۴ ص ۳۹۵ مصر۔
(۶) ابن ماجہ کتاب الجنائز باب ماجاء فی النہی عن التسلب مع الجنازۃ۔
(۷) ترمذی کتاب الطلاق باب ماجاء فی حدۃ المتوفی عنہا زوجہا۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''مردہ پر اس کے اعزہ کے رونے سے عذاب ہوتا ہے'، صحابہؓ اور محدثین کے درمیان اس حدیث کے مطلب میں اختلافات ہیں' [۱] جس بات پر سب کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ عرب میں جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا کہ لوگ فخر وغرور کے لیے حسبِ حیثیت ماتم کرنے کی وصیت کر جاتے تھے اسی وصیت کے مطابق اس پر رونے سے اس کو عذاب ہوتا ہے۔ [۲]

ہمدردی کا تقاضا ہے کہ جب کسی مسلمان کے گھر میں کوئی موت ہو تو مناسب ہے کہ عزیز دوست یا محلّہ کے لوگ اس کے ہاں کھانا بھیجیں، کیونکہ غم کے سبب سے اس کے گھر میں کھانا پکانے کا سامان مشکل ہے۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت جعفرؓ کی شہادت کے موقع پر ان کے گھر کھانا بھجوانے کا حکم دیا تھا اور فرمایا تھا کہ ان کے گھر کے لوگوں کو آج کھانا پکانے کا موقع نہ ملے گا۔ [۳]

ایک مسلمان کا فرض مشکلات میں صبر اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہے صبر اور دعا دفعِ غم کا وہ نسخہ ہے جس کو قرآن نے مسلمانوں کے لیے تجویز کیا ہے۔ ﴿وَ اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَ الصَّلٰوۃِ﴾ (بقرہ: ۴۵) صبر کا موقع حادثہ کے شروع ہی میں ہے، یہ نہیں کہ شروع میں خوب رو پیٹ لیا جائے اور پھر آخر میں مجبوری کا صبر کیا جائے' آنحضرت ﷺ نے ایک عورت کو جو اپنے بچہ کی موت پر رو رہی تھی سمجھایا مگر وہ نہیں مانی' بعد کو جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ رسول اللہ ﷺ تھے تو معذرت کرنے آئی اور صبر کا کلمہ ادا کیا آپؐ نے فرمایا کہ صبر صدمہ کے شروع ہی میں کرنا چاہیے۔ [۴]

خدا فرماتا ہے کہ اچھے مسلمان وہ ہیں کہ جب ان کو کوئی مصیبت پیش آئے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جائیں گے۔

﴿قَالُوۡۤا اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ﴾ (بقرہ:۱۵۶)

اسی لئے مسلمانوں میں دستور ہے کہ غم کی کوئی خبر سنتے ہیں تو اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ پڑھتے ہیں اور یہ دستور مستحسن ہے۔

تقدیر کا عقیدہ غم کا چارہ کار ہے' جو کچھ ہوا خدا کے حکم اور مصلحت سے ہوا یہ اسلام کی حکیمانہ تعلیم ہے اور اس تعلیم کا فائدہ بھی قرآن نے بتا دیا ہے۔

﴿لِّکَیۡلَا تَاۡسَوۡا عَلٰی مَا فَاتَکُمۡ﴾ (الحدید:۲۳)

''تاکہ تمہارے ہاتھ سے جو جاتا رہے اس پر غم نہ کرو۔''

---

(۱) مسلم کتاب الفضائل باب رحمتہ ﷺ الصبیان والعیال۔

(۲) فتح الباری جلد ۳ ص ۱۲۲۔

(۳) ابوداؤد کتاب الجنائز باب صنعۃ الطعام لاہل المیت۔

(۴) ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء ان اللہ یحب العطاس ویکرہ التثاؤب۔

متفرق آداب

انسان کی بعض جسمانی حالتیں ادب، تہذیب اور وقار کے خلاف ہوتی ہیں ان کو دیکھ کر ناگواری پیدا ہوتی ہے، مثلاً جماہی لینے میں انسان کا منہ کھل جاتا ہے۔ آہ آہ یاہاہ کی ناگوار آواز منہ سے نکلتی ہے اور چہرے کی قدرتی ہیئت بدل کر ایک مضحکہ خیز شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی مفہوم کو رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ جماہی شیطان کی جانب سے ہے اور جب کوئی اس حالت میں آہ آہ کہتا ہے، تو شیطان اس کے پیٹ کے اندر سے اس پر ہنستا ہے۔ (۱) بعض حدیثوں میں ہے کہ جب تم میں کوئی جماہی لے تو اپنے منہ کو بند کر لے، کیونکہ شیطان اس کے منہ کے اندر گھس جاتا ہے، (۲) حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اس میں حقیقت ومجاز کی اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ شیطان مکھی یا مچھر کو اڑا کر اس کے منہ کے اندر داخل کر دیتا ہے۔ (۳) اس لیے اسلام نے مختلف طریقوں سے اس بدنمائی کو دور کیا ہے۔

(۱) پہلا حکم تو یہ ہے کہ جماہی روکنے کی چیز ہے، اس لیے جہاں تک ممکن ہو اس کو روکنا چاہیے، ہاہ ہاہ نہیں کہنا چاہیے، اور اگر یہ نہ ہو سکے تو منہ پر ہاتھ رکھ لینا چاہیے۔

(۲) جماہی کے برخلاف آپؐ نے چھینک کے روکنے کی کوئی ہدایت نہیں کی ہے بلکہ اس کو خدا کی جانب سے بتلایا ہے (۴) ہمارے شراح حدیث اس کی وجہ یہ لکھتے ہیں کہ چھینک بدن کے ہلکے پھلکے ہونے، مسامات کے کھلنے اور بہت زیادہ نہ کھانے سے آتی ہے، لیکن جماہی بدن کے ثقل اور کسل وسستی کا نتیجہ ہے اس لیے چھینک عمل کے لیے نشاط اور جماہی اس کے لیے کسل پیدا کرتی ہے، شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ چھینک سے دماغی ابخرے نکلتے ہیں اور اس طریقہ سے وہ شفا کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس بنا پر شریعت نے چھینکنے والے کو حکم دیا ہے کہ وہ اس پر خدا کا شکر کرے اور ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ کہے دوسرے لوگ اس کے جواب میں ﴿یَرْحَمُکَ اللّٰهُ﴾ کہیں۔ (۵)

(۳) تاہم وہ ایک بدنما چیز ہے بعض اوقات اس حالت میں ناک سے بلغم نکل آتا ہے، اس لیے چھینکتے وقت منہ کو ہاتھ یا کپڑے سے ڈھانک لینا چاہیے اور اس طریقہ سے چھینک کی آواز کو پست کرنا چاہیے رسول اللہ ﷺ کا یہی طریقہ تھا۔ (۶)

---

(۱) ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی التثاؤب۔

(۲) حجۃ اللہ البالغۃ ادب۔

(۳) ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء ان اللہ یحب العطاس ویکرہ التثاؤب۔

(۴) ایضاً۔

(۵) ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء کیف یشمت العاطس۔

(۶) ابوداؤد کتاب الادب باب فی العطاس۔

(۴) انگڑائی اور ڈکار کے متعلق اگرچہ آپؐ نے کوئی خاص حکم نہیں دیا ہے، تاہم اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ عام مجمع میں انگڑائی اور ڈکار لینا تہذیب کے خلاف ہے۔ خصائص کی بعض کتابوں میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جماہی اور انگڑائی نہیں لیتے تھے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ان حدیثوں کو نقل کیا ہے اور ان کی تضعیف وتردید نہیں کی ہے، بلکہ بعض کی تائید کی ہے۔ (۱) بہر حال یہ حدیثیں صحیح ہوں یا نہ ہوں لیکن ان سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ انگڑائی لینے میں جسم کی جو حالت ہوتی ہے وہ بدنمائی پیدا کرتی ہے، اس لیے مجمعِ عام میں اس سے احتراز کرنا چاہیے۔ (۲)

ڈکار کے متعلق صحیح ترمذی میں ہے کہ ایک شخص نے آپؐ کے سامنے ڈکار لی تو آپؐ نے فرمایا کہ اپنی ڈکار کو روکو، کیونکہ جو لوگ دنیا میں بہت زیادہ پیٹ بھر لیتے ہیں وہ آخرت میں سب سے زیادہ بھوکے رہیں گے۔ اس حدیث سے پُرخوری کی ممانعت کے ساتھ ضمناً ڈکار کی کراہت ثابت ہوتی ہے۔

آداب کا فلسفہ

شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں ان آداب کی خصوصیات پر ایک نہایت عمدہ تبصرہ کیا ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

تمام متمدن ملکوں کے باشندوں نے خورد ونوش، نشست وبرخاست اور وضع ولباس وغیرہ کے متعلق اجتماعی و معاشرتی حالات میں فطرۃً چند آداب کی پابندی کا لحاظ رکھا ہے اور اس میں مختلف طریقے اختیار کیے ہیں۔

(۱) بعض لوگوں نے ان کی بنیاد حکمتِ طبعی کے قواعد پر رکھی ہے، اور ان آداب کو اختیار کیا ہے جو طب اور تجربہ کی رو سے مفید ہیں۔

(۲) بعض لوگوں نے ان کو مذہبی اصول پر قائم کیا ہے، اور اس میں اپنے مذہب کی پابندی کی ہے۔

(۳) بعض لوگوں نے اس معاملہ میں اپنے بادشاہوں، حکیموں اور راہبوں کی تقلید کی ہے۔ ان کے علاوہ اور اصول وقواعد بھی ہیں جن میں بعض مفید اور بعض مضر ہیں، اور بعض میں نفع ونقصان کچھ بھی نہیں، اس لیے جو مفید تھے وہ اس بات کے مستحق تھے کہ ان کی پابندی کا حکم دیا جائے، اور جو مضر تھے ان کی ممانعت کی جائے اور جن میں نفع ونقصان کچھ بھی نہیں تھا وہ اپنی اباحت کی حالت میں قائم رکھے جائیں۔ ان مصلحتوں کی بنا پر شریعت نے ان سے بحث کی اور اس میں امورِ ذیل کا لحاظ رکھا۔

(۱) ایک تو یہ کہ ان آداب کی پابندی سے بعض اوقات خدا بھول جاتا ہے اور دل کی صفائی باقی نہیں رہتی

(۱) فتح الباری جلد ۱۰ ص ۵۰۶۔

(۲) ترمذی ابواب الزہد ص ۴۰۹۔

(۳) حجۃ البالغہ ص ۳۶۳۔

اس لیے شریعت نے ان سے پہلے ان کے بعد اور ان کے ساتھ چند دعائیں مسنون کر دیں جو خدا کو یاد دلاتی ہیں۔

(۲) بعض افعال و اشکال شیطانوں کے مزاج سے مناسبت رکھتے ہیں مثلاً ایک جوتا پہن کے چلنا اور بائیں ہاتھ سے کھانا' اس لیے شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے اس کے بخلاف بعض باتیں ایسی ہیں جو فرشتوں سے قریب کر دیتی ہیں مثلاً گھر میں داخل ہونے اور نکلنے کے وقت دعا پڑھنا' اس لیے شریعت نے ان کی ترغیب دی ہے۔

(۳) بعض چیزیں ایسی ہیں جن سے تجربتاً تکلیف پہنچتی ہے مثلاً ایسی چھت پر سونا جس پر کوئی آڑ یا جالی نہ ہو' یا سوتے وقت چراغ کو جلائے رکھنا' اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ چوہے چراغ کی بتی سے گھر میں آگ لگا دیتے ہیں۔

(۴) بعض آداب ایسے ہیں جن سے عجمیوں کے مسرفانہ اور عیاشانہ تمدن کی مخالفت مقصود ہے مثلاً حریر' تصویر دار کپڑوں اور چاندی سونے کے برتنوں میں کھانے پینے کی ممانعت۔

(۵) بعض چیزیں وقار و تمدن کے منافی ہیں اور انسانوں کو بالکل وحشیوں اور بدوؤں میں شامل کر دیتی ہیں اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ان کی ممانعت فرمائی تاکہ افراط اور تفریط کے درمیان توسط و اعتدال کی راہ نکل آئے۔ (۱)

اس تفصیل کے پیش نظر رکھنے کے بعد یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ دنیا کی تمام مہذب قوموں کے اجتماعی و معاشرتی آداب کی بنیاد جن اصولوں پر قائم تھی اسلام کے احکام میں اور رسول انام علیہ السلام کے آداب میں وہ سب ملحوظ ہیں' اور مذہبی' اخلاقی' تمدنی اور طبی' غرض ہر قسم کے فوائد و منافع پر مشتمل ہیں یعنی ان آداب کی پیروی سے خدا کی رضا رسول اللہ ﷺ کی اتباع' روح اور جسم کی پاکیزگی' گھر کی صفائی' اخلاق کی طہارت اور بلندی' معاشرت کی اچھائی' صحت کی حفاظت اور ترقی' بزرگوں کے آزمودہ اصولِ کار' اور طریقِ زندگی کی ہدایت نصیب ہوتی ہے اور ان ہی کے مجموعہ کا نام اسلام کا خاص تمدن و معاشرت ہے۔

اسلام نے ان آداب میں بڑی لچک رکھی ہے یعنی ان میں جو اصلی اور بنیادی باتیں ہیں' ان کی تو قرآن پاک اور احادیثِ نبویہ میں پوری تاکید کر دی ہے اور اسی تاکید سے ان کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے' لیکن ان میں بعض ایسے امور بھی ہیں جو وقتی مصلحت' عرب کی ملکی معاشرت اور زمانہ کے حالات کے بدلنے سے بدل سکتے ہیں' اسی لیے ان کے متعلق کوئی ایسی تاکید نہیں کی جس سے ان کا شعار اسلامی ہونا ظاہر ہو' یا ان کے چھوڑنے پر کوئی وعید فرمائی گئی ہو (۲) اور اسی لیے ان کے دنیوی مصالح اور فائدے بھی بتا دیے گئے ہیں' ان کے معنی یہ ہیں کہ اگر ان میں کچھ ایسا تغیر کیا جائے جس سے اصل مقصد فوت نہ ہو بلکہ اس کی خوبی اور زیادہ بڑھ جائے تو وہ برا نہیں' جیسے

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ ص ۳۶۳۔

(۲) ہمارے فقہا نے اسی کو سنن الہدیٰ اور سنن الزوائد کی اصطلاحوں میں بیان کیا ہے۔

جہاں ہاتھ دھونے میں اصل مقصد صفائی اور پاکیزگی ہے وہاں اگر مٹی کی جگہ صابون استعمال کیا جائے، تولیے کام میں لائے جائیں، کھانے میں ہاتھ کے بجائے چمچوں سے کھانا نکالا جائے۔ چھری سے گوشت کاٹا جائے،[1] پلیٹیں بدلی جائیں یا صفائی اور ستھرائی کے اور دوسرے طریقے اختیار کیے جائیں، یا ہر ملک کے رہنے والے اپنے ملکی طریقہ کا جائز لباس پہنیں، حلال کھانا کھائیں، بیٹھنے اور سونے کے مناسب سامان استعمال کریں تو ان کی پوری اجازت ہے لیکن اس اجازت کے باوجود ایک مرتبہ عشق و محبت کا ہے، جو لوگ اس راہ سے رسول اللہ ﷺ کی پیروی کا عزم رکھتے ہوں، ان کے لیے زمانہ کچھ ہی بدل جائے مگر ان کی نظر میں وہی ادائیں محبوب ہیں جو محبوب سے نسبت رکھتی ہیں۔

❀❀❀

(۱) آنحضرت ﷺ نے چھری سے گوشت کاٹ کر کھایا ہے۔

حکمتِ ربانی کا چشمۂ نور

﴿یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِم﴾

ناظرین! آپ نے کتاب کا ایک ایک صفحہ پڑھ لیا‘ اسلام کی اخلاقی تعلیموں اور پیغمبرِ علیہ السلام کی اخلاقی ہدایتوں کا ایک ایک لفظ آپ کی نظر کے سامنے آ گیا‘ آپ نے دیکھا کہ اسلام کا فلسفۂ اخلاق کتنا مکمل‘ اس کی تعلیم کتنی کامل‘ اس کے تہذیب و تمدن کے اصول کتنے اعلیٰ اور اس کی اخلاقی تربیت کے نظریے کتنے بلند ہیں اور یہ سب کچھ نبی امی ﷺ کی زبانِ وحی ترجمان سے ادا ہوا‘ اگر حضور علیہ السلام کی صداقت کی کوئی اور دلیل نہ بھی ہوتی تو یہی ایک چیز کافی تھی کہ جس بلندی تک حکمائے زمانہ‘ فلاسفۂ روزگار اور قوموں کے معلم پہنچنے سے عاجز رہے‘ معلمِ امی ﷺ کسی انسانی تعلیم کے سہارے کے بغیر وہاں تک پہنچ گئے۔

اگرچہ یہ بات خود بھی اپنی جگہ پر بہت بڑی ہے‘ لیکن اس سے بھی بڑی یہ ہے کہ اس قوم کو جو تہذیب سے ناآشنا‘ اخلاق عالیہ سے بیگانہ‘ اور سلیقہ و شعور سے عاری تھی۔ نہ صرف اخلاق و تمدن کے ایسے بلند حکیمانہ اصول اور نظریے سکھائے بلکہ اپنی تعلیم و تربیت کے صیقل سے ان میں ایسی جلا پیدا کر دی کہ دنیا ان کے اخلاقی جلوؤں کو دیکھ کر ششدر رہ گئی‘ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ دعا قبول ہوئی یا یہ کہیے کہ وہ پیشین گوئی پوری ہوئی جو اسماعیلی نسل کے خاتم المرسلین ﷺ کی آمد کے لیے کی گئی تھی۔ ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِم﴾ یعنی ایسا نبی جو ان امیوں کو اللہ کے احکام اور اخلاق و حکمت سکھائے اور ان کو اپنی تعلیم و تربیت سے پاک و صاف کر کے نکھار دے۔“ یہ نکھارنے والا آیا اور نکھار کر دنیا کو پربہار بنا گیا ﷺ۔

امیدوارِ رحمت

سید سلیمان ندوی

۲۹ ذیقعدہ: ۱۳۵۷ھ

❀❀❀